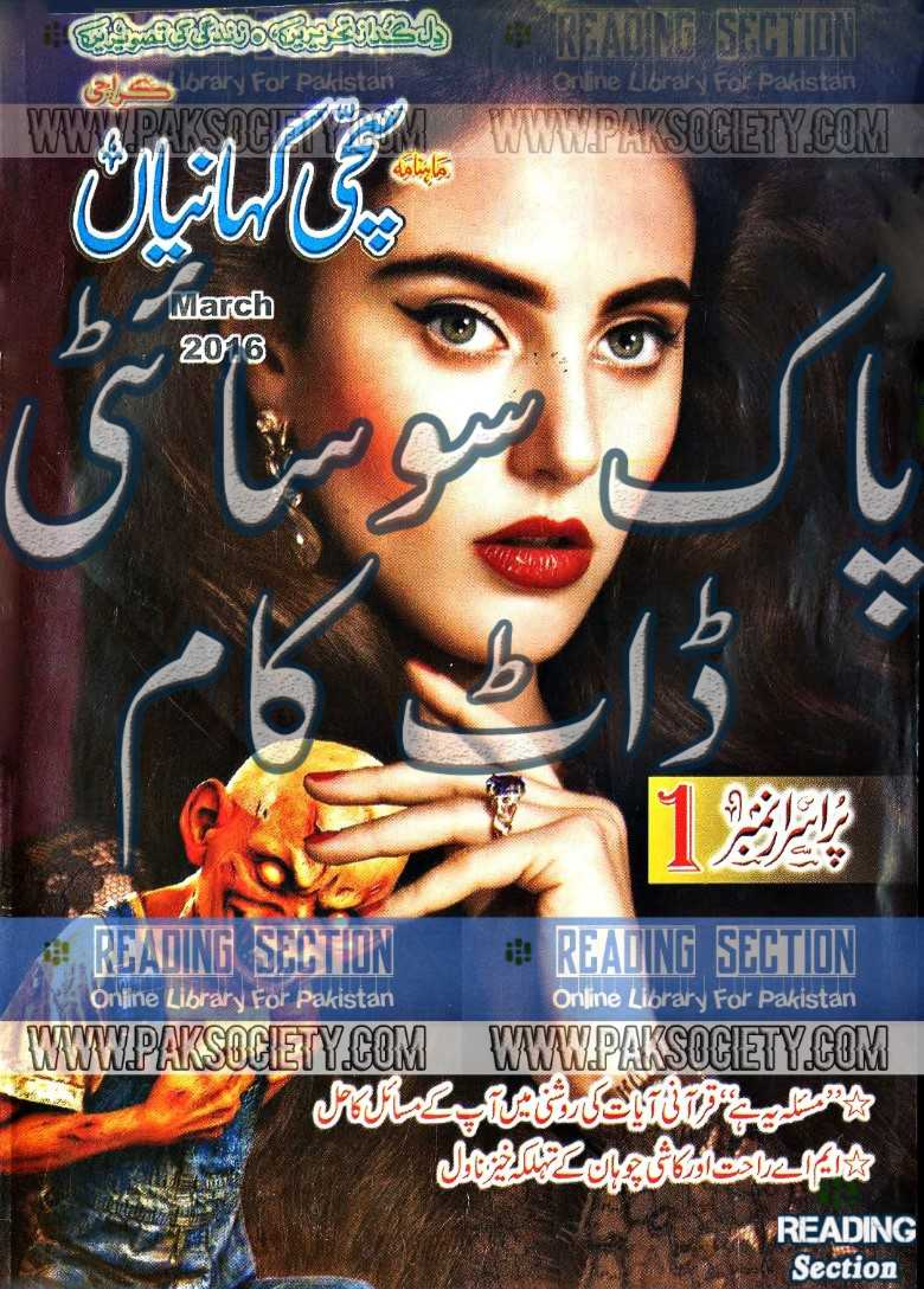

دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں
کراچی
ماہنامہ
سچی کہانیاں
March
2016
پراسرار نمبر 1
☆ "مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل
☆ ایم اے راحت اور کاشی چوہان کے تہلکہ خیز ناول

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



مارکیٹنگ

021-3...21

منیجر سر...

...3-2269932

مدیرہ ا... سہام

...ان/دانیال شمسی

انکم ٹیکس ایڈوائزر

مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے

021-35893122

021-35893123

خط و کتابت ...

ڈیفنس فیز-7 ... کراچی

قیمت فی شارہ: 60 روپے ✲ جلد: 33 ـ شمارہ ... 2016:

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا... کیا۔



07 الفاظ کھو گئے
منزہ سہام

08 احوال
کاشی چوہان
قارئین کے خطوط اور حال احوال کا دل چسپ سلسلہ

35 لائف بوائے
اسماء اعوان
حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

42 سترہواں مسافر
محمد سلیم اختر
ایک ایسے ڈرائیور کی خوف بیتی، جسے تیز رفتاری پر خوب مہارت تھی مگر......

51 معاف کر دو
[illegible]
چھوٹی بہن پر کالا جادو کرا دینے والے ایک شخص کا قصہ عبرت

62 روم نمبر 607
[illegible]
اٹلی میں پیش آنے والا قصہ، کلام اللہ کی طاقت کا پیش خیمہ

68 گم شدہ چہرہ
شانی خاماں
اس لڑکی کی لرزا دینے والی خوف بیتی، جس کا چہرہ ہوائی مخلوق لے گئی تھی

72 بھوک
رضوانہ پرنس
اُس دوشیزہ کو اچانک ہی وہ بھوکے مل گئے تھے اور......

79 عرشی کون تھی؟
نادیہ ملک
چار ماہ تک ایک ملازمہ کے روپ میں وہ کس کے ساتھ رہ رہے تھے

82 ہانڈی
شائستہ انور
اُس معصوم دوشیزہ کی دہشت ناک کہانی، جسے کسی اور کے نام کی موت مل گئی تھی

87 ایک تصویر ایک کہانی
دانیال شمسی
آنکھ کے کیمرے میں محفوظ ہو جانے والے ان مناظر کو آپ فراموش نہیں کر سکتے

88 ہم شکل
ایم اے راحت
سچی کہانیاں میں پہلی بار برصغیر کے نامور قلم کار کا سنسنی خیز سلسلہ

102 سُرخ لیموں
محمد یوسف لغاری
اس نوجوان نے ایک ایسی غلطی کر ڈالی جس کا خمیازہ اسے تاعمر بھگتنا پڑا

112 سنپولیے
علی حسنین تابش
حاسدوں کے شر سے نکلی ایک روح فرسا خوف بیتی

116 تمہارے ساتھ ساتھ
نازیہ بتول رضا
ان جنات کا قصہ خاص، جو انسانوں کے دوست بن کر رہنا چاہتے تھے

122 دوسری دنیا کا عشق
منعم اصغر
اس دوشیزہ پر بچپن ہی میں ایک جن عاشق ہو گیا تھا مگر......

126 آٹھ کہانیاں اِک کردار
مرج انیس
ایک دوشیزہ کے ساتھ پیش آنے والی پراسرار انہونیاں

257 تیرِ نیم کش
قارئین
قارئین کی سخن فہمی کو آزماتا ایک دلچسپ سلسلہ

131 اِک پل میں سب کچھ
نزہت ناز
ایک ایسا قصہ، جو یقیناً آپ کی نیند اڑا دے گا

134 مہانتا ناگ
تحسین جویجو
قدرت کا عجب رنگ دکھاتی زہریلی دنیا سے امرت بھری تحریر

138 آدم خور
ملک صفدر عباس اعوان
اُس شخص کا قصہ جو آدم خور بن کر زندہ انسان کھاتا تھا

150 کیسا یہ راز ہے
ارسہ سحر جوہان
ہندو آرٹسٹ کی کتھا، جسے اس کے خوابوں نے بامِ عروج عطا کر دیا

154 ہماری اُدھوری کہانی
کشاف اقبال
اُس ریڈیو آر جے کی سچ بیتی، جس کا ملن اس جہاں میں اُدھورا رہ گیا تھا

162 بھارت میں بلیک لسٹ
محمود شام
نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے 'سفر نامہ' بھارت

176 سب کچھ تیرا ہے
ارم خان
اُس رات اگر وہ کٹی میں پہنچ جاتی تو شاید جنات اسے......

179 وہ بڑھیا کون تھی؟
سیدہ حجاب فاطمہ
تیز خوشبوؤں کی شوقین، ایک دوشیزہ کی خوف بیتی

182 نجات
الماس عاطمہ ارمان
اس چائے فروش کا قصہ، عجب، جس نے چالیس سال سے بھٹکتی روح کو......

186 بیٹا دے یا...... مایا
سما عروج صدیقی
اُس ماں کی کہانی، جس سے 'مایا' بیٹے کی بھینٹ مانگ رہی تھی

188 پچھل پیری
بشیر احمد بھٹی
بہاول پور سے ایک خوف بیتی

190 حلوہ کھاؤں گی
محمد اسامہ
اُس جوڑے کو خدا نے اولاد تو دی، لیکن......!

192 بادبان
نعمان اسحٰق
ایک حاصلِ مطالعہ ناول، جو زندگی کے ایک نئے جذیرے کا سفر کرائے گا

206 منی باجی
جاوید راهی
اُس عورت نے اپنے مذموم مقاصد کے لیے شیطانی طاقتوں کو قابو کر لیا تھا

213 حسد کی آگ
ممتاز احمد
ٹرین سے ٹانگیں کٹ جانے والا شخص آج بھی لوگوں کو پلیٹ فارم پر......

224 زہرِ عشق
کاشی چوہان
خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور نیا سلسلہ

242 مسئلہ یہ ہے
ادارہ
آپ کے مسائل کا حل، سچی کہانیاں کا لازوال سلسلہ

252 ہائیڈ پارک
ڈی خان
زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ جسے قارئین خود ترتیب دیتے ہیں



فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی سٹی پریس OB-7 تالپور روڈ، کراچی
زرسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

الفاظ کھو گئے

آج دوسری بار الفاظ ساکت ہو گئے ہیں۔ دل بچوں کی طرح مچل رہا ہے کہ کسی طرح وقت کا پہیہ الٹا گھوم جائے، وہ ہنستے مسکراتے چہرے دوبارہ واپس لاسکوں، جو میری طاقت تھے۔ جن کے ہونے سے میں بالکل اسی طرح محفوظ تھی، جیسے مخمل کے دبیز غلافوں میں کوہِ نور ہیرا...... جیسے سمندر کی تہہ میں موجود سیپ میں موتی...... میری ہر خوشی پر جن کے چہرے کھل جاتے تھے اور میری ہر پریشانی بِنا بتائے جو محسوس کرتے تھے۔ وہ دونوں چہرے منوں مٹی تلے کیسے جا سوئے۔ اب سر پر کھلا آسمان ہے اور پیروں تلے تپتی ہوئی زمین...... ابو کے بعد بجیا ہی میری سب کچھ تھیں۔ میری ماں، میری دوست، میری غم گسار!! ان کے پاس جا کر میں اپنی ہر پریشانی ان کے حوالے کر کے ہلکی پھلکی ہو کر اٹھتی تھی۔ ہر انسان کی زندگی میں نشیب و فراز آتے ہیں، میں جب پریشان تھی تب اُن کے پاس جا کر ٹھہر گئی تھی اور وہ دو دن میری زندگی کا حاصل ہیں۔ میں ان ہی دو دنوں کو لے کر جیتی چلی گئی۔ شدید بیماری کے ایام میں جب وہ کسی کو بھی نہ پہچانتی تھیں تب کسی کے پوچھنے پر کہ "بجیا بتائیں یہ کون ہے؟" میرا ہاتھ تھام کر غور سے میری آنکھوں میں کچھ سیکنڈ دیکھا اور کہا "منیزہ" ہے۔ بس اسی دن انہوں نے مجھے مجھ سے ملوا دیا۔ میں اپنی اس پیاری سی خالہ کے احسانوں کا بدلہ تو کبھی نہیں اُتار سکتی مگر کوشش ضرور کروں گی۔ جو محبت، خلوص، رواداری، حسنِ سلوک اُن سے پایا وہ ان لوگوں کو ضرور لوٹا سکوں جو ان سے محبت کرتے ہیں۔ یا جن سے وہ محبت کرتی تھیں۔ اللہ میری بجیا کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور مجھے اس نقصانِ عظیم کو برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو!

ہم خدا کی بنائی شاہ کار تخلیق ہیں۔ ہم اشرف المخلوق ہیں۔ مگر اِس اشرف مخلوق میں بھی کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں۔ جو قریب ہوں تو بھی اپنی ہوتی ہیں اور جو دُور ہو جائیں تو اور بھی زیادہ اپنی ہو جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک عظیم ہستی...... فاطمہ ثریا بجیا بھی تھیں۔ بجیا سے ہمارا تعلق روح ایسا ہے۔ وہ ہراوّل دستے کی طرح ہمیشہ ہمارے آس پاس رہیں۔ اب ہماری بجیا ہم میں نہیں۔ ہم لاکھ خیال کو وجود دے کر انھیں ڈھونڈتے رہے۔ دعائیں پھونکتے رہے۔ مگر...... 'ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم' بجیا چلی گئیں اور جاتے سمے بھی بجیا نے یوں موت کو گلے لگایا کہ سب عبادتیں تراشتے رہے' اور بجیا نے نوری خلد پہن کر آسمانوں تک رسائی حاصل کر لی۔ وہ 11 فروری 2016ء کی جمعرات کا دن تھا۔ جس دن بجیا نے زمین سے پردہ کرلیا۔

ساتھیو! دل بوجھل ہے لیکن بجیا کے دیے ہوئے حوصلے نے ہمیں مہمیز کردیا ہے۔ اور پوری توانائیوں کے ساتھ محبت کے دیپ جلاتے ہم اپنے احوال کا آغاز کرتے ہیں۔ آپ لوگوں کے محبت بھرے ناموں سے پہلے بھائی مجید احمد جائی سے کچھ کہنا ہے۔ بھیا! آپ بہت اچھا لکھتے ہو۔ کوئی شک نہیں۔ امید ہے سمجھ گئے ہوگے۔ بات اگر لکھاری کی ہو تو سمجھ میں آتی ہے۔ مگر جب معتبر اشخاص اور ادارے انگلی اٹھانے لگیں تو سمجھیں کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ پیارے بھائی امید ہے جلد آپ اس بات کی وضاحت کریں گے۔ تب تک آپ سے معذرت! آپ ہماری بات یقیناً سمجھ گئے ہوں گے۔ محفل میں سب سے پہلے ہمارے ساتھ ہیں۔ کوہاٹ سے ہمارے بہت عزیز ساتھی سید ملازم حسین' لکھتے ہیں۔ آپ سچی کہانیاں کا رسالہ ارسال کرتے ہیں۔ میرے لیے بڑی سہولت ہے جیل میں بعض اوقات ذاتی چیزوں کا حصول اور ضروریات نظر انداز کردی جاتی ہیں۔ آپ کا بہت شکریہ میری ارسال شدہ کہانی ''فراڈ کمپنی'' ماہ جنوری میں شائع ہوئی بہت عنایت۔ ماہ جنوری کا شمارہ بہت خوب صورت ہے کہانیاں جاندار اور دلچسپیوں کی حامل ہیں۔ احوال میں دوستوں کی اٹھکیلیاں، سب نگینوں کی طرح پائیدار جڑی ہیں۔ یہ سب آپ کی مدیرہ اعلیٰ اور تمام اسٹاف ممبران کی انتھک محنت، کاوشوں اور لگن کا نتیجہ ہے۔ کہانیوں پر تبصرے تفصیلی طور پر کرنے کے لیے بہت جی چاہتا ہے۔ لیکن کاشی چوہان صاحب کی تیز طرار اور کاٹ دار قینچی سے ڈر لگتا ہے۔ مختصراً عرض ہے۔ منزہ سہام صاحبہ کا اداریہ ''تجدید عہد وفا'' انسانی جذبوں کی عکاسی کرتی خوب صورت تحریر ہے۔ دل میں اترتی...... واقعی انعام کی مستحق، عشق زادے، محبت لافانی ہے، سوچ میں ڈوبی کہانی، گرہن لگا جیون، فرحت صدیقی، عبرت ناک، بہترین تحریر، انوکھا نشہ، ارم ناز، نہایت شاندار، میں نے کہا لکھنا نہ چھوڑنا ایک دن کامیاب لکھاری بنیں گی۔ انعام یافتگان میں آپ کا نام منہ بولتا ثبوت ہے۔ مبارک باد مجید احمد جائی، آپ کی بیان کردہ واردات نے بہت دُکھی کردیا۔ ''دیکھ میرا نصیب'' از قلم ممتاز احمد۔ بھارت میں بلیک لسٹ از محمود شام خوب لکھتے ہیں۔ ایم اے راحت، خوب سے خوب تر سلسلہ وار کہانی

''زہر عشق'' کاشی چوہان کی خدمت میں میری طرف سے ایوارڈ...... ''بیسٹ رائٹر فار ایور۔'' 'وناشا' اقبال بانو کے قلم سے شاندار۔ 'آخری دعا' از فصیحہ آصف خان، ان سونا گاچھی بازاروں میں کتنی معصوم اور مصیبت زدہ دوشیزائیں مکروہ بدقماش ہوس پرستوں کا نشانہ بنتی ہیں۔ معاشرہ خاموش۔ مجھے موت چاہیے، محمد سلیم اختر تحریر شاندار ہے، ماشاءاللہ۔ وفا کیسی۔ اشفاق شاہین کے قلم کی کاٹ دار کہانی۔ دیگر کہانیاں بہت دلچسپ ہیں۔ مسئلہ یہ ہے، ہائیڈ پارک، تیر نیم کش، لائف بوائے بہت بہتر ہیں۔ آخر میں مجید احمد جائی، صائمہ مجید، ممتاز احمد، مور شاہد حسین، سونیا خان بہت مشکور ہوں کہ ہم جیسے پس زنداں لوگوں کو دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں۔ آپ کے لیے شکریہ جیسے الفاظ ہیچ ہیں۔ خوش رہیں اجازت چاہتا ہوں۔

☆: پیارے بھائی! آپ کا تبصرہ اتنا خوب صورت ہے کہ میرے پاس لفظ نہیں۔ کہانیاں جلد شائع ہوں گی۔ آپ کی بھیجی ہوئی کہانی پر اسرار نہیں تھی۔ لیکن جلد شائع نہیں ہوگی۔

☒: بہاولپور سے ہمارے نئے ساتھی عثمان بلوچ احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ سب سے پہلے میں اُن تمام قلمی دنیا میں رنگ بھرنے والوں کو تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ جنھوں نے اپنی محنت کی راہ اور سیج پر رواں دواں رہ کر ایوارڈ حاصل کیا۔ تعلقِ خاطر اور بلا کی محبت رکھنے والے، نزاہت افشاں، ممتاز احمد، ارم خان، ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، سونیا خان، مجید احمد جائی اور جملہ احباب کا میں ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں ہمیں یاد رکھا۔ ''کراس ٹاکنگ، ٹھکانہ، انوکھا نشہ، شہید، یاد رکھے گی دنیا، وہ بلی کا بچہ، دیکھ میرا نصیب، علاج، جدا نہ ہوں گے، ہم شکل اور زہرِ عشق، شعور کو بلندی، اور۔۔۔ ارادوں کو پختگی بخشنے والی تحریریں تھیں۔ کاشی بھیا! آخر میں آپ کو محبت بھرا اور پیارے سے لبالب سلام، زندگی نے وفا کی تو اگلے ماہ تک اجازت۔

☆: اچھے عثمان! محبت کے جام کو جام جم کرنے پر تمہارا شکریہ! احوال کی رونق تو تم سب ہی ہو یار! بس باقاعدہ رہا کرو۔

☒: کوئٹہ سے احوال کی نذر یہ تبصرہ کررہی ہیں۔ غزالہ نزہت فاطمہ، عرض کرتی ہیں۔ میرا نام غزالہ نزہت فاطمہ ہے۔ میں 'سچی کہانیاں' کراچی کی اشاعت سے۔ جب انکل سہام مرزا اور دانش دیروی انکل بقید حیات تھے۔ پھر حالات نے کچھ آندھیاں چلائیں کہ میرا بہت کچھ حالات کی آگ میں جل کر خاکستر ہوگیا۔ میں اپنا سب کچھ بھول گئی۔ صرف بچی کچھی راکھ اور دبی دبی چنگاریوں کی گرمی سے میری سانسیں چل رہی ہیں۔ ہوا یوں کہ میں چند روز قبل رسالوں کی ایک دکان پر گئی تو سامنے ریک پر پڑا 'سچی کہانیاں' کراچی مجھے اپنی جانب متوجہ کررہا تھا۔ میں نے جھٹ سے خرید لیا۔ پڑھنے سے پتا چلا کہ منزہ سہام مرزا کی زیرِ ادارت رسالہ بڑے تام جھام سے چل رہا ہے۔ مزید نئے اور قابل لوگ اُن کی معاونت کررہے ہیں۔ رسالہ خود بتاتا ہے کہ جناب کاشی چوہان، دانیال شمسی اور ذین شمسی جیسے ذہین نوجوان اِس کی نوک پلک سنوارتے ہیں۔ میں نے بھی بہت سی کہانیاں لکھی تھیں جن میں سے کچھ نے انعامات بھی حاصل کیے۔ ماہنامہ دوشیزہ میں بھی میری ایک دو کہانیاں چھپی تھیں۔ زیرِ نظر کہانی میں نے چند سال پہلے بُنی تھی اب کہانی کی صورت میں آپ کو ارسال کررہی ہوں۔ دیکھیں نئی نسل اِسے کس نظر سے دیکھتی ہے۔

☆: بہت محترم غزالہ جی! یقین کیجیے جب پرانے ساتھی پھر سے ہماری طرف آتے ہیں تو الگ ہی رنگ جمتا ہے۔ آپ کے موتیوں سے الفاظ بتارہے ہیں کہ آپ نے ہم سے دور رہ کر ہمارے ساتھ کس بلا کی زیادتی کی ہے۔ ہمیں آپ کی محبت کی حرارت کی اپنے کام کو بہتر طور پر سرانجام دینے کے لیے ازحد ضرورت ہے۔ وعدہ کیجیے کہ اب آپ ہم سے ناتا نہیں توڑیں گی۔

☒: گلابوں کی نگری، چھوکی سے ہمارے ساتھی محمد ندیم عباس میواتی شاملِ احوال ہیں۔ لکھتے ہیں۔ اشتہارات نظر انداز کرتے احوال کی پررونق بزم میں حاضر ہوا۔ جہاں پھول، کلیاں مسکراتی دل لبھاتی نظر آئیں۔ نئے مہمانوں کو خوش آمدید

یعنی امتیاز عاصم، شمسہ قمر، باقی کاشی بھائی یہ سب مہکتے پرانے پھول کدھر غائب ہیں۔ کاشی بھائی مجھے غصے سے مت گھوریے پلیز میرا کوئی دوش نہیں۔ پچھلے ماہ تین تاریخ کو اس تبصرہ کو ارسال کر دیا تھا مگر کھا گیا اسے محکمہ ڈاک۔ احوال کی محفل میں بابا مجید جائی (باباجی آپ کے ایکسیڈنٹ کا سن کر افسوس ہوا، خدا آپ کو صحت کاملہ دے۔ اور آپ کی اسٹوری۔ اُف۔ اپنے ہوس وار عیب کو چھپانے کی خاطر معصوم کا انتہائی سفاکی سے قتل وٹکڑے کرنا رلا گیا، آپی صالحہ مجید (اللہ تعالیٰ آپ کی دلی مراد پوری کرے گا میں ہمہ تن دعا گو ہوں۔ چلیں مونگ پھلیاں دیں ہمیں اب) سدرہ انور علی، کنزہ ملک، واقعی جاندار مٹھاس والا تبصرہ تھا۔ بھائی ملازم حسین شیرازی میری اسٹوری کی پسندیدگی کا شکریہ۔ (اللہ آپ کی مشکل آسان کرے۔ اسٹوری اچھی تھی) خادم حسین کھیڑا، ارم ناز، راشد لطیف، علی حسنین تابش، ممتاز احمد، ٹھکانہ شاہد رفیق اچھی سبق آموز تحریر تھی۔ وٹا سٹا (کہانی جہالت کی عکاس ہے) اشفاق شاہین کی اچھی اسٹوری تھی۔ زہر عشق واہ بھئی واہ، ہر قسط نیا رخ دکھا رہی ہے۔ ایک لڑکی اور اب تین امیدوار، کیا کرنا ہے کاشی بھیا نے دیکھتے ہیں۔ اپنی اپنی بات، نزہت ناز (ہر کوئی اپنی سوچ کے مطابق قیاس کرتا ہے) باقی پڑھی نہیں تو تبصرہ کیا۔ ایوارڈ کی سب کو مبارکاں۔

☆: لو پھولوں کی نگری کے شہزادے! اب خوش ہو جاؤ۔ تبصرہ بہت تاخیر سے ملا لیکن...... شکر ہے پھر بھی مل ہی گیا۔

✉: ہمارے بہت پیارے لکھاری محمد ابوہریرہ بلوچ، بہاول نگر سے لکھتے ہیں۔ پچھلے ماہ احوال کی محفل میں شرکت نہ کر سکا۔ وجہ محکمہ ڈاک ہے کیونکہ بروقت تبصرہ بھیج دیا تھا۔ چلیے کوئی بات نہیں۔ (اس بار بھی ایسا ہی ہوا، چلیے کوئی بات نہیں) دعا گو ہوں کہ نیا سال سب کے لیے خوشی اور امن کا باعث ہو۔ شمارہ کافی تاخیر سے ملا وجہ جو بھی رہی ہو لیکن یہ اچھا نہیں۔ ٹائٹل گرل کا انتخاب عمدہ رہا۔ جن احباب نے یاد کیا ان کا شکر گزار ہوں۔ خصوصاً سنبل صاحبہ، ایم اشفاق، سلیمان شبیر، سدرہ انور علی، ارم خان، نفیسہ فضل، نعیم اللہ، ڈاکٹر خادم حسین، کنزہ ملک، مجید احمد جائی، راشد لطیف، بھابی صائمہ مجید، سونیا خان، ممتاز احمد، ان سب نے اسٹوری کو پسندیدگی کی سند سے ہمکنار کیا خوشی ہوئی۔ سدرہ انور علی، کنزہ ملک، ممتاز احمد، مجید احمد جائی کے تبصرے پسند آئے۔ امتیاز عالم، شمسہ قمر کو پہلی بار آمد پر خوش آمدید۔ کہانیوں میں سیما غزل نے امریکہ سے دکھ بھری داستان لکھ کر رلا دیا۔ فرحت صدیقی لندن سے گرہن لگا جیون لیے نظر آئیں۔ کاشی بھائی ہماری مبارک باد لندن پہنچا دیں۔ بہت عمدہ لکھا بہترین کہانی۔ ایڈیسن ادریس مسیح عشق زادے۔2 آپ بھی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس کے علاوہ شاہد رفیق سہو کی ٹھکانہ، ارم ناز صاحبہ کی انوکھا نشہ، اشفاق شاہین کی وفا کیسی، صائمہ بشیر وہ بلی کا بچہ، اپنی اپنی بات، نزہت ناز صاحبہ، مجید احمد جائی، یاد رکھے گی دنیا۔ دیکھ میرا نصیب ممتاز احمد کہانیاں پسند آئیں۔ قسط وار کہانیاں ہم شکل، زہر عشق بھی زبردست جا رہی ہیں۔ تیر نیم کش میں ساتھیوں کے انتخاب پسند آئے۔ اب انشاء اللہ پھر حاضری ہوگی اور مسلسل ہوگی۔ خدا حافظ۔

☆: پیارے ہریرہ! لو تمہارا تبصرہ بھی لیٹ ہو گیا۔ اس ماہ تو پرچہ وقت پر مل گیا نا۔

✉: جہانیاں سے عرصے بعد یہ آمد ہے ہمارے پیارے ساتھی ملک صفدر عباس اعوان کی۔ لکھتے ہیں۔ ڈیئر سر کاشی چوہان...... آداب! جنوری کی ایک شدید سرد اور دھند سے لپٹی سہ پہر میں 'سچی کہانیاں' کے آنے کی اطلاع ملی۔ دل مچل اٹھا۔ مگر اتنی سردی میں باہر نکلنا قدرے مشکل امر تھا۔ دل نے شرمندہ کیا کہ نہیں کراچی سے یہاں تک چلا آیا ہے۔ اور تم کچھ منٹ کی مسافت نہیں طے کر سکتے۔ شاپ جا پہنچے۔ رسالہ ملا تو ٹھنڈے ہوتے ہاتھوں میں گرمی سی آنے لگی۔ رسالہ پڑھنے کی ابتدا کی اشتہارات کو یکسر انداز کرتے ہوئے آنٹی منزہ سہام کے اداریہ پر جا پہنچے۔ ان کا اداریہ میں موجودہ دور کی عکاسی ہی ہوتی ہے۔ احوال کی محفل میں انٹری ماری۔ پرانے اور نئے احوالیوں کو ہمارا سلام...... میڈم تحسین صاحبہ کے والد گرامی کا سن کر افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ہم بھی وہ لمحے بھول نہیں پائیں گے جب ہمارے بابا جانی دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ واپس رسالہ کی طرف آتے ہیں۔ سلسلہ وار

ہم تمہیں ڈھونڈنے جائیں تو ملو گے کہ نہیں...

آہ!

فاطمہ ثریا بجیا......



انا للہ وانا الیہ راجعون

1930ء۔2016ء

وہ! اک رشتہ جاں بلب
جس کے ہونے سے......
ہمتیں مجتمع تھیں
وہ اک سایۂ تابندہ
جس کی اک ذرا سی سخن فہمی سے
'کارواں راہ بھول جاتے تھے'
بس!
'ہم تمہارے ہیں' کہہ کر
ہمارے ہو جاتے تھے......



آج!
وہ درخشاں ستارہ
زمین چھوڑ کر
آسمان کا ہوا
بجیا......اب ہم میں نہیں

کہانیوں میں پہلے زہرِ عشق ہی صرف پڑھ پایا ہوں۔ کاشی بھیا کہانی میں پر اسراریت اور سسپنس اتنا ہے کہ دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگتی ہے۔ یہ قسط تو ختم ہو نئی اگلی قسط کا انتظار ہے۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش بہترین سلسلے ہیں۔ دسمبر کے سلسلہ ہائیڈ پارک میں عظمیٰ شکور کے ٹھنڈے ہاتھ ہمیں تو خوب پسند آئے۔ اب اجازت۔

☆: ..... بھائی صفدر! تمہارا تبصرہ اچھا لگا۔ کہانیاں بھی جلد شائع ہوں گی۔

✉: ڈسکہ، سیالکوٹ سے ہماری لکھاری ساتھی نسیم سکینہ صدف ایک طویل عرصے بعد احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں! ریڈ لپ اسٹک سے سجی سرورق کی ماڈل بہت پیاری لگی۔ پھر منزہ سہام کے 'تجدید عہد وفا' نے دل میں ہلچل مچادی۔ رضوانہ کوثر کی والدہ کے انتقال کا پڑھ کر دلی دکھ ہوا۔ گل آپا کے دنیا سے جانے کا پڑھ کے آنکھیں نم ہو گئیں۔ اب آیئے احوال کی طرف۔ کاشی چوہان اس قدر خوب صورت جوابات دینے پر عمدہ خراجِ تحسین پیش کرتی ہوں۔ ہر کسی کے دکھ سکھ میں شامل ہوتے ہیں۔ خدا انھیں سلامت رکھے۔ سیما غزل تو میری فیوریٹ رائٹر ہیں۔ کوثر خان، اشفاق شاہین اور محمد سلیم اختر نے بہت خوب لکھا۔ انوکھا نشہ، ارم ناز نے ایک دُکھتی رگ کو چھیڑا۔ آخری دعا، نسیمہ آصف میری پیاری دوست اور قابل رائٹر نے کمال کر دیا۔ بہت خوب صورت کہانی ہے۔ ایم ارشد وفا نے بھی ٹھیک ہی لکھا اور کاشی چوہان کا ناول زہرِ عشق کی تو بات ہی چھوڑو۔ جتنی بھی تعریف کرو کم ہے۔ بہت شاندار ناول ہے۔ غرض خوب صورت سلسلوں سے مزین 'سچی کہانیاں' آپ کی ٹیم کے عمدہ انتخاب کی درخشاں مثال ہے۔ اب اجازت۔ خدا مزید چار چاند لگائے ہمارے سچی کہانیاں کو۔

☆: پیاری نسیم جی! آپ جیسے پیارے لوگ اتنے طویل عرصے بعد حاضری لگائیں گے تو احوال کی رونق ماند پڑ جائے گی۔ کچھ تو خیال کریں۔

✉: **چک نمبر 58 شمالی، سرگودھا سے فیصل ندیم بھٹی لکھتے ہیں۔** نئے سال کا پہلا شمارہ یکم کو ہی مل گیا تھا۔ ٹائٹل میں لڑکی اپنی خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ نئے سال کی مبارک باد دے رہی ہے۔ اس کے بعد ورق پلٹتے پلٹتے منزہ سہام مرزا کے اداریے پر جا پہنچا۔ تجدید عہد وفا، کو بغور پڑھا در حقیقت ہم سب کو پاکستان کی خاطر یہ عہد کرنا ہے کہ دشمن کو ملک پاکستان سے بھگا کر ہی دم لینا ہے۔ احوال میں نئے آنے والے قارئین کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ جن میں شمسہ قمر، امتیاز عاصم امید ہے کہ آئندہ بھی احوال میں ملاقات کریں گے۔ راشد لطیف، کنزہ ملک، سونیا خان تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ بھائی مجید احمد جائی صاحب آپ نے ہمیں یاد کیا۔ احوال میں آپ کی محبت ہے کہ بندہ ناچیز کو یاد رکھا۔ اس کے علاوہ مبشر شاہد، ممتاز بھائی، روبینہ ناز، ڈاکٹر خادم کھیڑا، ملازم شیرازی کو سلام۔ تمام ایوارڈ حاصل کرنے والوں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ جدا نہ ہوں گے ہم، گرہن لگا جیون، عشق زادے، زبردست کہانیاں ہیں۔ ٹھکانہ، مجھے موت چاہیے زبردست ہیں۔ روگ، علاج، انوکھا نشہ، ارم ناز، حیران کر دینے والی تحریریں پہلی بار پڑھی ہے۔ کراس کٹنگ، وفا کیسی بھی اچھی ہیں۔ ہم شکل ایم اے راحت کا سلسلہ بہترین جا رہا ہے۔ پشیمان، حمیرا قریشی۔ یاد رکھے گی دنیا، مجید احمد جائی، جرم کی کہانی نے حقیقت میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اتنی بے حسی بھی دیکھی نہیں۔ بہترین کہانی ہے۔ دیکھ میرا نصیب، ممتاز احمد، عبرت سے بھرپور کہانی ہے۔ ویلڈن بھیا۔ کاشی چوہان کا زہرِ عشق زبردست مراحل میں ہے۔ صائمہ بشیر وہ بلی کا بچہ، مالک سے وفاداری کی بہترین مثال ہے۔ سید ملازم حسین شیرازی، فراڈ، کیا کہنے جناب اللہ تعالیٰ آپ کی قید و بند کی صعوبتوں کو آسان فرما۔ انہی الفاظ کے ساتھ اجازت۔

☆: اچھے فیصل! بس اسی طرح احوال میں شامل رہا کرو۔ ہم جانتے ہیں کہ تم مصروف ہو مگر ایسی بھی کیا مصروفیت کہ اپنوں ہی کو فراموش کر ڈالو۔

سانحہ ارتحال

ہمارے دیرینہ رفیق، کوآرڈینیشن آفیسر APNS محمود احمد کی اہلیہ گزشتہ دنوں رضائے الٰہی سے انتقال کر گئیں۔ ادارہ پرل پبلی کیشنز دکھ کی ان گھڑیوں میں اُن کے ساتھ ہے اور مرحومہ کے اعلیٰ درجات کے لیے دعا گو ہے اور لواحقین کے لیے صبر کی استدعا ہے۔

✉: ہماری بہت اچھی بہن نازیہ بتول رضا، کراچی سے لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے تو اتنا اچھا پر اسرار نمبر شائع کرنے پر مبارک باد۔ منزہ سہام مرزا کا تجدید عہد وفا آنکھیں نم کر گیا۔ یہ ایک سال قبل 16 دسمبر کو جو سانحہ ہوا وہ آج بھی خون رلاتا ہے اور یہ غم ہمیشہ تازہ رہے گا۔ دوشیزہ رائٹر ظہرا نے کی تصویریں دیکھیں بہت اچھا لگا، دراصل اک لکھاری کو مان اور محبت کے سوا کچھ اور چاہیے بھی نہیں، یہ محبتیں بہت قیمتی ہیں۔ میں بے حد مشکور ممنون ہوں کہ ممتاز احمد جیسے لکھاری نے میری کہانی قدرت کو سراہا، اس کے علاوہ شازیہ گل، سدرہ انور، سلیمان شبیر، مجید احمد جائی، صائمہ مجید، منز نوید ہاشمی، سنبل کنزہ ملک اور عثمان بلوچ آپ سب کا بے حد شکریہ کہ آپ سب نے میری ناقص سی کاوش کو سراہا اور مجھے حوصلہ دیا۔ تمام نئے احوالیوں، قاریوں اور لکھاریوں کو خوش آمدید۔ آخر میں تمام ایوارڈ یافتگان کو مبارک باد۔ بالخصوص ایم اے راحت، احمد سجاد بابر، اقبال بانو، ممتاز احمد، ارم ناز اور جاوید راہی صاحب کو ڈھیروں مبارک باد قبول ہو۔ اللہ پاک آپ کو ڈھیروں کامیابیاں عطا کرے آمین۔ ماہ جنوری کی تینوں انعام یافتہ کہانیاں زبردست رہیں سیما غزل، فرحت صدیقی، ایڈیسن اور لیس نیچ کیا خوب لکھا اس کے علاوہ ٹھکانہ، مجھے موت چاہیے بھی اچھی لگیں باقی ابھی پڑھ نہیں سکی زہرِ عشق بہت زبردست ہے۔ اچھا اب اجازت آپ سب اپنا بہت خیال رکھیے گا اور مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆: آپی جی! ہمیں آپ کی محبت کی اشد ضرورت ہے۔ اپنا بہت خیال رکھیں اور ہاں ہو سکے تو احوال میں ضرور یاد رکھا کریں۔

✉: کراچی سے ہماری لکھاری ساتھی منزل خان لکھتی ہیں۔ جنوری کے شمارے میں سنبل، ایم اشفاق بٹ، نفیسہ فضل، نعیم اللہ، شاندار تبصروں کے ساتھ احوال میں شامل تھے۔ سدرہ انور علی اور ممتاز احمد آپ کی دعائیں مقبول ہوئی ہیں، بہت شکریہ آپ کا۔ سلیمان شبیر، خادم حسین، کنزہ ملک، مجید احمد، راشد لطیف، صائمہ مجید تبصرہ پسند کرنے کے لیے تہہ دل سے مشکور ہوں۔ سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ حاصل کرنے والوں کو ڈھیروں مبارک باد۔ جدا نہ ہوں گے، گرہن لگا جیون، محبت موت چاہیے، علاج' وفا کیسی، پشیمان، وہ بلی کا بچہ، وتا منا، آخری دعا، دیکھ میرا نصیب، بہت اچھی تحریریں ثابت ہوئیں۔ جبکہ عشق زادے، انوکھا نشہ، کیا سے کیا ہو گیا، اسنیپ چیٹنگ، اجنبی مسیحا، آخری چوری بھی خوب صورت تحریریں تھیں۔ باقی مستقل سلسلے اپنی مثال آپ تھے۔ اس کے ساتھ اگر زندگی اور کاشی بھیا نے وفا کی تو اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گے۔ اللہ آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

☆: اچھی بہن! تبصرہ لیٹ ملا اس لیے معذرت۔ مگر یہ دیکھ لو کہ ہم اپنے ساتھیوں کے محبت بھرے یہ نامے قطعاً ضائع نہیں کرتے۔

✉: احوال میں یہ آمد ہے ہماری بہت پیاری بہن روبینہ ناز روبی کی رضا آباد، فیصل آباد سے۔ نئے سال کا شمارہ حسین رنگوں سے مزین سرورق کے ساتھ بہت اچھا لگا۔ اداریہ پڑھ کر آنکھیں چھلک گئیں۔ ہم بھی اس سانحے کو کسی لمحے نہیں بھولتے۔ بھیا! ایک نیا صدمہ پیاری آپی محترمہ مرحومہ گل ملک صاحبہ کی موت کا، آہ!! اللہ پاک اُن کی جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپی رضوانہ کوثر صاحبہ کی والدہ کے لیے بھی دعائے مغفرت اور اہل خانہ کے لیے صبر جمیل کی دعا۔ ممتاز احمد صاحب حسب معمول بہترین تحریر کے ساتھ تھی۔ ''یاد

رکھے گی دنیا'، محض ایک سیدھی سادی تحریر تھی جسے قلمکار صاحب نے گھما پھرا کر پڑھنے والوں کے لیے الجھا کر رکھ دیا مجھے تو ایسا ہی لگا۔ (قارئین رائے میں آزاد ہیں) 'آخری چوری' اچھی لگی۔ 'اجنبی مسیحا' بھی خوب تھی۔ 'آخری دعا' اندازِ تحریر دلکش تھا مگر کہانی کچھ کچھ افسانوی رنگ لیے ہوئے تھی۔ 'فراڈ کمپنی' عبرت ان کے لیے، جو دن رات راتوں امیر ہونے کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ 'وٹا سٹا' اچھی تحریر تھی اور واقعی اس قبیح رسم سے کئی گھر اجڑتے ہیں۔ اس رسم کو ختم ہی ہو جانا چاہیے۔ 'اپنی اپنی بات' میں قلمکارہ کیا سمجھانا چاہتی تھیں، کچھ واضح نہ ہو سکا۔ 'پشیمان' متاثر کن تھی۔ وہ بہنیں سنبھل جائیں جو انجان راستوں پر چلتے ہوئے کچھ نہیں سوچتیں۔ 'انوکھا نشہ' حسب معمول ارم ناز انوکھی اور دلکش تحریر کے ساتھ آئیں۔ 'علاج' بھی خوب لگی۔ 'روگ'، 'مجھے موت چاہیے' 'ٹھکانہ'، 'گرہن لگا جیون' پڑھ کر دل افسردہ ہو گیا، ذکیہ کو چاہیے تھا کہ اپنے حالات سے سمجھوتا کرتی اور اپنی خوش گوار زندگی کو یوں دکھوں کی نذر نہ کرتی۔ اگلے ماہ کے لیے اجازت بشرط زندگی۔

☆: پیاری بہن! قاری اور لکھاری اپنی رائے میں آزاد ہے۔ بجا کیا۔ آپ کی رائے کا احترام کرتے ہوئے آئندہ خیال رکھیں گے۔ آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔

☒: عمارہ ناز پہلی بار ہمارے احوال میں شریک ہو رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ میرا تعلق ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کی تحصیل کمالیہ کے ایک پسماندہ گاؤں سے ہے۔ شاعرہ ہوں اور میرا کلام مختلف میگزینز میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ سچی کہانیاں میری نظر سے گزرا جب مطالعہ کیا تو دل کو بھا گیا اور بہت پسند آیا۔ بہت معیاری اور عمدہ ڈائجسٹ ہے کیونکہ جہاں ملک کے مایہ ناز اور اچھے رائٹرز شاندار کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ وہیں پر کاشی چوہان بھائی کی محنت اور لگن نے اسے چار چاند لگائے ہیں تو دل سے آپ کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ احوال بہت خوب صورت سلسلہ ہے، جس میں پیار بھرے خطوط اور مزے مزے کے تبصرے ہوتے ہیں۔ 'زہر عشق' بہت لاجواب اور اپنی مثال آپ ہے۔ ممتاز احمد صاحب سرگودھا والے کی لکھی پلیٹ فارم کہانیاں تو بہت اچھوتی اور منفرد ہوتی ہیں۔ جنھیں میں بڑے شوق سے سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ ماہ جنوری میں شائع ہونے والی کہانی 'دیکھ میرا نصیب' تو بہت شاندار، نصیحت آموز اور عبرت انگیز کہانی تھی، بہت پسند آئی۔ ارم ناز بہت اچھی رائٹر ہیں، بہت اچھی کہانیاں لکھتی ہیں۔ انوکھا نشہ بہت اچھی کہانی تھی۔ مجید احمد جائی صاحب کی کہانی بھی بہترین تھی۔ انکل سلیم اختر، جاوید راہی صاحب بھی بہت خوب لکھتے ہیں۔ مختصر کہانیوں میں صائمہ شبیر کی کہانی 'وہ بلی کا بچہ' اچھی کہانی تھی۔ باقی سب رائٹرز کی تخلیقات بھی اچھی تھیں۔ میں چونکہ شاعرہ ہوں تو سب کی شاعری غور سے پڑھی، روبینہ ناز روبی، رضوانہ کوثر، صائمہ بشیر کے انتخاب بہت اچھے لگے، پسند آئے۔ اگر آپ نے اور پڑھنے والوں نے ویلکم کیا تو حاضر ہوتی رہا کروں گی۔

☆: عمارہ جی! خوش آمدید! اب ہم نے تو آپ کو ویلکم کر کے اپنا فرض نبھایا اب آپ کی آمد ہر ماہ ہونی چاہیے۔ وعدہ نبھانے کی اب آپ کی باری ہے۔

☒: حبیب الرحمٰن، سینٹرل جیل، لاہور سے ہمارے احوالی بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ کاشی بھائی! آپ نے یاد کیا ہے اس لیے میں حاضر ہوں۔ میری لکھی ہوئی کہانی اگر ٹھیک ہے تو حکم کریں میں آپ کو مختلف موضوعات پر کہانیاں لکھ کر بھیجتا رہوں گا۔ امید ہے کہ آپ رشتہ پکا کرنا جانتے ہیں۔ باقی آپ کے پہلے سوالات کا جواب یہ ہے کہ اپنے دل سے کیا پوچھوں بے وفاؤں سے ڈر لگتا ہے کیونکہ ایک چہرے پہ کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ۔ کاشی بھائی آپ کو میں نے لکھا تھا کہ آپ کثیر تعداد میں سے صرف ایک کاپی سالانہ مجھے گفٹ کر دیا کریں لیکن آپ نے...... اب آتے ہیں رسالے کی جانب تو جناب پہلے احوالیوں کی محفل میں۔ لو جی آپ سب کو نئے سال کے دوسرے ماہ کی مبارک باد۔ ہاہاہا۔ بھئی پہلے مجھے تھوڑی بیٹھنے کی جگہ تو دو۔ راشد لطیف توں تھوڑا جیا نال ہو جا۔ بس پاؤں رکھنے کی جگہ بنا دو بیٹھن واسطے

طویل کہانی نمبر

ہمارے قارئین طویل کہانیوں کے دلدادہ ہیں۔ قارئین کی پُر زور فرمائش پر "سچی کہانیاں" کا منفرد

"طویل کہانی نمبر"

آپ کی بصارتوں کا رزق بننے کے لیے تیار ہے۔ ماہِ اپریل کا شمارہ طویل کہانی نمبر ہوگا۔

ایک ایسا شمارہ جس میں سسکتی، بلکتی، روح فرسا سچائیاں، سنگین سچ بیانیاں آپ کو اپنی گرفت میں لے لیں گی۔

زندگی کی برہنہ سچائیاں لیے ایک یادگار نمبر......

پلیٹ فارم نمبر

یہ زندگی ریل کی دو پٹریوں کی طرح ہے۔ جس پر حق اور باطل ایک ساتھ محوِ سفر رہتے ہیں۔

زندگی ہر موڑ پر ایک پلیٹ فارم پر رُکتی ہے اور پھر...... زندگی کی منزل آ جاتی ہے۔

حق اور باطل کبھی مل نہیں پاتے۔

ایک ایسا یادگار شمارہ جسے قارئین کبھی نہ بھول پائیں گے۔

تلخ و شیریں، عبرت و سبق آموز، یادوں کو کہانی کے روپ میں ڈھال کر فوری طور پر ہمیں روانہ کر دیں۔

نوٹ: پلیٹ فارم نمبر کے لیے اپنی کہانیاں اس طرح ارسال کریں کہ ہمیں 25 مارچ سے پہلے موصول ہو جائیں۔

ماہِ اپریل کا شمارہ طویل کہانی نمبر ہوگا

قارئین اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

جلد میں آپ بنائوں گا۔ ہاں ہاں۔ چلو بس ٹھیک ہوگیا۔ اور دوسرے آپ سب کے لیے ایک اچھی کہانی لکھ کر کاشی بھائی کے حوالے کردی ہے اب دیکھیں کہ کاشی بھائی اسے کب منظر عام پر لاتے ہیں۔ اچھا کاشی بھائی ختم کرتا ہوں تھوڑی دیر میں کیوں کہ میں کون سا ہر ماہ آتا ہوں۔ تین چار ماہ بعد آیا ہوں تو تھوڑی باتیں تو کروں گا نا۔ اچھا دوستوں آپ سب کا شکریہ جو مجھے یاد رکھتے ہیں۔ جاوید صاحب میں غلطی سے تمام باتیں سچ لکھ دیتا ہوں اور آپ میری کہانی پڑھ کر میرے بارے میں کہہ سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ احوالیوں میں ایک پیاری سی نرم ونازک دل رکھنے والی ارم خان بھی ہیں۔ ارم صاحبہ حبیب کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتا اس لیے اگر آپ کو میری بات کا دکھ ہوا اس لیے معذرت۔ آپ سب کی دعاؤں سے ہی جیل سے آزاد ہوجاؤں گا پھر دعوت ضرور کروں گا۔ آنٹی مسز نوید ہاشمی پوری دنیا کے نام خط میں لکھ دیے مگر ہم...... منزل صاحبہ آپ جیسے لوگوں نے مجھے اس رشتے پر قائم رکھا ورنہ موت اور زندگی کی درمیانی دیوار پر بیٹھ کر یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ مقصود صاحب بالکل بات ہوچکی ہے۔ لیکن کوئی یاد نہیں رکھتا۔ سب بھول جاتے ہیں۔ ملک علی رضا، شکریہ یاد رکھا۔ رسالے پر تبصرہ کرنے پر معذرت خواہ ہوں کیوں کہ خط لیٹ ہوجائے گا۔ ویسے بھی سچی کہانیاں جنوری کا مجھے نہیں ملا ہے اس لیے کتابوں پر تبصرہ مارچ کے مہینے میں ہی کروں گا۔ شکریہ۔

☆: پیارے بھائی! یقین کرو اس خوشی کا کیا بیان ہو جو تمہارے خط سے آئی ہے۔ تمہاری قید کی آسانیوں کے لیے ہر پل دعا گو ہوں۔ پرچہ تمھیں مل جایا کرے گا۔ کہانی؟؟ اب تو خوش ہوناں......

✉: ایک زمانے کے بعد احوال میں یہ آمد ہوئی ہے ہمارے پیارے ساتھی وقاص حسین کی، رحیم یار خان سے۔ لکھتے ہیں۔ سب سے پہلے تو شکریہ کہانی شائع کرنے کے لیے۔ ویسے تو نئے ماہ کا رسالہ آنے والا ہوگا اور میں ہوں کہ اب خط لکھ رہا ہوں۔ خط دیر سے لکھنے کی وجہ صرف اور صرف کام کی مصروفیات ہیں۔ ویسے تو رسالہ پانچ تاریخ کو ہی مل گیا تھا۔ لیکن میرا کام ہی کچھ اس طرح کا ہے کہ روز ایک شہر سے دوسرے شہر جانا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت نہیں نکال پاتا۔ اب بھی آج شام کو لاہور کے لیے نکل رہا ہوں تو سوچا جانے سے پہلے خط بھیج دوں۔ رسالہ ہر ماہ لیتا ہوں کبھی تو پورا پڑھ لیتا ہوں تو کبھی ادھورا ہی رہ جاتا ہے۔ اور ہاں یاد آیا رائٹرز ایوارڈ کی فہرست میں میرا نام تو آیا ہے۔ لیکن جگہ کا نام غلط لکھا ہے۔ اب تک کے لیے اتنا ہی اگر وقت ملا تو اگلی بار وقت پر حاضر ہوں گا۔ 'رب راکھا'

☆: پیارے وقاص! تم جیسے دل چاہے آؤ، جم جم آؤ لیکن ایک گزارش ہے' ہماری محبت کا بھرم رکھ لو۔ کیا بے قاعدگی با قاعدگی میں نہیں بدل سکتی۔ پلیز جواب ضرور دینا۔

✉: میانوالی سے ہمارے ساتھی ملک محمد آصیر عرض کرتے ہیں۔ اداریے میں منزہ سہام کا تجدید عہد وفا اچھا لگا۔ احوال میں اپنی کہانی پر تبصرے پڑھے۔ جن لوگوں نے میری کہانی کی تعریف کی خاص طور پر جھنگ صدر سے ہماری بہن سدرہ انور علی، ممتاز احمد، نعیم اللہ، مجید احمد جائی، راشد لطیف، صائمہ مجید اور سونیا خان کا بے حد شکر گزار ہوں جنہیں میری کہانی پسند آئی اور میری حوصلہ افزائی کے لیے جو الفاظ ادا کیے ان کا بے حد شکریہ۔ اب آتا ہوں کہانیوں کی طرف 'جدا نہ ہوں گے ہم'، 'گرہن لگا جیون'، 'عشق زادے'، 'مجھے موت چاہیے'، 'انوکھا نشہ' زبردست تحریریں تھیں۔ ایم اے راحت کی 'ہم شکل' واقعی دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔ ملک الطاف سرور سے ملاقات اچھا انٹرویو تھا۔ دوسری حکایت پشیمان، حمیرا قریشی صاحبہ کی تحریر اچھی تھی۔ وہ بلی کا بچہ، بڑا آدمی، روشانے عبدالقیوم، اچھی تحریریں تھیں۔ مگر ان سب سے بڑھ کر انسان سے کتے کی وفا کی تحریر واقعی کہانی میں محبت کی منہ بولتی تصویر تھی۔ وٹا سٹا میں ہمارے ضلع میانوالی کی تاریخ کو رقم کیا گیا۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی رواج ہے۔ اقبال بانو نے تحریر کو خوب صورت بنا دیا۔ واقعی شعلہ ثابت ہوئی۔ دوسرا جلتا بجھتا شعلہ، فراڈ کمپنی، سید ملازم حسین شیرازی نے اچھا تجزیہ کیا یہاں تک کہانیاں پڑھ سکا۔ چند مصروفیات کی وجہ سے بقیا کہانیاں پڑھنے سے رہ گئی ہیں۔ ورنہ ان کے حوالے سے تبصرہ ضرور کرتا۔ اب اجازت چاہوں گا۔

مستقل بناؤ۔ پراسرار کہانی کے لیے انتظار کرو۔

☆: بھائی اکرم! تبصرے کا شکریہ۔ آمد

✉: لاہور سے ہماری بہت پیاری ساتھی لکھاری ثمینہ طاہر بٹ احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ان تمام لکھاری بھائیوں اور بہنوں کو میری طرف سے بہت بہت مبارک باد جنھوں نے 2015ء سچی کہانیاں بیسٹ رائٹرز ایوارڈ حاصل کیا سب کو بہت بہت مبارک۔ اور کاشی سر! میں آپ کی' ادارہ پرل پبلیکیشنز کے تمام ممبران، جیوری ممبران اور جن جن کو میری سچی کہانیاں کے لیے لکھی گئی پہلی پہلی کاوش پسند آئی اور اسے بھی ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا۔ میں سب کی دل سے شکر گزار ہوں۔ 2016ء کا پہلا شمارہ (سچی کہانیاں) میرے لیے سچی خوشی لے کر آیا اور اس کے لیے میں سب کی احسان مند ہوں، جزاک اللہ۔ اب آتی ہوں تبصرے کی طرف۔ منزہ سہام صاحبہ 'تجدید عہد وفا' کے ساتھ بہت اچھا پیغام لے کر آئیں۔ اس کے بعد پہنچے "ہم اور ہمارے مہمان" کی محفل میں۔ زبردست جناب! ان صفحات پر ہمیں اپنے پسندیدہ مصنفین کے دیدار نصیب ہوئے۔ کاشی سر! آپ کی احوال کی محفل میں جھانکا، اوہو...... بھئی واہ، یہاں تو خوب رونق ہے بھئی، اب سب احوالیوں کو میری طرف سے بہت بہت آداب۔ کاشی سر! آپ کا سب احوالیوں سے اتنی محبت اور عزت سے پیش آنا بہت متاثر کرتا ہے۔ احوال کے سب احوالیوں کے تبصرے ہمیشہ کی طرح جاندار رہے، اور اس پر کاشی سر کا سب کو فرداً فرداً محبت بھرا جواب سونے پہ سہاگہ کا کام کرتا ہے جزاک اللہ۔ گڈی آپا، گل ملک اور رضوانہ کوثر کی والدہ ماجدہ قضائے الٰہی سے وفات پا گئیں۔ اللہ ان سب کے درجات بلند فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین ثمہ آمین) سب سے پہلے آئی اسماء اعوان کی 'لائف بوائے کہانی'۔ اسماء صاحبہ ہمیشہ کی طرح بہت اعلیٰ کہانی لے کر آئیں۔ اسماء اعوان صاحبہ کی تحریر نے تو لگتا ہے بھولے بسرے خوابوں کا دیدار ہی کروا دیا۔ واہ اسماء جی خوش رہیں، سلامت رہیں اور اسی طرح چمکتے دمکتے لائف بوائے کی طرف چمکتی دمکتی کہانیاں ہمارے لیے لاتے رہیں۔ 'جدا نہ ہوں گے ہم' سیما غزل کی داستان واقعی بے مثال تھی۔ فرحت صدیقی 'لندن کے سرد ترین شہر سے' 'گرہن لگا جیون' لائیں اور کیا خوب لائیں۔ ایڈیسن ادریس مسیح کی 'عشق زادے'۔ شاہد رفیق صاحب کی 'ٹھکانہ' ایک اچھی سبق آموز کہانی تھی۔ محمد سلیم اختر صاحب کی 'مجھے موت چاہیے' عورت کی مظلومیت کی ایک سچ داستان ہے۔ انیلا

ناقابل اشاعت تحریریں

پرانی حویلی کا راز	سیدہ زینب فدا
خانہ بدوش	نعیم اللہ
(1) اظہار (2) قصور میرا تھا	کشاف اقبال
قدر	وقاص اسلم
نصیب	یاسر وکی
جب شک دل میں آجائے	عارف شہزاد
پچھتاوا	راشد لطیف
(1) جہالت (2) آ ہی جاتی ہے	دستگیر نواز
بے وفائی	منعم اصغر

امام بخش کی ''روگ''، کوثر خان کی 'علاج' پراثر تحریریں تھیں۔ ارم ناز کا 'انوکھا نشہ' بہت انوکھی تھی۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ایس امتیاز احمد کی کراس ٹاکنگ' وفا کیسی' بھی اپنی اپنی جگہ اچھی رہیں۔ سب رنگ حکایتوں میں سب حکایتیں زبردست تھیں۔ اقبال بانو اردو ادب کا بڑا نام۔ آپا کی وٹا سٹا روایتی رسم و رواج میں جکڑی ایک خوب صورت تحریر۔ فصیحہ آصف خان کی 'آخری دعا'۔ مجید احمد جائی صاحب کی 'یاد رکھے گی دنیا' اُف!! لرزا دینے والی کہانی تھی۔ پلیٹ فارم میں ممتاز احمد صاحب کی ''دیکھ میرا نصیب'' بھی دل ہلا دینے والی کہانی کے ساتھ آئے۔ ''ہم شکل'' ایم اے راحت صاحب کا سلسلہ وار ناول بہت اعلیٰ جا رہا ہے۔ ایم اے راحت صاحب میرے فیورٹ رائٹر ہیں اور ان کی ہر تحریر میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ 'زہر عشق' کاشی سر کا ناول بہت عمدگی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ہر قسط کے اختتام پر ہی اگلی قسط کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ جزاک اللہ۔ باقی سب سلسلے اور کہانیاں بھی اپنی اپنی جگہ اچھی تھیں۔ اب اجازت چاہتی ہوں زندگی رہی اور قسمت نے ساتھ دیا تو اگلے ماہ پھر حاضری دوں گی۔

☆: بہت عزیز ثمینہ! تبصرہ بے حد شاندار تھا۔ خوش رہو! ہمیں بھی اگلے ماہ کے تبصرے کا انتظار ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔

☒: احوال میں یہ کراچی سے ہماری بہت پیاری بہن سنبل کی آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ اداریہ لاجواب تھا لاجواب کر دینے والا یہ دکھ تو ہماری روحوں کا ناسور ہے۔ جو ساتھ ہی جائے گا۔ احوال سے سب کے احوال معلوم ہوئے اور سب کے دکھ سکھ بھی۔ اچھا سلسلہ ہے۔ جدا نہ ہوں گے۔ اچھی کہانی تھی قسمت کے پھیر کی طاہر کا فیصلہ بھی اچھا تھا۔ گرہن لگا جیون کم عمر لڑکیوں کی بے وقوفیوں اور خوف کیسے غلط فیصلے کرواتے ہیں' اچھی تھی۔ عشق زادے آج کل کے ماحول پر کمال کہانی لکھی ایڈیسن نے ویلڈن ایڈی، ٹھکانہ...... یہی کچھ ہو رہا ہے۔ مجھے موت چاہیے پتا نہیں ماں باپ ایسے فیصلہ کیوں کرتے ہیں اور ایسے نفسیاتی مریض شادی کیوں کرتے ہیں۔ روگ تکلیف ہوتی ہے مجھے عورت کے اس روپ پر جو رشتوں کا احترام نہ کرے اور لعنت ہے اسے بہنوئی پر کیونکہ بہنوئی محترم رشتہ ہے۔ علاج اچھی تھی، انوکھا نشہ کمال تھی۔ ایسا نشہ تو نہ دیکھا نہ سنا۔ کراس ٹاکنگ اچھا اینڈ تھا یہی ہونا چاہیے۔ مگر پچھ نہ کچھ تو صاحب کے ساتھ بھی ہونا چاہیے تھا۔ وفا کیسی آج کل کی وفا ایسی ہی ہے۔ ہم شکل مائی فیورٹ! ملک صاحب کا انٹرویو اچھا تھا اگر وہ ایسے ہی ہیں تو خود بھی اچھے ہیں۔ کیا سے کیا ہو گیا ہوں بس ٹھیک تھی۔ پشیمان' عورت کی یہ قسم قابل نفرین ہے۔ اسٹیپ چیکنگ کمال تھی۔ وہ بجلی کا بچہ رلا گئی۔ اپنی بات' اپنی ہی بات تھی مہمیز پڑھ کر لبوں کو بے اختیار، مسکراہٹ نے چھوا۔ بڑا آدمی بہت اچھی رہی۔ کتے اتنے بھی کتے نہیں۔ الفاظ گنگ ہیں حیرت اس پر ہوئی کہ سعودی عرب میں بھی یہ سب ہوتا ہے۔ 'وٹا سٹا' میں ریشماں، بڑی تھڑدلی نکلی۔ فراڈ کمپنی، ایک بار میرے میاں بھی اپنا گھر بیچنے کے چکر میں ایسے ہی لوگوں میں پھنستے پھنستے رہ گئے تھے۔ بس آیت الکرسی کا حصار انھیں بچا گیا۔ آخری دعا کیا کہیں اس معاشرتی برائی پر دل روتا ہے۔ مختاری کا فیصلہ درست تھا۔ اجنبی مسیحا بہت شاندار تھی۔ شہید ٹھیک تھی۔ آخری چوری بہت اچھا ہوا اُن کے ساتھ۔ محمود شام کا سفرنامہ اچھا شروع ہوا ہے۔ یاد رکھے گی دنیا نے روح تک کو کپکپا دیا ایسی بھی ہوتی ہیں بہنیں۔ دیکھ میرا نصیب۔ عظمیٰ جیسی عورتیں ناسور ہیں معاشرے کا۔ اور عاقب کے ساتھ تو بہت اچھا ہوا۔ زہر عشق، پل پل دل دھڑکانی اسٹوری ہے۔ اب دیکھیں نگران صاحب کیا کرتے ہیں بے چارے سلمان کے ساتھ۔ مسئلہ یہ ہے...... بابا جی کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش حسب معمول اچھے تھے۔ اور اب تم سناؤ کیا چل رہا ہے آج کل۔ دیکھو تم سے وعدہ وفا کرنے کے چکر ہر مہینے خط لکھ رہی ہوں لیٹ ہی سہی۔ اب اجازت دو زندگی اور طبیعت نے وفا کی تو پھر خط لکھوں گی۔ اپنا خیال رکھنا اور دعاؤں میں یاد رکھنا۔

☆: بس پیاری سی آپی! وعدہ وفا ہوا ہی چاہتا ہے۔ آپ کی محبت پر ہمیں ایسے ہی مان تھوڑی ہے۔ خوش رہیے۔

⊠: گارڈن ایسٹ، کراچی سے ہماری لکھاری ساتھی کنول عمران خان لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے آتے ہیں ’اسمارٹ فون‘ کی طرف ’منزہ جی‘ آپ نے کیا خوب صورت بات کہی۔ زبردست۔ شانی خامان اللہ تعالیٰ آپ کے والدِمحترم کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے آمین۔ نسیم سکینہ آپ کی نند کے شوہر کا پڑھا بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دیں آمین۔ کاشی بھائی پراسرار نمبر کا سن کر دل بڑا خوش ہوتا ہے۔ کیونکہ مجھے پراسرار کہانیاں بہت پسند ہیں۔ میرا بھی دل کرتا ہے لکھنے کو مگر آج کل ذرا مصروف ہوں۔ فرصت ملتے ہی قلم اٹھاؤں گی۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف ’یہ دوستی ہے‘، ’فاطمہ گل‘، ’میرا ساجن‘، ’آستین کے سانپ‘، ’وی سی آر‘، ’ازالہ‘، بہت بہترین تحریریں تھیں۔ اور ’زہرِ عشق‘ تو ٹپ ٹاپ جا رہی ہے۔ کاشی بھائی زبردست ’وہ کون تھی‘ بھی اچھی تھی۔ کاشی بھائی اس بار کا سرورق بڑا کلرفل اور خوب صورت لگا۔ رسالہ ترقی کی منزلیں طے کرتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور ترقی دے آمین۔ احوال میں سب کے خطوط اچھے لگے۔ اچھا جی اب اجازت دیں۔ انشاء اللہ اگلے احوال میں ملتے ہیں زندگی رہی تو۔ سب کو میرا پیار بھرا سلام۔ ارے ہاں کاشی بھیا 25 مارچ کو میرے چھوٹے بھائی فراز علی کی سال گرہ ہے اور اسی دن میری مہندی بھی ہوئی تھی اور 26 مارچ کو شادی تھی۔ مطلب ہماری شادی کو 11 سال ماشاء اللہ ہو جائیں گے مارچ میں۔

☆: پیاری سی کنول! سب سے پہلے تو ویڈنگ اینی ورسری کی مبارک باد۔ اب فراز علی کو سال گرہ مبارک۔ خوش رہو۔ تبصرہ مختصر مگر دلچسپ کیا۔

⊠: بورڑی شریف، خیر پور ناتھن شاہ سے ہماری اڈی زرینہ جونیجو احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ آپ نے میری نظم شائع کی جس کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔ شانی خامان کے والدِ محترم کی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔ سب سے پہلے میڈم منزہ سہام کا اداریہ اسمارٹ فون پڑھا۔ یہ بات تو سچ ہے کہ ایسا اسمارٹ فون اگر انسانوں کے لیے ایجاد کریں تو مزہ آ جائے، پھر 90 فیصد لوگوں کے دوغلے پن عیاں ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ہماری آفت کی پڑیا سدرہ انور کا خط پڑھا۔ سدرہ انور چندے آفتاب چندے ماہ تاب تو تم پر سوٹ کرتا ہے۔ ہم تو ٹھہرے مسکین لوگ۔ احوال میں سدرہ انور، زاہد حسین اور تحسین جونیجو کے خطوط پسند آئے۔ منزل خان، ادا ممتاز احمد، بھیا مجید جائی، سنبل، اور بھیا اشفاق شاہین کے لیے نیک تمنائیں۔ کہانیوں میں شانی خاماں۔ ’’تلاش‘‘ نوشابہ صدیقی ’’بلند بخت‘‘ نعمان اسحاق ’’بازبان‘‘ ممتاز احمد ’’ازالہ‘‘ فوزیہ احسان رانا ’’حرام خور‘‘ ضرغام محمود ’’میرا ساجن‘‘ بیسٹ تحریریں تھیں۔ دانیال شمسی ’’ایک تصویر ایک کہانی‘‘ محمد سلیم اختر ’’یہ دوستی ہے‘‘ اسماء اعوان ’’لائف بوائے‘‘ ارم ناز ’’وی سی آر‘‘ بھی بہترین کہانیاں تھیں۔ کاشی بھیا کی زہرِ عشق لازوال ہے۔ ہائیڈ پارک میں خضرِ حیات، روبینہ ناز روبی کی شاعری پسند آئی۔ کنول جی کی ’’تنہائی‘‘ کے دفتوں کے اچھے لوگ بہت پسند آئی۔

☆: زرینہ جی! آپ کی طبیعت کی وجہ سے دل پریشان رہتا ہے۔ یقین کریں آپ کی احوال میں آمد نے ہمیں بہت زیادہ اطمینان اور حوصلہ بخشا ہے۔

⊠: بورڑی شریف، خیر پور ناتھن شاہ سے ہماری گڑیا۔ ملکہ احوال تحسین جونیجو کی آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ گل رنگی یادوں کا سرمایہ ساتھ لیے موسمِ بہار کا آغاز۔ خوشبو بکھیرتی مہک خوب صورت رنگوں سے سجی سنگ میل محفل احوال اپنے عروج پر ہے۔ ماشاء اللہ اندھیروں کو اجالوں سے منور کرتی کچھ باتیں سنگ لیے ہم بھی حاضرِ محفل ہیں۔ احوال میں اپنے بھیا کاشی بڑی جلدی میں ہیں۔ بس اتنی سی باتیں؟ ٹائٹل بڑا پیارا ہے۔ اداریہ اسمارٹ فون کے حوالے سے منزہ آپی کی باتوں سے ہم بھی اتفاق کرتے ہیں۔ گزشتہ کئی سالوں سے کئی لوگوں سے واسطہ پڑا۔ جن میں کچھ اچھے تو کچھ انوکھے بھی اور کچھ بہت ہی اچھوں کا ساتھ ملا۔ ان میں ایک بہت ہی پیاری دوست کا ساتھ بھی ملا ہے عزیز از جان سدرہ انور علی، سوچا نہیں تھا کہ ہم یوں ملیں گے۔ اپنے اصولوں کی پابند (میری طرح) یقین نہیں ہو رہا کہ وہ حقیقت میں مجھے ملکہ کا درجہ دیتی ہے، کہ اس نے مجھے (تاج) بھی پہنایا بقول سدرہ کے کہ ملکہ کا حق بنتا ہے کہ تاج بھی پہنے،

انعام یافتہ کہانیاں

یقیناً ہمارے لکھاری اور قاری ساتھی۔ ماہ فروری میں انعام یافتہ کہانیوں کو ڈھونڈتے ہی رہ گئے ہوں گے۔ ساتھیو حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لیجنڈ لکھاری تو یونیورسٹی کا درجہ رکھتے ہیں۔ اصل مقابلہ تو دورِ حاضر کے ان لکھاریوں کے درمیان ہوتا ہے۔ جو کامیابی کی شاہراہ پر اپنے قلم لیے رواں دواں ہیں۔ مجھے انتہائی دکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے لکھاری کہانی میں کہانی کھوجتے رہ جاتے ہیں اور سبق پورا...... میری آپ سے گزارش ہے ساتھیو کہ آپ ہمیں منفرد اور اعلیٰ پائے کی کہانیاں ارسال کریں تاکہ ہم بھی فخر سے یہ کہہ سکیں کہ ہمارے انعام یافتہ لکھاریوں کی تحریریں پڑھ کر دیکھیں اور سر دھنیے۔ ساتھیو لکھو...... دل سے لکھو...... جم کر لکھو...... کہ الفاظ بہت قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔

بہت ہی سپاس گزار ہوں۔ یار تمہارا خلوص پیار اور (چاندی کا بنا ہوا تاج) انمول ہے میرے لیے ہمیشہ اپنے پاس محفوظ رکھوں گی تمہارا تاج۔ شاد رہو جانی۔ سنبل آپی بہت شکریہ۔ سلامتی ہو۔ شائستہ جمال آپی کہاں غائب ہیں؟ منزل خان ڈیئر شانی خامان آپ کی خالہ ہیں؟ (جی ہاں) اشفاق شاہین بھائی آپنے یاد رکھا مشکور ہیں۔ آپ کا تبصرہ بہت عمدہ رہا اور ساتھ میں ممتاز احمد بھائی اور سونیا خان کا بھی بہت پسند آیا۔ حنا بشریٰ بہت ممنون ہوں خوش رہیے۔ مجید احمد جائی بھائی اور صائمہ بھابی شاد و آباد رہیں۔ کہانیوں میں یہ دوستی ہے۔ سلیم اختر انکل۔ ارم ناز ’وی سی آر‘۔ ’روایات کی دلدل‘ ثمینہ فیاض۔ آپ اپنے دام میں‘ قاسم خان بلوچ‘ منعم اصغر‘ ممتاز احمد‘ حنا بشریٰ‘ مقصود بلوچ کی تحریریں پسند آئیں۔ زہرِ عشق تو ہے بہت زبردست۔ اب چلتی ہوں۔ پھر ملیں گے۔

☆: پیاری گڑیا! اب تو خوش ہو نا۔ تبصرہ وقت پر مل گیا۔

⊠: شیخوپورہ سے ہمارے احوال میں یہ پہلی آمد ہی احتشام احسان کی۔ لکھتے ہیں۔ محفل کے سب دوستوں کو آداب۔ اپنے چند دوستوں کے کہنے پر کہانی لکھ ڈالی ہے۔ کاشی چوہان صاحب اور آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ نعمان اسحاق، منعم اصغر اور محسن علی دیکھ لو دوستوں۔ اور میں ایک اچھی خبر بھی سنانا چاہتا ہوں۔ منعم اصغر کے امتحان ہوئے اور اس نے کلاس میں سیکنڈ پوزیشن لی ہے۔ بہت مبارک ہو منعم۔ منعم تمہاری کہانی بہت اچھی ہے مگر مجھے اس سے اچھی چاہیے سمجھے۔ نعمان کے ناول کی پہلی قسط شاندار تھی۔ میری پہلی حاضری ہے اس وجہ سے کچھ اور تو پڑھا ہی نہیں۔ ہاں اکتوبر کے شمارے میں ایک حکایت تھی ’’استاد‘‘ نعیم اللہ صاحب کی بہت اچھی کہانی لگی تھی۔ اور میں کیا کہوں؟ اگلے ماہ حاضری دوں گا اگر وقت پر سچی کہانیاں مل گیا۔

☆: پیارے احتشام! خوش آمدید! کہانی کے بارے میں تو ہم پڑھ ہی کر رائے دیں گے اور ہاں! اب غیر حاضری نہیں چلے گی۔

⊠: ہمارے لکھاری ساتھی منعم اصغر، ڈی جی خان سے لکھتے ہیں۔ امتحانات کہاں کھل کر سانس لینے دیتے ہیں۔ خیر اب تو فراغت کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ اسی خوشی میں ’’سچی کہانیاں‘‘ میں داخل ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے منزہ سہام کی باتیں ’’اسمارٹ فون‘‘ گہرائیوں میں ڈوب کر تحریر کی ہوئی۔ بہت زبردست پھر حسبِ عادت احوال میں قدم دھرے۔ تبصروں میں سنبل، سدرہ انور علی، زرینہ جونیجو، تحسین جونیجو، منزل خان، مسز نوید ہاشمی، فرح انیس، عظمیٰ شکور، ممتاز احمد، عبدالغفار عابد، صائمہ مجید، مجید احمد جائی، خادم حسین نے بہت اچھے تبصرے کیے۔ ایم یعقوب صاحب نے میری خیریت پوچھی۔ جناب ہم بالکل خیریت سے ہیں بلکہ ہمیشہ ہی ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنی طبیعت بدلو تو ہمارا جواب ہے۔ یعقوب صاحب، منعم کی طبیعت بہت سے لوگوں کو بہت پسند ہے۔ اب بدلنا تو زیادتی ہوئی ناں؟

سدرہ انور علی، فرح انیس، ارم خان، مسز نوید ہاشمی، ممتاز احمد، کیسے ہیں آپ لوگ؟ باقی سب کو بہت سی دعائیں۔ کہانیوں میں ''یہ دوستی ہے، ڈراپ سین، فاطمہ گل، روایات کی دلدل، آستین کے سانپ، حرام خور، ازالہ، وہ کون تھی اور وی سی آر اچھی لگیں۔ باقی سب سے معذرت ابھی پڑھی نہیں باقی تحاریر۔ سلسلے وار میں زہر عشق بہت پسند آیا کچھ اقساط مس ہوگئیں۔ مجھے اس میں کہانی کے کرداروں سے زیادہ کاشی کا ہر بات پر زور دے کر سمجھایا گیا طریقہ بہت زبردست لگا، سوچ کے کئی در وا ہوتے ہیں ویلڈن! ہم شکل مجھے پسند نہیں سو معذرت اس بار ''بادبان'' پڑھا۔ اسٹارٹ نے بہت محظوظ کیا بہت دلچسپ۔ یہ پہلا ناول ہے نعمان اسحاق کا جو پہلا حصہ پڑھا میں نے۔ اسفر کا کردار اچھا ہے کافی جس میں، میں دکھتا ہوں ہاہاہا (برائے مہربانی پڑھائی کے معاملے میں نہ سمجھا جائے) خط طویل ہوگیا میرا خط ضرور لگائیے گا۔ ابھی مجھے اجازت دیں سب کے لیے دعائیں اللہ نگہبان۔

☆: پیارے منعم! تبصرہ اچھا لگا! اب اپنی کہانی انجوائے کرو۔ خوش رہو۔

✉: روڈہ تھل سے ہمارے ساتھ احوال میں خضر حیات۔ لکھتے ہیں۔ فروری کا شمارہ اچھلتا، کودتا اور مسکراتا ہوا 2 فروری کو ایک خوب صورت اور دلکش ٹائٹل کے ساتھ مل گیا۔ شمارہ بہت عمدہ اور اچھا تھا۔ پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک عمدہ اور اچھا تھا۔ سب کہانیاں بہت زبردست، اچھی، سبق آموز اور سسپنس سے بھرپور تھیں۔ ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ شاعری نے تو پورے شمارے کا مزہ ہی دوبالا کردیا۔ سب شعر بہت عمدہ تھے۔ باقی تحریریں بھی عمدہ اور اچھی تھیں۔ شمارے میں اپنا خط اور غزل دیکھ کے دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ کاشی صاحب آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرے خط اور غزل کو جگہ دے کر خوش آمدید کہا اور حوصلہ افزائی کی۔ آپ اپنے قارئین کی عزت اور قدر کرتے ہیں، انھیں نظر انداز نہیں کرتے۔ میں مزید کچھ بھیج رہا ہوں اور امید کرتا ہوں جگہ دے کر مزید لکھنے کا موقع دیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ آمین۔

☆: خضر پیارے! ہم اپنے قاری کی قدر اس لیے کرتے ہیں کیونکہ ہم اپنے قاری کے مقام کا ادراک رکھتے ہیں۔ خوش رہو۔

✉: ہمارے ریگولر قاری ساتھی نزاہت اِفشال، مہورہ، فتح جنگ سے اپنی چاہتیں لیے حاضر ہیں۔ فروری کا شمارہ آج میرے ہاتھ میں ہے، منزہ آپی نے ہمیشہ کی طرح بہت خوب لکھا۔ واقعی میں ایسا سمارٹ فون ہونا چاہیے مگر پھر وہ خوف ہے کہ جو آپ نے ظاہر کیا۔ احوال میں میری پیاری ایلڈر سسٹر فرح انیس آپ کی دعاؤں کی طلب گار ہے۔ آپ کا چھوٹا بھائی۔ آپ کیسی ہیں آپی؟ اتنی غیر حاضر نہ رہا کریں پلیز۔ سونیا خان، اور صائمہ مجید یاد کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ راشد لطیف، مجید احمد جائی اور ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا سب کا شکریہ تبصرہ پسند کرنے کا۔ اور منزل آپی آپ نے اپنے اس بھائی کو یاد نہیں کیا۔ چلو کوئی بات نہیں ویسے اتنا ہی کہوں گا کہ

یاد میری بلا کرے اُن کو ☆ وہ مجھے کیا سمجھ کے بھول گئے؟

مذاق کر رہا ہوں۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ آپ کے بیٹے کی صحت کیسی ہے؟ اور نئے لکھنے والوں کو خوش آمدید۔ کہانیوں میں، ''ناسور، میرا ساجن، ہم شکل (ناول) فاطمہ گل، چھوٹی سی نیکی اور میرے اپنے'' اچھی کہانیاں تھیں۔ باقی پڑھی نہیں کیونکہ مارچ کے آخر میں میرے پیپرز ہیں B.A کے سو تیاری کر رہا ہوں۔ کاشی پیپرز کے بعد آپ کو اپنی کافی تحریریں بھیجوں گا۔ کہانیاں اور شاعری بھی ہوگی۔ بس آپ میری کامیابی کے لیے دعا کریں۔ سلسلہ تیر نیم کش میں نگہت منیر، ایم افضل آزاد، بشیر احمد اور فرح انیس آپی آپ سب کا انتخاب اچھا ہوتا ہے۔ اللہ پاک سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔ ناصر کاظمی کے اس شعر کے ساتھ اجازت کہ

ایک بہت خاص آپ بیتی

لاہور کی جیل میں سزائے موت کی سزا کاٹنے والے اُس قیدی کی زندگی کے شب روز جو اسے ایک معصوم انسان سے مجرم بننے پر مجبور کر گئے۔ اُس قیدی کی داستانِ عبرت جس میں آہیں بھی ہیں...... سسکیاں بھی ہیں' محبت اور نفرت کے رنگ بھی...... بہت جلد رانا حبیب الرحمٰن کے قلم سے ایک آتش فشانی سچی کہانیاں کے صفحات پر ملاحظہ کیجیے۔

دنیا تو سدا رہے گی ناصر ☆ ☆ ہم لوگ ہیں یادگار کچھ دیر

2 مارچ کو ناصر کاظمی کی 44 ویں برسی گزر جائے گی، سب سے فاتحہ کی گزارش ہے۔

☆: اچھے نزاہت! ہماری ساری اچھی اور سچی دعائیں تمہارے لیے اور تمہاری کامیابی کے لیے۔ تمہارے لیے ایک شعر۔

دائم آباد رہے گی دنیا ☆ ☆ ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

✉: کبیر والا سے ہمارے ساتھی شاہد رفیق سہو عرض کرتے ہیں۔ ٹائٹل اس دفعہ پھر کچھ یادیں دے گیا۔ بہت خوب صورت تھا۔ یہ آپ کی محنت ہے اس کے بعد آگے بڑھا۔ منزہ سہام کے بہت خوب صورت الفاظ تھے احوال میں سنبل، ایم اشفاق بٹ، مور شاہد حسین، نزاہت افشال، سدرہ انور علی، شمسہ قمر، ممتاز احمد، میرے عزیز بھائی، فرزانہ نگہت، روبینہ ناز، صائمہ بشیر ان سب کے احوال بہت خوب صورت تھے۔ کہانیوں میں'' جدا نہ ہوں گے، گرہن لگا جیون، مجھے موت چاہیے، روگ، علاج، وفا کیسی، پشیمان، اسپیپ چیکنگ، وہ بلی کا بچہ، آخری دعا، شہید، آخری چوری، دیکھ میرا نصیب، زہر عشق'' بہترین اسٹوریاں تھیں۔ ان رائٹرز کو میری طرف سے مبارک باد۔

☆: شاہد! بھائی کے چیئرمین بننے پر مبارک باد قبول فرماؤ۔ اب تبصرہ ہر ماہ آئے۔ تمہاری صحت کے لیے دعائیں۔

✉: ہمارے نئے ساتھی محمد قاسم خان بلوچ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھتے ہیں۔ فروری کا خوب صورت شمارہ خوب صورت حسینہ کے ٹائٹل کے ساتھ ملا۔ یہ شمارہ میرے لیے تو بہت ساری خوشیوں کا انمول تحفہ تھا۔ احوال میں سبھی کے خطوط پڑھے تو معلوم پڑا یہاں نفرتیں کم اور محبتیں زیادہ ہیں۔ کاش ہر جگہ ایسا ہوتا تو آج ہم خون کے آنسو نہ بہا رہے ہوتے۔ اللہ خیر کرے۔ مقصود بھائی آپ نے مجھے سچی کہانیاں میں ویلکم کیا تو جناب بہت بہت شکریہ پر کبھی تم نے میرے دل میں جھانک کر نہیں دیکھا۔ سونیا خان اور صائمہ مجید آپ دونوں کا بھی بہت شکریہ تبصرہ پسند کرنے کا۔ تحریروں میں پہلی سچ بیانی جناب محترم محمد سلیم اختر کی یہ دوستی ہے۔ بہت اچھی تھی آپ کے بارے میں اور کچھ کہنا ضروری نہیں۔ آپ کا جاندار قلم ہی آپ کی تعریف ہے۔ ڈراپ سین بھی اچھی لگی۔ فاطمہ گل، واہ جی واہ زبردست اور دلفریب داستان تھی۔ قسمت کے کھیل نرالے ہیں۔ کوئی خوشیاں لادے۔ روایات کی دلدل بھی اس شمارے کی زینت بنیں۔ آپ اپنے دام میں، اس کہانی کے بارے میں خود تو کچھ نہیں کہہ سکتا اس لیے کہ یہ میری اپنی تحریر تھی اور اس کے بارے میں میں اپنے تمام قارئین کی رائے دیکھوں گا کہ وہ اس کہانی کو کس نظریے سے دیکھتے ہیں۔ بہرحال پیارے کاشی تحریر شائع کرنے پر بہت شکریہ۔ خوش رہو۔ میرا ساجن۔ آستین کے سانپ، اور بھائی ایڈیسن ادریس مسیح کی کہانی، ایک اور خبر۔ ارم ناز کی وی سی آر اور حرام خور یہ کہانیاں بھی دلچسپ تھیں۔ حنا بشریٰ کی کہانی اچھی لگی۔ بھائی مقصود احمد بلوچ کی کہانی۔ قاتل۔ پسند آئی۔ تلاش، بلند بخت بھی لاجواب تحریریں رہیں۔ اس بار ہائیڈ پارک میں بہت مزہ آیا اس لیے کہ۔ ام حبیبہ کا مرسلہ سوا سیر، تنویر فاطمہ کا غیرت مند، اور نادر شاہ کا صحیح طریقہ بہت مزے دار تھے پڑھ کر ہنسی خوب آئی۔ شاعرہ، عمارہ ناز کی غزل تو

دل میں اتر گئی پر امید کے چراغ کب تک روشن رکھوگی، امید وفا چھوڑو۔ بہت ساری دعاؤں کے بعد اجازت چاہوں گا اللہ آپ سب کو سکھی رکھے۔ آمین۔

☆: پیارے قاسم! تم کو پرچہ پسند آیا، ہماری محنت وصول ہوئی۔ تمہارے اندر واقعی ایک بہت بڑا لکھاری چھپا ہے۔ خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔

✉: سرگودھا سے ہمارے بہت پیارے بھائی اور لکھاری ساتھی ممتاز احمد عرض گزار ہیں۔ اپنے خط کی ابتداء اس دعا کے ساتھ کرتا ہوں کہ اللہ کریم اپنے پیارے حبیب حضرت محمد ﷺ کے صدقے ہر انسان کو حاسدوں کے حسد، منافقوں کی منافقت، جھوٹ بولنے والے تہمت لگانے والے بہتان لگانے والوں کے شر سے ہمیشہ محفوظ رکھے آمین۔ سچی کہانیاں کا شمارہ بروقت مل گیا۔ پیاری بہنا منزہ سہام نے اسمارٹ فون کے عنوان سے بہت مزے دار، اداریہ پڑھنے کو دیا۔ سچ کہا انسانی رشتے بالخصوص خون کے رشتے اور نام نہاد دوست ہی اپنی منافقت، خباثت اور حسد جیسے بدترین اور رذیل ترین سوچ اور جذبات میں لتھڑے پھر اگھونپتے ہیں۔ احوال میں پہنچا تو کاشی بھائی مسکراتے نظر آئے۔ یار کاشی آپ ایک لائن اور ایک جملے میں بہت بڑی بات اور خوب صورت پیغام دے دیتے ہو۔ بہت خوب سب سے پہلے تمام بہن بھائیوں بالخصوص زاہد حسین، مقصود احمد بلوچ، ایم افضل آزاد، سلیمان شبیر، فرح انیس، ایم یعقوب، سید ملازم حسین شیرازی، حنا بشریٰ، شعبان کھوسہ، سونیا خان، صائمہ مجید، مجید احمد جائی، راشد لطیف، کنزہ ملک اور ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا کا بے حد ممنون و مشکور ہوں۔ آپ کے خلوص اور ڈھیروں محبتوں کا بہت قرض ہے مجھ پر۔ اللہ کی بارگاہ میں صدق دل سے دعا گو ہوں آپ سب کو صحت، سلامتی، تندرستی کے ساتھ ڈھیروں خوشیاں، بے پناہ عزت اور سکھ عطا فرمائے۔ آمین پیاری بہنا کنول عمران خان، اور مقصود احمد بلوچ کا خصوصی اور اسپیشل تھینکس کہ آپ میری ٹوٹی پھوٹی تحریروں کو جو کہانی کی صورت میں ہوتی ہیں۔ اپنی پسندیدگی کی سند سے نواز کر میری عزت افزائی کرتے ہیں۔ یقین کیجیے آپ کی حوصلہ افزائی بہت طاقت بخشتی ہے۔ لکھنے کا جو یہ شوق ہے۔ یہ اور بڑھ جاتا ہے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ لائف بوائے کمرشل کہانی بہت خوب رہی۔ محترم سلیم اختر صاحب کی ''یہ دوستی ہے'' بہت لاجواب کہانی تھی۔ محمد قاسم خان بلوچ کی ''آپ اپنے دام میں'' بہت اچھی تخلیق تھی۔ ویلڈن قاسم میرا ساجن منفرد اور بہترین کہانی تھی۔ ''قسمت کے کھیل، روایات کی دلدل، آستین کے سانپ، ایک خبر اور، حرام خور، میرے اپنے، تلاش، بلند بخت، ذرا سی غلطی، چھوٹی سی نیکی، اپنا ہو گیا سپنا'' اچھی کہانیاں تھیں۔ برادرم مقصود احمد بلوچ ''قاتل'' کے عنوان سے اچھی کہانی لے کر آئے۔ موسٹ پاپولر رائٹر ارم ناز نے وی سی آر کی لعنت اور اس کے نقصانات کو کہانی کی شکل میں خوب صورت الفاظ اور انداز سے تحریر کیا۔ جاوید راہی صاحب کا تو جواب نہیں۔ کیا خوب لکھتے ہیں پڑھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔ بادبان بہت زبردست کاوش ہے۔ ہائیڈ پارک میں کنول جی تنہا، شعبان کھوسہ اور کرن شہزادی کا انتخاب بہت اچھا تھا۔ روبینہ ناز روبی کا کلام ''سال نو میں'' بہت عمدہ اور لاجواب تھا۔ بہت پسند آیا۔ عمارہ ناز اور خضر حیات کی شاعری بھی اچھی تھی۔ نبیل جاوید اور آپا رضوانہ کوثر کے لطیفے بہت مزے کے تھے۔ ترنم کش میں مسز نگہت غفار کا اچھا انتخاب تھا۔ باقی دوستوں کے انتخاب بھی بہت اچھے تھے۔ اجازت چاہتا ہوں۔

☆: اچھے بھائی ممتاز! تبصرہ لاجواب اور تحریر کا جواب نہیں۔ ادھر ادھر دیکھنے سے اپنا کام رہ جاتا ہے۔ بس اپنا کام کریں۔

✉: لاہور سے ہمارے بہت عزیز قاری زاہد حسین لکھتے ہیں۔ اسلام علیکم۔ ''اسمارٹ فون'' نے تو ہماری آنکھوں کی پتلیوں کو ساکن کر دیا ہے۔ اور اسماء اعوان نے عارفین کو فراز کے حوالے کر کے سب کا قہقہہ سنا دیا ہے۔ ''یہ دوستی ہے'' میری دوستی میرا پیار گنگناتی معقول ترین کہانی محترم مصنف کی شان میں اضافہ کر رہی ہے۔ ''ڈراپ سین'' بہت دلچسپ رہا۔ ''ناسور'' صرف کہانی نہیں اک درس گاہ ثابت ہوئی ہے۔ ''قسمت کے کھیل نرالے ہیں'' روایتی معاشرتی

مارچ2016ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کررہا/کررہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام:...

مکمل پتا:...

....

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

مارچ2016ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی:................ تعداد صفحات:..........

نام:...

مکمل پتا:...

....

فون رسیل نمبر:...

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

مارچ2016ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل،عنوان:................ مصنف:..........

دوم،عنوان:................ مصنف:..........

سوم،عنوان:................ مصنف:..........

نام:................ شہر:..........

عام کہانی ہے۔ ''کوئی خوشیاں لادے'' میں چھوٹا سا اک بچہ ہوں پر کام کروں گا بڑے بڑے، ''ثمینہ فیاض روایات کی دلدل'' میں تھیں۔ ''آپ اپنے دام میں'' بظاہر جو لکھا ہے اس کی روشنی میں تو صاف عیاں ہے کہ بددعائیں نہیں لینی چاہیے کسی کی۔ ''میرا ساجن'' اول جہالت آخر فطرت۔ ''ایک خبر اور'' افسوس زدہ سی پڑھ کے آگے بڑھنا پڑا۔ ارم ناز صاحبہ بڑے پیارے انداز میں ''وی سی آر'' کے ہمراہ براجمان تھیں۔ کیا کمال کے حروف الفاظ جملے، دیکھنے کو ملے مسکراتے ہوا کی طرح نرم سادے سے فقرے ماحول کی منظرکشی بہت پسند آئی۔ ''حرام خور'' فوزیہ احسان رانا صاحبہ نے دکھایا کہ یہ مرض تو بڑے بڑے کرسی نشینوں کو بھی لاحق ہے۔ ''قاتل'' لالچ بُری بلا ہے بھول گیا۔ ''تلاش'' ختم ہوتے ہی ہم شاد ہوئے۔ نوشابہ صدیقی نے ''بلند بخت'' ہونے کا مہکتا ہار ہمارے گلے میں ڈال دیا۔ ثناء کنول اللہ دتہ کا ہمیں ''ذرا سی غلطی'' کا خطرہ بتادیا۔ ''ایک چھوٹی سی نیکی'' پڑھ کے۔ ''اپنا ہوگیا سپنا'' پیار دیوانہ ہوتا ہے مستانہ ہوتا ہے ہر خوشی سے ہر غم سے بیگانہ ہوتا ہے یہ دیکھا ہے اس سینے میں۔ نعمان اسحاق ''بادبان'' کا شامیانہ لہرائیے دور افق پر آسمان کی طرح پھیلے اور سمندر کی مانند رواں دواں تھے قلم کے سفر پر۔ ہم اور نظارہ کرتے تو ہماری ٹرین چھوٹ جاتی۔ پلیٹ فارم پر پہنچے تو ممتاز احمد صاحب حسب معمول سجے سنورے منتظر تھے۔ ملتے ہی فرمایا کہ چند لمحے جو دیر کی ہے اس کا اب ''ازالہ'' پڑھیے۔ کوچ کرو کی سیٹی بجی تو تیزی سے ہجوم اور بھیڑ سے گزر کر بخیریت ٹرین میں جا بیٹھے تو سامنے ہی محترم جاوید راہی صاحب صورت پاری لبوں پہ تبسم جاری لیے تشریف فرما تھے۔ ہم سمجھ گئے کہ ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔ لہٰذا فوراً پوچھا کہ ''وہ کون تھی''

☆: بہت پیارے بھائی! تبصرہ اتنا شاندار کیا کہ مزہ آگیا۔ آپ کی محبت کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔ بس باقاعدہ حاضری برقرار رکھیں۔

✉: کراچی سے ہماری آپا، مسز نوید ہاشمی لکھتی ہیں۔ دوستوں اور ساتھیوں آپ سب کیسے ہیں۔ آپ سب سے دور رہ کر بھی آپ سے دور نہیں تھی۔ آپ سب ڈائجسٹ کی شکل میں میرے پاس تھے۔ گل ملک، جواب ہم میں نہیں اُن کے لیے دعا ہے اللہ ان کے درجات بلند کرے (آمین) ثنا خوش رہو، مور شاہد میرے بھائی صحت مندی کا سن کر خوشی ہوئی۔ سلیمان شبیر، نزاہت افشاں، آپ دونوں کیسے ہیں۔ رضوانہ کوثر کی والدہ کا سن کر افسوس ہوا۔ اس دکھ کی گھڑی میں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم محنت کریں اور اس کا پھل ایوارڈ کی صورت کاشی چوہان اور منزہ سہام ہمیں پیش کریں تو اس سے بڑی خوشی نہیں ہوتی۔ شکریہ آپ سب کا۔ اور آپ کی پوری ٹیم کو میں مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ میری طرف سے تمام ایوارڈ ونرز کو ایوارڈ مبارک۔ مگر ایک کمی رہ گئی ایوارڈ دینے میں کاشی چوہان میرے بھائی کی زہر عشق اسٹوری جو مزے دار دھماکہ خیز سب کی پسندیدہ ہے۔ اُس کا ایوارڈ کہاں ہے؟ (ناول ایوارڈ سے بالاتر ہوتے ہیں آپا) اسماء اعوان بھی کیا خوب لکھ رہی ہیں، ان کو ایوارڈ بھی دینا چاہیے تھا۔ سیما غزل، فرحت صدیقی، ایڈیسن کی کہانیاں واقعی شاندار تھیں۔ شاہد رفیق، محمد سلیم اختر کی کہانی پسند آئی۔ انیلا کوثر، ارم چھا گئیں، الیس امتیاز، اشفاق شاہین بہت اچھی اسٹوری تھی۔ محمد اقبال زمان نے کیا خوب لکھا۔ ملک الطاف سرور خوب صورت لکھا۔ حمیرا قریشی نے پیارا لکھا۔ کرن نورین، صائمہ بشیر کہانی پسند آئی۔ نزہت ناز، غنی پرواز، روشانے، اقبال بانو نے اچھا لکھا۔ ملازم حسین شیرازی، فصیحہ آصف، محمود شام، مجید احمد جائی، ممتاز احمد، مقصود احمد بلوچ سب کی محنت نظر آرہی ہے۔ اب اجازت۔

☆: پیاری آپا! سلامت رہیے! آپ کی محبت اور انسیت نے میری آنکھیں نم کردیں۔ مجھے تو آپ سب کی محبت کا ایوارڈ ہر ماہ ملتا ہے۔ اب بھلا اس سے بڑھ کر کون سا ایوارڈ ہوگا۔

✉: کراچی سے ساجدہ لطف اللہ کی احوال میں پہلی آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ میں آپ کا رسالہ بہت شوق سے ہر ماہ پڑھتی ہوں۔ مجھے بچپن سے ہی کہانیاں لکھنے کا بہت شوق تھا۔ اپنے اس شوق کو عملی جامہ پہنانے کے لیے

میں پہلی بار کہانیاں ارسال کر رہی ہوں جو کہ حقیقی واقعات پر مبنی ہیں۔ امید ہے میری حوصلہ افزائی کریں گے۔

☆: پیاری بہن! خوش آمدید! کہانیاں پڑھنے کے بعد رائے دیں گے۔ تبصرہ تو روانہ کریں آپ۔

✉: ہماری لکھاری ساتھی اُمّ عادل، کراچی سے عرض کرتی ہیں۔ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ فروری کا شمارہ نہ صرف ہاتھوں میں ہے بلکہ ہم اسے آدھے سے زیادہ ہضم بھی کر چکے ہیں۔ فہرست کو چیک کیے بغیر ہم آگے بڑھے۔ منزہ صاحبہ کا اداریہ ''اسمارٹ فون'' خوب صورت تجویز کے ساتھ بہترین تحریر تھی۔ احوال میں آئے ایک مرتبہ بغیر چشمے کے اور دوسری بار چشمے کے ساتھ سارے احوال کو کھنگال لیا۔ مگر حسبِ معمول ہمارا نامہ کہیں نہ تھا۔ حد تو یہ ہے کہ لیٹ ملنے والے خطوط بھی ہمارا منہ چڑا رہے تھے کہ تمہارا قاصد یہاں بھی نہیں ہے۔ ہم چونکہ احوال کے بعد رسالہ الٹی کی طرف سے شروع کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہائیڈ پارک اچھا تھا۔ بس شاعری سمجھ میں نہیں آئی۔ مسئلہ یہ ہے کو پھلانگا کیوں ہمارا کوئی مسئلہ نہیں۔ (سوائے رسالے میں کہیں جگہ نہ ملنے کے) آگے آیا 'زہرِ عشق' واہ کاشی جی۔ جاوید راہی صاحب ہمیشہ کی طرح جاندار کہانی لاتے ہیں زندہ باد۔ پیارے ممتاز بھیا آپ کی تحریر ازالہ حسبِ روایت بہترین، شاندار، جاندار تحریر تھی۔ زندگی کے دکھوں کو اجاگر کرتی اپنا ہو گیا سپنا اچھی لگی۔ 'بلند بخت' اوپر سے گزر گئی۔ شانی خامان کی 'تلاش' اچھی کوشش تھی۔ اُف حناجی 'میرے اپنے' لرزا گئی۔ سفرنامہ پڑھنا شروع نہیں کیا۔ جب مکمل ہو جائے گا تو ایک ہی نشست میں بیٹھ کر پڑھنے میں لطف دے گا۔ ''حرام خور'' اُن ماؤں کے لیے لمحہ فکریہ ہے تو اولاد کے بے جا ناز اٹھاتی ہیں۔ ارے ارم ناز بہنا خوش رہو، سلامت رہو، ہمیشہ کی طرح معاشرے کی بدصورتی کس خوب صورتی سے ضبطِ تحریر میں لائی ہیں۔ آپ کو پتا ہی نہیں میں آپ کی تحریروں کی مداح ہوں۔ ممتاز بھیا کی تحریروں کی طرح اڈیسن مسیح ،ایک اور خبر لگا کر چھا گئے ہیں۔ ہم شکل بھی مکمل ہونے پر ایک ساتھ ہی پڑھیں گے۔ تاکہ ہم بھی کسی سے کہہ سکیں بھئی ہمیں ڈسٹرب نہ کریں ہم ناول پڑھ رہے ہیں۔ 'آستین کے سانپ' اُلجھی ہوئی تحریر تھی۔ ہائے ضرغام محمود آپ نے ''میرا ساجن'' میں کمال ہی کر دیا خوب صورت تحریر۔ منعم اصغر ابھی چھوٹے ہو مگر خوب لکھتے ہو۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ اللہ اللہ نسرین اختر بہنا اپنی تحریر 'ناسور' میں آپ نے جس خوب صورتی سے معاشرے میں پنپنے والی بیماری گھمنڈ کو واضح کیا ہے، بہت ہی خوب ہے۔ بھیا محمد سلیم اختر کی تحاریر بھی نہایت شاندار اور جاندار ہوتی ہیں۔ اب اجازت دیجیے۔ محنت سے یہ نامہ لکھا ہے جگہ ضرور دیجیے گا۔

☆: اچھی بہن! آپ یقین کر لیں کہ آپ کا نامہ ہم تک پہنچ ہی نہ پایا۔ ورنہ ہم تو لیٹ خطوط بھی لگا دیتے ہیں۔

✉: ایم افضل آزاد، ساہیوال سے لکھتے ہیں۔ دلکش سرورق سے سجا فروری کا شمارہ 30 جنوری لاہور سے ملا۔ منزہ آپی نے اسمارٹ فون کے بارے میں لکھا تھا۔ آپ کی بات درست تھی۔ جاوید اقبال، راجو شریال کو احوال میں خوش آمدید۔ کنول جی آپ کا احوال بہت اچھا تھا۔ سندرہ انور، کنول عمران خان، شاہ زری، منزل خان، اشفاق شاہین بھائی، حنا بشریٰ، قاسم بلوچ، عظمیٰ شکور اسلام آباد سے، سونیا خان، صائمہ مجید ملتان، مجید احمد، سب نے اپنے قلم سے خوب انصاف کیا۔ اسٹوری زہرِ عشق کو لکھتے ہوئے کاشی بھیا آپ کو ڈر نہیں لگا۔ ہم کو تو رات ڈر لگتا ہے آپ کی اسٹوری پڑھ کر۔ ایک خبر اور اڈیسن ادریس مسیح 'ہم شکل' ایم اے راحت 'آستین کے سانپ'، ایم یعقوب 'میرا ساجن'، ضرغام محمود 'آپ اپنے دام میں' محمد قاسم خان بلوچ، 'روایت کی دلدل'، ثمینہ فیاض، 'کوئی خوشیاں لادے' منعم اصغر 'قسمت کے کھیل نرالے ہیں'، نازیہ بتول رضا۔ 'فاطمہ گل'، اعجاز احمد 'ناسور'، نسرین اختر، 'ڈراپ سین' اقبال بانو 'یہ دوستی ہے'، سلیم اختر 'ازالہ' ممتاز احمد 'وہ کون تھی' شانی خامان 'قاتل' مقصود احمد بلوچ 'حرام خور' فوزیہ احسان رانا 'وی سی آر' ارم ناز سب کی اسٹوریاں بہت اچھی تھی۔ سب نے بہت اچھا لکھا۔

☆: اچھے بھائی! تبصرے کا شکریہ! بس ذرا اپنا احوال ہمیں جلدی روانہ کیا کرو۔

✉: یاسر وکی اوکاڑہ سے اور ملک ندیم عباس ڈھکو، ساہیوال سے مشترکہ تبصرہ لیے حاضرِ خدمت ہیں۔ لکھتے ہیں۔ فروری کا شمارہ ہم دونوں دوست مل کر پڑھ رہے ہیں۔ کیا بات ہے کاشی بھائی جان پرچے کو ترتیب دینا آپ پر End ہے۔ بے حد پیاری ترتیب، انتخاب اور بے حد خوشبودار الفاظ سچی کہانیاں کے صفحات پر پڑھنے کو مل رہے ہیں۔ آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔ شمارے پر دل کھول کر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں مگر ڈرتے ہیں احوال کی سجی ہوئی محفل میں ہمارے بے کار سے الفاظ قارئین کو پسند بھی آئیں یا نہ آئیں۔ ویسے اجازت تو ہے ناں؟ اپنا رسالہ ہے سچی کہانیاں اس میں کوئی شک بھی نہیں۔ اس میں شامل ہونے پر محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اپنوں میں آ گئے ہیں۔ احوال میں افضل آزاد بھائی سب کو ویلکم کرتے ہو چلو جلدی سے ہمیں بھی خوش آمدید کہو۔ پورا جھنگ سچی کہانیاں میں آ گیا ہے۔

☆: عزیز ندیم اور یاسر! شکوہ بجا مگر...... ندیم تم نے جہاں کہانیاں بھیجی تھیں ہم نے دے دیں۔ بلکہ ہم نے اُس میں سے ہی کہانی جولائی میں لگائی بھی تھی۔ جب ہم وہاں نہیں تو کیسے لگائیں۔ یاسر وکی سے فون پر بات ہو چکی تھی۔ ایک سال سے زیادہ ہوا۔ کہانی اب تک نہ آئی۔ ہمارا قصور؟

✉: احوالیو! یہ دیکھو ہمارے ساتھ اس ماہ احوال میں کون شریک ہے۔ ہماری بہت پیاری لکھاری اور شاعرہ۔ میری آپی پروفیسر صفیہ سلطانہ مغل، جیکب آباد سے محبتیں لیے حاضر ہیں۔ پیارے سے بھیا کاشی چوہان۔ امید ہے کہ آپ بخیریت سے ہوں گے۔

تمہارا نام ستاروں پہ لکھتی رہتی تھی ☆ ☆ یہ عمر کاٹ دی تارے شمار کرتے ہوئے

یہ شعر سچی کہانیاں کی محبتوں کے لیے ممنون بھی ہے اور مسنون بھی۔ تمہاری محبت اور خلوص کی زیرِ بار ہوں۔ پرچہ وقت مل جاتا ہے میں ہی اب بہت تساہل پسند ہو گئی ہوں۔ اب پرانے احباب بھی نہیں۔

ذرا سا راستہ دے زندگی ☆ ☆ یہاں اک دائرے میں دائرہ ہے

کہانیاں سب کی سب بہترین۔ بعض ناقابلِ یقین تھیں۔ مگر یقین کرنا پڑتا ہے کہ دنیا ہست اور نابود کا کھیل ہے۔ بس وقت کے ساتھ ساتھ کردار بدلتے رہتے ہیں۔ اقبال بانو کے ڈراپ سین نے ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیا۔ بہت اچھا اختتام۔

☆ وہ کہیں بھی ہو گیا لوٹا تو میرے پاس آیا

اقبال جی بہت عرصے بعد آپ کے قلم سے ایک سادہ شاہ کار لکھا گیا۔ جبکہ نسرین اختر تنہا کی کہانی بھی ٹپال ٹی کی طرح دانے دار اور دم دار تھی۔ کرداروں پر گرفت اور ان کے کردار متنبہ کرنے والے تھے۔ انجام بالآخر ندامت پر ختم ہوتا ہے۔ کاش ہم انا کے کشکول کو توڑ کر اپنی خودی کو سر بلند کرنا سیکھیں۔ یہ سبق ہمیں اس کہانی سے بخوبی ملتا ہے۔

جب جواں ہونے لگی پاؤں کو زنجیر کیا ☆ ☆ نام جس لڑکی کا ماں باپ نے پائل رکھا

فاطمہ گل کے نام سے موسوم کہانی' بے حد رقت آمیز تھی۔ اللہ تعالیٰ ایسی تمام لڑکیوں، نوجوانوں کو شہادت کا درجہ عطا فرمائے۔

کاغذ پہ ایک نام اتارا تھا اور بس ☆ ☆ پھر ہم تھے یا کشمیر ہمارا تھا اور بس

نازیہ بتول کی کہانی بھی اپنی معصومیت سے زیادہ افادیت کو لیے ہوئے تھی۔ اس کا فیصلہ دانشمندانہ تھا۔ عورت اپنی جگہ چھوڑ دے تو اس کی جگہ خالی نہیں رہتی۔ بہت اچھی کہانی تھی۔

آس کے کتنے ستاروں کو لبھا کر آئی ☆ ☆ رات آئی تو کئی درد جگا کر آئی

شعر و شاعری کا معیار بھی اچھا تھا۔ غزلوں کی تعداد کم ہے۔ شاعری کا حصہ بڑھا دیں۔ (ثواب ہوگا) کیونکہ شاعروں کے دل سے جو دعا نکلتی ہے وہ عرش تک جاتی ہے۔ کہانیاں جتنی پڑھیں ان سب پر تبصرہ حاضر ہے۔ اب اجازت دو۔ انشاءاللہ ہر ماہ حاضری ہوگی۔

☆: ہماری بزم میں آئے ہو بڑی دیر کے بعد...... آپی جی! خدا کرے کہ جو آپ نے لکھا وہ پورا ہو۔ آپ کی آمد نے مجھے جو خوشی دی وہ کہاں درج کروں والا معاملہ ہے۔

✉: اکوال تلہ گنگ سے ہمارے مستقل پیارے سے سلیمان شبیر لکھتے ہیں۔ دلکش سرورق سے سجا ماہِ فروری سچی کہانیاں 29 جنوری کو ملا۔ سب سے پہلے منزہ آنٹی کا ''اسمارٹ فون'' پڑھا۔ واقعی ہمیں اب کوئی ''اسمارٹ فون'' ایجاد کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے بعد آپ کی محبتوں کی دنیا ''احوال'' میں پہنچے۔ ماشاء اللہ احوال میں بھی سب نے خوب تبصرے کیے۔ اللہ پاک آپ کی اسی محبتوں کی دنیا کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔ آمین۔ اسماء اعوان 'لائف بوائے' میں پھر ایک خوب صورت کہانی لائیں۔ بھائی محمد سلیم اختر صاحب ہمیشہ کی طرح منفرد اور اچھوتی کہانی لے کر حاضر ہوئے مزہ آ گیا۔ ''ناسور'' نسرین اختر نینا۔ 'فاطمہ گل' اعجاز احمد فکرال، ایک خبر اور ایڈیسن اور یس میسج ''حرام خور'' فوزیہ احسان رانا' شانی خامان' چھوٹی سی نیکی' رئیسہ خالد' میرے اپنے' حنا بشریٰ صاحبہ کی اس ماہ کی بہت ہی خاص کہانیاں تھیں۔ بھائی ممتاز احمد ''ازالہ'' کی صورت میں ایک اور خوب صورت شاہ کار لے کر آئے۔ اور جاوید راہی صاحب کی ''وہ کون تھی'' بہت ہی زبردست لگی۔ ''ہم شکل'' ایم اے راحت صاحب کا ناول بھی آہستہ آہستہ پوری دلچسپی کے ساتھ اختتام پذیر ہو رہا ہے۔ ''بادبان'' نعمان اسحاق کے ناول کی پہلی قسط نے اپنے حصار میں جکڑ لیا۔ اور ''زہرِ عشق'' کی قسط نے تو اگلے ماہ کا انتظار اور بھی زیادہ کر دیا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ''مسئلہ یہ ہے'' میں بابا جی دکھی انسانوں کی جو مدد کر رہے ہیں اللہ پاک ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش میں بھی سب کے انتخاب خوب تھے۔

☆: پیارے سلیمان! تمہاری محبت نے ہمیں اپنے حصار میں جکڑ لیا ہے۔ تبصرہ بہت جاندار ہوتا جا رہا ہے تمہارا۔

✉: ہماری آفت کی پڑیا۔ سدرہ انور علی، جھنگ صدر سے عرض کرتی ہیں۔ ماہ فروری کا شمارہ انتہائی دلکش ٹائٹل کے ساتھ 31 جنوری کو ملا۔ منزہ آنٹی کا اداریہ ''اسمارٹ فون'' بہت خوب صورت تحریر لکھی۔ احوال میں سبھی نے بہت اچھا لکھا۔ زرینہ آپی ملکہ احوال تحسین جونیجو، کنول عمران خان، آپی مسز نوید ہاشمی، منزل خان آپی، حنا بشریٰ، عظمیٰ شکور، عبدالغفار عابد بھیا، مسٹر پرفیکٹ مجید احمد بھیا، صائمہ مجید بھابی، کنزہ ملک، فرح انیس کے احوال پسند آئے۔ مائی سویٹ آپی زرینہ جونیجو آپ مجھے شاہین ہی کہہ لیا کیجیے۔ ملکہ احوال تحسین جونیجو آپ کیسی ہو مائی بے بی؟ کنول عمران خان، ڈیئر سسٹر، عبدالغفار عابد بھیا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ مسٹر پرفیکٹ مجید احمد جائی بھیا آپ کی کہانی کدھر ہے۔ لائف بوائے، رشتے مضبوط بنائے اسماء اعوان نے بہت اچھا لکھا۔ ویلڈن اسماء اعوان، انکل محمد سلیم اختر کی ''یہ دوستی'' بہت دلچسپ اور میرے خیال میں اس شمارے کی بہترین کہانی ہے۔ ڈراپ سین، اقبال بانو کی ناقابل فراموش تحریر ہے۔ ایسی عورتوں کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔ نسرین اختر نینا کی 'ناسور' اپنی نظریں آسمان پر ضرور رکھیں لیکن یہ کبھی مت بھولیں کہ سرزمین پر ہی رکھے جاتے ہیں۔ اعجاز احمد فکرال، کی فاطمہ گل، بہت اچھی لگی۔ جب بھی لکھتے ہیں بہت اعلیٰ لکھتے ہیں ویلڈن۔ نازیہ بتول رضا کی قسمت کے کھیل نرالے، بہت اچھا لکھا۔ منعم اصغر کی کوئی خوشیاں لا دے ویلڈن منعم۔ روایات کی دلدل، ثمینہ فیاض، قاسم خان بلوچ کی، آپ اپنے دام میں، ضرغام محمود کی 'میرا ساجن' محمد یعقوب کی 'آستین کے سانپ' پہلا شعلہ میں ایڈیسن اور یس میسج ایک خبر اور، فوزیہ احسان کی 'حرام خور' تمام کہانیاں بہت اچھی اور سبق آموز تھیں۔ تین مرد تین کہانیاں میں، حنا بشریٰ' میرے اپنے' مقصود احمد بلوچ' قاتل' شانی خامان' تلاش' خوب لکھا۔ ثنا کنول کی ایک چھوٹی سی غلطی، رئیسہ خالد، 'چھوٹی سی نیکی' الماس فاطمہ ارمان کی، اپنا ہو گیا سپنا' بادبان' نعمان اسحاق، 'ازالہ' ممتاز احمد بھیا، بہت اچھی تحریریں تھیں۔ کار جہاں دراز ہے میں انکل جاوید راہی۔ 'وہ کون تھی' کمال لکھا۔ کاشی بھیا کی زہر عشق بہت اچھی جا رہی ہے۔ ہم شکل میں کوئی نہیں پڑھتی ہوتی اس کے لیے معذرت، ہائیڈ پارک میں

تمام لوگوں کے انتخابات پسند آئے۔ تیر نیم کش میں سب کے اشعار پسند آئے۔ مقصود احمد بھیا میں خیر سے ہوں آپ کیسے ہیں؟ عبدالعزیز انکل، منشی عزیز بھیا، شائستہ جمال، ثمینہ ناز آپی پلیز واپس لوٹ آئیں۔ اب تک کے لیے اتنا ہی ملتے ہیں اگلے میں تب تک اپنا بہت سارے والا خیال رکھیے گا۔ اللہ نگہبان۔

✉: لیّہ سے یہ آمد ہے ہمارے پیارے بھائی محمد یوسف لغاری کی۔ لکھتے ہیں۔ ہر دفعہ سوچتا ہوں کہ اس دفعہ شمارے پر لازمی تبصرہ کرنا ہے مگر جب تک رسالہ ختم ہوتا ہے اس وقت ہم مقررہ تاریخ گزار چکے ہوتے ہیں اور اس کی وجہ بے پناہ مصروفیت کا ہونا بقول شاعر احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات۔ سب سے پہلے تو میری طرف سے تمام ایوارڈ ونرز لکھاریوں خصوصاً مسز شمع حفیظ، اقرا سیف اور پیارے بھائیوں مجید احمد جائی و شعبان کھوسہ کو مبارک باد قبول ہو۔ سیما غزل کی کہانی میں اینڈ نے ایک دم کہانی کو نیا رخ دیا بلاشبہ اک بہترین کہانی۔ اقبال بانو کی کہانی وٹہ سٹہ نے بہت متاثر کیا کیونکہ وٹہ سٹہ آج کے دور میں بھی جاری و ساری ہے کیونکہ یہ ایک ایسے رشتے کا خاندانی سسٹم ہے جس سے اگر ایک گھر میں کوئی بھی مسئلہ ہو تو دوسرے گھر میں خود بخود مسئلہ ہو جاتا ہے محترمہ اقبال بانو نے اس پر خوب قلم لکھا۔

☆: یوسف پیارے! آئندہ بھی ایسی ہی پھرتی دکھانا تاکہ ہم بھی فخریہ کہہ سکیں کہ اہلِ محبت چھپ کر نہیں ڈنکے کی چوٹ پر سامنے آتے ہیں۔

✉: کنزہ ملک' قاسم پور کالونی' ملتان سے شاملِ احوال ہیں۔ لکھتی ہیں۔ سلام محبت! راستہ دو' پیچھے ہٹو! مجھے کاشی بھائی کو سلام تو کرنے دو ظالمو! اتنی بھیڑ میں کم سن لڑکی کو جگہ ہی نہیں مل رہی۔ کاشی بھیا! کیسے ہیں؟ والسلام تو کہہ دیں۔ فروری کا سچی کہانیاں پھولوں کے ہار لئے بک اسٹال پر میرے انتظار میں تھا۔ جلدی جلدی اپنے ہاتھوں میں قید کیا اور ٹٹولا، چوما اور بیگ میں چھپا لیا (کہیں نظر ہی نہ لگ جائے) اتنا پیارا جو ہے۔ منزہ سہام کا اداریہ زبردست تھا، بھلا جانوروں کے جذبات جاننے کی کیونکر فکر لاحق ہوگئی۔ جانور تو کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتے۔ جانوروں میں پیار بھی ہے اور وفا بھی' مگر انسان ان جانوروں سے بھی گیا گزرا ہے۔ کیوں میں نے ٹھیک کہا ناں۔؟ کاشی بھیا جب آپ گڑیا کہتے ہیں۔ میں بہت خوش ہوتی ہوں۔ لبوں پہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ سدا خوش رہیں۔ سب دوستوں کا شکریہ کہ انہوں نے مجھے یاد رکھا۔ سبھی کے تبصرے پیارے تھے۔ کہانیوں میں زہر عشق مزے لے لے کر پڑھی کیوں کہ مجھے ہارر کہانیاں بہت پسند ہیں۔ بادبان ناول پہلا حصہ اچھا رہا۔ وہ کون تھی۔ جرم کہانی ٹھیک رہی۔ ازالہ میں انکل ممتاز احمد نے بہترین درس دیا ہے۔ ماموں مجید احمد جائی کی کہانی اس بار پڑھنے کو نہیں ملی۔ کیوں؟ حرام خور، ایک خبر اور، وی سی آر، میرے اپنے، ڈراپ سین، ناسور، آپ اپنے دام میں، میرا ساجن، پیاری کہانیاں تھیں۔ اس کے علاوہ بھی اچھی رہیں۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش، مسئلہ یہ ہے سچی کہانیاں کی شہ رگ ہیں۔ اس بار سچی کہانیاں بہت دل کو بھایا۔ کاشی بھیا، یقیناً آپ کی محبتوں کا ثمر ہے جو ہمیں سچی کہانیاں بروقت اور لاجواب مل جاتا ہے۔ اب اجازت۔

☆: پیاری سی کنزہ! گڑیا تمہارا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ ہمیں تو انتظار رہتا ہے تمہارے تبصرے کا۔

✉: ڈاکٹر خادم حسین' رجب والا، بڈھلہ سنت روڈ ملتان سے برقی نامے کے ساتھ احوال میں موجود ہیں۔ عرض کرتے ہیں۔ اُمید ہے خیریت سے ہوں گے اور اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھا رہے ہوں اور نبھا بھی رہے ہیں، جس کا واضح ثبوت سچی کہانیاں کا بروقت مل جانا ہے۔ ماہِ فروری کا سچی کہانیاں پا کر جہاں خوشی ہوئی وہاں دِل غمگین بھی ہوا۔ خوشی اِس لیے کہ بہت پیارا پرچہ شائع ہوا اور غمگین اِس لئے کہ اِس میں مجید احمد جائی کی کہانی شامل حال نہیں ہے۔ اللہ خیر کرے خیریت سے ہوں۔ اداریہ میں منزہ سہام نے جاپانیوں کے لیے خوبصورت بات کی ہے۔ کاش کے جاپانی اِدھر کان بھی دھریں۔ احوال میں کاشی بھائی کی باتیں پسند آئی اور اللہ عمل کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائے۔ سبھی کے سبھی تبصرے خوبصورت اور جاندار تھے۔ ہاں البتہ اس بار نئے

لوگوں کی اکثریت تھی اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سچی کہانیاں پڑھنے والے روز بروز بڑھتے جاتے ہیں۔ یہ بڑی خوش آئندہ بات ہے۔ مجید احمد جائی، صائمہ مجید، ممتاز احمد، شعبان کھوسہ، منزل خان، حنا بشریٰ، مسز نوید ہاشمی کے تبصرے زبردست رہے۔ نئے احوالیوں کو ست بسم اللہ۔ کہانیوں میں ''ازالہ'' ممتاز احمد کی کہانی نے کافی متاثر کیا۔ وی، سی، آر، یہ دوستی ہے، ناسور، تلاش، ڈراپ سین، آستین کا سانپ، میرے اپنے، حرام خور، خوب تر تحریریں تھیں۔ بھارت میں بلیک لسٹ زبردست سفرنامہ ہے۔ زہر عشق نے تو رگوں میں دوڑتے خون میں بھی وحشت بھردی ہے۔ جن، نوکر کی شکل میں محبوب کے آگے پیچھے گھومتا پھرتا ہے۔ ہائیڈ پارک اور تیرنیم کش اچھے چل رہے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے میں بابا جی! نیکیاں کما رہے ہیں۔ مصروفیات سے وقت نکال کر جتنا سچی کہانیاں پڑھا اُتنا تبصرہ کر دیا، مصروفیات سے وقت نکال کر کہانی لکھ رہا ہوں جیسے ہی مکمل ہوتی ہے روانہ کر دوں گا۔ اب اجازت، سب کو خلوص بھرا سلام۔

☆: ڈاکٹر صاحب! خوش باش رہیے۔ آپ کی تحریر کا شدت سے منتظر ہوں۔ تبصرے کے لیے شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا ہے۔

✉: بستی شاہ گردیز، کوٹلہ رحم علی سے سونیا خان عرض کرتی ہیں۔ ماہ فروری کا سچی کہانیاں بروقت مل گیا۔ ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ اداریہ میں منزہ سہام ''اسمارٹ فون'' کی تعریف کرتے ہوئے جاپانیوں کی کم عقلی کو داد دے رہی تھیں۔ احوال میں کاشی بھیاء ہمیشہ کی طرح سچی باتیں کر رہے تھے۔ باجی سدرہ انور علی، بہن زرینہ جونیجو اور تحسین جونیجو، زاہد حسین، ملک محمد اکرم آحیر، ایم افضل آزاد، منزل خان، محمد سہیل خان، سلیمان شبیر، مسز نوید ہاشمی، فرح انیس، سید ملازم حسین، حنا بشریٰ، محمد قاسم خان، عظمیٰ شکور، انکل ممتاز احمد، صائمہ مجید، پیارے مجید احمد جائی، راشد لطیف صبر والے، ڈاکٹر خادم حسین اور کنزہ ملک کے تبصرے بہت پیارے تھے۔ اس بار جھنگ بازی لے گیا اور سدرہ انور نے خوب سچی کہانیاں متعارف کروایا۔ نئے آنے والے لوگوں کو خوش آمدید۔ اب غیر حاضری نہیں چلے گی۔ کہانیوں میں زہر عشق سب سے پہلے پڑھی۔ بیچارے سلیمان (جن) اپنی محبت کی خاطر کیا کیا بھیس بدل رہے ہیں، شروع میں پلّے کی شکل میں آئے، پھر ہم شکل بھی بنایا اور اب محبوب کے دیدار کے لئے نوکر بن کر اُس کی حویلی میں گھوم پھر رہا ہے۔ سچ ہی تو کہتے ہیں عشق کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ ازالہ میں ممتاز احمد، فواد کی کہانی پیش کر رہے تھے، بیچارے کو خواہ مخواہ رات بھر پولیس کی مار کھانی پڑی لیکن رب کی ذات بڑی بے نیاز ہے۔ اُس ایک رات کا ازالہ بھی خوب ہوا۔ گریٹ انکل جی! اس بار میرے فیورٹ لکھاری مجید احمد جائی کی کہانی کہاں گئی۔ اُن کی کہانی نہ پا کر دل افسردہ سا ہوا۔ بادبان ناول کا پہلا حصہ اچھا لگا اور وی سی آر میں دینو نے اپنا دین گنوا دیا۔ ایک اور خبر نے حیرت میں مبتلا کر دیا' جب آٹھ سالہ لڑکے کو اسٹاپ پر بٹھایا گیا لیکن بیچارے خود ہی درندوں کا شکار ہو گیا۔۔۔ قسمت کے کھیل بھی پیاری لگی۔ ڈراپ سین میں ایک عورت نے دوسری عورت کی کوشش ناکام بنا کر اپنا گھر اجڑنے سے بچا لیا۔ اسی طرح تلاش، میرے اپنے، حرام خور، اپنا ہو گیا سپنا، وہ کون تھی، ناسور، یہ دوستی ہے، میرا سا جن بہترین کہانیاں تھیں۔ اور اتنا پیارا شائع کرنے پر ہم پیش کرتے ہیں سلوٹ اور چاہتے ہیں آپ سب سے اجازت، اگلے پرچے میں ہوگی پھر ملاقات بشرط زندگی سلامت۔

☆: اچھی لڑکی! تمہارے پیارے تبصرے پر ہماری طرف سے محبت کی تھپکی اور اگلے ماہ کے لیے انتظار۔

✉: ہماری صائمہ مجید' ملتان شریف' سے لکھتی ہیں۔ ماہ فروری کا سچی کہانیاں تھوڑا لیٹ ملا۔ نجانے ملتان میں سچی کہانیاں لیٹ کیوں آتا ہے۔ سرورق بہت پیارا تھا۔ سرورق کی دوشیزہ محبت کا پیغام مسکرا کر دے رہی تھی۔ نجانے محبتیں ناپید کیوں ہوتی جا رہی ہیں۔ نفرتوں کا انبار ہے اور بھائی، بھائی کا دشمن ہے۔ اسی کا اظہار منزہ سہام بھی اداریہ

''اسمارٹ فون'' میں کر رہی ہیں۔ احوال میں کاشی بھیاء کی سچی باتیں گرویدہ کر گئیں۔ سنبل آپی مبارک ہو۔ سدرہ انور علی آپ کا سلام پہنچ گیا اور (والسلام) یاد رکھنے کا شکریہ۔ بہن زرینہ جونیجو، تحسین جونیجو، منزل خان، فرح انیس، حنا بشریٰ، انکل ممتاز احمد، پیارے بھائی شعبان کھوسہ، نزاہت افشاں (سال گرہ کی بہت بہت مبارک باد) سونیا خان، کنزہ ملک، ڈاکٹر خادم حسین، علی حسنین تابش، راشد لطیف کے تبصرے زبردست رہے۔ اس بار نئے احوالیوں کی حکومت رہی اور پرانے بھی ساتھ ساتھ رہے۔ منشی محمد عزیز مئے، کہاں غائب ہیں۔ حاضر ہوں۔ کہانیوں میں انکل ممتاز احمد کی ''ازالہ'' پڑھی۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے وہ کبھی کو نوازتا ہے یہ تو انسان ہے جو دوسرے کو اچھا کھاتا، پہنتا دیکھ نہیں سکتا۔ زبردست کہانی پر مبارک باد۔ وہ کون تھی، اور بادبان کا پہلا حصہ زبردست تھا۔ چھوٹی سی نیکی، عموماً ذریعہ نجات بن جاتی ہے۔ ایک اور خبر، معاشرے کی تلخ تحریر تھی۔ ڈراپ سین، عورت ہی عورت کی دشمن رہی ہے۔ مرد کو صرف الزام دیا جاتا ہے۔ بہت خوب۔ ارم ناز نے وی سی آر کی داستان میں بہت کچھ کہہ دیا۔ تلاش اعلیٰ تحریر تھی۔ بھارت میں بلیک لسٹ نے خوب مزہ دیا۔ حرام خور، میرے اپنے، ذرا سی غلطی، اپنا ہو گیا سپنا، روایات کی دلدل، ناسور، فاطمہ گل، آپ اپنے دام میں، میرا سا جن سپرہٹ کہانیاں تھیں۔ زہر عشق نے اپنے زہر سے گھائل کیا ہوا ہے۔ ہم شکل اپنی سنسنی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ہائیڈ پارک اور تیرنیم کش، مسئلہ یہ ہے زبردست رہے۔ کاشی بھیا آپ کی پُرخلوص دعائیں میرا سیروں خون بڑھا دیتی ہیں۔ اللہ خوش رکھے اور خوشیاں بانٹیں۔

☆: پیاری بھابی جی! خلوص کا بدلہ صرف خلوص ہوتا ہے اور خلوص محبت کی کسوٹی ہے۔ میرا تو یہی ماننا ہے۔ تبصرے کے لیے شکریہ۔

✉: راشد لطیف' صبر والا' ملتان سے احوال میں شریک ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ماہ فروری کا سچی کہانیاں بہاول پور بک اسٹال سے لیا۔ ماشاء اللہ بہت پیارا پرچہ نکالا گیا۔ سرورق خوبصورت جاذب نظر تھا۔ منزہ سہام ''اسمارٹ فون'' میں دل گیر باتیں کر رہی تھیں۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔ احوال میں کاشی بھائی اپنی سچی باتیں کرنے کی روایات برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ سلامت رکھے آمین۔ سبھی کے احوال اچھے رہے اور جنہوں نے مجھے یاد رکھا، اُن کا شکر گزار ہوں۔ کہانیوں میں ممتاز احمد کی ازالہ بہت ہی اچھی کہانی تھی۔ گریٹ سر! بادبان نے اپنی گرفت میں جکڑ لیا اور مجید احمد جائی کی کہانی......؟ مجید احمد جائی ہر ماہ کہانی لکھا کریں۔ ہمیں آپ کی کہانیوں کا انتظار رہتا ہے۔ آستین کے سانپ ایم یعقوب پیاری کہانی لکھنے میں کامیاب رہے۔ بہت خوب پیارے۔ اس کے علاوہ فاطمہ گل، ڈراپ سین، یہ دوستی ہے، ناسور، حرام خور، روایات کے قیدی، بلند بخت، اپنا ہو گیا سپنا، تلاش، ذرا سی غلطی، وہ کون تھی، زبردست کہانیاں تھیں۔ باقی پڑھنی باقی ہیں اور زہر عشق ہر قسط میں نیا موڑ دے کر کاشی بھائی ہمیں تڑپانے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ بھارت میں بلیک لسٹ سفرنامہ خوب چل رہا ہے۔ نئے احوالیوں کو کرتے ہیں ویلکم اور پرانے کہاں کھو گئے۔ جیسے منشی محمد عزیز مئے، ندیم عباس میواتی، اور بہت سے میرے دوست حاضری یقینی بنائیں۔ ہائیڈ پارک اور تیرنیم کش میرا پسندیدہ کالم ہیں۔ ہاں کاشی بھائی، ایک اور کہانی ''لمحوں کی خطا، عمر بھر کی سزا روانہ کی ہے۔

☆: بھائی راشد! سلامت رہو! یار تمہاری پچھلی کہانی نے مایوس کیا۔ پلیز مطالعہ وسیع کر لو بھائی!

✉: ہمارے بھائی مجید احمد جائی' ملتان شریف' سے لکھتے ہیں۔ ماہ فروری 2016ء کا شمارہ پوری آب و تاب کے ساتھ ملا۔ سرورق شاندار اور جاندار تھا۔ مسکراتی دوشیزہ بھلی لگی۔ ٹائٹل دیدہ زیب تھا۔ اداریہ میں منزہ سہام نے ''اسمارٹ فون'' کمال لکھا۔ احوال میں کاشی بھیاء کی باتیں دل کو

لگیں۔اور جن دوستوں نے میری کہانیوں کو پسندیدگی کی سند سے نوازا، تمام کا ممنون و مشکور ہوں۔اُن تمام کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے میری صحت یابی کے لئے دعائیں کیں۔یقیناً یہی دعائیں تو ہیں جو مجھے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔سدرہ انور علی بہن، مسٹر پرفیکٹ خیریت سے ہے۔اِس بار احوال میں نئے لوگ زیادہ اور پرانے کم کم تھے۔نئے احوالیوں کو خوش آمدید اور پرانے کو کم بیک کرنے کی درخواست کروں گا۔کاشی بھیاء پرزور اپیل وہی کہ آپ کی نظم اِس بار بھی نہیں پڑھنے کو ملی۔کیوں۔؟ منزل خان! تیسرا 'سچی کہانیاں' آنٹی لے جاتی ہیں۔کہانیوں میں ایک خبر اور، ایڈیسن نے کمال تحریر لکھی۔وی سی آر زبردست تحریر تھی۔ازالہ، ممتاز احمد پلیٹ فارم سے جڑی تحریر سپر لائے۔بادبان ناول کا پہلا حصہ خوب رہا۔ڈراپ سین بھی کمال تھی۔ناسور، یہ دوستی ہے، روایات کی دلدل، فاطمہ گل، کوئی خوشیاں لادے، قسمت کے کھیل، میرا ساجن، حرام خور، میرے اپنے، بلند بخت، اپنا ہوگیا سپنا، ذرا سی غلطی، بہترین کہانیاں تھیں۔جرم کہانی ''وہ کون تھی'' معاشرے کی عکاس تحریر تھی۔زہر عشق کا بارہواں حصہ پُراسراریت کی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔بھارت میں بلیک لسٹ۔کا دوسرا حصہ زبردست رہا۔لائف بوائے خوب لکھی گئی۔اس کے علاوہ ہائیڈ پارک، تیر نیم کش، چھائے رہے۔محبتوں کا درس دیتے فروری کے ساتھ سچی کہانیاں بھی محبتوں سے سجا تھا۔مبارک باد اینڈ ویلڈن، ٹیک کیئر اینڈ بائے بائے۔

☆: پیارے مجید! تم سے احوال کے اسٹارٹ میں ہم نے جو پوچھا ہے۔اس کی وضاحت جلد دو۔ہمیں تمہارے خلوص پر شک نہیں لیکن جب گواہیاں دو ہو جائیں تو پھر بندہ مجرم گردانا جاتا ہے۔

✉: ہمارے لکھاری ساتھی علی حسنین تابش چشتیاں سے شاملِ احوال ہیں۔لکھتے ہیں۔ماہ فروری کا شمارہ موصول ہوا تو یوں لگا ویران گلشن میں بہار آئی ہو۔پھولوں میں خوشبو اُمنڈ آئی ہو۔ٹائٹل نے تو دل کو مسرور کر دیا۔ٹائٹل لاجواب تھا۔منزہ سہام جی کا اداریہ ''اسمارٹ فون'' خوب صورت الفاظ کا چناؤ تھا۔اچھا لکھا۔یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر انسان کی دلی کیفیت سے آشنا کروانے والا اسمارٹ فون ہو تو انسان اک دوسرے سے دور کیا ہزاروں میل دور کنارہ کشی اختیار کر جائے۔کہانیوں کی فہرست میں مجید بھائی کی کہانی نہ پا کر دل افسردہ ہوگیا۔احوال کی محفل میں سب دوست خوب صورت محبت نامے لے کر حاضر ہوئے۔ڈیئر منزل یہ تو کاشی بھائی کی محبت ہے کہ مجھے ننھا کہتے ہیں۔رب کے فضل و کرم سے میں ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ پامسٹ بھی ہوں۔جن دوستوں نے میرا تبصرہ پسند کیا۔ان کا بے حد مشکور ہوں۔اپنا لیٹر نہ پا کر دل افسردہ ہوگیا۔شاید دفتر کے کمپیوٹر کا وائرس میرا لیٹر اُڑا گیا۔کہانیوں میں سب سے پہلے کاشی بھائی کے ناول کا مطالعہ کیا۔بہت کمال لکھتے ہیں۔ایڈیسن ادریس مسیح صاحب آپ کی کاوش بہترین تھی۔بہت اچھا لگتے ہو۔منعم اصغر' ممتاز احمد' ایم یعقوب کے ساتھ ساتھ سب کی کہانیاں اچھی تھیں۔'ہائیڈ پارک' اور 'تیر نیم کش' بھی اچھے رہے ہیں۔اب اجازت دیں۔

☆: پیارے حسنین! خوش رہو۔احوال میں باقاعدگی تم سب کی محبت ہے۔

ساتھیو! ساری محنتیں یکجا کر کے پہلا پراسرار نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔کیسا لگا؟ اسے پڑھیے اور اپنے تبصروں میں لکھ بھیجیں۔آپ کی آراء ہمارے لیے بہت محترم ہے۔اگلے ماہ انشاء اللہ انہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔اگر زندگی نے وفا کی۔تب تک کے لیے اجازت۔

آپ کا اپنا

کاشی چوہان

بیوٹی گائیڈ

مہرین اسماعیل

صحت اور خوبصورت زندگی

خواتین روزمرہ زندگی میں اتنی مصروف رہتی ہیں کہ اپنے لیے وقت نکالنا ہی بھول جاتی ہیں۔ اپنے گھریلو کام کاج کی مصروفیات' ملازمت کے تقاضے' بچوں یا بچوں کی نگہداشت میں وہ اتنی مشغول ہوتی ہیں جس کی وجہ سے اپنی صحت اور جاذبیت گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ کھونے لگتی ہے۔ حالانکہ ان سب کاموں کو صحیح طریقے سے انجام دینے کیلئے ان کو اپنے آپ پر توجہ دینا چاہیے۔ صحت مند زندگی کیلئے ضروری ہے کہ اپنی فٹنس کو قائم رکھیں اور فٹنس قائم رکھنے کیلئےضروری ہے روزمرہ زندگی میں ہلکی پھلکی ورزش کریں۔

ہر خاتون چاہتی ہے کہ وہ صحت مند اور تندرست رہے ہمیشہ اسمارٹ اور دلکش نظر آئے اور جب تک ہوسکے بڑھاپے کے اثرات سے دور رہے جو خواتین ورزش نہیں کررہی ہوتیں اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ وہ ورزش کرنا ہی نہیں چاہتیں ''ان کی وجوہات'' کئی ہیں جیسے غیر متوازن غذا کا استعمال خواتین کو علم ہی نہیں ہوتا کہ کون سی ورزش ان کے لیے فائدہ مند ہے۔ ورزش کیلئے وقت کا نا ہونا۔ اسی طرح وقت گزرتا چلا جاتا ہے جس کی وجہ سے کئی بیماریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان بیماریوں سے بچنے کیلئے دو چیزیں بہت ضروری ہوتی ہیں۔

☆ مکمل غذا

☆ ورزش

یاد رکھیں کہ کم کھانا اتنا ہی نقصان دہ ہے جتنا زیادہ کھانا مشاہدے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ موٹاپے سے پریشان خواتین اکثر اتنی سخت ڈائٹنگ کرتی ہیں کہ وہ کمزور ہوکر بیمار ہوجاتی ہیں یا پھر اس کے مثبت نتائج حاصل نہ ہونے کی صورت میں پہلے سے زیادہ کھانے لگتی ہیں اور تیزی سے وزن بڑھا لیتی ہیں اس لیے انسانی صحت کی نشوونما کے لیے اچھی اور مکمل غذا ایک اہم کردار ادا کرتی ہے لہٰذا اپنی خوراک کو سادہ اور سہل بنائیں اور کھانے میں سبزیاں اور فروٹ کا استعمال زیادہ سے زیادہ رکھیں اور روزمرہ زندگی میں ورزش ضرور کریں۔

خشک جلد میں نہ صرف چکنائی بلکہ اہم جز ''کولاجن'' کی کمی بھی ہے، جلد کی اوپری سطح پر ظاہر ہونیوالے دانے اسی قلت کی علامت بھی ہیں۔ یوں تو بازار میں کولاجن پر مشتمل کریمیں عام دستیاب ہیں۔ تاہم ان کے انتخاب میں یہ احتیاط بھی ضرور ذہن میں رکھیں کہ اس نوعیت کی کریم صرف خشک یا الرجی کی شکار جلد کیلئے ہی تیار کی گئی ہوں۔ بصورت دیگر فائدے کے برعکس مختلف نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ ردعمل میں جلد پر جمنے والی خشک تہہ مسامات کو بند کرسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جلد کے ماہرین موسم سرما میں بھاپ لینے کے عمل کو سب سے بہتر ٹوٹکا گردانتے ہیں۔ بھاپ کے بعد جلد نرم پڑجاتی ہے۔ مسامات کھل جاتے ہیں جلد کی تہہ در تہہ صفائی نہایت آسانی سے ہوجاتی ہے۔ گھریلو نسخے بھی جلد کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ خشک جلد کی صفائی کیلئے ایک چمچہ شہد، آٹھ قطرے حیاتین ''ای'' ایک چمچہ خوبانی کی گری کا تیل ملا کر چہرے پر لگائیں تو قدرتی طور پر کچھ روز بعد جلد میں تبدیلی آتی ہے۔ یعنی جلد کے پرانے خلیات مردہ ہوجاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلیات لے لیتے ہیں۔ اس لیے خشک جلد کیلئے مندرجہ بالا نسخہ ہر دو سے تین ہفتے میں ایک بار ضرور آزمائیں اور ایک معیاری فیئرنس کریم روزانہ استعمال میں لائیں۔

لائف بوائے شیمپو... پرفیکٹ دلہن بنائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

بچپن ہی سے میرا دل چاہتا تھا کہ میں ہواؤں میں اڑوں، پنچھی مجھے بہت متاثر کرتے تھے۔ کیسی آزاد زندگی ہوتی ہے ان کی...... نہ کوئی روک نہ کوئی ٹوک، بس جدھر دل کیا، رین بسیرا کرلیا۔ اِدھر تو یہ حال ہے کہ زندگی ایک دائرے کے درمیان ہی گھومتی رہتی ہے مگر کیا کریں دل کا۔ دل یہ کرتا تھا کہ کوئی ایسا کام کیا جائے کہ جس سے دل مطمئن ہو جائے۔

دو بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی بہن تھی۔ اس لیے ان کا بس نہیں چلتا ان کا کہ اُسے دنیا سے ہی کہیں چھپا کر رکھ لیں۔ اماں بی سو سو بار قربان جاتیں۔ مانا کہ محبت قسمت والوں کو ملتی ہے مگر...... یہ محبتیں کبھی کبھی بغاوت کرنے پر بھی اکساتی ہیں۔

☆......☆......☆

''فریحہ! فریحہ! کہاں ہو تم؟''

اماں بی آوازیں دیتی لان میں چلی آئیں اور اسے مہندی کی باڑ کے پاس کتاب میں مگن دیکھ کر ہول گئیں۔ ''کیا ہوا ہے تمہیں بیٹا؟ کتنی بار سمجھایا ہے کہ جب دونوں وقت گلے مل رہے ہوں تو کھلے آسمان کے نیچے نہیں بیٹھتے؟'' پھر اسے منہ بسورتے دیکھ کر چمکارنے لگیں۔ ''اٹھو میری جان! دیکھو منع کرنے کے باوجود سرِ شام نہائی ہو۔ دو تین چھینکیں بھی آئی تھیں۔ اگر دشمنوں کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو؟'' وہ خود ہی اس کی کتابیں سمیٹنے لگیں۔

فریحہ ٹھنک کر بولی۔ ''کچھ نہیں ہوتا مجھے اماں بی! دونوں وقت تو ہر وقت گلے ملتے رہتے ہیں۔ رات صبح سے 'صبح دوپہر سے' دوپہر شام سے 'ایک گھڑی دوسری گھڑی سے پھر بھلا ہم کب تک اندر چھپے بیٹھے رہیں؟''

''لیکن تم تو خاص طور پر اسی وقت باہر نکل آتی ہو۔'' اماں بی نے شکایتاً کہا۔

''یہ وقت تو ہمیں اس لیے بھلا لگتا ہے کہ پرندوں کی ڈاریں چہچہاتی' خوب صورت لہریے بناتی گزرتی ہیں اور بعض دفعہ تو اتنی نیچے آجاتی

ہیں کہ ہم ان کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ صاف سن سکتے ہیں۔ اماں بی! کیا آپ کو یہ سب اچھا نہیں لگتا؟''

''کیوں نہیں لگتا لیکن کچھ کام ایسے ہیں جن سے ہمارے بزرگ روکتے چلے آئے ہیں اس لیے......''

بات ادھوری تھی کہ فریحہ تالی بجا کر بولی۔ ''وہ دیکھیے' ادھر سفیدے کے پیچھے سے ایک اور غول آ رہا ہے۔ ہائے' کاش میں بھی ایک پرندہ ہوتی' سچ' کتنا مزہ آتا۔ ہر دم کھلی فضاؤں میں اڑتی پھرتی۔''

ماں نے پھر اس کی محویت میں خلل نہ ڈالا' خنکی ہونے کے باوجود خود بھی وہیں بیٹھ گئیں۔

جاگیر اور دولت نے ساتھ چھوڑ دیا تھا پھر بھی آن بان اور روایات کی پاس داری اس خاندان کے خمیر میں شامل تھی۔ بیٹے سمجھدار تھے' بچے کھچے سرمائے کو تجارت میں لگا دیا تھا۔ کچھ آبائی مکانوں کا کرایہ ملتا اور یوں خاندانی ٹھاٹ باٹ نہ سہی لیکن خوش حال زندگی گزر رہی تھی۔ ماں بیٹوں کی نگاہوں کا مرکز فریحہ تھی۔ چھوئی موئی کے پودے کی طرح اسے سرد و گرم سے بچایا جاتا اور ہر ممکنہ آرام پہنچانے کی کوشش کی جاتی لیکن فریحہ کے نازک جسم میں ایک سیمابی روح تھی جو کبھی آسمان کی وسعتوں میں کھو جانا چاہتی، تو کبھی سمندر کی گہرائیوں کی متلاشی رہتی۔ اس کی ضد سے مجبور ہو کر بھائیوں نے گرلز کالج میں داخلے کی اجازت دے دی تھی خاص طور پر اس کی سہولت کے لیے ایک چھوٹی گاڑی خریدی گئی تھی۔ با اعتبار اور تنومند ڈرائیور ڈھونڈا گیا تھا جو بہ وقتِ ضرورت باڈی گارڈ کے فرائض بھی انجام دے سکتا تھا۔ اس کے باوجود فریحہ کی واپسی تک ماں کا دل ہولتا رہتا۔ وہ بار بار بیٹی کے خیالی پیکر کے گرد آیت الکرسی کا حصار باندھا کرتیں۔ وہ تھی بھی ایسی حسین اور جاذبِ نظر شخصیت کی مالک کہ جو بھی دیکھتا' اس کا گرویدہ ہو کر رہ جاتا۔ جوان ہوتے ہی رشتوں کی بھرمار ہو گئی تھی جن میں سے بڑی سوچ بچار اور استخارے کے بعد نواز کے رشتے کو قبولیت کی سند بخشی گئی جو نہ صرف فریحہ کا تایازاد اور بچپن کا ساتھی تھا بلکہ حسن و وجاہت میں خود بھی یکتا تھا۔ فریحہ کے دل میں اس کے نام ہی سے سریلی گھنٹیاں بجنے لگتیں۔ تنہائی میں وہ پہروں اسی کے خیالوں میں مگن رہتی۔ کبھی مسکراتی' کبھی خود ہی شرم سے دہری ہو جاتی۔ دونوں گھرانوں میں منگنی کے بعد ہی سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں لیکن شادی اس وقت تک ملتوی کر دی گئی تھی جب تک نواز C.A کا اور فریحہ B.A کا امتحان پاس نہ کر لے۔

☆......☆......☆

یہ ان دنوں کی بات ہے جب فائنل کے امتحانات کے بعد رزلٹ کا انتظار اور طویل چھٹیاں فریحہ کو بے زار کیے ہوئے تھیں کہ فریحہ کے اسکول کے زمانے کی سہیلی راشدہ کی شادی طے پا گئی۔ اپنے مزاج کی سادگی اور خوش خلقی کی بنا پر فریحہ ہر طبقے کی لڑکیوں میں مقبول تھی۔ راشدہ کا شمار بھی انہی میں سے تھا جو بظاہر معاشرتی اعتبار سے یکسر مختلف تھی۔ اس کا تعلق ایک زمیں دار خاندان سے تھا۔ راشدہ کا باپ اپنے گاؤں کا چوہدری اور انتہائی قدامت پسند تھا۔ راشدہ اس کی چہیتی بیٹی تھی جس کی ضد کی وجہ سے اس نے اسے اسکول تو بھیج دیا تھا لیکن چھٹی جماعت کے بعد آگے پڑھنے کی اجازت نہ دی تھی۔ یہ طبیعتوں

کا خلوص ہی تھا جس کی وجہ سے اب تک دونوں لڑکیوں کی دوستی نبھ رہی تھی۔ راشدہ اپنے ماں باپ کے ساتھ کئی بار فریحہ سے ملنے اس کے گھر آ چکی تھی لیکن خود فریحہ کبھی گاؤں کی جھلک نہ دیکھ سکی۔ اب جو شادی کا بلاوا آیا تو مچل گئی۔ اس کا زور ماں پر خوب چلتا تھا۔ پیار سے' ضد سے' روٹھ کر اور آنسو بہا کر وہ کسی نہ کسی طرح اپنی بات منوا لیتی تھی لہٰذا اس دفعہ بھی اس نے یکے بعد دیگرے ہر حربہ استعمال کر لیا۔

''اماں بی! وہ ہماری بڑی پیاری سہیلی ہے۔ ہم شادی میں شریک نہ ہوئے تو برا مانے گی۔''

''اور تمہارے جانے سے دونوں بھائی جو خفا ہوں گے؟'' ماں نے تاویل پیش کی۔

''انہیں آپ منا لیجیے گا۔'' اس کے پاس حل موجود تھا۔

''نا بھئی' میں بھلا اتنی دور تمہیں کیسے بھیج دوں؟''

''پھر آپ بھی چلیے نا ہمارے ساتھ۔'' وہ ٹھنکی۔

''میرے پیروں کا درد پیچھا چھوڑے تب نا۔''

''ہم آپ کے پاؤں دبا دیں گے۔'' اس نے خلوص سے اپنی خدمات پیش کیں۔

''دبانے سے کہیں جاتے ہیں یہ بڑھاپے کے درد۔ بس کہہ دیا میں نے کہ تمہارا جانا ممکن نہیں ہے۔''

''ہائے اللہ! یہ بھی تو سوچیں کہ ہم نے کبھی گاؤں نہیں دیکھا' اس بہانے وہاں کی سیر بھی کر لیں گے۔''

''سارے شوق پورے کر لینا تایا جان کے گھر جا کر۔'' ماں نے پیار سے سمجھایا۔

''ہاں ضرور۔'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''اچھی طرح اندازہ ہے ہمیں ان کی طبیعت کا' آپ سے بھی زیادہ ظالم ہیں وہ۔''

''میں ظالم ہوں؟'' اماں بی نے حیرت سے پوچھا۔

''اور نہیں تو کیا۔'' وہ باقاعدہ سسکنے لگی۔ ''ہم تو ایک پنجرے سے دوسرے پنجرے میں قید کیے جائیں گے پھر قبر میں اتر جائیں گے سارے ارمانوں سمیت۔''

ماں کا دل بھر آیا۔ بیٹی سے جدائی کی گھڑی قریب تھی گو اپنے رشتے داروں ہی میں جا رہی تھی پھر بھی سسرال تو سسرال ہی ہوتی ہے نا' وہاں جا کر تو اس طرح ضد بھی نہ کر سکے گی میری بچی! وہ پسیج گئیں۔ ''کون سی تاریخ ہے راشدہ کی شادی کی؟''

''بیس مارچ۔'' اس نے جھٹ آنسو پونچھ ڈالے۔ ''لیکن مجھے تو ایک ہفتہ پہلے بلایا ہے اس نے۔''

''ہرگز نہیں' اتنے دن تم گھر سے باہر کیسے رہ سکتی ہو؟ بھائیوں کا یہ حال ہے کہ آتے ہی تمہیں پکارتے ہیں۔ دو گھڑی نہ دیکھیں تو بے چین ہو جاتے ہیں۔ میں کسی طرح انہیں نہیں سمجھا سکتی۔ جانا ہے تو صرف شادی والے دن چلی جاؤ۔ ویسے بھی اگلے ہفتے زوہیب اور شعیب شکار پر جا رہے ہیں۔ تم صبح سے شام تک سہیلی کے پاس رہ سکتی ہو لیکن شرط یہی ہے کہ اگر رخصتی میں دیر ہو تو سب سے معذرت کر کے ہر حال میں اندھیرا پھیلنے سے پہلے واپس آ جانا۔''

''چلیے یوں ہی سہی۔'' اس نے بخوشی قبول کر لیا کیوں کہ اتنا بھی توقع سے بڑھ کر تھا۔

''اور موسیٰ بھی تمہارے ساتھ جائے گی۔''

’’ٹھیک ہے۔‘‘ فریحہ نے زور زور سے گردن ہلادی۔

اسی رات اس نے اپنا سوٹ کیس تیار کرلیا۔ ایک ہی دن کی تو بات تھی‘ اسی حساب سے کپڑے اور زیور رکھے گو میک اپ کی عادی نہ تھی لیکن ایسے موقعوں پر امنگ پیدا ہو ہی جاتی ہے لہٰذا سنگھار کا سامان بھی پرس میں بند کرلیا گیا۔

اگلے دن اماں بی نے راشدہ کے بُندے‘ انگوٹھی اور بھاری سا جوڑا بھی منگوادیا۔

وہ تو گاؤں جانے کے خیال سے بے حد خوش تھی لیکن نہ جانے کیوں اماں بی کا دل دہلا جارہا تھا؟ کئی بار سوچا‘ اب بھی جانے سے روک لیں لیکن جب اس کا معصوم چہرہ خوشی سے دمکتا پاتیں تو خاموش رہ جاتیں پھر بھی صبر نہ ہوا تو اپنے قریب بٹھا کر اس کی صورت تکنے لگیں۔ ماں کو افسردہ دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی۔

’’کیا ہوا اماں بی؟‘‘

’’کچھ بھی نہیں‘ بس خواہ مخواہ جی گھبرا رہا ہے میرا۔‘‘

’’طبیعت خراب ہے آپ کی؟‘‘ وہ بے چین ہوگئی۔

’’نہیں‘ ایسی کوئی بات نہیں ہے‘ بس تم سے یہ کہنا ہے کہ پہلی بار اکیلی کسی کے گھر جارہی ہو‘ نیا ماحول ہے اور اجنبی لوگ ہوں گے۔ تمہاری کسی حرکت یا بات سے خاندان کے وقار پر حرف نہ آئے۔ لڑکیوں کے بیچ میں جاکر خود بھی انہی کے رنگ میں نہ رنگ جانا۔ اچھی طرح یاد رکھنا کہ تمہارا تعلق کس باعظمت خاندان سے ہے جہاں لوگ اپنی جان سے بڑھ کر عزت کو اہم سمجھتے ہیں۔‘‘

’’آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں......‘‘ اس نے احتجاجاً کچھ کہنا چاہا۔

ماں نے ٹوک دیا۔ ’’جانتی ہوں کہ تم سمجھ دار ہو‘ اپنے خون پر بھی بھروسا ہے مجھے پھر بھی سن لینے میں کیا حرج ہے؟ تم بہت چھوٹی تھیں جب میں بیوہ ہوئی تھی۔ میرا آسمان میرے سر سے چھن گیا تھا لیکن میں نے خود کو اس چھت کے نیچے مقید کرلیا جسے تمہارے والدِ محترم نے تعمیر کرایا تھا۔ اس معزز خاندان کی عورتوں اور لڑکیوں پر سوائے اُن کے باپ‘ بھائی اور شوہر کے‘ کسی غیر مرد کی نظر نہیں پڑی۔ یہ تو نئے دور کے تقاضے ہیں کہ تمہیں اتنی آزادی مل گئی ہے پھر بھی اپنی روایات سے بغاوت نہ کرنا ورنہ یہ سمجھ لو کہ ماں کا خون تمہاری گردن پر ہوگا۔‘‘

’’اماں بی......! آپ تو اس طرح کہہ رہی ہیں جیسے ہم ہمیشہ کے لیے کہیں جارہے ہیں۔‘‘

’’ماں ہوں نا‘ اتنی ذرا سی جدائی بھی گوارہ نہیں ہے مجھے۔ اگر تمہاری ضد نہ ہوتی تو......‘‘ ان کی آواز بھرا گئی۔

’’اچھا اماں بی! خدا حافظ!‘‘ اس نے محبت سے ان کا ہاتھ تھام کر اجازت لی۔ تھوڑا سا تو وقت تھا‘ وہ بھی ان کے پندونصائح میں گزرا جارہا تھا لیکن ابھی ایک اور مرحلہ باقی تھا۔ ڈرائیور مراد کی طلبی ہوئی۔ اماں جانی نے اسے مستعد رہنے کی تلقین کی۔ گاڑی آہستہ چلانے اور صاحب زادی کی حفاظت کے لیے کہا۔ موہنی بی سے، بٹیا سے جُڑے رہنے کی تاکید ہوئی اور یوں تین نفری قافلہ روانہ ہوا۔

☆......☆......☆

راستے کے مناظر فریحہ کا دل لبھاتے رہے۔ وہ بڑے اشتیاق سے کھیتوں‘ کسانوں اور مویشیوں کو دیکھتی رہی‘ کھلی فضا میں اتنا لمبا سفر کرنے کا اس کا پہلا اتفاق تھا۔ راشدہ کے گاؤں تک پہنچنے کے دو گھنٹے چٹکی بجاتے گزر گئے پھر جس جوش و خروش سے وہاں اس کی پذیرائی ہوئی‘ رنگ برنگی جھنڈیوں کی سجاوٹ‘ چہکتی دمکتی دیہاتی لڑکیاں‘ شوروغل‘ چہل پہل‘ سب کچھ اس کے لیے نئے تھے۔

وہ آنکھیں پھاڑ کر ہر چیز کی تفصیل اپنے ذہن میں اماں بی کو بتانے کے لیے محفوظ کرلینا چاہتی تھی۔ ادھر وہ حیرت و شوق سے ہر طرف دیکھ رہی تھی‘ ادھر اس کا اپنا وجود سب کے لیے عجوبہ بنا ہوا تھا۔

لڑکیاں اور عورتیں گھور گھور کر اس کا چہرہ اور لباس دیکھتیں اور اس کے متوجہ ہوجانے پر بھونڈے پن سے انجان بننے کی کوشش کرتیں۔ تقریباً ہر نظر اسی پر لگی ہوئی تھی کیونکہ اپنے بے پناہ حسن اور سنگھار کے ساتھ وہ سب سے منفرد دکھائی دے رہی تھی۔

وہ راشدہ کے پاس پہنچی تو حیران رہ گئی۔ دلہن بن کر اُس پر خوب روپ آیا تھا مگر اُس کی سادہ سی چوٹی میں گندھے بال بہت زیادہ عجیب و غریب لگ رہے تھے۔

’’راشدہ! یہ...... یہ تمہارے بالوں کا حشر۔‘‘ وہ راشدہ کے گلے لگتے بولی تھی۔

’’کیوں! کیا ہوا ہے میرے بالوں کو؟‘‘ فریحہ نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ اُسے مزید تاؤ اُس وقت آیا جب وہ اپنی چوٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

’’اتنے اچھے تو ہیں۔‘‘ اُس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

’’پگلی! آج تم دلہن بنی ہو۔ دلہن کا روپ تو الگ ہی ہوتا ہے اور اس روپ کے لیے اُس کے بال بہت اہم ہوتے ہیں۔ ہار سنگھار بھلا بغیر بالوں کی آرائش کے پورا ہوتا ہے؟‘‘ فریحہ جیسے رو دی تھی۔

’’ارے یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔‘‘ راشدہ اب تک اُس کی بات پر سنجیدہ نہ ہوئی تھی۔

’’ایسا نہیں ہوتا پگلی! بس بات یہ ہے کہ تم لوگ سہولتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔‘‘ راشدہ سے بحث بے کار تھی سو فریحہ نے فوراً اُسے پرفیکٹ دلہن بنانے کا فیصلہ کیا۔

’’کتنی دیر ہے بارات آنے میں۔‘‘ فریحہ نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’بس آدھے پون گھنٹے تک۔‘‘ راشدہ نے ترنت کہا۔

’’اوکے! آئی وانٹ اونلی 15 منٹس۔‘‘ فریحہ نے جیسے خود سے کہا۔ اور وہ جھٹ کمرے سے باہر نکل گئی۔ دو منٹ بعد وہ واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں نیو لائف بوائے شیمپو کی چھوٹی بوتل تھی جو اُسے گاؤں کی ایک چھوٹی سی دکان سے باآسانی مل گئی تھی۔

’’چلو جلدی سے یہ زیور اتارو۔ میں تمہیں پندرہ منٹ میں پھر سے تیار کروں گی۔‘‘ یہ کہہ کر اُس نے راشدہ کی حواس باختگی کو نظرانداز کیا اور کام میں جُت گئی۔

اِس وقت راشدہ کی پھوپی زاد انجم اُس کی معاون کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ فریحہ نے فوراً راشدہ کے بال نیو لائف بوائے شیمپو سے واش کیے اور پھر انہیں تیزی سے خشک کرنے لگی۔ اُس کے بال منٹوں میں سلکی اور شائنی ہوگئے تھے۔ فریحہ کو اب اُس کی سادگی پر رہ رہ کر پیار آرہا تھا۔

مگر غصہ اس بات پر تھا کہ آخر بالوں کی

حفاظت نہ کرنے کی وجہ کیا ہے؟ شعور کیوں نہیں اِن لوگوں میں۔ لڑکیاں منوں ٹنوں تیل لگا کر سمجھتی ہیں کہ بالوں کی غذا پوری ہوگئی۔

نہیں ایسا بالکل نہیں ہوتا بلکہ بالوں کی اصل غذا تیل کے علاوہ شیمپو کی بھی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ لائف بوائے شیمپو میں شامل دودھ اور بادام کے ساتھ ساتھ بالوں کے لیے مفید وٹامنز بھی بالوں کی نشوونما کے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں۔

''باجی! تم نے تو کمال کردیا۔ آپا کے بال تو ایسے ہوگئے جیسے فلم والی لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔'' انجم اُس کے بالوں سے اٹھتی لائف بوائے شیمپو کی سحرانگیز مہک کو سونگھتے ہوئے بولی تھی۔

''یہ کمال تو تم سب بھی کرسکتے ہو۔ یہ جادو میں گھر سے نہیں لائی ہوں پگلی! تمہارے گاؤں کی ہر چھوٹی بڑی دکان پر موجود ہے۔ یہ دیکھو جادو کی بوتل......!'' فریحہ نے نیو لائف بوائے شیمپو کی بوتل اٹھا کر اُس کے ہاتھ میں رکھ دی۔

اب وہ جلدی جلدی راشدہ کا میک اپ کرنے لگی تھی اور میک اپ کرنے کے بعد اُس نے فوراً راشدہ کے بالوں کو ایک خوبصورت انداز دیا اور پھر پنوں سے دوپٹہ سیٹ کردیا۔

اب راشدہ کے بالوں کی چمک اور مہک بہت نمایاں تھی۔ دور سے محسوس کی جاسکتی تھی۔ اور یہ سب بلاشبہ لائف بوائے شیمپو ہی کا جادو تھا۔ انجم نے راشدہ کی بلائیں لیں اور لائف بوائے شیمپو کی بوتل اٹھا کر بولی۔

''باجی آج سے میں بھی یہی لائف بوائے شیمپو استعمال کروں گی۔''

''صرف تم ہی کیوں ...... یہ تو ہر لڑکی کو استعمال کرنا چاہیے بلکہ میں تو کہوں گی ہر شخص خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی...... لائف بوائے شیمپو سب کے بال اچھے بنائے۔''

''واہ باجی!'' انجم کھلکھلائی۔

''ارے میں تو کہتی ہوں۔ لائف بوائے شیمپو، پرفیکٹ دلہن بنائے۔'' اب کی بار گھونگھٹ سے آواز آئی تھی۔ راشدہ کی آواز پر وہ دونوں قہقہے لگاتی کمرے سے باہر آگئیں۔

نگاہوں کی آنکھ مچولی کے ساتھ ساتھ شادی کی رسمیں بھی انجام پاتی رہیں۔ فریحہ کی وجہ سے خاص اہتمام کیا گیا تھا کہ کسی مرد کو زنانہ حصے میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ خود اس نے بھی اپنے آپ کو دلہن تک ہی محدود رکھا تھا کہ برات کے ساتھ آنے والے بینڈ باجے کی آوازوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔

لڑکیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ سب دلہا کو دیکھنے کے لیے دوڑیں۔ دل تو اس کا بھی چاہا کہ برات کا نظارہ کرے لیکن اماں بی کی آواز جیسے پاؤں میں زنجیر ڈالے ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

گاؤں سے واپسی کے بعد اُس کے دل میں عجیب ایک بے قراری سی بھرگئی تھی۔

''بھلا یہ کیسی آگہی تھی...... ایک طرف تو میڈیا چیخ چیخ کر اپنی ہر شے کو سیل آؤٹ کررہا ہے۔ ہر شہر، ہر گاؤں، ہر قصبے میں موجود دکانوں پر اشیائے ضرورت تو موجود ہیں مگر خدا بھلا کرے اِن سادہ لوح لوگوں کا......

آگہی اور مناسب ہاتھوں میں چیزیں نہ پہنچ پائیں تو ایسی اشیاء کس کام کی......

راشدہ کی شادی میں بھلے سے وہ اپنے طور پر لائف بوائے شیمپو کی صورت میں ادراک کا ایک در وا کرکے آگئی تھی۔ اب اُسے پھر سے گاؤں کی یاد ستا رہی تھی کہ جا کر دیکھے تو سہی کہ اُس کی یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی۔

اماں بی سے بہت زیادہ ریکویسٹ کرکے وہ بڑے بھائی کی مصروفیات میں سے وقت نکال کر آخر گاؤں پہنچ ہی گئی۔

☆......☆......☆

راشدہ کے گھر آئے اُسے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ انجم اپنی دو لانبی اور چمکدار چوٹیاں لہراتی اُس کے سامنے تھی۔

''ارے باجی آپ!'' وہ فریحہ کو دیکھ کر بے ساختہ اُس سے لپٹ گئی۔

''کیسی ہو چھوٹی!'' وہ محبت سے بولی۔

''باجی میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ آج رکیں گی ناں۔'' اُس کی اس بات پر بڑے بھیا نے فوراً آنکھیں دکھاتے کے ساتھ ہی گھڑی بھی دکھائی۔ مطلب واضح تھا۔

''جلدی کرو۔''

''ارے نہیں نہیں! بس ہم تو یہاں سے گزر رہے تھے تو سوچا کہ تم سب کو دیکھتے ہوئے چلتے ہیں۔''

''باجی یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔ باجی میں ابھی آتی ہوں۔''

''ارے بابا! بس ہم نکلیں گے۔''

''کہاں نکلیں گے......ارے دھی رانی! شام کا کھانا کھائے بغیر تو میں تجھے جانے نہیں دوں گی۔ تُو بھی تو میری راشدہ ہی ہے۔'' راشدہ کی امی نے اُس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

''آنٹی بھائی جان کی میٹنگ ہے۔ ہم بس چلیں گے۔ پھر انشاء اللہ جلد آئیں گے۔''

''آپ کہیں نہیں جائیں گی۔ میں ابھی آئی۔''

''ارے لڑکی سُن تو۔ یہ تو بتا آج اتنی پیاری کیسے لگ رہی ہے۔''

''آپ نے ہی تو اُس دن سکھایا تھا پیارا لگنے کا طریقہ۔'' وہ مسکرائی اور دروازہ پار کرگئی۔

کچھ ہی دیر میں وہ واپس آئی تو اُس کے ساتھ درجن بھر لڑکیاں تھیں۔ جن کے بال لہرا رہے تھے۔ شائن کرتے ہوئے، ریشم کی طرح نرم ملائم......

''یہ کیا ہے؟'' وہ گنگ رہ گئی۔

''باجی! یہ ہے بالوں کی Care۔ آپ نے کہا تھا کہ جادو اِس بوتل میں ہے۔'' انجم نے نیو لائف بوائے شیمپو کی بوتل اُس کے سامنے کی اور پھر دوسری لڑکیوں نے بھی اُس کی تقلید میں لائف بوائے شیمپو کی بوتلیں اور ساشے آگے کرکے لہرائے۔

یہ تبدیلی دیکھ کر اُس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اُس کی ذرا سی کوشش نے بالوں کی خوبصورتی میں پہلا قدم لائف بوائے شیمپو کی صورت میں اٹھایا تو کتنا سدھار آیا۔ کاش کہ ہر کوئی اِس تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے اپنا فرض نبھائے تو ہر شخص سکھ کی بانسری بجائے۔

وہ سنہری یادیں لیے بڑے بھائی کے ساتھ واپسی کے سفر پر رواں دواں تھا۔

''ارے میری گڑیا! تُو نے کر دکھایا۔ لائف بوائے شیمپو پرفیکٹ کام دکھائے۔'' بھیا نے کہا تو اُس نے ان کے کاندھے سے سر لگادیا۔

آج لائف بوائے شیمپو کے نتیجے نے لائف بوائے شیمپو کے ہر دعوے کو سچ ثابت کرکے اس کا سر فخر سے بلند کردیا تھا۔ اُس کے دل سے آواز آئی تھی۔

''تھینک یو لائف بوائے شیمپو...... تم نے وعدے سچ کر دکھائے۔''

☆☆......☆☆





سترہواں مسافر

محمد سلیم اختر

ایک ایسے ڈرائیور کی خوف بیتی' جسے تیز رفتاری پر خوب مہارت تھی مگر......

رشید خان عرف شیدا ایک ماہر ڈرائیور تھا۔ وہ ایک پرائیویٹ کمپنی کی بس چلاتا تھا۔ اس کا روٹ راولپنڈی سے ایبٹ آباد اور وہاں سے راولپنڈی آنے کا تھا۔ وہ وقت کا پابند تھا۔ کبھی اس نے بس کو لیٹ نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ مقررہ وقت پر بس اڈے سے نکلتا۔ اور مقرر کردہ وقت میں ایبٹ آباد پہنچ جاتا۔ بعض اوقات راستے میں ٹریفک بلاک ہونے کی صورت میں وہ بس کو تیزی سے چلاتا تھا۔ تاکہ وہ مقررہ وقت میں ایبٹ آباد پہنچ جائے۔ وہ اپنی اس کوشش میں اکثر کامیاب رہتا تھا۔ حالانکہ یہ کوشش نہایت ہی خطرناک ہوتی تھی۔ بعض اوقات سواریاں بھی اعتراض کرتی تھیں کہ وہ اوور اسپیڈ نہ کرے مگر وہ کسی کی بھی نہ سنتا، اور بس کو تیزی سے بھگاتا رہتا۔ بس کے مالکان اس سے خوش رہتے تھے۔ اس لئے وہ کسی اور کی پروا نہ کرتا تھا۔

☆......☆......☆

وہ بارہ سال قبل راولپنڈی سے ایبٹ آباد جا رہا تھا۔ راستے میں ٹریفک جام کی وجہ سے بس کافی لیٹ ہوگئی۔ اور جب اسے راستہ ملا تو اس نے لیٹ نکالنے کے لیے بس کی رفتار بڑھا دی۔ وہ بس سڑک کا سینہ چیرتے ہوئے تیز رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی، کہ بس ایک خاتون کی کار سے ٹکرا گئی۔ اور کار الٹ کر ایک گڑھے میں جا گری۔ اس خاتون کا سفید لباس اس کے اپنے خون سے تر ہو گیا، اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہوگئی۔ اس نے بس کو روکا تو سہی مگر صرف چند لمحوں کے لیے اور وہ بھی مسافروں کے اصرار پر۔ پھر وہ بس کو وہاں سے تیزی سے بھگا کرلے گیا۔

ایبٹ آباد پہنچ کر اس نے بس کو اڈہ پر پہنچ کر بس کھڑی کی اور لاری اڈہ کے انچارج کو بس کی چابی دے کر وہاں سے فرار ہوگیا۔ شیدے کے کچھ دوست کراچی میں تھے۔ وہ ان کے پاس جا پہنچا اور وہاں کچھ عرصہ روپوش رہا۔ جب حالات بہتر ہوئے تو اس نے کراچی میں بس چلانی شروع کر دی۔

بارہ سال کراچی میں گزارنے کے بعد اس نے واپس راولپنڈی آنے کا ارادہ کیا۔ یہاں آ کر اس نے اپنی ٹویوٹا ویگن خرید لی۔ اور پھر سے اسی روٹ یعنی راولپنڈی سے ایبٹ آباد پر چلانی شروع کر دی۔ اب چونکہ ویگن اس کی اپنی تھی۔ اس لیے ایک تو وہ نہایت احتیاط سے ڈرائیونگ کرتا تھا اور



دوسرا وہ ایک پھیرا فالتو بھی لگا لیتا تھا۔ جسے وہ آخری پھیرا کہتا تھا۔ اس آخری پھیرے میں عموماً رات کے بارہ بج جاتے تھے اور اس پھیرے میں کنڈیکٹر اس کے ساتھ نہ ہوتا تھا۔

☆......☆......☆

اُس رات جب وہ ویگن اسٹینڈ پر پہنچا تو وہ بہت خوش تھا کہ آج اس کا یہ آخری پھیرا ہے۔ جو ایبٹ آباد سے راولپنڈی کا تھا۔ یہ پھیرا لگا کر اس نے گھر جا کر آرام کرنا تھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ جب اس نے ویگن اسٹینڈ پر جا کر ویگن روکی تو مسافر اس سے باہر نکلے۔ چند مسافر اس ویگن کے انتظار میں ویگن اسٹینڈ کے ایک کونے میں کھڑے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی شیدے کی ویگن مسافروں سے خالی ہوئی۔ تقریباً اسی وقت وہ نئے مسافروں سے بھر گئی۔ شیدے نے نظر گھما کر پیچھے نگاہ ڈالی۔ پیچھے کی تمام سیٹیں مسافروں سے پُر ہوگئی تھیں۔ صرف اس کی اپنی سیٹ کے ساتھ فرنٹ سیٹ خالی تھی۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فرنٹ سیٹ پر دو مسافر آ جائیں تو وہ ویگن لے کر چلے پڑے۔ اسی وجہ سے وہ نیچے نہیں اُتر رہا تھا۔ اتنے میں ایک طرف سے ایک شخص آیا اور آ کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے اشارہ سے دونوں سیٹیں رکھنے کو کہا۔ تو شیدا خوش ہوگیا۔ یوں بھی ملتے ہیں مسافر فٹافٹ!! اس نے جی ہی جی میں خوش ہوتے ہوئے اپنے آپ سے کہا اور مسافروں سے کرایہ وصول کرنے لگا۔ فرنٹ سیٹ

والے نے دو سواریوں کا کرایہ دیا تھا۔ سب سواریاں راولپنڈی کی تھیں۔ ویگن کی تمام نشستیں پُر ہوگئی تھیں۔ باہر اور کوئی بھی مسافر موجود نہ تھا۔ اسے ڈرائیونگ کرتے ہوئے بیس سال ہوگئے تھے۔ مگر ایسی صورت کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ ویگن کی ساری نشستیں بھی پُر ہوجائیں اور باہر اسٹینڈ پر کوئی اور مسافر بھی موجود نہ ہو۔ چنانچہ اسے اسٹینڈ پر آئے پانچ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ وہ آخری پھیرے کے لیے ویگن مسافروں سے بھر کر وہاں سے نکل آیا۔ ٹریفک کے ہجوم سے نکل کر اس نے ویگن کی رفتار بڑھائی اور بڑے اطمینان سے منزل مقصود کی طرف جانے والی سڑک پر گاڑی دوڑانے لگا۔

سردیوں کا آغاز ہوچکا تھا۔ وہ رات غضب کی تاریک تھی اور ہوا بھی نہیں چل رہی تھی۔ سامنے سڑک پر ویگن کی ہیڈ لائٹس سے نکلنے والی تیز روشنی تھی اور ویگن کے پیچھے تاریکی میں بیٹھے ہوئے سولہ مسافر سایوں کی طرح خاموش اور بے حس وحرکت بیٹھے تھے۔ گاہے گاہے ویگن کی حرکت کے ساتھ اُن کے سر ضرور ہل جاتے تھے۔ جس سے یہ معلوم ہوجاتا تھا کہ وہ مٹی کے بے جان بُت نہیں ہیں بلکہ جیتے جاگتے انسان ہیں۔ شیدے کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا مسافر خاموشی سے باہر ایک سمت مسلسل گھور رہا تھا۔ مسافروں کی یہ خاموشی شیدے کو بُری طرح کھل رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ ان مسافروں کو اس حالت میں دیکھ کر ہر شخص یہی سمجھے گا کہ میں انھیں کسی جنازے میں شامل ہونے کے لیے لے جارہا ہوں۔

☆......☆......☆

آبادی کا آخری گھر بھی گزر گیا تھا اور اب ویگن سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے بلند وبالا درختوں کے درمیان دوڑ رہی تھی۔ مگر ابھی تک کسی مسافر کی زبان سے ایک لفظ تک نہ نکلا تھا۔

''کیا نرالے مسافر ہیں یہ بھی!'' شیدے نے دل میں کہا۔

''لگتا ہے ان سب نے یا تو گونگے کا گڑ کھا رکھا ہے یا پھر یہ نہ بولنے کی قسم کھائے ہوئے ہیں۔'' اچانک اس گھمبیر خاموشی میں پچھلے حصے کی تاریکی سے ایک آواز اُبھری۔

''استاد! ہمیں یہاں اتار دو۔''

شیدے نے کمال اطاعت اور فرمانبرداری سے ویگن کی رفتار کم کر کے بریکیں لگائیں۔ ویگن سے دو آدمی باہر نکلے اور اندھیرے میں غائب ہوگئے۔

''عجیب بات ہے۔'' شیدے نے دوبارہ ویگن اسٹارٹ کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

''یہاں تو کوئی چوراہا ہے نا اسٹاپ، اور نہ ہی قریب کوئی آبادی ہے۔ پتا نہیں اُن دونوں کو کہاں جانا تھا۔ جو یہاں اتر گئے۔''

ویگن دوبارہ سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے بلند وبالا درختوں کے درمیان دوڑنے لگی۔ سوائے ویگن سے اترنے والے مسافروں کے اور کسی مسافر کی زبان سے ابھی تک ایک لفظ بھی ادا نہ ہورہا تھا۔ شیدا پھر سوچنے لگا کہ یہ مسافر بھی کیسے عجیب مسافر ہیں جو یوں چُپ چاپ اور نہ بولنے کی قسم کھائے بیٹھے ہیں۔ پانچ منٹ بعد پھر ایک آواز نے خاموشی کو توڑ دیا۔

''استاد، ہمیں یہاں اترنا ہے۔''

شیدے کے پاؤں پھر بریک کی طرف بڑھے۔ ویگن آہستہ ہوتے ہوتے رُک گئی۔ پچھلے حصے سے دو آدمی دروازہ کھول کر باہر نکلے اور پھر دروازہ بند کر کے اندھیرے میں غائب ہوگئے اور ویگن پھر آگے روانہ ہوگئی۔

''پتا نہیں ان مسافروں کو کہاں جانا تھا۔ یہاں تو آس پاس کوئی آبادی ہی نہیں۔ خیر ہوسکتا ہے کہ ہو آبادی یہیں کہیں۔ اندھیرے میں کیا پتہ چلتا ہے کہ ہم کہاں ہیں اور کہاں نہیں۔'' شیدے نے سوچا۔

ایک چھوٹی سی کار خاصی تیز رفتار کے ساتھ ویگن کے قریب سے گزری۔ اس کار کے گزرنے سے شیدے کو عجیب سا اطمینان محسوس ہوا۔ بالکل ایسا اطمینان جو رات کے اندھیرے میں اکیلے سفر کرنے والوں کو کسی اور مسافر ساتھی کے مل جانے پر ہوتا ہے۔ اس نے اطمینان کے ساتھ اس لمحے میں مڑ کر پیچھے نگاہ ڈالی۔ ویگن کے پچھلے حصے میں بارہ مسافر خاموش سایوں کی طرح بیٹھے تھے اور ویگن کی جو حرکت سے ان کے گاہے گاہے ہلتے ہوئے سروں کے علاوہ ان میں زندگی کی کوئی اور علامت نظر نہ آرہی تھی۔ جب دوسری کار گزر گئی تو شیدے نے محسوس کیا جیسے رات کی سیاہی کچھ اور بڑھ گئی ہے اور سڑک پہلے سے کہیں زیادہ تاریک اور بدصورت نظر آنے لگی ہے۔

دو منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ شیدا پھر ایک مسافر کی آواز پر چونک اٹھا۔

''ڈرائیور! مجھے یہاں اترنا ہے۔''

یہ آواز ہو بہو پہلے دو مسافروں جیسی تھی۔ شیدے نے ویگن روکی اور جب پانچواں اور چھٹا مسافر باہر نکل کر اور دروازہ بند کر کے اندھیرے میں غائب ہوگیا تو اس نے کھڑکی سے سر نکال کر باہر تاریکی میں کسی آبادی کے آثار دیکھنے کی کوشش کی مگر باہر اتنی تاریکی تھی کہ اسے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ممکن تھا کہ قریب ہی کہیں کوئی چھوٹی موٹی آبادی ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس جگہ دور دور تک کسی آبادی کا نام ونشان تک نہ ہو۔

شیدے نے دوبارہ گاڑی کی رفتار تیز کردی۔ ساتھ ہی وہ سوچنے لگا۔

یہ مسافر یا تو اس کے ساتھ کوئی شرارت کررہے ہیں یا ان کا مقصد کچھ اور ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مجھے لوٹنا اور میری دن بھر کی کمائی ہتھیانا چاہتے ہوں۔ ان سب نے پنڈی تک کا کرایہ ادا کیا ہوا ہے۔ مگر یہ اپنے کرائے کے مطابق سفر طے کیے بغیر یہاں وہاں ویران اور بے آباد جگہوں پر کیوں اُتر جاتے ہیں۔''

اب کے ویگن چلی تو نہایت تیز رفتاری کے ساتھ فاصلہ طے کرتے ہوئے سڑک پر دوڑتی رہی۔ شیدے نے سوچا کہ اگر رُکے بغیر اسی طرح اور اسی رفتار سے فاصلہ طے کرتی رہی تو وہ مقررہ وقت پہ پنڈی پہنچ جائے گا۔

ایک بار پھر پیچھے سے آواز آئی۔ ''ڈرائیورا! ہم یہاں اترنا چاہتے ہیں۔''

شیدے نے اس بار سر باہر نکال کر اترنے والے دونوں مسافروں کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ویگن کے عقبی حصے کی طرف نظر ڈالی۔ ایسا نہ کرنا ہی اس کے لیے بہتر تھا۔ تاہم اس نے گوشۂ چشم سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر کی طرف دیکھا اور سوچا کہ یہ مسافر بھی انہی کا ساتھی ہے۔ آخر یہ کوئی بات کیوں نہیں کرتا۔

مگر وہ فرنٹ سیٹ کا مسافر بار بار باہر دور دور تک پھیلے ہوئے اندھیرے کو دیکھ رہا تھا اور ایسا کرتے ہوئی اس نے ایک بار بھی اپنا سر تک نہ ہلایا تھا۔

''کیسی منحوس دکھائی دے رہی ہے یہ تاریک سڑک بھی۔'' شیدے نے زیرلب کہا۔ اور جب پھر ویسی ہی آواز سنائی دی تو وہ چونک گیا۔

''استاد! ہمیں یہاں اتار دو۔'' اس نے جی ہی جی میں ان الفاظ کی نقل اتاری اور جب ویگن کے پچھلے حصے سے یہی الفاظ بالکل پہلے اترنے والے ہر مسافر کے لب ولہجے میں دوہرائے گئے تو اس کے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

نواں اور دسواں مسافر اتر گئے اور ویگن پھر تاریکی میں ڈوبی ہوئی سڑک کے سینے پر دوڑنے لگی۔ اب کے شیدے نے اِدھر اُدھر دیکھنے اور یہ معلوم کرنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی کہ وہاں کوئی آبادی ہے یا نہیں۔ اسے اگرچہ اس کا احساس نہیں تھا۔ مگر وہ ویگن کو اتنی تیز رفتاری سے چلا رہا تھا کہ اس سے پہلے اس نے کبھی ویگن کی رفتار اس حد تک نہیں بڑھائی تھی۔ دس مسافروں کا بوجھ کم ہوجانے کے باعث ویگن کچھ ہلکی ہوگئی تھی اور شیدا حیران ہوکر سوچ رہا تھا کہ ویگن میں جتنے مسافر کم ہوتے جاتے ہیں۔ مجھے اندر ہی اندر اتنا خوف کیوں محسوس ہوتا جارہا ہے۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ پھر آج کیا بات ہے؟''

وہ برابر پھر کسی مسافر کی آواز پر کان لگائے

بیٹھا تھا اور جب آواز آئی تو وہ اپنی نشست پر اُچھل سا پڑا۔ اور اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

''ڈرائیور! ہمیں یہاں اترنا ہے۔''

اور پھر گیارہواں اور بارھواں مسافر ویگن سے باہر نکل کر دروازہ بند کرکے اندھیرے میں غائب ہوگئے۔ پہلے مسافروں کی طرح یہ مسافر بھی ایسی جگہ اترے تھے جہاں کوئی راستہ اور کوئی آبادی نہ تھی۔ پیچھے بیٹھے ہوئے باقی ماندہ چار مسافر اب بھی سایوں کی طرح خاموش اور چُپ چاپ بیٹھے تھے۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر نے ابھی نہ تو اپنی جگہ سے حرکت کی تھی اور نہ ہی اپنی زبان سے کوئی لفظ نکالا تھا۔ وہ تو بس سامنے دور تک پھیلے ہوئے اندھیرے کو گھورے جا رہا تھا۔

''کاش مجھے اس سڑک پر سے گزرتی ہوئی دوچار گاڑیاں اور نظر آجائیں۔'' شیدے نے دل ہی دل میں تمنا کی۔ گاڑی تو اسے کوئی نظر نہیں آئی۔ مگر مسافر کی وہی آواز گونج اٹھی۔

''ڈرائیور! ویگن روکو۔ ہمیں اترنا ہے۔''

یہ آواز اب شیدے کے لیے نامانوس نہ رہی تھی۔ مگر اس موقع پر نہ جانے کیوں یہ آواز بار بار آنے والی آواز۔ اسے پاگل کردینے والی تھی۔ اس نے پھر ویگن روکی۔ دو مسافر ویگن سے اترے اور دروازہ بند کرکے اندھیرے میں غائب ہوگئے۔ شیدے نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر سے ویگن آگے بڑھادی۔

'سترہ میں سے چودہ نکالیں تو باقی تین بچتے ہیں۔'

شیدے نے دل ہی دل میں حساب لگاتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ اگر یہ کسی شرارت پر اتر آئے تو میں اکیلا ہی ان تینوں کو بڑی آسانی سے سنبھال سکتا ہوں۔ مگر کاش یہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا مسافر پہلو ہی بدل دے۔ باہر نکل جائے یا اپنی زبان سے دو لفظ نکال لے، چاہے یہ دو لفظ میرے لیے کافی ہی کیوں نہ ہوں۔''

ویگن تاریک رات میں اندھیری سڑک پر تیز رفتاری سے دوڑتی رہی۔ اب اس میں صرف شیدا ڈرائیور پیچھے بیٹھے ہوئے دو سائے۔ یا پھر فرنٹ پر بیٹھا ہوا وہ مسافر جو برابر باہر دور تک پھیلے ہوئے اندھیرے کو دیکھ رہا تھا۔ شیدے نے اسٹیئرنگ ویل اپنی گرفت کچھ اور مضبوط کرلی کیونکہ ایک انجانے سے خوف کے احساس کے ساتھ اس کے سر کے بال کھڑے ہونے لگے تھے۔ پچھلے حصے میں بیٹھے ہوئے دونوں سائے ایک حرکت کرنے لگے تھے۔ شاید وہ بھی اترنے کا ارادہ کررہے تھے اور پھر وہی ہوا۔ وہی آواز شیدے کو بدحواس کرگئی۔

''ڈرائیور! ہمیں یہاں اترنا ہے۔''

اس آواز کا لہجہ بھی بالکل پہلے اترنے والے مسافروں جیسا ہی تھا۔ ذرا بھی فرق نہیں تھا۔ اب ان آوازوں سے شیدے کو نفرت کے ساتھ ساتھ اذیت بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ دونوں مسافر ساتھ باہر نکلے اور پھر ان کی آواز آئی......

''شب بخیر۔''

''کیا؟'' شیدے نے کہا اور اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ پندرہویں اور سولہویں مسافروں کی زبان سے ادا ہونے والے ان دو الفاظ نے شیدے کو غیر معمولی طور پر چونکاتے ہوئے خوف زدہ سا کردیا حالانکہ ان الفاظ میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ جیسے ہی وہ دونوں مسافر اندھیرے میں غائب ہوئے۔ ویگن پھر پہلی سی رفتار سے دوڑنے لگی۔ مگر شیدا بہت ہی الجھا ہوا تھا۔ سولہ مسافر اتر گئے تھے اور اب ایک مسافر رہ گیا تھا جو فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ شیدا خوف زدہ ہوکر سوچنے لگا اگر ان سولہ مسافروں میں راستے نے ہی اترنا تھا۔ تو انھوں نے پنڈی تک کا کرایہ کیوں دیا۔ اور پھر وہ دو دو کی ٹولی میں کیوں اُترے۔ کہیں بھی اکیلا مسافر نہیں اترا۔ وہ تین اکٹھے ہوکر اتر سکتے تھے۔ اور اس سے زیادہ بھی۔ مگر دو دو کرکے اترنا اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا اور پھر آخری دو مسافروں کا ''شب بخیر'' کہنا اُسے خوفزدہ سا کیوں کرگیا ہے؟''

اکثر مسافر جاتے ہوئے شب بخیر کہا کرتے

تھے مگر چونکہ یہ الفاظ سولہویں مسافر نے ادا کیے تھے اور باقی پندرہ مسافر سارا راستہ بالکل خاموش بیٹھے رہے تھے۔ اس لیے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ الفاظ بظاہر عام اور معمولی ہونے کے باوجود کوئی غیر معمولی اور پُراسرار مفہوم لیے ہوئے ہیں۔

'سترہ میں سے سولہ گئے باقی رہا ایک۔' شیدے نے جیسے اپنے آپ کو اطمینان دلانے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔

'مگر یہ ایک کیا شے ہے؟ اس کے کیا ارادے ہیں؟'

پھر جیسے شیدے کے ذہن میں اٹھتے ہوئے ان سوالوں کے جواب میں فرنٹ سیٹ کے مسافر نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور سامنے تاریکی کی طرف سے نظریں ہٹالیں۔ مسافر کے چہرے کا رخ ذرا سا اس کی طرف ہوا تو شیدے کو معلوم ہوا کہ اس نے اس چہرے کو اس سے پہلے کہیں بھی اور کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ ایک صاف اور زرد زرد سا چہرہ تھا۔ جس کی سیاہ آنکھیں کچھ زیادہ ہی چمک رہی تھیں۔ مسافر نے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے اور پھر پہلی دفعہ اس کی زبان کھلی۔

''کالا قبرستان کتنی دور ہے؟''

شیدا چونکتے ہوئے اچھل سا پڑا۔ گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے اس نے ویگن کی رفتار بڑھادی۔

''پانچ میل'' پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

'' آپ کا سفر تو خوب مزے سے کٹ رہا ہے۔ ہے نا؟''

جواب میں فرنٹ سیٹ والے مسافر نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''ہاہا...... ہاہا...... تم گاڑی ذرا تیز چلا رہے ہو۔ شیدے استاد!''

شیدا مسافر کا قہقہہ سن کر گھبرا گیا۔ اگرچہ قہقہے کی آواز ویگن کے چلنے کی آواز میں ڈوب گئی تھی۔ پھر بھی وہ قہقہہ اسے ڈراؤنا اور پُراسرار محسوس ہوا اور

غزل

پھر تیری بے رخی کا تقاضا اُٹھ رہا ہے
میری الفت کا بھی دیکھو جنازا اٹھ رہا ہے
مجھے اب موت کا تو ڈر نہیں ہے
تیری دوری سے یازہ اٹھ رہا ہے
نکلنا تیری دنیا سے پڑے گا
نیا اِک یہ تنازعہ اُٹھ رہا ہے
لغو سے معنیٰ باتوں میں یہاں ہیں
بھروسہ بھی لہٰذا اُٹھ رہا ہے
جلا کر دل کو ہم بیٹھے ہیں مہدی
یہاں دھواں بھی تازہ اُٹھ رہا ہے

(شاعر: مہدی قاضی)

مسافر کی زبان سے اپنا نام سن کر تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ حالانکہ کسی اور مسافر کی زبان سے اپنا نام سن کر اس نے آج تک ایسا محسوس نہیں کیا تھا۔ جو اس وقت وہ بُری طرح محسوس کررہا تھا کہ اُسے کچھ کرنا یا کچھ کہنا ضرور چاہیے ورنہ معاملہ گڑ بڑ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے، یا سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''بہتر ہوگا تم اپنا تعارف کرادو۔ کیونکہ ہم دونوں اکٹھے سفر کررہے ہیں اس وقت۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' مسافر نے بڑے آرام وسکون سے کہا۔ ''مجھے موت کہتے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''موت'' مسافر نے دوبارہ کہا۔

شیدے نے بریکوں کی طرف پاؤں بڑھایا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ مسافر مذاق کررہا ہے۔ مگر جب مذاق خطرناک ہو تو پھر مذاق کہاں رہتا ہے۔

''نہیں'' مسافر نے جیسے اس کی سوچوں کو پڑھتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے مذاق نہیں کررہا۔'' اُس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ ''میری کہنی کے نیچے تمہیں کوئی چیز دکھائی دیتی ہے؟''

شیدے نے مدھم مدھم روشنی میں مسافر کی کہنی کے نیچے نگاہ ڈالی۔ مسافر کے سینے پر بندھے ہوئے ہاتھوں سے ایک آٹومیٹک پستول کی نال ذرا سی باہر نکلی ہوئی تھی۔

''چلو مان لیا'' شیدے نے جیسے بے بسی سے کہا۔ ''تمہارا نام موت ہے۔ یہی کہا تھا ناں تم نے۔ چلو میں تمہاری بات کا یقین کرلیتا ہوں۔ شاید اسی وجہ سے تم قبرستان کا پوچھ رہے تھے۔ شاید تم قبرستان ہی جارہے ہو۔''

''بالکل۔ بالکل۔'' مسافر نے کہا۔ ''یہی وجہ ہے کہ ہم قبرستان جارہے ہیں۔''

ایک خوفناک سی سنسنی شیدے کے رگ وپے میں دوڑ گئی۔

''ہم......؟'' اس نے اپنی حیرت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو معلوم نہیں کہ مجھے وہاں کسی نے بلایا ہے۔''

''تمہیں اسی وقت بلالیا گیا تھا۔ جب میں نے اس سفر کا منصوبہ بنایا تھا۔''

''تو اس سفر کا منصوبہ تم نے بنایا تھا۔ کیا خوب! کیا وہ مسافر تمہارے اس منصوبے کے مطابق راستے میں ویران اور بے آباد جگہوں پر اترے تھے؟''

''ہاں۔ تم بالکل ٹھیک سمجھے ہو رشید خان۔'' مسافر نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''تاکہ ہم دونوں اکیلے سفر کرسکیں اور ہماری باتیں سننے والا یا ہمیں دیکھنے والا کوئی تیسرا آدمی اس گاڑی میں موجود نہ ہو۔''

یہ کہتے ہوئے مسافر نے اپنے پیر نیچے ویگن کے فرش پر آہستہ آہستہ مارتے ہوئے تھپ تھپ کی آواز پیدا کرنی شروع کردی۔ تھپ تھپ کی آواز حیرت انگیز طور پر ویگن کے چلنے کی آواز سے ہم آہنگ تھی۔ شیدے نے اسٹیئرنگ ویل پر اپنی گرفت مضبوط کی مگر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ہاتھ ہی نہیں اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اپنے کانپتے ہوئے جسم اور کانپتی ہوئی مگر غصے بھری آواز کے ساتھ اس نے کسی قدر چیختے ہوئے کہا۔

''اگر تمہارا نام واقعی موت ہے تو تم ایک بار نہیں سو بار اور بڑے شوق سے قبرستان جاؤ لیکن یہ تو بتاؤ ذرا کہ تم اپنے ساتھ مجھے بھی وہاں کیوں لے جانے پر اصرار کررہے ہو؟ کوئی تک ہے اس بات کی؟ اگر تمہارے ہاتھ میں اس پستول کی بجائے کوئی خنجر وغیرہ ہوتا تو پھر میں بھی یہ کوشش کرکے دیکھ لیتا کہ ہم دونوں وہاں جاتے ہیں یا نہیں۔''

''موت نے اس سے پہلے بھی بہت سے لوگوں کو فریب دیا ہے۔'' مسافر نے بڑے آرام سے جواب دیا۔

''اور میرا خیال تو یہ ہے کہ تم کو ذرا ایک منٹ کے لیے کچھ سوچنا اور غور کرنا چاہیے۔ یہ دیکھنے اور جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ تمہارے وہاں یعنی قبرستان جانے کی معقول وجہ ہے یا نہیں؟''

''یہ تم کیا ہوا میں تیر چلا رہے ہو؟ کیا کیا ہے میں نے؟''

''تمہیں یاد ہونا چاہیے۔''

''کیا یاد ہونا چاہیے؟''

''یہی کہ تم نے کیا کیا تھا؟''

مسافر کے یہ الفاظ سن کر شیدے کا دل یوں زور سے دھک دھک کرنے لگا کہ جیسے ابھی اس کی پسلیوں کو توڑ کر باہر آجائے گا۔ ویگن کے چلنے سے پیدا ہونے والے شور کے باوجود اسے اپنے دل کی دھک دھک صاف سنائی دے رہی تھی اور ویگن اگرچہ سڑک پر پوری تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی اور وہ اس کا اسٹیئرنگ مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ اس کے باوجود اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے

سڑک کی خوفناک تاریکی کے درمیان ویگن ایک دم ساکن اور بے حس وحرکت ہوگئی ہے۔

''تو تمہیں بالکل یاد نہیں آرہا؟''

''بالکل نہیں'' شیدے نے کہا۔ ''بات کیا ہے؟''

''اب قبرستان کتنی دور ہے؟''

''تقریباً تین میل'' شیدے نے جواب دیا۔ ''مگر کیوں؟''

''اور تمہیں اب بھی کچھ یاد نہیں آرہا۔''

''نہیں'' شیدے نے تنگ آکر کہا۔ ''آخر تم ہو کون؟''

''تم بھول گئے ہو۔'' مسافر نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں یکایک ایک بلی کی آنکھوں کی طرح چمکنے لگیں۔

''میرے اللہ! کاش میں بھی بھول سکتا۔ کتنے دکھ کی بات ہے۔ میں تو بھول نہیں سکا اور تمہیں یاد تک نہیں آرہا۔''

''لیکن وہ بات کیا ہے جو تمہارے کہنے کے مطابق مجھے یاد نہیں آرہی۔''

''تو سنو۔'' فرنٹ سیٹ کے مسافر نے کسی قدر مضطرب انداز سے اور گویا اپنی اندرونی کیفیت کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''آج سے دس سال پہلے جب تم یہاں بس چلایا کرتے تھے تو تم نے ایک خاتون کی کار کو ٹکر مار دی تھی۔ کار الٹ کر ایک گڑھے میں جاگری تھی۔ مگر تم وہاں سے بھاگ گئے تھے۔''

''اُس بات کا تم سے کیا تعلق ہے؟''

''تو گویا تم نے وہ حرکت کی تھی؟''

''ہاں۔'' شیدے نے جیسے بے دلی سے کہا۔ ''مگر اس کا تم سے کیا تعلق ہے؟''

''اس خاتون کا کیا بنا؟''

''اس کی کار الٹ کر گڑھے میں گرگئی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ خاتون بھی ہلاک ہوگئی تھی۔ مگر وہ......اس کا...... وہ تمہاری کیا لگتی تھی۔ عزیزہ تھی یا کچھ اور؟''

''وہ میری زندگی تھی۔ وہ میرا سب کچھ تھی۔''

مسافر نے یہ کہتے ہوئے ایک مجنونانہ انداز میں شیدے کی طرف دیکھا۔ پھر دو ایک لمحے کے لئے خاموش رہ کر جیسے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''میں بہت پہلے مرگیا ہوتا۔ موت نہ جانے کتنی بار میرے قریب سے ہوکر گزر جاتی رہی۔ لیکن میں اس کی خاطر یا اس کی وجہ سے زندہ رہا۔ میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگیا تھا۔ اس کے باوجود میں مرا نہیں زندہ رہا۔ پھر جب میں بیرون ملک سے یہاں گھر واپس آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کی جان لینے والے تم تھے۔''

''مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔'' شیدے نے جیسے صفائی پیش کی۔

''میں لیٹ ہورہا تھا اور مجھے وقت پر بس اسٹینڈ پہنچنا تھا۔ اس روز۔''

یہ کہتے کہتے شیدا جیسے اپنے آپ ہی رُک گیا۔ اور اس نے اپنا چہرہ۔ مسافر کی چبھتی ہوئی پراسرار اور خوفناک نظروں کا سامنا کرنے سے بچنے کے لئے دوسری طرف کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی جیسے اس کی نظروں کے سامنے دس سال پہلے کا وہ منظر پوری تفصیل کے ساتھ اُبھر آیا جس کے متعلق اس نے وقوعہ کے روز کے بعد دوبارہ کبھی سوچنے اور یاد کرنے کی زحمت ہی نہ کی تھی اور وہ بھاگ کر کراچی چلا گیا تھا۔ وہاں جاکر اُس نے اس واقعہ کو بالکل ہی بھلا دیا تھا۔

''تو یہ تم تھے۔ جو اسے اور مجھے دونوں کو ختم کرنے کا باعث بنے۔ اس کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ مگر اندر سے ختم ہوجانے کے باوجود میں اس کی خاطر جیتا رہا۔ جیتا رہا اور تمہارا سراغ لگاتا رہا۔ کہ کب تم میرے سامنے آتے ہو۔ آخر آج رات قسمت مجھ پر مہربان ہوئی اور میں تم تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔''

شیدے کے تخیل کے پردے پر اب بھی

حادثے کا منظر گھوم رہا تھا اور اس کے کانوں میں ہلاک ہونے والی خاتون کی دلخراش چیخیں گونج رہی تھیں۔ اس کے پاس فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا مسافر جو نہ جانے کوئی پاگل انسان تھا یا کوئی آسیبی روح۔ مگر وہ اسے بغیر اپنی زبان سے کہے اس حادثے کی ایک ایک تفصیل پوری جزئیات کے ساتھ یاد دلائے جا رہا تھا۔

''قبرستان اب کتنی دور رہ گیا ہے؟''

''ایک میل۔'' شیدے نے اپنے سختی سے بھینچے ہوئے دانتوں کے درمیان کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم وقت پر پہنچ جائیں گے وہاں۔''

ویگن تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے اور سڑک کا ڈھلوانی راستہ تیزی سے طے کرتے ہوئے اونچائی والے راستے پر چڑھی۔ اس اونچائی کے اختتام کے قریب پہنچتے ہوئے شیدے کو آسمان پر ایک مدھم سی روشنی نظر آئی۔ وہ جان گیا کہ وہ جلد ہی کھلی جگہ میں نکل آئیں گے۔ جہاں سے قبرستان صاف دکھائی دینے لگے گا۔

''جلدی کرو۔ اب کتنی دور رہ گیا ہے؟''

''صرف ایک چوتھائی میل۔''

یہ کہتے ہوئے شیدے کی آنکھیں سامنے دیکھتے ہوئے جیسے حلقوں سے باہر نکلنے کو ہوگئیں اور اس کے سر کے سارے بال کھڑے ہوگئے۔ اس کی آنکھوں میں حادثے میں ہلاک ہونے والی خاتون کا خون آلود لباس پھر رہا تھا۔ اور اس کے کانوں میں اس خاتون کی دل خراش چیخیں گونج رہی تھیں۔

'کاش میں یہاں کہیں رکے بغیر اس جگہ کے پاس سے گزر جاؤں۔' شیدے نے جی ہی جی میں کہا۔ 'پھر مجھے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔'

اب قبرستان کے اردگرد بنا ہوا لوہے کا جنگلات دکھائی دینے لگا تھا۔ اس جنگلے کی سلاخوں کے درمیان سے نظر آتے ہوئے قبروں کے تعویذ اور کتبے پراسرار بھوتوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ ذرا آگے سڑک پر وہ موڑ تھا۔ جس کے قریب قبرستان کا بڑا دروازہ تھا۔ اس دروازے کے بلند ستون اب نظر آنے لگے تھے اور شیدا سوچ رہا تھا کہ اگر وہ موڑ کاٹتے ہوئے اپنی ویگن کو سڑک پر ہی رکھنے میں کامیاب رہا تو پھر اسے شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں گی اور وہ ہر خطرے سے محفوظ ہو جائے گا۔

تیز رفتاری کے باعث ویگن سڑک کی اونچی نیچی جگہوں پر اُچھلی تو شیدا ایک انجانے سے خوف کی تحت آنکھیں جھپکنے لگا۔ مگر پھر اسے قبرستان کا بڑا دروازہ دکھائی دیا تو اس نے اپنی ویگن کو سڑک پر ہی رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن یہ کیا؟ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے قبرستان کے بڑے دروازے کی تاریک محراب اس کی گاڑی کو ایک طاقتور مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ شیدے نے بظاہر اسٹیئرنگ کو بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ مگر اس کی ساری کوشش کے باوجود اسٹیئرنگ مڑ گیا۔ ویگن بے قابو ہو کر پہلے اپنے ایک پہلو پر ہو کر رکی اور پھر ایک دھچکے کے ساتھ اُچھلتے ہوئے قبرستان میں جا گری۔ جہاں مردوں کے قطار در قطار تعویذ اور کتبے اس کے استقبال کے لیے چشم براہ تھے۔

ویگن اُچھل کر قبرستان میں گری تو سیدھی بڑے دروازے کے ایک ستون سے جا ٹکرائی۔ ویگن اور ستون کے اس تصادم سے جو خوفناک دھماکہ ہوا۔ اس کی آواز شاید آسمانوں تک بھی سُنی گئی ہوگی لیکن تصادم کی اس آواز سے بالکل الگ بلکہ نمایاں اور وہ وحشیانہ قہقہہ تھا۔ جو اس لمحے فضا میں گونج اٹھا تھا۔ اس وحشیانہ قہقہے سے فتح مندی کا احساس صاف ظاہر تھا اور یہ قہقہہ تو فرنٹ سیٹ والے پاگل مسافر نے لگایا تھا۔ یا شاید قبروں میں لیٹے ہوئے اُن مردوں کی طرف سے تھا۔ جو نہ جانے کب سے اس خاتون کو ہلاک کرنے والے ڈرائیور ''رشید خان'' کی اس قبرستان میں آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

☆☆☆



مجھے معاف کر دو!

حنا بشریٰ

جائیداد کے لالچ میں چھوٹی بہن پر کالا جادو کرا دینے والے ایک شخص کا قصہ عبرت

میں ابا کی قبر پر فاتحہ کے لئے اکثر جاتا تھا۔ آتے جاتے اکثر میری ملاقات چوہدری کے بیٹے قاسم سے ہو جایا کرتی تھی۔ شاید وہ پابندی سے قبرستان آتا تھا۔ ایک دن میں قبرستان گیا تو میری نظر چوہدری قاسم پر پڑی۔ وہ آج بہت شدت سے رو رہا تھا۔ اُس کی حالت دیکھ کر مجھ سے رہا نہ



گیا۔ میں اُس کے قریب چلا گیا۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ میں نے کتبے پر غور سے پڑھا تو ’’نین تارا‘‘ لکھا نظر آیا تھا۔ پتا نہیں چوہدری کا اس سے کیا رشتہ تھا۔ میں چونکہ اِس گاؤں میں نیا آیا تھا۔ اس لیے زیادہ کچھ جانتا نہیں تھا۔ میں نے وہاں فاتحہ پڑھی اور گھر آ گیا۔ سارا دن مجھے چوہدری قاسم کا شدت سے رونا یاد آتا رہا۔ وہ اتنی شدت سے رو رہا تھا کہ جیسے کوئی ابھی حال ہی میں فوت ہوا ہو۔

کچھ دن بعد پھر میرا قبرستان جانا ہوا۔ میں جلدی جلدی فاتحہ پڑھ کر جانے کے لیے مُڑا تھا۔ کیونکہ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ میری نظر چوہدری قاسم پر پڑی۔ وہ بارش سے بے نیاز قبر کے پاس بیٹھا شدت سے رو رہا تھا۔

’’نین تارا مجھے معاف کر دو۔ تم نے مجھے معاف نہ کیا تو میرا اللہ بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔‘‘ یہ کہہ کر وہ قبر پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

’’چوہدری صاحب! بارش تیز ہو رہی ہے۔‘‘ میں نے چوہدری کو پکارا۔ مگر چوہدری نے میری طرف دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ ابھی بھی رو رہا تھا۔ اتنی دیر میں بادل زور سے گرجا اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ کوئی گھنا درخت بھی نظر نہیں آیا کہ جس کے نیچے سے کھڑے ہو کر بارش سے محفوظ رہتے۔ سردیوں کی بارش بندے کو بیمار بھی کر دیتی ہے۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے چوہدری قاسم کا بازو پکڑا اور گورکن کی جھونپڑی میں آ گیا۔ گورکن موجود نہیں تھا۔ چوہدری قاسم چٹائی پر نڈھال سا بیٹھ گیا۔ مگر وہ ابھی بھی رو رہا تھا۔ نین تارا کی قبر یہاں سے بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ چوہدری قاسم ابھی بھی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا تھا۔
’’نین تارا مجھے معاف کر دو۔ اگر تم نے مجھے معاف نہ کیا تو یہ زمین بھی مجھے جگہ نہیں دے گی۔‘‘

’’یہ کس کی قبر ہے؟‘‘ میں نے ہمت کر کے سوال کیا۔

’’میری چھوٹی بہن کی۔‘‘ چوہدری نے جواب دیتے ہوئے پہلی بار میری طرف دیکھا تھا۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

’’آپ یہاں روزانہ آتے ہیں۔ لگتا ہے آپ کو اپنی بہن سے بہت محبت ہے۔‘‘ میں نے اُسے خاموش دیکھ کر پھر سوال کیا۔

چوہدری نے نفی میں سر ہلا دیا۔ تھوڑی دیر تک جھونپڑی میں خاموشی چھائی رہی۔ میں نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔

’’چوہدری صاحب آپ مجھے اپنا غم بتائیں۔ آپ کا دل ہلکا ہو جائے گا۔‘‘ میں ہمدرد لہجے میں بولا۔

’’غم نہیں گناہ۔‘‘ چوہدری غم ناک لہجے میں بولا۔

’’ہو سکتا ہے کہ میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔‘‘ میں نے اُسے بولنے پر آمادہ دیکھ کر کہا۔

’’کبھی کبھار انسان گناہوں کی وجہ سے اتنا دور نکل جاتا ہے کہ کوئی حل نہیں نکلتا۔ کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں، اور اس کے ذمہ دار بھی ہم خود ہیں۔‘‘ چوہدری قاسم کی آواز کسی کھائی سے آ رہی تھی۔ اور پھر اُس نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

چوہدری ہاشم ابھی تک بے اولاد تھا۔ دن رات وہ اپنی بیوی کو طعنے دیتا رہتا کہ صرف بیٹا ہونا چاہیے۔ اگر بیٹی ہوئی تو تمہاری اِس حویلی میں کوئی جگہ نہیں ہو گی۔

میں بہت منتوں اور مُرادوں کے بعد پیدا ہوا۔ حویلی میں جشن کا سماں تھا۔ میرا باپ فخر سے سینہ پھلا کر پھر رہا تھا۔ وراثت کے علاوہ باپ کے بے جا لاڈ پیار نے میرے اندر ضد، غصہ اور ہٹ دھرمی و غرور پیدا کر دیا تھا۔ میں عورت کو پیر کی جوتی سمجھتا تھا۔ ماں کی محبت کے باوجود میں اُسے بہت تنگ کرتا اور بدتمیزی کرتا۔ حویلی کی ملازمائیں بھی میری بدسلوکی کا شکار تھیں۔ باپ کی حمایت میرے ساتھ ساتھ تھی۔ 9 سال تک بلا شرکت غیرے میری بادشاہی قائم رہی۔ اِس دوران امّاں اُمید سے ہوئیں۔

’’حاجرہ یاد رکھنا اس بار بھی بیٹا ہونا چاہیے۔‘‘ ابا رعونت بھرے لہجے میں بولے۔

’’چوہدری صاحب یہ تو اللہ کے کام ہیں، میں بھلا اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں۔‘‘ اماں کمزور سے لہجے میں بولیں۔

’’بس بس زیادہ بک بک نہ کر، بڑی آئی مجھے سمجھانے والی۔ جو کہہ رہا ہوں وہی ہو۔‘‘ ابا دھاڑے۔ ماں باپ کی باتیں سُن کر میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کسی صورت میں بیٹا نہ ہو۔ ورنہ میری بادشاہی میں کوئی حصے دار آ جائے گا۔ میرے اندر جلن اور حسد کے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ میں نے دن رات دعائیں مانگنا شروع کر دیں کہ اب کی بار بہن ہو، اور آخر میری دعاؤں کے آگے ابا کی دعائیں ہار گئیں اور ایک بہن میرے لیے آ گئی۔ ابا کا غصے سے بُرا حال تھا۔ وہ تو اسے دیکھنے بھی نہیں گئے۔ بہن سے مجھے بھی کوئی مطلب نہیں تھا۔ کیونکہ مجھے اُس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ آخر عورت ہے تو ایک کمزور مخلوق، اِس کا اور ہمارا کیا مقابلہ۔ غرور، تکبر میرے اندر پنپ رہے تھے۔

اماں نے اُس کا نام ’’نین تارا‘‘ رکھا۔ نین تارا بہت خوبصورت تھی۔ اماں اُس نازک سی گڑیا کے ساتھ بہت خوش تھیں۔

’’قاسم اِدھر آؤ بیٹا، دیکھو تمہاری بہن!‘‘ میں کھیل رہا تھا کہ اماں کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

’’کیا ہے اماں!‘‘ میں بدتمیزی سے بولا۔

’’بیٹا اپنی بہن سے ملو دیکھو تمہارے لیے چھوٹی سی گڑیا آئی ہے۔‘‘ اماں کے لہجے میں نین تارا کے لیے محبت تھی۔

’’تو میں کیا کروں۔ مجھے کسی بہن کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ باپ کی زبان میرے منہ میں تھی۔ نین تارا کا وجود میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ میں اُسے مارتا، اس کے کھلونے توڑ دیتا، اُس کی چیزیں چھپا دیتا۔ وہ روتی، شور مچاتی مگر کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میں ابا کا لاڈلا اور اُن کا وارث تھا۔ اور نین تارا کو تو ابا دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اماں مجھے سمجھاتی مگر میں اُن کی ایک نہیں سنتا تھا۔ میرے اِسی سلوک کو دیکھتے ہوئے وہ مجھ سے خوف زدہ رہنے لگی۔ میرے آنے پر چھپ جایا کرتی۔

’’اماں بھائی مجھ سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟‘‘ نین تارا اماں سے پوچھ رہی تھی۔

’’نہیں بیٹا وہ تو تم سے محبت کرتا ہے۔ بس ناسمجھ ہے اس لیے جھگڑا کرتا ہے۔‘‘ اماں نے میری حمایت کرتے ہوئے کہا۔

’’مگر میں تو بھائی سے جھگڑا نہیں کرتی۔‘‘ نین تارا نے لمحوں میں کتنی گہری بات کی تھی۔ میں چند لمحوں کے لیے اپنی جگہ ساکت رہ گیا تھا۔ مگر پھر اپنی ازلی ہٹ دھرمی کے باعث باہر چلا گیا۔ کیونکہ مجھے نین تارا اور اُس کی باتوں سے کوئی مطلب نہیں تھا۔

اماں نے نین تارا کو اسکول داخل کروا دیا۔ وہ بہت شوق سے اسکول جاتی۔ مجھے اسکول جانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میں تو صرف دوسرے بچوں پر اپنی برتری ثابت کرنے جاتا تھا، کہ پڑھ لکھ کر وہ میرے برابر ہرگز نہیں ہو سکتے۔ بلکہ رہیں گے وہ ہمارے ملازم ہی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ نین تارا پڑھائی میں اور میں اپنی آوارگی میں بڑھتا رہا۔ شرارتیں بھی کرتا اور ابا کو شکایت استاد کی لگاتا۔ جب ابا انہیں ذلیل و خوار کرتے تو میری فرعونیت کو بڑی تسکین ملتی۔

نین تارا نے میٹرک اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا۔ پورے گاؤں میں دھوم مچی تھی۔ صورت اور سیرت میں تو باکمال تھی ہی پڑھائی میں بھی اُس نے میدان مار لیا تھا۔ میں نے گاؤں والوں کے چہرے پر نین تارا کے لیے عزت اور محبت دیکھی تھی۔ مجھ سے وہ ڈرتے تھے۔ مگر نہیں وہ مجھ سے نفرت بھی کرتے تھے۔ مجھے پہلی دفعہ نین تارا سے حسد محسوس ہوا۔ یعنی ایک لڑکے کے سامنے ایک لڑکی فوقیت لے گئی تھی۔ حویلی میں آنے جانے والے اماں ابا کو مبارک باد دے رہے تھے۔ اور میرا حسد کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ اُس نے اماں سے اس بات کا اظہار کیا کہ اُسے شہر کے میڈیکل کالج میں داخلہ لینا ہے۔ یہ سننا تھا کہ میرے تن بدن میں آگ

لگ گئی۔ ابا اور میں نے خوب مخالفت کی۔

''کیا ضرورت ہے آگے پڑھنے کی۔'' میں نے قہر آلود نگاہوں سے اُسے گھورا تھا۔

''ابا مجھے شوق ہے۔'' نین تارا نے پہلی بار زبان کھولی۔

''پڑھ کر کیا تُو تیر مارے گی، کرنا تو پھر بھی چولہا ہانڈی ہے۔'' میرے لہجے میں حقارت تھی۔

''پتر پڑھنے دے بے چاری کو۔'' اماں حمایت میں بولی۔

''نا بھئی ضرورت کیا ہے شہر جا کر پڑھنے کی، کرنی تو تیری شادی ہے۔ ہم نے کون سا تجھ سے نوکری کروانی ہے۔'' ابا غصے سے دھاڑے۔

''چوہدری صاحب میں نے آپ سے زندگی میں کبھی کچھ نہیں مانگا مگر اپنی بیٹی کے لیے منت کرتی ہوں کہ اُسے پڑھنے کی اجازت دے دیں۔'' اماں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولیں۔

''ابا بس زیادہ غور نہ کر۔ نا تو بس نا، کوئی ضرورت نہیں ہے لڑکی ذات کو سر پر بٹھانے کی۔''

میں نے نفرت سے کہتے ہوئے نین تارا پر نظر ڈالی، اس کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تھے۔ مگر مجھے ذرا رحم نہیں آیا تھا۔

اور پھر اماں کی التجائیں اور نین تارا کی دعائیں رنگ لے آئیں، ابا مان گئے تھے۔

میں نے سُنا تو حیران رہ گیا تھا۔ ابا کی نفرت اور حقارت کہاں گئی تھی۔ شاید بیٹی کی محبت جاگ گئی تھی۔ ابا نے اِس شرط پر شہر پڑھنے کی اجازت دی تھی، کہ نین تارا کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گی جس سے ہماری عزت پر حرف آئے اور نین تارا نے وعدہ کیا تھا۔

نین تارا کا داخلہ میڈیکل کالج میں ہوگیا تھا۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ جب اُسے ہوسٹل سے چھٹیاں ہوتیں تو میں اسے لینے جاتا۔ سارے راستے اُسے ڈانٹتا، ڈراتا، بلاوجہ کا اس پر رعب ڈالتا۔ دیر سے کیوں آئی۔ کہیں کسی سے چکر تو نہیں چلا رہی۔ ایسی کوئی خبر مجھے ملی تو یاد رکھنا تُو زندہ حویلی نہیں جائے گی، تیری لاش ٹکڑے ٹکڑے کر کے لے کر جاؤں گا۔''

وہ سارے راستے آنسو بہاتی مگر مجھے رحم نہ آتا۔ حویلی جا کر بھی اماں ابا کو اس کی جھوٹی شکایتیں لگاتا۔ شاید اس طریقے سے میں اُس سے انتقام لیتا کہ وہ پڑھائی میں مجھ سے آگے کیوں نکل رہی تھی۔''

اسی دوران حویلی میں میری شادی کے ہنگامے جاگ گئے۔

گل بانو میری منگیتر تھی۔ جو اب دلہن بن کر حویلی کی رونق بڑھانے آ گئی۔ میں بہت خوش تھا۔ مگر اس خوشی میں بھی میرا دل نین تارا سے صاف نہیں ہوا تھا۔ وہ میری نفرت کا ہمیشہ شکار رہی تھی۔

گل بانو اور نین تارا کی بہت اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ مگر وہ مجھ سے خائف ہی رہتی تھی۔ میں نے اُس کو کبھی بھائیوں والا پیار جو نہیں دیا تھا۔ ہم مرد نہ جانے عورتوں کے معاملے میں اس قدر خود غرض اور تنگ نظر کیوں ہوتے ہیں؟

☆☆☆

''نین تارا ڈاکٹر بن گئی۔'' یہ خبر میرے تن بدن میں آگ لگا گئی تھی۔ ساری حویلی میں جشن کا سماں تھا۔ ہر کوئی ابا کو مبارک باد دے رہا تھا۔ ابا کی عزت کو چار چاند جو لگ گئے تھے۔ پہلی بار کوئی لڑکی اتنا زیادہ پڑھ گئی تھی۔

''بیٹا تم نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا۔'' ابا نے نین تارا کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ابا آپ کی عزت مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔'' ڈاکٹر بن کر بھی نین تارا کے انداز میں عاجزی اور انکساری ختم نہیں ہوئی تھی۔

''میری بیٹی بہت نصیبوں والی ہے۔'' اماں کے لہجے میں اُس کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ مجھے اُن کا پیار ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔

''نین تارا میں نے ہمیشہ تجھ سے نفرت کی۔ کبھی تجھے پیار نہیں دیا۔ میرے ہوتے ہوئے بھی تُو باپ کی محبت سے محروم رہی۔'' ابا کے لہجے میں دکھ تھا۔ میرے لیے خطرے کی گھنٹی بج گئی تھی۔

''مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ میرا خواب تھا ڈاکٹر بننے کا وہ پورا ہوگیا۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔'' نین تارا کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''مگر میں بیٹا تمہارے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی تمام زیادتیوں کا ازالہ۔'' ابا پُرعزم انداز میں بولے۔

''مجھے گاؤں میں ہسپتال بنانا ہے۔ اُس کے لیے زمین چاہیے۔'' نین تارا نے اُمید بھری نظروں سے ابا کو دیکھا۔

''ہاں بیٹا جو تم کہو گی وہی ہوگا، جتنی زمین چاہیے لے لو۔'' ابا محبت سے بولے۔

''ابا میں چاہتی ہوں گاؤں والے علاج سے محروم نہ رہیں۔ اُنھیں شہر نہ جانا پڑے۔ انھیں علاج کی سہولیات گاؤں میں میسر ہوں۔'' نین تارا کی نگاہوں میں اُمید اور ولولہ تھا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اِسے زمین دینے کی، کرنی تو اس کی شادی ہی ہے تو پھر یہ نیا شوشا کیوں چھوڑا جا رہا ہے۔'' میں نے غصے سے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''تُو چپ کر قاسم! یہ میرا اور میری بیٹی کا معاملہ ہے۔'' ابا تو بالکل ہی بدل گیا تھا۔

''ابا اگر تُو نے اِسے زمین دی تو میں اِس کے ٹکڑے کر دوں گا۔'' میں نفرت سے پھنکارا۔

''اوئے آرام سے بہن ہے تیری۔'' ابا غصے سے چلائے۔

''آپ ہوتے کون ہیں میرے ٹکڑے کرنے والے۔'' نین تارا نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ میں اُس کا اعتماد اور جرأت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُسے تھپڑ مارنا چاہا تھا کہ ابا میرے سامنے آ گئے اور میرے منہ پر تھپڑ رسید کیا۔

''اپنی بکواس بند کر اور چلا جا یہاں سے۔'' ابا نے پہلی بار مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا اور اِس کی وجہ صرف نین تارا تھی۔

''دیکھتا ہوں کیسے بنتا ہے ہسپتال۔'' میں دھمکی دیتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ اور جاتے جاتے نین تارا پر نفرت بھری نگاہ ڈالنا نہیں بھولا تھا۔

☆☆☆

''قاسم کیوں غصہ کر رہے ہیں، بنانے دیں نا ہسپتال۔ اس میں سب کا فائدہ ہے۔'' گل بانو نے محبت سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

''بکواس بند کرو اور میرا دماغ نہ کھاؤ۔'' میں غصے سے دھاڑا۔

''سب اُسی ناگن کے حمایتی بن گئے ہیں۔'' میرا خون غصے سے کھول رہا تھا۔ گل بانو خاموش ہوگئی تھی۔ نفرت میرے خون میں شامل ہوگئی تھی۔ میرے سر پر انتقام سوار تھا۔

''میں اِس جاگیر کا اکیلا مالک ہوں۔ کسی کو اس میں شریک نہیں بننے دوں گا۔''

میں ساری رات جاگتا رہا اور منصوبے بناتا رہا کہ نین تارا کو کیسے مزہ چکھاؤں۔ کیسے اُس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لوں کہ وہ ہمیشہ یاد رکھے۔ اور پھر میرے شیطانی دماغ میں ایک ترکیب آئی تھی۔ جس سے سانپ بھی مر جاتا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹتی۔ یعنی میں بُرا بھی نہیں بنوں گا اور نین تارا میرے راستے سے ہٹ جائے گی۔

صبح میں اپنے کمرے سے نکلا تو معلوم ہوا کہ ابا اور نین تارا زمین دیکھنے گئے ہوئے ہیں۔ میں کھولتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میرا ارادہ گاؤں سے باہر جانے کا تھا۔ گاؤں سے باہر ایک ہندو سادھو تھا۔ جو کالے عملیات کا ماہر تھا۔ میں اس کے پاس جا پہنچا۔

اس کی جھونپڑی سے ناگوار بُو آ رہی تھی۔ جگہ جگہ کھوپڑیاں اور ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔

وہ شاید کسی چلے میں مصروف تھا۔ میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ نفرت اور حسد نے مجھے کہاں پہنچا دیا تھا۔ وہ میری بہن تھی۔ مگر میں ظالم ہوگیا تھا، اُس کی ایک ذرا سی معصوم خواہش نے میرے اندر کے حیوان کو جگا دیا تھا۔

''بول کیوں آیا ہے۔'' سادھو کی اچانک آواز پر

میں چونکا تھا۔ سادھو نے میری طرف سرخ انگارہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے ہمت کر کے اُسے ساری بات بتادی۔ نین تارا سے اپنی بے پناہ نفرت بھی۔

''یہ کون سا مشکل کام ہے، ہوجائے گا۔ بس تمھیں اس کے لیے دو شرائط ماننا ہوں گی۔'' سادھو گہرے لہجے میں بولا۔

''وہ کیا شرائط ہیں؟'' میں نے جوش سے بولا۔

''ایک تو 15 دن تک غسل نہیں کرنا اور کوئی نماز نہیں پڑھنی اور 15 دن کے بعد قرآن کی بے حرمتی کر کے میرے پاس لے آنا۔'' سادھو رازدارانہ انداز میں میرے قریب جھکا۔

دوسری شرط سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ قرآن کی بے ادبی...... میں سوچ میں پڑ گیا۔

''اگر یہ نہیں کرسکتا تو چلا جا یہاں سے۔'' میری خاموشی پر سادھو چیخا۔

''دوسری شرط بہت مشکل ہے مگر اپنے مقصد کی خاطر یہ سب کروں گا۔'' حسد نے میرا ضمیر مار دیا تھا۔ اگر اُس دن میں واپس گھر چلا جاتا اور نین تارا سے نفرت ختم کر دیتا تو شاید آج اِس حال میں نہ ہوتا۔

نماز تو میں پہلے ہی نہیں پڑھتا تھا۔ مگر جمعے کا مسئلہ تھا۔ جو ابا کے ساتھ پڑھنے جاتا تھا۔ اور جہاں تک غسل کا تعلق تھا تو وہ میں سب سے چھپا سکتا تھا۔ مگر گل بانو واقف ہوسکتی تھی۔ اس کا میں نے یہ حل نکالا کہ کم از کم کپڑے روز بدل لیا کروں۔ میں حویلی میں کسی سے زیادہ بات نہ کرتا۔ حویلی میں سب سمجھ رہے تھے کہ شاید مجھے عقل آ گئی ہے۔ میں نے غسل چھوڑ دیا۔ مگر روز کپڑے بدل لیتا۔ جمعے کا دن آ گیا اس دن مجھے بہت بے چینی تھی۔ نماز چھوڑنے کی نہیں ابا سے بچنے کی۔ جمعے کے وقت ابا تیار ہو کر نکلنے لگے تو انھوں نے مجھے بھی آواز دی۔

''قاسم آجا جمعے کو دیر ہورہی ہے۔'' میں نے بہانہ بنایا کہ ابا میرے دوست کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے میں اُسے دیکھ کر وہیں سے مسجد آجاؤں گا۔ یہ مصیبت ایسے ٹل گئی تھی۔ میں روز کپڑے تو بدل لیتا تھا۔ مگر میری بیوی مجھے شک بھری نگاہوں سے دیکھتی تھی۔

''قاسم آپ روز نہاتے ہیں مگر آپ کے کپڑوں سے ناگوار مہک آتی رہتی ہے۔'' گل بانو الجھن بھرے لہجے میں بولی۔

''مہک! مگر میں تو روز نہاتا ہوں۔'' میں نے تھوک نگلتے ہوئے جھوٹ بولا۔

''پتا نہیں مگر بہت ناگوار بو ہے۔'' اس کی آنکھوں میں شک کے بادل اُٹھے۔

''اچھا زیادہ بک بک مت کرو، بڑی آئی نیک بی بی۔'' میں نے ناگواری سے اُسے جھڑک دیا سچ کڑوا جو تھا۔

☆☆☆

پندرہ دن ہوچکے تھے۔ دوسری شرط پوری کرنے کا وقت آچکا تھا۔ میں اپنی بیوی کے سونے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ سوگئی تو میں اُٹھا، رات کے دو بجے تھے۔ میں نے الماری کھولی جس میں قرآن پاک رکھے ہوئے تھے۔ میں نے سب سے پرانا قرآن پاک نکالا جو کوئی پڑھتا ہی نہیں تھا۔

میرے ہاتھ بُری طرح کانپ رہے تھے۔ مگر کیا کرتا اُس نفرت اور حسد کا جو مجھے ایک پل بھی چین سے سونے نہیں دے رہی تھی۔ ابھی میں الماری بند کر کے مُڑا ہی تھا مجھے ایسا لگا کہ جیسے زمین ہل رہی ہو۔ میں اپنی جگہ رک سا گیا کہ واقعی زلزلہ آ رہا ہے۔ حویلی میں چیخ وپکار سی مچ گئی تھی۔ میری بیوی جو اُمید سے تھی گھبرا کر اُٹھ گئی۔ حویلی میں سب کلمہ پڑھ رہے تھے۔ میرا دل بُری طرح کانپ رہا تھا۔ میرا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ یہ زلزلہ نہیں ہے۔ قرآن کی ابھی ابھی جو بے حرمتی ہوئی ہے یہ اُس کا نتیجہ تھا۔

کچھ دیر بعد زلزلہ رُک گیا۔ حویلی میں سکون ہوتا گیا۔ صبح حویلی میں زلزلے کی باتیں ہورہی تھیں۔ مگر گاؤں کے کسی فرد نے زلزلے کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ سب حیران تھے کہ یہ کیسا زلزلہ تھا جو صرف حویلی والوں کو ہی محسوس ہوا تھا۔ میں اپنے ارادے سے باز آنے والا نہیں تھا۔

نیچے اُترتے ہوئے میری نظر نین تارا پر پڑی، وہ بھی اب مجھ سے بات نہیں کرتی تھی۔ میں اُسے دیکھ کر اندر تک کڑوا ہوگیا۔ بہت جلد ڈاکٹر صاحبہ کی عقل ٹھکانے آجائے گی۔ یہ کام بہت خوفناک تھا۔ مگر وہ مجھے کرنا تھا۔

☆☆☆

''یہ لو!'' میں نے قرآن نکال کر سادھو کو دیا۔ جسے دیکھتے ہی سادھو کی آنکھوں میں شیطانی چمک اُبھری تھی۔

''بہت اچھے!'' سادھو میری طرف دیکھ کر مکروہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

''بس آگے کا کام آسان ہوگیا ہے۔'' سادھو نے ایک گڑیا نکالی۔ گڑیا کے سر میں سوئیاں چبھوئیں اور اس کی ٹانگوں کو کالے دھاگے سے باندھ دیا۔

''یہ لے۔'' سادھو نے گڑیا میری طرف بڑھا دی۔ میں نے دیکھا گڑیا پر ''نین تارا'' کا نام لکھا تھا۔ یعنی میری منزل قریب آگئی تھی۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ سادھو نے قرآن دیکھ کر ان پر پڑھائی شروع کر دی تھی۔ پھر پھونک مار کر مجھے دے دیا۔

''اِس کو اپنی بہن کے بستر کے نیچے رکھ دینا اور گڑیا قبرستان میں پرانی سی قبر میں دبا دینا اور یہ چھری لو اِن پر یہ منتر پڑھنے ہیں جو میں تمھیں بتادیتا ہوں اور آخر میں چھری پر پھونک مار کر گڑیا کے پیٹ میں گاڑ دینا۔'' سادھو نے تمام عمل کے بدلے میں بھاری رقم وصول کرتے ہوئے کہا۔

میں جھونپڑی سے نکلنے لگا تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔ میں وہیں رک گیا۔ انسان کا ضمیر اُس کو کوڑے مارتا رہتا ہے جب تک انسان خود نہ ٹھان لے نے میں اُس کو آواز نہیں سنی۔ بارش تیز سے تیز ہوتی جارہی تھی۔ قدرت مختلف بہانوں سے انسان کو روکتی ہے، منع کرتی ہے۔ سمجھاتی ہے، ڈراتی ہے۔ مگر انسان جب شیطان بن جائے تو وہ کہاں باز آتا ہے۔ میرا ذہن اُلجھ رہا تھا۔ شاید سادھو بھانپ گیا تھا۔ میری کیفیات کو وہ سمجھ رہا تھا۔

''کالے عملیات چاند کے آخری دنوں میں کیے جاتے ہیں۔ خاص کر جب دشمن کو راستے سے ہٹانا ہو۔ اگر یہ دن گزر جائیں تو پھر پورا مہینہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔'' سادھو نے تیر چلایا تھا جو ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ فوراً ہی جھونپڑی سے نکل پڑا۔

بارش ابھی بھی ہورہی تھی۔ بجلی کڑک رہی تھی۔ ماحول میں ایک خوفناک سا احساس بسا تھا۔ بجلی چمکنے سے قبرستان کا ماحول مزید خوفناک لگ رہا تھا۔ میں نے گاڑی قبرستان کے باہر کھڑی کی اور ٹارچ نکال لی۔ قبرستان میں چلتے ہوئے بار ہا محسوس ہوتا تھا کہ ابھی قبریں پھٹیں گی اور مُردے باہر نکل آئیں گے اور مجھ پر حملہ کر دیں گے۔ میں نے بہت مشکل سے خوف پر قابو پایا تھا۔ بارش ابھی بھی ہورہی تھی۔ مجھے ایک پرانی قبر کی تلاش تھی۔ ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں گڑیا۔ کیچڑ کی وجہ سے میرا پاؤں پھسلا اور میرے ہاتھ سے گڑیا گر گئی۔ پہلے پرانی قبر تلاش کر رہا تھا اب گڑیا کی تلاش تھی۔

اللہ انسان کو بہانے سے روکتا ہے غلط کام کرنے سے، مگر رُکتا وہی ہے جو انسان ہو، شیطان نے تو ازل سے نافرمانی کی ہے اور ابد تک نافرمانی ہی کرے گا۔ میں نے زمین کی طرف ٹارچ کا رُخ کیا۔ قبروں پر روشنی پڑ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ قبر سے ہاتھ نکلے گا اور میری ٹانگیں پکڑے گا۔ میں نے ہمت کی اور گڑیا کی تلاش شروع کی۔ اچانک میرے پاؤں کے نیچے کوئی نرم سی چیز آئی تھی۔ میں نے دیکھا تو گڑیا تھی۔ میں نے کیچڑ صاف کیا تو ''نین تارا'' لکھا ہوا نظر آیا۔

''منحوس کا پتلا بھی اتنا تنگ کر رہا ہے۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ میں نے جلدی سے پرانی قبر تلاش کی اور وہیں بیٹھ کر منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ میرا منہ سادھو کی ہدایت کے مطابق قبلے کے رخ کے مخالف تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے عمل شروع کیا۔ یکایک کسی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ساتھ والی قبر پہ منظر دیکھ کر میرا خون خوف سے جمنے لگا تھا۔ قبر کے اوپر ایک

آدمی بیٹھا رو رہا تھا۔ اس کا لباس سفید لیکن بہت میلا ہو رہا تھا۔ چہرے سے کئی برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ بارش کے قطرے گرنے کے باوجود اس کا لباس گیلا نہیں ہو رہا تھا۔ خوف کے مارے میں عمل کرنا بھول گیا اور آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مسلسل رو رہا تھا۔

''ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے ہیں۔ برباد ہوئے وہ لوگ جو عورتوں کا وراثت کا حق کھا جاتے ہیں۔ کوئی ٹھکانہ نہیں ان کا اس دنیا میں اور نہ ہی آخرت میں۔''

اس کی آواز سے بہت تکلیف نمایاں تھی۔ ایسی آواز جیسے بہت تشدد اور اذیت کے بعد انسان کراہ رہا ہو۔ وہ دوبارہ رونے لگا تھا۔ اب اُس کی آواز اس قدر بھیانک تھی کہ مجھے لگا کہ میرا دل پھٹ جائے گا۔ میں تیزی سے اُٹھا۔ بھاگنے ہی لگا تھا کہ وہی ہندو سادھو نظر آیا۔ اس نے مجھے قبر کے پاس دھکیل دیا۔

''کہاں جا رہے ہو عمل اُدھورا چھوڑ کر۔ یاد رکھو اگر بھاگنے کی کوشش کی تو میری مددگار قوتیں تمھیں زندہ نہیں چھوڑیں گی، عمل اُلٹا بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے عمل پورا کرو۔'' سادھو کی آنکھیں سُرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

ایک دفعہ پھر ضمیر کی جنگ شروع ہو گئی۔ آخر کار شیطان جیت گیا اور ضمیر کی آواز خاموش ہو گئی۔ اب مجھے اپنی زندگی کی فکر تھی۔ اپنی زندگی بچانے کے لیے میں نے نین تارا کو قبر میں اُتارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

بارش ہلکی ہو چکی تھی۔ آخر میں نے چھری پر پھونک مار کر گڑیا کے پیٹ میں گاڑ دی۔ بادل زور سے گرجا اور بجلی چمکی تھی۔ بجلی کی چمک میں سارا قبرستان نمایاں ہو کر بھیانک لگ رہا تھا۔ بہت سی چمگادڑیں نہ جانے کہاں سے شور مچاتی ہوئی گزر گئیں۔ میرا دل خوف کے مارے دھڑکا تھا۔ کچھ عجیب و غریب پرندوں کی آوازیں بلند ہوئی تھیں اور پھر ہر سو سناٹا چھا گیا۔ عمل ختم کر کے میں نے گڑیا قبر کھود کر اُس میں دبا دی۔ اور بہت مطمئن ہو کر گھر آ گیا۔ گھر میں سب سو رہے تھے۔ میں نہایا اور کپڑے تبدیل کیے۔ میں کافی دنوں بعد نہایا تھا اس لیے خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ میں بہت پرسکون ہو کر سو گیا تھا۔

اب عمل کا دوسرا مرحلہ تھا۔ یہ کام مشکل تھا کیونکہ میں کبھی نین تارا کے کمرے میں نہیں گیا تھا۔ اور یہاں یہ کہ اُس کے کمرے میں وہ قرآن رکھنا تھا۔ کسی ملازمہ کو کہہ کر یہ کام کروانا مناسب نہیں تھا۔ کہ کہیں بات نہ کھل جائے۔ میں اپنے کمرے سے باہر نکلا تاکہ حالات کا جائزہ لے سکوں۔ ملازم نے بتایا کہ ابا اور نین تارا ہسپتال کی زمین کے سلسلے میں باہر گئے تھے۔ میرے پاس سنہری موقع تھا میں فوراً قرآن لے کر نین تارا کے کمرے میں گیا اور جلدی سے بیڈ کے بالکل درمیان میں رکھ کر فوراً باہر آ گیا تھا۔ کسی کو پتا نہ چل سکا تھا۔

☆☆☆

میرا بیٹا ہوا تھا۔ میں بہت خوش تھا ساری حویلی میں جشن منایا گیا تھا۔ پورے گاؤں میں مٹھائی بانٹی گئی تھی۔ ابا اماں، نین تارا سب بہت خوش تھے۔

رات کے کسی پہر نین تارا کی چیخوں سے پوری حویلی گونج اٹھی تھی۔ ہم سب اُٹھ گئے۔ نین تارا مسلسل روئے جا رہی تھی۔ اماں اور ابا اسے تسلی دے رہے تھے۔

''نین تارا کیا ہوا ہے! کیوں رو رہی ہو؟'' گل بانو نے پریشانی سے پوچھا۔

''بھابی میرے کمرے میں دو لمبے لمبے کالے سائے تھے۔ وہ میری طرف بڑھ رہے تھے۔ انھوں نے میری گردن دبانے کی کوشش کی تو میری چیخ نکل گئی۔'' نین تارا روتے ہوئے بولی۔

لگتا ہے کالے علم نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا ہے۔ میرے ذہن میں فوراً خیال آیا تھا۔ اماں اُسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ بس پھر تو یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ ساری رات روتی رہتی چیخیں مارتی رہتی۔ کبھی کہتی میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ کبھی کہتی میں جیسے ہی سونے لگتی ہوں ایسے لگتا ہے سارے جسم میں آگ لگ گئی ہے۔ وہ بیڈ سے اُتر کر نیچے لیٹتی تو وہی سیاہ سائے آ جاتے تھے۔ جن کے آنے سے کمرے میں سڑے گوشت کی بدبو آنے لگتی۔ وہ ساری رات جاگتی رہتی۔ چند دنوں میں اُس کی حالت پاگلوں جیسی ہو گئی۔ میں اپنے کمرے میں پُرسکون لیٹا اُس کی چیخوں کی آوازیں سنتا رہتا۔ میں جانتا تھا کہ وہ سائے سادھو کے مؤکل تھے۔ جو عمل پورا کر رہے تھے۔ جو نین تارا کو ڈراتے تھے۔

حویلی میں سب بہت پریشان رہنے لگے تھے۔ کسی کو کوئی مسئلہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ ساری رات فرش پر لیٹی رہتی۔ جیسے ہی بستر پر لیٹتی تو چیخیں مارتی اُٹھ جاتی۔ ایک رات اسی طرح رونے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ اماں ابا بُری طرح رو رہے تھے۔ نین تارا سیڑھیوں کے پاس بے ہوش گری ہوئی تھی۔ اُسے ہسپتال لے جایا گیا تو پتا چلا کہ اُس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔

وہ وہیل چیئر پر واپس حویلی آئی تھی۔ اس کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے رحم نہ آیا تھا۔ کس قدر پتھر دل تھا میرا۔ وہ سارا دن اپنے کمرے میں پڑی رہتی، ہنسنا بولنا سب چھوڑ دیا تھا۔ سب اُس کی زندگی کی دعائیں مانگ رہے تھے اور میں اُسے قبر میں اتارنے کا انتظام کر کے آیا تھا۔

کچھ دنوں بعد وہ سوتے میں مر گئی۔ کسی کو پتا نہ چلا کہ اسے کیا ہوا تھا۔ میں خوش تھا کہ میرے راستے کا پتھر ہٹ گیا تھا۔ اب پھر سے میری بادشاہی حویلی میں قائم ہونے والی تھی۔ اماں ابا غم سے نڈھال تھے۔ مگر میرا خون سفید ہو چکا تھا۔

''قاسم مجھے لگتا ہے نین تارا کی موت قدرتی نہیں ہے۔'' گل بانو پُرسوچ انداز میں بولی۔

''کیا مطلب؟'' میں چونکتے ہوئے بولا۔

''یعنی کہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ نین تارا کو سایا ہو گیا تھا۔ مگر میرا دل کہتا ہے کہ اُس پر کسی نے کچھ کروایا تھا۔'' گل بانو مزید بولی۔

''کیا بکواس ہے؟'' میں نے ڈانٹ دیا۔

''میں اندازہ نہیں لگا رہی اُس کے کمرے کی

صفائی کرتے ہوئے قرآن ملا تھا۔ جس سے۔۔۔۔۔۔۔۔" گل بانو تاسف بھرے انداز میں بولی۔

بے کار باتیں کر کے میرا سر نہ کھاؤ۔ اپنے اندازے اپنے پاس رکھو۔" میں نے اُسے جھڑک دیا۔

☆☆☆

میرا دوسرا بیٹا پیدا ہوا تو وہ معذور تھا۔ میرا دل بجھ سا گیا۔ چند دنوں کے بعد میرا بیٹا فوت ہو گیا۔ میرے اوپر غم کا پہاڑ ٹوٹ چکا تھا۔ اماں ابا تو پہلے ہی جوان بیٹی کی موت پر نڈھال تھے۔ اب مزید دکھی ہو گئے تھے۔ ایک قیامت تھی جو حویلی پر ٹوٹ چکی تھی۔ اور پھر اس کے بعد حویلی پر غم کے بادل چھا گئے۔ حویلی میں پھر کبھی خوشی نہ آئی۔

میرا بڑا بیٹا سیڑھیوں سے گرا اور گرتے ہی مر گیا تھا۔ میری کمر ٹوٹ چکی تھی۔ گل بانو بالکل خاموش ہو گئی تھی۔ نین تارا کی موت کے بعد مجھے ہر کام میں نقصان ہو رہا تھا۔ کبھی تیار فصل تباہ ہو جاتی۔ کبھی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا۔ ایک رات میں سوتے سے اُٹھ گیا۔ پسینے میں بھیگ چکا تھا۔ میں نے خواب دیکھا کہ میں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو ایک لڑکی بیٹھی رو رہی تھی۔

"کون ہو تم؟" میں نے اس سے پوچھا۔

اس لڑکی نے سر اُٹھایا تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ نین تارا تھی۔

"بھائی آپ نے میرے ساتھ یہ ظلم کیوں کیا۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا کہ آپ نے وقت سے پہلے مجھے مار دیا۔" نین تارا کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر شکوہ تھا۔ میرے خوف سے پسینے چھوٹ گئے میں گنگ کھڑا تھا۔

"میرے اللہ تُو اِسے کبھی معاف نہ کرنا۔ نہ دنیا میں اور نہ دنیا میں اور نہ ہی آخرت میں۔" نین تارا نے آسمان کی طرف دیکھا اور دردناک انداز میں کہتے ہوئے غائب ہو گئی۔

میں کتنی دیر تک بستر پر پریشان بیٹھا رہا تھا۔ یہ مصیبت میں نے خود مول لی تھی۔ اب بھگتنے کا وقت آ چکا تھا۔

میری بیوی پھر امید سے تھی۔ پتا نہیں کیوں اس بار مجھے خوشی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے لگا کہ اس بار میرے ساتھ کچھ بُرا ہونے والا ہے۔ میں ساری ساری رات جاگتا رہتا۔ نین تارا کی بے بسی اور اُس کی چیخیں مجھے رات بھر جگاتی تھیں۔

میں گاؤں کے امام مسجد کے پاس اپنا مسئلہ لے کر گیا کہ مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔ وہ علم و حکمت میں بہت سمجھ بوجھ رکھتے تھے۔ انھوں نے میرا مسئلہ سن کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ جب آنکھیں کھولیں تو ان کے ماتھے پر ناگواری سے بل تھے۔

"قرآن کی بے حرمتی کرو، کالا علم کرواور ناحق کسی کا قتل کرواور اس کے بعد یہ کہنا کہ مجھے سکون کی نیند نہیں آتی۔ چوہدری صاحب میرے پاس آپ کے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ آپ نے حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں زیادتی کی ہے۔ آپ چلے جائیں۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" امام صاحب نے مجھے مایوس لوٹا دیا تھا۔

میری بیوی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اُسے شہر لے کر جانا پڑا تھا۔ ڈاکٹروں نے جو خبر مجھے سنائی تھی اُسے سن کر میرے پیروں تلے زمین نکل گئی تھی۔ میرا بیٹا ہوا تھا جس کے دو سر تھے۔ اس کی رنگت بالکل سیاہ تھی۔ اس کی آواز اس قدر بھیانک تھی کہ سب لوگ توبہ استغفار کر رہے تھے۔ میری بیوی قریب المرگ تھی۔ ڈاکٹروں نے صاف جواب دے دیا تھا۔

"قاسم میں جانتی ہوں کہ نین تارا پر کالا علم آپ نے کروایا تھا۔ قرآن پاک کی بے حرمتی بھی آپ نے کی تھی۔ اللہ نے ہمیں اولاد کے دُکھ دیے تا کہ ہمیں سزا ملے۔" یہ کہہ کر گل بانو نے دم توڑ دیا تھا۔ میرا بچہ بھی مر چکا تھا۔ اماں ابا تو صدمے جھیل کے ٹوٹ سے گئے تھے۔ اب اس نئے غم پر ایک ایک کر کے دنیا سے منہ موڑ گئے۔

میں سارا دن دیوانوں کی طرح پھرتا رہتا تھا۔

جس حویلی کا واحد مالک بننے کے لیے اتنا کچھ کیا وہ برباد ہو چکی تھی۔

ایک دن اسی طرح بھٹکتے بھٹکتے نین تارا کی قبر پر آ گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن میں نین تارا کی قبر پر روز آتا ہوں۔ اللہ سے معافیاں مانگتا ہوں۔ قرآن کو ہاتھ لگاتے مجھے شرم آتی ہے۔"

چوہدری قاسم خاموش ہو چکا تھا۔ اُس کی کہانی سُن کر میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ میں جو اُسے حوصلہ دینے بیٹھا تھا۔ میرا اپنا حوصلہ ختم ہو چکا تھا۔

میں نے ایک نظر چوہدری قاسم پر ڈالی اور جھونپڑی سے بالکل باہر نکل آیا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی مگر اب مجھ سے وہاں رکا نہیں جا رہا تھا۔ میں بوجھل قدموں سے چلتا ہوا قبروں کے پاس سے گزرا تو میری نظر نین تارا کی قبر پر پڑی۔ اس خاموش اور پُرسکون قبر کے نیچے یہ داستان چھپی تھی۔

میں گھر آ گیا مگر دل و دماغ چوہدری قاسم کی طرف لگا ہوا تھا۔ مجھے اس پر رحم آ رہا تھا۔ مگر میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کافی دنوں تک میں قبرستان نہیں گیا تھا۔ دو ہفتوں کے بعد میرا قبرستان جانا ہوا تھا، تو دیکھا کہ چوہدری قاسم کا ڈرائیور "نین تارا" کی قبر کی صفائی کر رہا تھا۔ اور اس پر پھول ڈال رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں اُس کے پاس چلا گیا۔

"چوہدری صاحب خود نہیں آئے۔" میں نے ملازم سے پوچھا۔

"چوہدری صاحب اب چل نہیں سکتے۔" ملازم کے بتانے پر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

"کیوں کیا ہوا انھیں۔" میں نا سمجھی سے بولا۔

"انھیں کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا تھا جس کی وجہ سے وہ معذور ہو گئے ہیں۔" ملازم کہہ کر واپس چلا گیا۔

☆☆☆

میں شام کو سیدھا حویلی گیا۔ چوہدری بستر پر لیٹا تھا۔ میں اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا میں نے وجہ پوچھی۔

"بس اللہ کی پکڑ میں آ گیا ہوں۔ میں اب چل نہیں سکتا۔ میں نے قرآن کی بے حرمتی کی تھی۔ اس دن میں نین تارا کی قبر پر بیٹھا رو رہا تھا کہ عجیب وغریب بڑے بڑے کیڑوں نے میری ٹانگوں پر کاٹ لیا۔ کالے علم کی وجہ سے میں ایمان بھی گنوا بیٹھا۔ جس دولت و جائیداد کی خاطر میں نے سب کیا اب وہ میرے لیے بے معنی ہو چکی ہے۔" یہ کہہ وہ زار و قطار رونے لگا۔ میں نے تسلی کے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ کہے اور گھر آ گیا۔

فجر کی اذان کے وقت میری آنکھ کھلی۔ میں وضو کر کے مسجد جانے لگا تھا کہ اعلان ہوا۔ "چوہدری قاسم رضائے الٰہی سے وفات پا گئے ہیں۔"

میں تیزی سے مسجد کی طرف گیا۔ معلوم ہوا کہ چوہدری قاسم کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی کہ ٹانگیں کاٹنی پڑ گئیں اور وہ برداشت نہ کر سکا اور فوت ہو گیا۔

چوہدری قاسم کی تدفین کے بعد میں قبر کے پاس بیٹھا اُن کی مغفرت اور آسانی کے لیے دعا کر رہا تھا کہ اچانک میری نظر کچھ عجیب و غریب کیڑوں پر پڑی وہ بہت تیزی کے ساتھ چوہدری قاسم کی قبر کی طرف آ رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر میں خوف سے پیچھے ہٹ گیا۔ ایسے کیڑے میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ تیزی سے قبر میں اُتر کر غائب ہو گئے۔ میں نے شدتِ غم اور خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

"اے اللہ تو ہی چوہدری قاسم کی مغفرت فرما۔"

میں دعا کر کے قبرستان سے باہر آ گیا۔

بالکل صحیح ہے کہ کالا جادو کرنے والا کافر ہے۔ کیونکہ وہ اللہ سے جھگڑا کرتا ہے۔ اپنی تقدیر پر راضی نہیں ہوتا۔ اپنا ایمان بھی گنوا بیٹھتا ہے اور دنیا آخرت بھی برباد کر لیتا ہے۔

قارئین میری آپ سے گزارش ہے کہ کبھی بھی نفرت اور دشمنی میں اتنا آگے نہ بڑھ جائیں کہ کالے جادو کا سہارا لینا پڑے۔ یہ دولت یہیں رہ جاتی ہے۔ دنیا سے جاتے وقت صرف نیک اعمال کا ذخیرہ ہی ضروری ہے۔ اللہ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆



روم نمبر 607

نفیسہ سعید

اٹلی میں پیش آنے والا قصہ حیرت' کلام اللہ کی طاقت کا پیش خیمہ

سفیان اور اس کا دوست حیدر علی دونوں مل کر نوادرات کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کے اس بزنس کا دائرہ کار تھائی لینڈ، بنکاک اور یورپ کے دیگر ممالک تک پھیلا ہوا تھا، جن میں خاص طور پر اٹلی بھی شامل تھا۔ یہ دونوں دوست تھائی لینڈ سے قیمتی پتھر اٹھاتے اور ان ممالک میں سپلائی کرتے جو ان کے خریدار تھے۔ جس کے سلسلے میں ان کا زیادہ تر وقت پاکستان سے باہر ہی گزرتا۔

دو سال پرانی بات ہے جب حسب روایت سفیان اور حیدر علی نوادرات کی خریداری کے لیے تھائی لینڈ گئے۔ اس دفعہ انھیں اٹلی سے کوئی بہت بڑا خریدار ملا تھا جس کی ڈیمانڈ کے مطابق قیمتی پتھر کی خریداری کے سلسلے میں یہ دونوں تقریباً دو سے تین دن تھائی لینڈ رکنے کے بعد اپنے سارے سامان سمیت اٹلی کے شہر روم جا پہنچے۔ جہاں وہ ڈیلر موجود تھا، جس کو انھوں نے اپنی ڈیلیوری پہنچائی تھی۔

یہاں تک پہنچتے پہنچتے انھیں تقریباً رات ہو چکی تھی۔ ایئرپورٹ کے آس پاس کسی ہوٹل میں کوئی روم خالی نہ تھا۔ عام حالات میں وہ دونوں یورپ کے دوسرے شہروں میں تو جاتے رہے تھے لیکن روم آنے کا اتفاق آج پہلی بار ہوا تھا۔ اسی وجہ سے وہ وہاں کے ہوٹل کے مطابق زیادہ معلومات نہ رکھتے تھے پھر بھی ٹیکسی ڈرائیور کی کوششوں اور کچھ نیٹ سرچنگ کے بعد ایئرپورٹ سے تقریباً آدھا گھنٹہ کی مسافت پر انھیں ایک ہوٹل میں خالی کمرہ مل ہی گیا۔ جس پر ان دنوں نے اللہ کا شکر ادا کیا ورنہ عام طور پر تعطیلات کے دنوں میں روم جیسے شہر میں سیاحوں کا رش اس قدر ہوتا ہے کہ خالی کمرہ ملنا محال ہو جاتا ہے۔ اگر انھیں یہ سب پہلے سے علم ہوتا تو یقیناً یہاں آنے سے قبل وہ اپنے ڈیلر کے ذریعے کسی ہوٹل میں روم بھی بک کروا لیتے۔ ان پر تو روم آتے ہی ایک افتاد یہ بھی پڑی تھی کہ وہ جس سے ملنے اتنی دور آئے تھے، وہ بندہ بھی شہر میں موجود نہ تھا۔ پریذانو' اچانک فیملی میں ہونے والی کسی ڈیتھ کے سبب دو دن کے لیے شہر سے باہر تھا۔ ویسے بھی ان دونوں کے لیے یہ کوئی بڑا ایشو نہ تھا۔ وہ نوادرات کی خرید و فروخت کے ساتھ اپنا سیاحت کا شوق بھی پورا کرتے تھے۔ اس لیے انھیں زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ روم گھومنے کا موقع اتنی آسانی سے مل گیا۔ ہوٹل ریورس ترازا میں چھٹے فلور پر بمشکل ایک روم خالی تھا۔

"چھٹا فلور کچھ زیادہ اوپر نہیں، آنے جانے میں مشکل ہوگی۔" سفیان نے ہوٹل منیجر کی بات سنتے ہی حیدر کو مخاطب کیا جو اٹلی زبان بولنے میں عبور رکھتا تھا اور اس وقت منیجر سے تمام معاملات وہ ہی ڈیل کر رہا تھا۔

"ہاں مگر اس کا کہنا ہے کہ اس کے علاوہ فی الحال کوئی روم خالی نہیں ہے۔ کل تک اگر نیچے کسی فلور پر کمرہ خالی ہو گیا تو پہلی فرصت میں وہ ہمیں دے دے گا۔"

"ٹھیک ہے کر دو پے منٹ۔" سفیان کا تھکن



کے مارے بُرا حال تھا۔ ایسے میں ریورلی ترازا کے فلور پر ملنے والا ایک خالی کمرہ بھی اس کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ پوری پے منٹ کرنے کے بعد ویٹر کی رہنمائی میں وہ دونوں اپنا سامان اٹھائے ہوٹل کے چوتھے فلور پر پہنچ گئے۔ یہاں تک آتے آتے ان دونوں کی سانس پھول گئی۔ کیونکہ حیدر کو لفٹ فوبیا تھا اور وہ کبھی بھی، کسی بھی صورت لفٹ میں سوار نہ ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے بحالت مجبوری سفیان کو بھی ہمیشہ اوپر چڑھنے کے لیے سیڑھیوں کا استعمال کرنا پڑتا۔ یہی وجہ تھی جو وہ چھٹے فلور سے گھبرا رہا تھا۔

روم نمبر 607 کے دروازے پر پہنچ کر ویٹر نے حیدر سے چابی لے کر دروازہ کھولا اور اندر لے جا کر ان کا سامان رکھ دیا، سفیان نے آگے بڑھ کر سامنے لگی بڑی شیشے کی کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا، سامنے نظر آنے والے دریائے ٹمبر کا منظر اس قدر دلکش تھا وہ چند لمحوں قبل سیڑھیاں چڑھنے سے پیدا ہونے والی تھکن اور بےزاری ایک ہی پل میں بھول گیا۔ ویٹر سامان رکھ کر جا چکا تھا۔ حیدر بھی اس کے پیچھے ہی آن کھڑا ہوا۔

"واؤ یار کس قدر خوبصورت منظر ہے یہ۔"

"ہاں اور اس کی خوبصورتی میں اضافے کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ ہم اسے بلندی سے دیکھ رہے ہیں۔" سفیان نے اوپر سے نیچے دیکھتے ہوئے بے خودی سے کہا۔

"یقیناً ایسا ہی ہے۔" حیدر نے اس کی بات کی تائید کی۔

آ جاؤ کھانا کھا لیں، مجھے بہت بھوک لگی ہے۔"

وہ ہوٹل آتے ہوئے کھانا ساتھ لے کر آئے تھے۔ کیونکہ یہاں آنے کے بعد انھیں حلال حرام کا بہت خیال رکھنا پڑتا اور پھر کھانا کھا کر وہ دونوں ایسی

گہری نیند سوئے کہ آنکھ صبح گیارہ بجے بمشکل کھلی، وہ بھی شاید سفیان کے فون پر آنے والی کسی کال سے۔ ورنہ تو وہ اسی طرح بے خود پڑے رہتے۔

☆☆☆

لنچ کے بعد وہ دونوں ہوٹل کے سوئمنگ پول کی جانب آ گئے۔ سوئمنگ کا شوق دونوں میں سے کسی کو بھی نہ تھا یہاں آنے کا ان کا مقصد صرف تفریح تھا۔ سوئمنگ پول کے ایک جانب موجود لکڑی کے بینچ پر یہ دونوں جا بیٹھے، جب ایک بوڑھا سا شخص ان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' اس کا سوال اٹالین میں تھا، جواب میں سفیان نے ذرا سا پرے سرک کے اس کے لیے جگہ بنا دی۔

''شکریہ۔'' بیٹھتے ہوئے وہ شکریہ ادا کرنا نہ بھولا۔

''سنا ہے تم اس ہوٹل کے چھٹے فلور پر رہتے ہو؟''

''جی۔'' حیدر مختصر سا جواب دے کر سامنے نظر آنے والے نظاروں میں گم ہو گیا۔

''مسلمان ہو؟'' اس دفعہ اس شخص کا لہجے میں کچھ حیرت سی تھی۔

''الحمدللہ۔'' سفیان بنا یہ سوچے کہ وہ سمجھا یا نہیں ،فوراً بول اُٹھا۔

''کل رات سے۔'' اس کی طرف سے کیے جانے والے مسلسل سوال سفیان کو الجھا رہے تھے۔

''گاڈ بلیس یو۔'' یہ کہہ کر وہ بوڑھا شخص اچانک ہی بینچ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ سفیان نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔ کیونکہ وہ اس اجنبی شخص کی بلاوجہ کی جراح سے اکتا گیا تھا۔

☆☆☆

''ہوٹل ریورلی ترازا، روم نمبر 607، معاف کیجیے گا، سر آپ وہاں کب سے ہیں۔''

جس ٹیکسی میں وہ دونوں روم گھومنے نکلے تھے اس ٹیکسی کے باتونی ڈرائیور نے جیسے ہی یہ سنا کہ وہ دونوں ریورلی ترازا کے روم نمبر 607 کے رہائشی ہیں۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

حیدر نے ایک نظر ڈرائیور کے چہرے پر ڈالی اور بنا کوئی جواب دیے خاموشی سے آنکھیں موندتے ہوئے گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگا لی۔ جبکہ سفیان لاپروائی سے کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے روم کے نظارے دیکھنے میں محو تھا۔

''آپ لوگ روم نمبر 607 میں کب سے رہ رہے ہیں؟'' ان دونوں جانب سے جواب نہ پا کر بھی ٹیکسی ڈرائیور نے ہمت نہ ہاری اور اپنا پرانا سوال ایک بار پھر دہرا دیا۔

''کل رات سے یار، کوئی پرابلم ہے کیا؟'' حیدر نے ہلکی سی آنکھیں کھول کر اُسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں...... نہیں اٹس اوکے...... ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔'' اس وقت تو وہ دونوں خاموش ہو گئے لیکن رات واپسی پر ہوٹل کے ویٹر کی جانب سے کیے جانے والے سوال نے حیدر کو بتا دیا، اس وقت جب وہ واپس آ کر اوپر جا رہے تھے تو فرسٹ فلور پر ہی انھیں وہ ویٹر مل گیا جو کل ان کا سامان کمرے میں پہنچا کر آیا تھا۔

''آپ آج رات بھی اسی کمرے میں رہیں گے؟'' وہ آج پھر ان دونوں کو اوپر جاتا دیکھ کر اپنی حیرت نا چھپا سکا۔

''کیوں بھائی اس کمرے میں ایسا کون سا خزانہ چھپا ہے جو تمھیں ہمارے اوپر جانے سے پریشانی لاحق ہو گئی۔''

''سوری سر میں نے تو ویسے ہی پوچھ لیا۔'' جلدی جلدی بولتا ہوا وہ ویٹر سیڑھیاں اتر گیا۔

☆☆☆

''ہم مزید دو دن یہاں رہیں گے اور دونوں دن ہمیں روم نمبر 607 میں ہی رہنا ہے۔'' حیدر اور سفیان نے باہمی مشورے کے بعد ہوٹل منیجر کو نہ صرف اپنے فیصلے سے آگاہ کیا بلکہ دو دن کی ایڈوانس پے منٹ بھی کر دی۔

''روم نمبر 607!!'' منیجر کاؤنٹر پر رکھے نوٹ اُٹھاتے ہوئے رک گیا۔

چکی چلتی رہی

کہتے ہیں کہ اللہ والوں کی مدد منجانب اللہ ضرور ہوتی ہے۔ بس توکل علی اللہ قوی ہونا شرط ہے۔ ہم بھی اگر اپنی ''سوچ'' اچھی رکھیں اور اللہ پر بھروسہ کریں تو مدد ضرور آتی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک انصاری بہت غریب تھا۔ گھر میں کھانے تک کو کچھ نہیں تھا۔ اور وہ کسی سے کچھ مانگ کر نہیں کھانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے گھر سے باہر گیا تو اُس کی بیگم نے سوچا کہ پڑوس میں کسی پر ظاہر نہ ہو کہ گھر میں کچھ نہیں ہے۔ اُس نے کھجور کی کچھ ٹہنیاں تندور میں ڈال کر تندور جلایا اور اندر جا کر چکی چلانے لگی۔

تھوڑی دیر بعد جب اس کا شوہر واپس آیا تو پوچھا کہ تم چکی پیس رہی ہو؟

بیوی نے اسے اندر بلایا۔ جب دونوں اندر گئے تو دیکھا کہ چکی خود بخود چل رہی ہے اور آٹا نکل رہا ہے۔ بیوی جلدی جلدی برتنوں میں آٹا بھرنے لگی۔ گھر کے سارے برتن آٹے سے بھر گئے۔ پھر اس نے باہر جا کر تندور کو دیکھا تو وہ روٹیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ انصاری نبی اکرمؐ کے پاس گیا اور جا کر سارا واقعہ سنایا۔ آپؐ نے دریافت کیا کہ پھر چکی کا کیا ہوا؟ انصاری نے جواب دیا کہ پھر میں نے اُسے اٹھا کر جھاڑ دیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم چکی کو اسی طرح رہنے دیتے تو وہ تمہاری زندگی تک یونہی چلتی رہتی۔ سبحان اللہ۔

(زورِ قلم: نزہت ناز۔ کراچی)

''آپ وہاں ایزی فیل کر رہے ہیں سر۔'' اس کا انداز بظاہر سرسری سا تھا۔

''ایزی ہم وہاں انجوائے کر رہے ہیں یار۔'' حیدر نے سگریٹ کا ایک بڑا سا کش لگاتے ہوئے جواب دیا۔

''انجوائے۔'' ہوٹل منیجر ایک بار پھر سے حیران ہوا۔

''پاگل انجوائے، تم شاید کبھی اپنے ہوٹل کے سکس فلور پر نہیں گئے۔ اگر جاتے تو میری بات سن کر اتنا حیران نہ ہوتے۔''

اس بار منیجر نے بنا کوئی جواب دیے جلدی جلدی بل کاٹ کر سلپ اور کارڈ حیدر کے حوالے کر دیا۔

☆☆☆

روم گھوم کر ان دونوں کی واپسی تقریباً دو بجے ہوئی۔ جب وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا رہے تھے اسی پل اوپر سے نیچے اترتی ایک لڑکی ان سے ٹکرا گئی۔

''تم دونوں وہی ایشین ہو نا جو روم نمبر 607 میں رہ رہے ہو۔'' سفیان تھرڈ فلور کی جانب بڑھا ہی تھا جب لڑکی نے آواز دے کر روکتے ہوئے سوال کیا۔ جبکہ حیدر اوپر چڑھ چکا تھا۔

''ہاں۔'' مختصر سا جواب دے کر وہ وہیں کھڑا رہا تاکہ پتا چلے لڑکی مزید کیا کہنے والی ہے۔

''ایشور تمھیں اپنی حفاظت میں رکھے۔''

سفیان نے اس کا جملہ سن کر غور کیا تو پتا چلا وہ ایک انڈین لڑکی ہے۔ یہ کہہ کر وہ لڑکی رکی نہیں بلکہ تیز تیز سیڑھیاں اترتی نیچے چلی گئی۔ سفیان آہستہ آہستہ چڑھتا اوپر آیا تو حیدر فریش ہو کر اپنے بستر پر لیٹ چکا تھا۔

''کیا کہہ رہی تھی وہ کالی میم۔'' انگریزی لباس میں سانولی لڑکی دیکھ کر حیدر ہمیشہ یہی جملہ کسا کرتا تھا۔

''وہی ایک سوال۔'' سفیان نے اسٹینڈ پر لگا تولیہ اُٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

''رونم نمبر 607؟'' حیدر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں یار سمجھ نہیں آتا، ان تین دنوں میں کوئی تین سو لوگ ایک ہی بات بار بار کیوں پوچھ رہے ہیں۔''

لعنت بھیجو سب پر، ویسے جو بھی ہو اس فلور پر سکون بڑا ہے۔ ابھی جب ہم اوپر آ رہے تھے سب فلورز پر گہما گہمی تھی لیکن اوپر آتے ہی سکون مل گیا۔‘‘

حیدر کی بات سچ تھی، اس فلور پر دن کے ٹائم بھی کم ہی لوگ نظر آتے لیکن شام ہوتے ہی یہاں بالکل سناٹا چھا جاتا۔ حیدر بستر میں گھسا اپنے موبائل پر کوئی گیم کھیل رہا تھا جب سفیان چیخ کر آیا۔ ابھی وہ بستر پر بیٹھنے ہی لگا تھا کہ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا بھی موجود ہے۔ سفیان نے پلٹ کر دیکھا۔ حیدر بڑے اطمینان سے ابھی بھی اپنے موبائل میں ہی بزی تھا۔ اس نے یہاں وہاں دیکھا، چاروں طرف کوئی نہ تھا۔

’’شاید مجھے وہم ہوا ہے۔‘‘ دل ہی دل میں اپنے وہم پر مسکراتا جیسے ہی وہ سیدھا ہوا تا کہ لیٹ سکے، یک دم کمرے کے سکوت میں کسی کے قدموں کی چاپ ابھری۔ ہوٹل کا سارا فرش لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی جو اس پر کسی کے چلنے کی ہلکی سی آواز بھی محسوس کی جا سکتی تھی، خاص طور پر رات کے اس پل، سناٹے میں ابھرنے والی یہ آواز خاصی نمایاں تھی۔ سفیان چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ اُسی دم اُسے حیدر کی حیرت زدہ آواز سنائی تھی۔

’’تمھیں کسی کے چلنے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ ایسے جیسے کوئی یہاں اس فرش پر چل رہا ہو۔ وہ بھی اپنے قدم گھسیٹ کر۔‘‘

’’ہاں اور مجھے ایسا بھی محسوس ہوا جیسے فرش پر رکھے جانے والے قدم خاصے بھاری تھے۔‘‘

آواز آنا بالکل بند ہو چکی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس وقت کمرے میں موجود کوئی انجان ہستی ان دونوں کی باتیں سن رہی ہو۔

’’میرا خیال ہے کوئی ہمارے کمرے کے باہر تھا، اُسی کے چلنے کی آواز رات کے اس سناٹے میں گونج رہی تھی۔ سو جاؤ اب!‘‘

آواز آنا بالکل بند ہو چکی تھی۔ اس لیے سفیان نے حیدر کو تسلی دی۔ اسی پل چاپ ایک بار پھر سے ابھری، اس بار آواز پہلے سے خاصی تیز تھی، شاید چلنے والے نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی تھی۔

’’کیا مصیبت ہے یہ۔‘‘ سفیان ایک دم سے اُٹھ بیٹھا۔

’’صبح مجھے ڈائننگ ہال میں ایک لڑکی ملی تھی جس نے یہ مشورہ دیا تھا کہ ہمیں پہلی ہی فرصت میں یہ روم چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن میں نے اس کی کسی بات پر کوئی توجہ نہیں دی، شاید وہ مجھے کچھ اور بھی بتانا چاہ رہی تھی۔‘‘ حیدر بھی دوبارہ ابھرنے والی آواز سن کر اُٹھ بیٹھا، اُسی پل کمرے میں لکڑی کا بھاری فرنیچر بُری طرح لرزنے لگا۔

’’میرا خیال ہے زلزلہ آ گیا ہے۔‘‘ خوف زدہ حیدر بستر پر اُٹھ بیٹھا مگر اسی لمحے کسی نے اس کا بیڈ اُٹھا کر زمین سے اوپر کر دیا۔ یقیناً اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ کہیں وہ اس ساری رفتار کو زلزلہ سمجھ کر کمرے سے باہر نہ نکل جائے۔

’’پلیز مجھے نیچے اتارو۔‘‘ خوف سے حیدر کی گھگی بندھ گئی مگر سننے والے پر کوئی اثر نہ ہوا، حیدر کا بیڈ ابھی بھی ہوا میں معلق تھا۔

’’پلیز مجھے نیچے اتار دو۔‘‘ اس دفعہ اس کے الفاظ اٹالین زبان میں تھے شاید اُسے اندازہ ہو چکا تھا کہ کمرے میں موجود ہوائی مخلوق کی سمجھ میں اُس کی زبان نہیں آ رہی اور اگلے ایک ہی سیکنڈ میں اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ کیونکہ اس کی فریاد سن لی گئی اور بیڈ دوبارہ سے اپنی جگہ واپس آ گیا۔ اب ایک بار پھر کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔ سفیان کو یاد آیا اس نے ابھی تک آیت الکرسی کا ورد نہ کیا تھا جو وہ حسبِ عادت سونے سے قبل کرتا تھا اور شاید موبائل گیم میں مصروف حیدر بھی آیت الکرسی اور دیگر حفاظتی دعائیں پڑھنا بھول گیا تھا۔ اسی لیے یہ سب افتاد نازل ہو رہی تھیں۔

’’آیت الکرسی پڑھو۔‘‘ سفیان نے خوف زدہ بیٹھے حیدر کو پکارا، مگر ان کے آیت الکرسی کا ورد شروع کرنے سے قبل ہی کمرے میں موجود اس مخلوق نے ایک عجیب و غریب حرکت اور کی، اُن کا سارا سامان

کمرے کے دروازے سے باہر پھینک دیا صرف ایک سیکنڈ میں ان کے بیگ جس میں قیمتی نوادرات بھی موجود تھے۔ اس طرح کمرے سے باہر پھینکے گئے جیسے وہ ہوا میں اُڑ کر جا رہے ہو۔ اس منظر نے ان کی یہ حالت کی کہ وہ دونوں آیت الکرسی پڑھنا ایک بار پھر سے بھول گئے صاف پتا لگ رہا تھا کہ اس طرح باہر پھینکنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ وہ دونوں اسی وقت کمرے سے نکل جائیں۔ اس کا یہ اشارہ سمجھتے ہی سب سے پہلے حیدر اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کی تقلید میں سفیان نے جلدی جلدی چپل اپنے پاؤں میں پھنسائی جب اسے حیدر کے بولنے کی آواز سنائی دی۔

’’ہم باہر جانا چاہتے ہیں آپ جو کوئی بھی ہو ہمیں صرف اتنا بتا دو کہ آپ کہاں کھڑے ہو تا کہ ہم آپ سے بچ کر کمرے سے باہر جا سکیں۔‘‘

اس نے اس دفعہ بھی یہ تمام باتیں اٹالین زبان میں کیں۔ اس کی زبان سے ان الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی کمرے میں موجود ہستی نے انھیں اپنی موجودگی کا احساس اس طرح دلایا کہ وہ دونوں ہکا بکا رہ گئے۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس نے کمرے میں موجود وزنی ٹیبل اُٹھا کر ہوٹل کی چھت سے لگا دی۔ اتنی وزنی ٹیبل کا اس طرح ہوا میں معلق ہونا، یقیناً اس بات کی علامت تھا کہ وہ مخلوق اس وقت وہاں ہی کھڑی ہے جہاں ہوا میں ٹیبل معلق تھا۔ اب سفیان اور حیدر کے پاس کوئی راستہ نہ بچا تھا۔ ماسوائے اس کے کہ وہ اپنی جانیں بچا کر کمرے سے نکل بھاگیں اور اپنے دونوں وزنی بیگ بمشکل گھسیٹتے ہوئے وہ پانچ منٹ میں نیچے گراؤنڈ فلور پر آ گئے۔

آج وہ نیچے لفٹ سے آئے تھے کیونکہ خوف زدہ حیدر اپنا لفٹ فوبیا بھول گیا تھا۔ نیچے آتے ہی سفیان ہوٹل منیجر پر چڑھ گیا۔

’’جب تم سب لوگوں کو علم تھا کہ روم نمبر 607 میں جنات کا بسیرا ہے تو تم نے جرأت کیسے کی ہمیں وہ روم دینے کی۔‘‘

’’ایک منٹ سر! تحمل سے میری بات سنیں، ہم نے آپ کو روم صرف ایک رات کے لیے دیا تھا اور اس رات کی صبح جب آپ بخیریت نیچے آ گئے تو ہمیں خود حیرت ہوئی۔ لیکن اگلی رات بھی آپ کو کسی نے کچھ نہ کہا تو ہم بھی خاموش ہو گئے اور پھر وہاں مزید رہنے کا پروگرام آپ کا تھا۔ جبکہ میں نے پے منٹ لینے سے قبل آپ کو سمجھانا چاہا تھا لیکن آپ نے میری بات نہیں سنی۔‘‘

منیجر کی بات درست تھی سفیان خاموش ہو گیا۔

’’مگر پھر بھی آپ کا فرض تھا ہمیں اس سارے خطرے سے آگاہ تو کرتے۔‘‘ اب جب وہ بولا تو اس کا لہجہ پہلے کی نسبت نرم تھا۔

’’اصل میں سر ہم نے سنا تھا کہ مسلمانوں کے کلام میں وہ خاصیت ہوتی ہے جو ایسی بُری چیزوں کو بھگا سکے اور آپ چونکہ مسلمان تھے اس لیے ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے آپ نے اپنے کلام کی طاقت سے اس بُری مخلوق کو زیر کر لیا ہے۔‘‘

’’اوہ۔‘‘ حیدر نے منیجر کی پوری بات سن کر اپنے ہونٹ سکوڑے۔

’’تم ٹھیک کہہ رہے ہو، پچھلے تین دن سے ہم دونوں آیت الکرسی اور چاروں قل کے علاوہ بھی کچھ خاص دعائیں پڑھ کر سوتے رہے ہیں اس لیے کچھ نہیں ہوا۔ یہی وجہ تھی جو آج اس نے ہمیں روحانی عمل سے قبل ہی روک دیا اور اپنا شیطانی کام شروع کر دیا۔‘‘

اب ان دونوں کی سمجھ میں ساری بات آ گئی اور پھر اس رات کا باقی وقت انھوں نے نیچے لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھ کر گزار لیا۔ لیکن جب تک وہ وہاں سے واپس نہ آئے سارے کمروں کے لوگ انھیں باری باری آ کر دیکھتے، ان سے ملتے اور حیرت کا اظہار کرتے کہ تین راتیں اُس کمرے میں گزارنے کے بعد وہ زندہ تھے۔

یقیناً ہمارے کلام پاک میں ایسی تاثیر موجود ہے جو بُری بلاؤں کو ہم سب سے دور رکھنے کا سبب بنتی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہم سب مسلمانوں کو ایسی شیطانی بلاؤں سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

☆☆☆



پراسرار نمبر کی چوتھی خاص کہانی

گم شدہ چہرہ

شانی خامان

اس لڑکی کی لرزا دینے والی خوف بیتی، جس کا چہرہ ہوائی مخلوق لے گئی تھی

''ارے لڑکی گھوڑی ہوگئی ہے مگر وہی بچپن والی عادتیں...... کب تجھے عقل آئے گی۔'' ......صابرہ بیگم اپنی پوتی کو جو صحن میں لگے گھنے نیم تلے بال بنانے میں مصروف تھی۔ دیکھ کر بولی تھیں۔

''ارے کم عقل شام ہوتے ہی بال کھول کر پیڑ تلے آجاتی ہے۔ جانتی نہیں اس سے طرح طرح کی چیزیں باہر نکلتی ہیں۔''

''ارے میری پیاری سی دادی جان آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ آپ کی یہ طرح طرح کی مخلوق بڑی نا قدری ہے، انھیں میں کہاں نظر آنے والی۔ میرے ایسے بھاگ کہاں۔'' وہ دادی کو مزید تاؤ دلاتے ہوئے بولی تھی۔

''ارے اُلو کی پٹھی نہ ہو تو۔ یہ کیا فضولیات بک رہی ہے۔ پناہ مانگو خدا سے۔'' دادی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

''امی میری بس آنے والی ہے، آج مجھے کچھ دیر ہوجائے گی۔ واپسی سعدیہ کے ساتھ ہوگی۔'' وہ چائے کا آخری گھونٹ جلدی سے حلق میں اتارتے ہوئے بولی تھیں۔

''اچھا بیٹا خدا کی امان میں جاؤ آؤ۔'' عالیہ بیگم بیٹی کو دعا دیتے ہوئے بولی تھی۔

''اماں آپ بھی ناشتا کرلیں تو مخدوم صاحب کے گھر جانا ہے۔ اُن کی بیوی نے اپنی ماہم کے لیے ایک بہت اچھا رشتا بتایا ہے۔

ہاں بیٹا اچھی بات ہے۔ خیر سے ماہم اب بڑی ہوگئی ہے۔ جتنی جلد اپنے گھر کی ہو اچھا ہے، ویسے بھی مجھے ماہم کے حوالے سے بہت پریشانی سی رہتی ہے۔ عجیب لڑکوں والی عادتیں ہیں اس کی۔ نہ کسی کا ڈر نہ خوف، بھلا کیا کام تھا کل بھرے بازار میں اُس لڑکے کی پٹائی کا۔ ارے اُس نے دوسری لڑکی کو چھیڑا تھا، یہ کون تھی درمیان میں مولا جٹ بن کر سامنے آنے والی۔ یہ کوئی تک ہے۔ یقین کرو بہو میں تو شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ یہ بہادری لڑکیوں کو زیب نہیں دیتی۔ نجانے کب کیا گل کھلا دے۔ بہتر ہے جتنی جلدی اپنے گھر کی کرو اس کو۔'' دادی کل کے واقعے کو یاد کرتے ہوئے بولی تھیں۔

☆☆☆

''ماہم ماہم گھر آگیا ہے اُترو جلدی سے۔'' سعدیہ ماہم کا کاندھا ہلاتے ہوئے بولی اور ماہم چونک کر جلدی سے اپنا پرس سنبھالتی ہوا اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''ماہم مجھے لگتا ہے تمہاری اوپر والی ایک منزل یقیناً خالی ہے۔ ورنہ یہ بھی کوئی تک ہے، نارمل انسانوں والی حرکت ہے۔ اکثر تم دورانِ سفر یہی کرتی ہو۔ نہ جانے کس دنیا میں کھو جاتی ہو۔'' ماہم کو گہری نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی تھی۔

کم آن سعدیہ بھلا اس میں کیا عجیب ہے۔ تم تو میری بچپن کی دوست ہو۔ تم جانتی ہو کہ مجھے سب سے ہٹ کر دیکھنے، سوچنے اور کرنے کی عادت ہے۔ پتا نہیں کیوں دورانِ سفر یا کہیں آتے جاتے جب بھی میری نظر ان تاریک تپلی اندھیری گندی گلیوں پر پڑتی ہے تو مجھے ایک انوکھا سا احساس ہوتا ہے۔ جب تک یہ میری نظروں میں رہتی ہیں۔ میری نگاہیں پلٹنا بھول سی جاتی ہیں اور میرا دل کرتا ہے میں انھیں قریب سے دیکھوں۔ ان کے اندھیروں میں اُتر جاؤں، نجانے کیوں یہ مجھے پکارتی ہوئی لگتی ہیں۔ اپنے وجود کا ان دیکھا سا حصہ مجھے ان گلیوں میں گم ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ کوئی طلسم، کوئی جادو بے اختیار مجھے کھینچتا چلا جاتا ہے۔''

''خدا کے لیے بس کرو ماہم، ان گندی اور خوفناک گلیوں کی شان میں اور قصیدے نہ سناؤ مجھے۔ چلو یہاں سے۔'' سعدیہ ماہم کی کیفیت جان کر بے چین سی ہوئی تو اُس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے بولی تھی۔

☆☆☆

''سُنو عالیہ بیگم! شام کو تیار رہنا۔ صدیقی صاحب کے ساتھ جانا ہے۔ انھوں نے ایک بہت اچھا اور مناسب رینٹ کا گھر ہمارے لیے دیکھا ہے۔ مجھے تو پسند آیا تم اور بچے بھی دیکھ آؤ تو میں فائنل بات کروں۔'' وہ چائے کا سِپ لیتے ہوئے بولے تھے۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ یہ گھر اب بچوں کی اور ہماری ضرورتوں کے لیے چھوٹا پڑ رہا ہے۔ خیر سے ہمارے تینوں بچے اب بڑے ہوگئے ہیں اور ویسے بھی ہمیں جلد ہی ماہم کی شادی بھی کرنی ہے۔ بڑا گھر ہوگا تو سہولت رہے گی۔''

''ہاں عالیہ بیگم! سچ کہو تو میں بھی روز روز کی اس گھر بدلنے کی ہجرت سے تنگ آگیا ہوں۔ خدا ہمیں بھی اپنا گھر دے۔ یہ مالک مکان کی گھر خالی کرنے کی لٹکتی تلوار ہر وقت سر پر رہتی ہے تو اس سے بھی جان چھوٹے۔'' وہ



دل کا غبار ہلکا کرتے ہوئے بولے تھے، جواب میں عالیہ بیگم نے ٹھنڈی آہ پر ہی اکتفا کیا تھا۔

☆☆☆

شام کو سرور صاحب بمعہ فیملی گھر دیکھنے پہنچ گئے۔ چار بڑے بڑے کمرے، کھلا وسیع صحن، صاف ستھرے کچن باتھ روم۔ گھر ہر لحاظ سے عالیہ بیگم اور بچوں کو پسند آیا مگر ماہم کو جو بات گھر کی سب سے زیادہ پسند آئی۔ (بلکہ اُس کے دل کی مراد بر آئی) وہ گھر کے پیچھے گندی گلی کا ہونا تھا، جس کا دروازہ صحن کے کونے میں بنا ہوا تھا۔

''واہ ابو یہ گھر تو میرے خوابوں کی تعبیر ہے بس آپ آج ہی فائنل کریں۔'' ماہم خوشی سے مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

''ہاں ہاں فکر نہ کرو۔ میری صدیقی صاحب سے بات ہوگئی ہے اور میں ایڈوانس بھی دے چکا ہوں۔ آئندہ چند روز میں ہم یہاں شفٹ ہو جائیں گے۔'' وہ پیار سے اپنی اکلوتی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے تھے۔

گھر کی شفٹنگ میں انھیں دو تین روز ہی لگے اور سب اپنی روٹین میں واپس آ گئے مگر ماہم کی روٹین سب سے الگ تھی۔ وہ گندی گلی کا راستہ اپنے لیے اختیار کرنے لگی۔ بھلے سے کہیں بھی جانا ہوتا، صبح کالج کے لیے بھی اُسے گندی گلی سے جانا پڑتا تھا۔ جس پر اُسے والدین خاص کر دادی سے روز ہی جھاڑ پڑنے لگتی۔

''ارے او کم عقل! کیوں باز نہیں آتی، صاف راستہ چھوڑ کر چوروں کی طرح پچھلے راستے سے کیوں آتی ہے۔'' دادی اُسے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر غصے سے بولتی تھیں۔ مگر وہ دادی کی جھاڑ سُنی ان سُنی کرتی مسکراتی، بلا کیسی خوف و خطر وہی راستہ اپناتی رہتی۔

☆☆☆

آج سعدیہ کی خرابی صحت کی وجہ سے وہ اکیلی کالج گئی تھی، سو واپسی پر بھی تنہا ہی تھی۔ وہ اپنی دھن میں مگن گلی میں داخل ہوئی ہی تھی کہ تیز شور نے اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ارے یہ کیا!!

وہ حیرانی سے گندی گلی میں کھڑے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ بہت سے سانولے سانولے بچے نیکریں پہنے ادھم مچا رہے تھے۔ کچھ عورتیں ساڑیاں پہنے کپڑے دھونے میں، کچھ چولہا جلائے کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔ جبکہ لال لال آنکھوں اور درمیانی قد و قامت کے بہت سے مرد کھڑے ماہم کو گہری نظروں سے تولنے میں مصروف تھے۔ اُن کی نگاہیں ماہم کو اپنے وجود کے آر پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

اُن عورتوں و مردوں کے حلیے اور لباس سے ماہم کو یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ اُن کا تعلق ہندو مذہب سے تھا۔ مگر یہ یہاں کیسے...... کیا نئے نئے آئے ہیں اور میری طرح انھیں بھی یہ گلی یُوز کرنا پسند ہے۔ مگر بھلا گندی یوں گلی میں کپڑے دھونے اور کھانا بنانے کی کیا تک ہے۔ وہ خود ہی سوال و جواب سوچ رہی تھی۔ ہاں میں خود ہی جا کر ان سے پوچھتی ہوں وہ گلی میں قدم آگے بڑھاتے ہوئے سوچنے لگی۔ مگر یہ کیا...... گلی شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہوتی چلی گئی۔ اُس نے اپنی رفتار اور تیز کر لی مگر گلی کی طوالت کم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی گئی۔ وہ کچھ کچھ حواس باختہ سی ہونے لگی تھی۔ آخر تھی تو ایک لڑکی ذات ہی۔ ایک اَن دیکھی دنیا میں موجود ہونے کا ادراک بس پل بھر میں ہوا اور پسینہ اُس کے ماتھے پر پانی کی طرح بہنے لگا۔ دادی کی ساری نصیحتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگی۔ جنھیں وہ اکثر ایک کان سے سُن کر دوسرے سے نکال دیتی تھی۔ وہ انجانے میں اسرار کی ایک ایسی جگہ پہنچ چکی تھی جہاں کے واپسی اس کے اختیار میں نہ تھی۔ لال لال آنکھوں والے مرد اُس کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگے تھے۔ ماہم کا دل اُچھل کر حلق میں آ چکا تھا۔ آخر وہ دل کڑا کر کے بہت ہمت سے بولی تھی۔

''پلیز مجھے گھر جانے دیں۔''

''ہاں جاؤ گی گھر ضرور مگر ایسے نہیں۔''

''پھر کیسے......'' وہ سراپا سوال بن گئی۔

''ہمیں تمہاری خوبصورتی کی بلی دینی ہے لڑکی۔ تم نہیں صرف تمہارا چہرہ چاہیے ہمیں۔ اس گندی گلی میں ہماری پوری بستی آباد ہے اور تمہارا یہ چہرہ ہمارا وہ گم شدہ حصہ ہے، جس کی ہمیں زمانوں سے تلاش تھی۔ یہ گیت، یہ خوشی کا سماں یونہی نہیں۔''

اُن سب کے مکروہ قہقہے اُس کے کانوں میں زہر بن کر اُترنے لگے تھے اور پھر اک تیز آگ سی اُس کے اطراف دہک اُٹھی۔ وہ بے آب مچھلی کی طرح تڑپنے لگی تھی۔ درد کی اذیت سے گھبرا کر بھاگتے بھاگتے وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔

☆☆☆

''آئیں انسپکٹر صاحب! ماہم بی بی اب بیان دینے کے قابل ہیں۔'' ڈاکٹر انھیں ماہم کے روم کی طرف لے جاتے ہوئے بولا تھا۔

وہ اب بھی پٹیوں میں جکڑی بے بس سی پڑی تھی۔ اُس کا درد، اس کی پُور پُور سے عیاں تھا۔

''جی ماہم صاحبہ! کیسی طبیعت ہے آپ کی۔ دیکھیے ہم آپ کی اذیت ختم تو نہیں کر سکتے مگر گناہ گار کو اس کے انجام تک پہنچا کر آپ کا درد کم ضرور کر سکتے ہیں۔ جلد کسی خوف و دباؤ کے بتائیں کس نے کیا آپ کے ساتھ یہ خوفناک، تڑپا دینے والا سلوک، آپ کی دوست سعدیہ اور ایک عینی شاہد کے مطابق وہ لڑکا خرم جو آپ کو پسند کرتا تھا اور آپ کے والدین کے رشتے پر انکار کے سبب اُس نے انتقاماً گلی میں آپ کو تنہا جان کر آپ کے چہرے پر تیزاب ڈالا...... کیا یہ سچ ہے؟''

''نہیں بالکل نہیں۔ میرا چہرہ تو وہ لے گئے ہیں۔ خرم بے قصور ہے۔ جائیں سب یہاں سے۔'' وہ دیوانوں کی طرح چیخنے لگی تو ڈاکٹر اسے ٹھنڈا کرنے لگے۔

''انسپکٹر صاحب! ابھی بھی یہ صدمے میں ہیں۔ چہرہ ختم ہو جانے سے ان کی دماغی حالت پر خاصا اثر پڑا ہے۔'' اُس کے والد انسپکٹر کو ماہم کی حالت بتاتے ہوئے بولے تھے۔

☆☆☆

شیطان کا سامانِ تجارت

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیکھا۔ چار گدھوں پر سامانِ تجارت لادے شیطان جا رہا ہے۔ آپؑ نے پوچھا۔ ''اے مردود! یہ کیا لے کر جا رہے ہو؟''

شیطان نے کہا۔ ''یہ مال تجارت ہے، ایک گدھے پر ظلم، دوسرے پر خیانت، تیسرے پر مکر و فریب اور چوتھے پر حسد لادا ہوا ہے۔''

پیغمبرِ خدا نے پوچھا۔ ''اس مال کا خریدار کون ہے؟''

شیطان نے کہا۔ ''ظلم حکمرانوں اور بادشاہوں کے کام کی چیز ہے، وہ اس کو خریدتے ہیں، خیانت تاجروں کے ہاتھ فروخت کرتا ہوں، مکر و فریب عورتوں کو پسند ہے اور حسد کی علما کے ہاں بہت مانگ ہے، میرے تمام مال کے گاہک موجود ہیں۔''

حسنِ انتخاب: رازِ عدن۔ بحرین

لوگ سمجھتے ہیں اُس لڑکے نے تیزاب ڈال کر میرا چہرہ بگاڑ ڈالا ہے، کوئی میری بات کا یقین نہیں کرتا۔ لوگ مجھے دیوانہ جانتے ہیں مگر میں جانتی ہوں سچ کیا ہے۔ بہت زمانہ گزر گیا ہے۔ میرا سب کچھ کھو گیا ہے۔ میں کھو گئی ہوں مگر میں آج بھی ہر گندی گلی کی تاریکی میں اپنا روشن چہرہ تلاش کرتی ہوں، جس کی بلی چڑھادی گئی تھی۔ کسی دن ضرور میں اُن سے اپنا گم شدہ چہرہ واپس لینے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔'' اور پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگی تھی۔

اجڑے بکھرے بالوں، گندے کپڑے پہنے، مسخ چہرے والی ماہم نامی وہ عورت مجھے ایک گندی گلی کے کونے پر بیٹھی ملی تھی۔ اُس کی یہ انوکھی داستان سُن کر میں کتنے ہی لمحے سُن سی بیٹھی رہی کہ اس کائنات میں کیسے کیسے اسرار چھپے ہیں ماہم کی طرح۔ ایک لمحے میں ایک قدم ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دے کچھ پتا نہیں۔ بس شش شش!!! احتیاط کیجیے۔

☆☆☆



بُھوک

رضوانہ پرنس

اُس دوشیزہ کی خوف میں ڈوبی کتھا' جسے اچانک ہی وہ بُھوکے مل گئے تھے اور......

اس وقت رات کے تقریباً بارہ بج رہے تھے اور وہ بڑے انہماک سے اکنامکس کی کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔ کل اسی سبجیکٹ کا پیپر تھا حالانکہ اس کی اچھی خاصی تیاری تھی لیکن نہ جانے کیوں پھر بھی دل کو اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ یہی سوچ کر ہولے جا رہی تھی کہ اگر کل کا پیپر بہت مشکل آیا تو کیا ہوگا؟

اس نے پڑھتے پڑھتے اچانک ہی وال کلاک کی طرف نگاہ اٹھائی تو گھڑی کی سوئیاں ایک بجا رہی تھیں۔ اس نے جمائی لیتے ہوئے کتاب میز پر رکھ دی۔ 'پانچ منٹ ریسٹ کرلوں پھر نوٹس پڑھنا شروع کروں گی۔' اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے سوچا۔

پورا گھر ایک مہیب سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ امی ابو اور دونوں چھوٹے بہن بھائی اپنے اپنے کمروں میں دنیا و مافیہا سے بے خبر گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ تمام کمرے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ سوائے اس کے کمرے کے یا پھر برآمد میں 40 والٹ کا بلب روشن تھا جو ابو ہمیشہ رات کو جلا دیا کرتے تھے۔

پانچ منٹ ریسٹ کرنے کے بعد اس نے نوٹس کی طرف ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ اسے امی کی آواز سنائی دی۔ وہ اُسے پکار رہی تھیں۔ وہ بری طرح چونک اٹھی۔ اتنی رات گئے امی کیوں مجھے بلا رہی ہیں، کہیں کسی کی طبیعت تو خراب نہیں ہوگئی؟ وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی اور ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی ان کے کمرے میں پہنچی مگر یہ کیا وہ دروازے میں ہی ٹھٹھک کر رک گئی۔

کمرے میں پھیلا گہرا اندھیرا اور مکمل سکوت کچھ اور کہہ رہا تھا۔ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اس کمرے سے کسی نے بھی کوئی آواز نہیں دی ہے۔ اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر امی ابو کے بیڈ کی طرف دیکھا برآمدے سے آنے والی ملگجی سی روشنی میں اسے وہ دونوں بے خبر سوتے نظر آرہے تھے۔

یقیناً یہ میرا وہم تھا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ واپس پلٹی تو سامنے علیب اور رمشا کے کمرے پر نظر پڑ گئی۔ وہ بے اختیار ان کے کمرے میں چلی آئی۔ اسے اپنے ان دونوں چھوٹے بہن بھائیوں سے بے پناہ محبت تھی۔ آٹھ سال تک اس نے اکیلے ہی امی ابو کی بے پناہ محبتیں سمیٹی تھیں لیکن اس کے ساتھ اسے کسی بھائی یا بہن کی کمی کا احساس بھی بہت شدت سے ہوتا تھا جب علیب اور پھر اس کے ایک سال بعد ہی رمشا بھی اس کی تنہائی مٹانے چلی آئی تو جیسے اسے سارے جہاں کی دولت مل گئی۔ ان کے ڈھیر سارے کام وہ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اتنی اچھی طرح انجام دیتی کہ سب حیران رہ جاتے۔ امی سے زیادہ تو وہ ان کے لیے ہلکان ہوا کرتی تھی۔ اب جب کہ دونوں نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا اور وہ کالج میں آگئی تھی اس کا اب بھی وہی معمول تھا۔

امی تو جیسے ان دونوں کی ہر ذمے داری سے بری الذمہ ہوگئی تھیں اور وہ دونوں بھی اپنی نیلما آپی سے کچھ زیادہ ہی اٹیچ تھے۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے کھڑی ان دونوں کو دیکھتی رہی پھر باری باری ان کی پیشانی چوم کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ کیسا عجیب سا سناٹا پھیلا ہوا تھا پورے گھر میں۔ پتا نہیں کیوں ایک عجیب سا خوف اسے اپنے رگ و پے میں دوڑتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے میں آگئی۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے کتاب اٹھائی لیکن دماغ جیسے بلینک سا ہو رہا تھا۔ اس نے امی کی کتنی واضح آواز سنی تھی۔

''نیلما! نیلما جلدی آؤ۔'' کتنی بے قراری تھی ان کی آواز میں اور یہ وہم ہرگز نہیں تھا۔ اس نے اُلجھ کر کتاب نیچے رکھ دی۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔

آج دوپہر کو بھی اس کے ساتھ ایک عجیب سا واقعہ پیش آیا تھا۔ دوپہر کو وہ کچھ دیر کے لیے اپنی بہت عزیز دوست سعدیہ کے گھر کچھ ضروری نوٹس پر ڈسکس کرنے گئی تھی۔ سعدیہ ان کے گھر کے نزدیک ہی رہتی تھی۔ بس دوسری گلی میں اس کا گھر تھا۔

واپسی پر گرمی کی شدت سے گھبرا کر اس نے



درخت کے نیچے کھڑے قلفی والے سے قلفی خریدنے کا ارادہ کیا۔ پرس سے پیسے نکال کر وہ قلفی والے کی جانب بڑھی لیکن وہ پیسے لینے کے بجائے ایک ٹک اسے دیکھنے گیا۔ کیسی عجیب سی آنکھیں تھیں اس کی ساکت اور زندگی سے عاری آنکھیں! نیلما کے ہاتھ کپکپا گئے اور حلق میں جیسے کانٹے اُگ آئے۔ کچھ بولنا چاہا لیکن آواز نکل ہی نہ سکی۔

یہ صرف چند لمحوں کی بات تھی پھر درخت کے اوپر سے کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ منمناتی ہوئی سی ہنسی تھی۔ اس نے گھبرا کر اوپر دیکھا۔ ایک عورت سرخ رنگ کے دوپٹے کا گھونگھٹ کاڑھے اس درخت کی ایک شاخ پر اپنے دونوں پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔

کیسے سیاہ اور سوکھے سے پیر تھے اس کے جو لہنگے سے جھانکتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ نیلما کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے چاہا وہاں سے بھاگ جائے لیکن اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا اس کے پیروں میں جان ہی نہیں رہی تب ہی اتفاق سے پڑوس میں رہنے والی آنٹی اپنی کار میں وہاں سے گزریں اور اُسے یوں حواس باختہ درخت کے نیچے کھڑا دیکھ کر انہوں نے کار روک لی اور اسے پکارا تو وہ حواس میں واپس آ گئی۔

"کیا ہوا نیلما سب خیریت ہے؟" انہوں نے کار کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی قلفی والا اپنا ٹھیلا لے کر آگے بڑھ گیا لیکن اس کی بے جان آنکھیں اس وقت بھی اسے اپنے چہرے پر جمی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ دوڑ کر آنٹی کی کار کر قریب آ گئی اور بنا پوچھے دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

"آنٹی یہ قلفی والا بہت عجیب سا آدمی لگ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ زندہ نہیں بلکہ مردہ ہے۔" پتا نہیں کیسے بے اختیار ہی اس کے منہ سے خوف کے کپکپاتے ہوئے یہ جملے نکلے تھے۔

آنٹی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ "ارے پاگل ایسے نہیں کہتے۔ دیکھو تو بے چارہ اس عمر میں، اتنی شدید گرمی میں گھر چلانے کے لیے کتنی محنت کر رہا ہے۔" وہ کار کو آگے بڑھاتے ہوئے بولیں۔

تب ہی نیلما نے درخت کی اُس شاخ کی جانب دیکھا جہاں اسے وہ عجیب الخلقت عورت بیٹھی ہوئی نظر آئی تھی۔ لیکن اس وقت وہ شاخ بالکل خالی تھی۔ خوف سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ ناحق ہی اس درخت کے نیچے آ کھڑی ہوئی تھی۔ شاید یہ درخت چڑیلوں اور بھوتوں کا مسکن ہے۔

اس نے خوف سے کانپتے ہوئے سوچا لیکن آنٹی سے اس عورت کا ذکر نہیں کیا کہ وہ مذاق اڑاتیں اور پھر گھر آ کر امی سے بھی وہ اس واقعے کو چھپا گئی کیونکہ کل اس کا بہت اہم پیپر تھا اور امی کافی ضعیف الاعتقادہ خاتون تھیں۔ پتا نہیں یہ سن کر ان کا ری ایکشن کیا ہوتا جبکہ وہ بڑی یکسوئی سے تیاری کرنا چاہ رہی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سب میرا وہم ہو گرمی بھی تو اتنی شدید تھی۔

اس نے خود ہی اپنے دل کو تسلی دے ڈالی تھی لیکن اب اس وقت رات کے اس گہرے سناٹے میں وہ خوف جیسے دوبارہ دل کے اندر کمند ڈال کر زور زور سے اسے کھینچ رہا تھا۔ وہ زندگی سے عاری دو بے جان آنکھیں اسے چاروں جانب سے اپنی طرف گھورتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو گیا۔

"یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ شاید مجھے امی کو جگا دینا چاہیے۔" اس نے کانپتے ہوئے دل کے ساتھ سوچا تب ہی علیب کے رونے کی آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا۔

"آپی! آپی۔" وہ بری طرح سے روتے ہوئے اُسے پکار رہا تھا۔

وہ پوری قوت سے دوڑتی ہوئی علیب کے کمرے میں پہنچی تو ایک بے حد دہشت ناک اور روح فرسا منظر نے اس کے ہوش و حواس ہی معطل کر دیے۔ سامنے وہی قلفی والا بوڑھا بیٹھا اپنی زندگی سے عاری آنکھوں کے ساتھ اُسے گھور رہا تھا اور اس کی گود میں علیب تھا جو اس کے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا اور وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے

بری طرح رو رہا تھا۔

"علیب!" وہ پوری قوت سے چیخی۔

وہ بوڑھا آہستہ آہستہ ہنسنے لگا۔ ایسی کریہہ ہنسی کہ نیلما کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے پورے منہ میں صرف تین دانت تھے۔ جن میں ایک دانت خون سے تر تھا جبکہ باقی دونوں دانت بے انتہا میلے اور پیلے تھے۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے مجھے کچھ کھانے کو دو۔" وہ عجیب منمناتی آواز میں اپنا استخوانی ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا جبکہ دوسرے ہاتھ سے اس نے علیب کو مضبوطی کے ساتھ جکڑا ہوا تھا۔

"امی ابو جلدی آئیے۔" نیلما کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور پھر وہ چلاتی ہی چلی گئی۔ دفعتاً اسے کندھے پر کسی کا ہاتھ رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے بے اختیار پلٹ کر پیچھے دیکھا تو وہی صبح والی عورت جس کے چہرے پر اس وقت بھی گھونگٹ ہی پڑا ہوا تھا، اس کے بالکل پیچھے کھڑی تھی۔ نیلما کی چیخیں بے اختیار رک گئیں اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس عورت کو دیکھنے لگی۔

"وہ بھوکا ہے، اسے کچھ کھانے کو دو۔" گھونگٹ کے اندر سے وہ من من کرتی ہوئی بول رہی تھی۔ نیلما تھر تھر کانپنے لگی۔ علیب اب بھی بری طرح رو رہا تھا، تڑپ تڑپ کر اسے پکار رہا تھا لیکن کتنی حیرت کی بات تھی کہ ساتھ والے بیڈ پر لیٹی ہوئی رمشا کی نیند میں ذرا سا بھی خلل نہیں پڑا تھا اور مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ امی ابو اتنا شور و غل ہونے کے باوجود کمرے سے باہر نہیں نکلے تھے، ورنہ امی کی آنکھ تو ذرا سی آہٹ سے کھل جاتی تھی۔

نیلما نے بڑی بے بسی سے اپنے چھوٹے سے معصوم بھائی کو دیکھا جو اس کریہہ شکل بوڑھے کے شکنجے میں جکڑا بری طرح سے تڑپ رہا تھا۔

"میرے بھائی کو چھوڑ دو، تم کو اللہ کا واسطہ!" وہ بے اختیار روتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئی۔ خوف، دہشت اور پریشانی سے جیسے اس کا ذہن مفلوج ہوتا جا رہا تھا۔ ہاتھ پیروں میں جان ہی نہیں رہی تھی۔

"اسے کھانا دو وہ بھوکا ہے۔" دفعتاً وہی منحوس آواز سرگوشی کی صورت میں اس کے کان کے پاس گونجی۔

نیلما کا دل خوف سے بند ہوتے ہوتے بچا۔

وہ عورت بھی اس کے ساتھ ہی زمین پر بیٹھ چکی تھی اور چہرے سے گھونگٹ بھی سرک چکا تھا۔ اس کی بڑی بڑی بے نور آنکھیں جن میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ نیلما کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ناک کی جگہ محض ایک سوراخ تھا اور ہونٹ بھی بالکل سفید تھے۔ وہ اپنا استخوانی ہاتھ نیلما کے کاندھے پر رکھے صرف ایک ہی جملے کی گردان کر رہی تھی۔

"اسے کھانا دو وہ بھوکا ہے۔"

"اچھا میں ابھی کھانا لاتی ہوں تم لوگ علیب کو چھوڑ دو۔" وہ اس سے دور ہٹتے ہوئے بولی۔ خوف سے اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ وہ لرزتے قدموں سے علیب کی جانب بڑھی۔

"میرے بھائی کو چھوڑ دو میں ابھی کھانا لے کر آتی ہوں۔" اس نے بڑے ملتجیانہ انداز میں بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے علیب کی جانب اپنے دونوں ہاتھ بڑھا دیے لیکن دوسرے ہی لمحے خوف کی شدت سے لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گئی۔ علیب کی آنکھیں ایک دم سے بے رمق ہو گئی تھیں۔ ایسی آنکھیں جن میں زندگی کی کوئی بھی رمق نہ ہو۔ وہ اسے گھورتے ہوئے ہنسنے لگا۔ بالکل اسی بوڑھے کی طرح۔ نیلما پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کو دیکھنے لگی۔

اب وہ اپنے دونوں ہاتھوں کے اشارے سے اس کو اپنا پاس بلا رہا تھا۔

"آپی میرے پاس آؤ۔" نیلما نے دیکھا اس کے سات سالہ بھائی کا معصوم چہرہ اس وقت ایک بہت بوڑھے شخص کے چہرے جیسا لگ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ایسی بھیانک ہنسی تھی کہ وہ تھرا کر رہ گئی۔

وہ عورت اس کے پاس سے گزر کر علیب کے نزدیک پہنچ گئی اور پھر اس نے بوڑھے کی گود سے علیب کو چھین کر زمین پر پٹخ دیا۔

نیلما کی بے اختیار چیخ نکل گئی لیکن علیب پر جیسے

گرنے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ دوسرے ہی لمحے پھرتی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی پھرتی اور نیلما کے خوف زدہ چہرے کو دیکھ کر وہ عورت اور بوڑھا زور زور سے ہنسنے لگے۔ علیب نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

''ہی ہی ہی۔'' کمرے میں چار سوان لوگوں کی کریہہ ہنسی کی آواز گونجنے لگی۔

نیلما کی ٹانگیں اور ذہن دونوں ہی شل ہوتے جارہے تھے۔ وہ چیخنا چاہ رہی تھی لیکن حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی پھر اس نے ان تینوں کو رمشا کے بیڈ کی طرف بڑھتے دیکھا۔

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' بوڑھا اپنی منمناتی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے رمشا کے نزدیک آ کر رُک گیا جبکہ علیب اور وہ عورت ابھی بھی بدستور ہنسے جارہے تھے۔

''رمشا یہاں سے بھاگو۔'' نیلما ہذیانی انداز میں چیخی تھی پھر اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ جب ہوش آیا تو وہ اسپتال کے ایک سفید بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔

اس کی امی اور ابو اس کے سرہانے کھڑے ہوئے تھے۔ پریشانی ان کے چہروں سے ہویدا تھی۔ امی کی آنکھیں بہت رونے کی وجہ سے سوجی ہوئی لگ رہی تھیں۔

''امی آپ لوگ کہاں تھے؟ میں نے آپ لوگوں کو کتنا پکارا، کتنی آوازیں دیں۔'' چند لمحے ان لوگوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد وہ یکا یک ہذیانی انداز میں چلانے لگی۔

''رمشا کو بچالیں، علیب کہاں ہے۔''

وہ چیخ چیخ کر پاگل ہوئی جارہی تھی۔ ڈاکٹر اور نرسیں سب کمرے میں جمع ہوگئے تھے لیکن وہ کسی کے قابو میں نہیں آرہی تھی پھر زبردستی اسے نیند کا انجکشن دے دیا گیا اور اس کا ذہن ایک بار پھر غنودگی میں ڈوبتا چلا گیا۔

اس بار جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں امی اور ابو کے علاوہ علیب اور رمشا بھی تھے۔ وہ چند لمحے چپ چاپ دم سادھے علیب کو دیکھتی رہی۔

''آپی آپ کو کیا ہوگیا ہے؟'' علیب اسے آنکھیں کھولتا دیکھ کر بھاگ کر اس کے قریب آ گیا جبکہ امی اور ابو بھی اس کے نزدیک آ کر اس کے ہاتھ سہلانے لگے۔

''علیب وہ بوڑھا آدمی اور وہ عورت کیسے چلے گئے؟'' اس نے نقاہت بھرے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

''کون بوڑھا آدمی؟'' علیب کی معصوم آنکھوں میں تحیر امنڈ آیا۔

''بیٹے یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟'' امی نے ہول کر نیلما کو گلے سے لگالیا لیکن وہ بدستور خوف زدہ نظروں سے علیب کو دیکھتی رہی۔

''یہ میری بچی کو کیا ہوگیا ہے حسیب!'' وہ بے اختیار رودیں۔

☆☆☆

آج صبح جب وہ سو کر اٹھی تھیں تو علیب اور رمشا کو اسکول کے لیے جگانے سے پہلے وہ نیلما کے کمرے میں آئیں تھیں کہ اس کو پیپر کے لیے کہیں دیر نہ ہوجائے لیکن اسے کمرے میں نہ پا کر وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی بچوں کے کمرے میں آئیں تو دروازے پر ہی نیلما کو فرش پر بے ہوش پڑا دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہوگئے اور وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگیں۔

ان کی چیخ پکار سن کر حسیب صاحب دوڑے چلے آئے تھے۔ اس کو فوراً اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں اسے آج دو دن کے بعد ہوش آیا تھا۔ ڈاکٹرز بھی سمجھ نہیں پارہے تھے کہ آخر اسے ہوا کیا تھا۔ انہوں نے حسیب صاحب کو یہ ہی بتایا تھا کہ ان کی بچی کا ذہن کسی شدید خوف اور ڈپریشن کے زیر اثر ہے اور اس وقت اس کی آنکھوں سے چھلکتا خوف ڈاکٹروں کی بات کی تصدیق کررہا تھا۔

''نیلما بیٹا مجھے بتاؤ تم کس بات سے خوف زدہ ہو۔ میں ہوں نا تمہارے پاس میں سب ٹھیک کردوں گا۔'' حسیب صاحب نے بہت پیار سے اس کا سر

سہلاتے ہوئے پوچھا۔

''پھر آپ رات کو کیوں ہماری مدد کو نہیں آئے جب مجھے، رمشا اور علیب کو وہ لوگ ڈرا رہے تھے، ختم کرنے کی کوشش کررہے تھے۔'' وہ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں ان سے شکوہ کرنے لگی۔

''کون ڈرا رہا تھا مجھے سب تفصیل سے بتاؤ بیٹا!'' حسیب صاحب نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے چمکار کر پوچھا جبکہ امی دم سادھے اس کو دیکھ رہی تھیں۔

نیلما نے خوفزدہ نظروں سے علیب کی جانب دیکھا جو نزدیک ہی خاموش کھڑا تھا لیکن اس کی آنکھوں کی بدلتی رنگت نیلما کو واضح طور پر محسوس ہوئی۔ ہونٹوں پر ویسی ہی کریہہ مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ نیلما نے کپکپا کر حسیب صاحب کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''ابو ان لوگوں نے علیب پر جادو کردیا ہے۔ اس کو اپنے جیسا بنادیا ہے۔'' وہ خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں علیب کو دیکھ کر بولی۔

حسیب صاحب نے کچھ حیرت سے علیب کی جانب دیکھا جو اپنی آنکھوں میں زمانے بھر کی معصومیت بھر کر ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

پھر وہ نیلما کی جانب تھوڑا سا جھکا۔ ''آپی مجھے کیا بنادیا ہے اُن لوگوں نے؟'' بڑی معصومیت سے اس نے سوال کیا تھا۔

نیلما نے بے اختیار اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا وہی سرد زندگی سے عاری ساکت آنکھیں اس کو تک رہی تھیں اور اس کا چہرہ کسی بہت ہی بوڑھے شخص کی مانند محسوس ہورہا تھا۔

وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ چہرہ پسینے سے تر ہوگیا۔ ''ابو یہ علیب نہیں ہے۔ ان لوگوں نے ہمارے علیب کو ماردیا ہے۔ آپ میرا یقین کریں ابو میرا علیب شاید مرگیا ہے۔'' وہ بے اختیار حسیب صاحب کا ہاتھ تھام کر بے تحاشا رونے لگی، اس کی چیخیں آسمان کو چھورہی تھیں۔ امی بھی اس کی یہ حالت دیکھ کر رو رہی تھیں۔

''حسیب میری بچی پر کوئی سایا ہوگیا ہے، آپ کسی مولوی کو بلائیں۔'' وہ اسے اپنے کلیجے سے لپٹاتے ہوئے رندھی ہوئی آواز سے کہہ رہی تھیں۔

''بیٹے! علیب اللہ رکھے بالکل ٹھیک ہے، دیکھو یہ تمہارے سامنے کھڑا ہوا ہے۔'' حسیب صاحب نے اسے چمکارتے ہوئے علیب کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن نیلما منہ چھپائے روتی رہی۔ وہ اس چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت ہی نہیں کر پارہی تھی جو اس کے علیب کا تھا ہی نہیں۔ وہ چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپائے رو رو کر بس یہ ہی کہتی رہی کہ ابو آپ میرا یقین کرلیں ان لوگوں نے میرے علیب کو ماردیا ہے۔''

''آپی میں زندہ ہوں آپ مجھے چھو کر دیکھیں۔'' اچانک ہی وہ اچک کر اس کی گود میں بیٹھ گیا۔

اتنا اچانک کہ اسے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بس اس کے بیٹھتے ہی نیلما کو اپنے رگ و پے میں ایک برف جیسی ٹھنڈک کے پھیلنے کا احساس بے حد شدت کے ساتھ ہوا۔ علیب کے بے حد سرد ہاتھ اس کی گردن پر تھے اور وہ بہت آہستگی کے ساتھ اس کے کانوں میں بے حد عیب سی آواز کے ساتھ سرگوشی کررہا تھا۔

''میں زندہ ہوں لیکن آج تم مرجاؤ گی، پھر رمشا مرے گی، ہی ہی ہی۔'' کتنی مکروہ ہنسی تھی وہ۔

نیلما نے ایک جھٹکے سے اسے اپنی گود سے ہٹانا چاہا لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں بلکہ اس سے کچھ اور چمٹ گیا۔ نیلما نے پوری قوت سے اس کو اپنے آپ سے الگ کرنا چاہا لیکن اس سات سال کے بچے میں جیسے فولاد جیسی قوت آ گئی تھی اور اس کی سخت اور سرد بانہوں میں نوکیلے کانٹے اُگ آئے تھے جو نیلما کو اپنی گردن میں پیوست ہوتے محسوس ہورہے تھے۔ اس نے امی کو پکارنا چاہا، ابو کو آواز دینی چاہی لیکن بس وہ ہونٹ ہلا کر رہ گئی۔ آواز حلق سے نکل ہی نہیں رہی تھی۔

علیب کا چہرہ بالکل اس کے منہ کے قریب

تھا۔ بے جان ساکت آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ اس نے بہت بے بسی کے ساتھ امی کی جانب دیکھا تو دہشت سے اس کا تیز رفتاری سے دھڑکتا دل ایک دم سے ساکت ہوگیا اور وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے بس ان کو دیکھتی رہ گئی کیونکہ وہاں اس کی امی کی جگہ وہی کریہہ صورت عورت کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کے زرد دانتوں پر لگی خون کی بوندیں بہت واضح تھیں اور وہ رمشا کو اپنی گود میں لیے آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھ رہی تھی اور وہ بوڑھا رمشا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بس یہ جملہ بول رہا تھا۔

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' یہ آخری منظر تھا جو نیلما نے اپنے دل کی دھڑکن رُکنے سے پہلے دیکھا تھا۔

☆☆☆

آج نیلما کا چالیسواں تھا۔ امی عورتوں میں گھری بے حد نڈھال سی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی بچی نے اتنا اچانک ان کے سامنے لمحوں میں دم توڑا تھا کہ انہیں اس کی موت کا اب تک یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ آنکھوں کے سوتے رو رو کر خشک ہو چکے تھے۔ ہوش و حواس سے بیگانہ بس وہ نیلما کو ہی پکارتی رہتیں۔

حسیب صاحب خود غم کی شدت سے نڈھال تھے۔ نیلما کی اچانک موت کا معما وہ کسی صورت نہیں حل کر پا رہے تھے۔ ڈاکٹر نے اس کی موت کا سبب اچانک ہی ہارٹ فیل بتایا تھا۔ ویسے سارے ڈاکٹرز خود بھی اس کی اس اچانک موت پر کافی حیران تھے۔ ڈاکٹرز کا ایک بورڈ اس کیس پر ڈسکس کرنے کے لیے بیٹھا بھی تھا لیکن وہ لوگ کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔

لیکن حسیب صاحب کو اپنی بیٹی کی وہ آنکھیں بھولتی ہی نہ تھیں جن میں علیب کو دیکھ کر ایک عجیب قسم کا خوف، دہشت اور بے بسی امنڈ آتی تھی اور جب علیب پیار سے اس سے لپٹا تھا تو خوف سے کیسے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور بس چند ہی لمحوں کے بعد وہ ختم ہوگئی تھی۔ آخر ایسی کیا بات تھی۔ وہ کس بات سے اتنی خوف زدہ تھی کہ اس خوف نے اس کی جان ہی لے لی۔

وہ روتے ہوئے دل کے ساتھ بار بار یہ بات سوچتے لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ علیب کو بھی کئی بار بلا کر انہوں نے کریدا لیکن وہ بس معصومیت سے آنکھیں پٹ پٹا کر رہ جاتا۔

☆☆☆

اچانک انہیں دروازے پر کسی فقیر کی آواز سنائی دی جو عجیب سی آواز میں صدا لگا رہا تھا۔

''مجھے بھوک لگ رہی ہے مجھے کھانے کو دو۔''

چالیسواں کی فاتحہ کے بعد اس وقت تقریباً سب ہی مہمان جا چکے تھے۔ لیکن باورچی خانے میں کافی کھانا بچا ہوا رکھا تھا۔ انہوں نے ماسی سے کہہ کر ایک پلیٹ میں سالن اور روٹی نکلوائی اور خود پلیٹ ہاتھ میں لے کر دروازے کی جانب بڑھے تو راستے میں علیب نے اُن کو روک دیا۔

''ابو میں فقیر کو کھانا دے دوں وہ مجھے دعائیں دے گا۔''

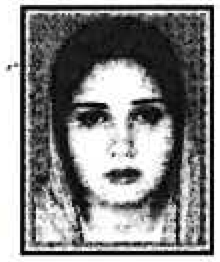
''ٹھیک ہے بیٹا تم ہی دے دو۔'' وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولے اور پھر اپنی بیوی کے رونے کی آواز پر جلدی سے کمرے کی جانب بڑھ گئے کہ آج صبح سے وہ کچھ زیادہ ہی اپ سیٹ تھیں اور سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھیں۔ علیب نے پلیٹ ہاتھ میں تھامی اور سامنے سے آتی رمشا کو آواز دی۔

''رمشا! آؤ میرے ساتھ وہ بھوکا ہے اور تم کو بلا رہا ہے اور پھر ہمیں بھی تو بھوک لگ رہی ہے۔'' علیب نے اپنے سرد ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھوں کے پتلے بالکل ساکت تھے اور ہونٹوں پر ایک خون آلود مسکراہٹ...... وہ رمشا کو لے کر مین گیٹ کی طرف بڑھا جہاں ایک عجیب الخلقت بوڑھا اس کا شدت سے منتظر تھا جبکہ اس سے ذرا فاصلے پر کھڑی ایک عورت گھونگٹ میں منہ چھپائے ہنسے جا رہی تھی۔

☆☆......☆☆



عرشی کون تھی؟



نادیہ ملک

چار ماہ تک ایک ملازمہ کے روپ میں وہ کس کے ساتھ رہ رہے تھے؟ پراسرار نمبر کی ایک بہت خاص کہانی

عرشی یونیورسٹی آف ایجوکیشن میں داخلے کے لیے گئی اور یونیورسٹی کی کینٹین کا ٹنڈر بھر دیا۔ نہ کینٹین کا کوئی تجربہ اور نہ ہی اس بات کا ادراک یہ سوچ کر ٹینڈر فارم خرید لیا کہ بھائی کو ایڈجسٹ کرلوں گی۔ جو گھر پر فارغ ہی رہتا تھا۔ داخلے کے ساتھ ساتھ کینٹین کا ٹھیکہ بھی مل گیا۔ پہلے والے ٹھیکدار کے اسٹاف میں سے ایک ملازم سے بات ہوگئی جو پچھلے دو سال سے یونیورسٹی کی کینٹین پر کام کرتا آ رہا تھا۔ اور کچھ سامان بھی پہلے والے ٹھیکدار سے خرید لیا۔ دو فریزر



اور ایک ڈسپلے فریزر ایجنسی والوں کے پڑے تھے۔ ایک فریزر آئس کریم والے دے گئے، کینٹین میں پڑا فرنیچر یونیورسٹی کی ملکیت تھا۔ مجھے صرف برتن اور کچھ اسٹومنٹ وغیرہ خریدنا پڑے تھے۔ ڈائریکٹر رانا محمد شفیق صاحب بہت رکھ رکھاؤ والے اور دھڑلے کے انتظام کار تھے۔ مجال ہے اسٹاف اور آل اسٹوڈنٹس ان کے اصولوں کی کوئی خلاف ورزی کرتے۔ پہلی میٹنگ میں انہوں نے کینٹین کے حوالے سے موٹی موٹی باتیں میری موجودگی میں بھائی سے کیں، میں نے بڑی ذمہ داری سے سارا ذمہ اُٹھاتے، کسی بھی شکایت کا موقع نہ دینے کا انہیں یقین دلایا۔ میں اپنے فری پیریڈ کینٹین کی نگرانی اور کینٹین کی سروس بہتر بنانے میں صرف کرتی۔ کینٹین کے معیار سے یونیورسٹی کا اسٹاف اور تمام اسٹوڈنٹ مطمئن تھے۔ ریٹ اور کھانے پینے کی چیزوں کو میں خود دیکھتی تھی۔ آہستہ آہستہ کینٹین بہتری کی جانب بڑھ رہی تھی۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے دونوں چھوٹی بہنیں اور والدہ بھی ہاتھ بٹانے آجاتیں یوں ہم سب گھر والے مل جل کر کینٹین چلا رہے تھے۔ ہمارا رویہ اور خدمت ہماری پہچان بن گئی۔ تعلیم کے ساتھ رزق کی بھی آسانی ہو گئی۔ میرا معمول تھا کہ کھانے پینے کا جو سامان بچ جاتا میں کچھ گھر لے جاتی اور کچھ یونیورسٹی کے اسٹاف میں بانٹ دیتی۔ ڈائریکٹر صاحب میرے اس اقدام کو کئی بار سراہ چکے تھے اور بڑے اعتماد سے کہتے کہ ہمیں ہر چیز تازہ ملتی ہے۔ ورنہ تو آج کی بچی چیزیں کل کو بھی ہم کو ہی کھانا پڑتی تھیں۔"

میں پورے دن کا حساب کر کے دوسرے دن کے لیے سامان لینے بھائی کے ساتھ مارکیٹ جانے کے لیے کینٹین سے باہر نکل رہی تھی کہ چوکیدار کو اپنی طرف آتے دیکھا جس کے ہمراہ ایک خاتون بھی تھی۔ میرے قریب آتے اُس نے مجھے سلام کیا اور اس کی جانب اشارہ کرتے بولا۔ "یہ دو دن سے میرے پاس آ رہی ہے کہ مجھے کینٹین میں کام دِلوا دو۔" میں نے اس کا جائزہ لیا۔ مرجھایا ہوا چہرہ اور یاسیت میں ڈوبی بے رونق آنکھیں۔ میں نے واپس کینٹین کے اندر آتے اُنہیں بیٹھنے کا کہا اور مریم کو دو بوتلیں لانے کا اشارہ کیا جو والدہ صاحبہ کے ہمراہ سامان سمیٹنے میں مصروف تھی۔ میں نے اس خاتون کو مخاطب کیا۔

"اس سے پہلے کہیں کام کیا ہے؟"

"جی ایک دو گھروں میں نگران کو میرا کام پسند نہیں آیا اور جواب مل گیا اُن کی طرف سے۔"

"کہاں رہتی ہو؟"

"قریبی گاؤں ہے میرا۔"

"شادی ہوئی؟"

"جی ہوئی تھی شوہر طلاق دے کر کسی اور عورت کو لے کر گاؤں چھوڑ گیا۔"

"کتنے بچے ہیں۔"

"جی ایک تھا جو سال کا ہو کر فوت ہو گیا۔"

"اگر تمہیں رکھ لوں تو روز گاؤں سے آیا کرو گی۔"

نہیں اگر آپ کہیں تو آپ کے پاس ہی رہ لوں گی۔" اس نے بڑی دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"کیا تنخواہ ملتی تھی تمہیں ان دونوں گھروں سے؟"

"پہلے والے تین ہزار اور روٹی کپڑا دوسرے والے ساڑھے تین ہزار اور کھانا وغیرہ۔"

"تو چلو ٹھیک ہے میں تجھے چار ہزار اور روٹی کپڑا رہائش فراہم کروں گی۔ ہر سنڈے چھٹی اگر تم اپنے گاؤں جانا چاہو تو۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے بدستور دھیمی آواز میں رضامندی کا اظہار کیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"عرشی! اس نے بوتل خالی کر کے رکھتے ہوئے اپنا نام بتایا۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ اسے جاتے ہوئے گھر لے جانا آج سے یہ گھر کا اور کینٹین کا کام کیا کرے گی۔ اوپر والے کمرے میں اس کی چارپائی لگوا دیجیے گا۔" یہ کہہ کر میں بھائی کے ساتھ مارکیٹ جانے کے لیے باہر آ گئی۔ جو باہر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ سامان رکھوا کر ہم نے کینٹین بند کی اور یونیورسٹی سے باہر آتے ہی گھر کی طرف چل پڑے۔

☆☆☆

عرشی برآمدے میں بیٹھی دھلے کپڑوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ میں اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ میرا معمول تھا کہ گھر آ کر کچھ آرام کرتی پھر اپنی پڑھائی میں لگ جاتی۔ دروازے پر دستک ہوئی میں نے کہا آ جاؤ۔ عرشی تھی جو چائے کا کپ لے کر اندر آئی اور رکھ کر جانے لگی تو میں نے روک لیا۔

جی آپی! اس نے واپس پلٹتے پوچھا۔

"کیسا لگا ہمارا گھر اور گھر کے لوگ؟"

"بہت اچھے ہیں سب۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"دل لگ جائے گا یہاں۔" جواباً وہ ہلکا سا مسکرا کر کمرے سے نکل گئی۔ میں دوبارہ اپنا ہوم ورک کرنے میں لگ گئی۔

اسے میرے پاس کام کرتے تیسرا ماہ جا رہا تھا۔ اس دوران وہ دو بار اپنے گھر گئی تھی۔ "عرشی ڈاکٹر شفیق صاحب کو دو کپ کوفی کے دے آؤ کوئی مہمان آیا ہے ان کا۔" میں نے بھائی کو کوفی بنانے کا کہا اور دوبارہ کاؤنٹر کی طرف متوجہ ہو گئی اسٹوڈنٹ لڑکیاں بل دینے کے لیے کھڑی تھیں۔

عرشی شام کو کھانا اپنے ساتھ اوپر لے جاتی تھی۔ کینٹین پر بھی وہ ایسا ہی کرتی۔ اگر کھانے کی کوئی چیز دی جاتی تو وہ کچن کے اندر رکھ دیتی پتا نہیں وہ کب کھاتی تھی کوئی ضرورت نہیں پیش آتی ہمیں اس بات کی۔ کہ میں تصدیق کرتی اس کے کھانے پینے کی۔

سارا وقت کینٹین میں تھوڑا بہت رش رہتا تھا۔ مریم اور وہ کلاس روموں سے برتن اور خالی بوتلیں اکٹھی کرنے میں لگی رہتی تھیں۔ جب میں اسے تنخواہ دینے کی بات کرتی تو وہ کہہ کر انکار کر دیتی کہ آپ اپنے پاس ہی جمع رکھیں جب ضرورت ہوئی لے لوں گی۔ مریم کے ساتھ وہ بڑی خوش رہتی، جب ذرا فرصت ہوتی تو دونوں کینٹین سے نکل کر باہر کسی نہ کسی پلاٹ کے کونے میں جا بیٹھتیں اور ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف ہو جاتیں۔ میں زیادہ توجہ اس لیے نہ دیتی کہ عرشی کو میں نے اچھی طرح دیکھ بھال لیا تھا۔ وہ میری بہن کے ساتھ بہت عزت اور محبت سے پیش آتی اور اس میں ایسی کوئی بھی عادت نہیں تھی کہ میں مریم کو اس سے دور رکھتی۔ میری والدہ صاحبہ اور بھائی بھی اس سے خوش تھے۔ وہ ہمارے گھر کا حصہ بن کر اوپر والے کمرے میں رہ رہی تھی۔ نا کوئی اسے شکایت ہوئی تھی ہم سے اور نہ ہی ہمیں۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں تین دن کی چھٹیاں تھیں اور عرشی اپنے گھر چلی گئی۔ چھٹیاں ختم ہو گئیں مگر عرشی واپس نہ آئی۔ مجھے تشویش ہوئی کہ کہیں وہ بیمار وغیرہ تو نہیں ہو گئی۔ میں نے عابد بھائی سے کہا کہ ہم چل کر اس کا پتا نہ کر آئیں۔ ایک تو اس کے گھر والوں سے ملاقات ہو جائے گی اور اس کی بھی خیر خبر ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" عابد بھائی نے رضامندی کا اظہار کیا اور ہم سنڈے کو دونوں بھائی بہن موٹر سائیکل پر اس کے گاؤں جانے کے لیے چل پڑے۔ کوئی سوا گھنٹہ لگا ہمیں اس کے گاؤں پہنچنے میں اور پوچھتے پھر پوچھتے ہم اس کے گھر پہنچ گئے۔ اس کا والد گھر کے باہر ہی مل گیا، میں نے عرشی کے بارے میں پوچھا تو وہ بڑی حیرانگی سے میرا منہ تکنے لگا۔ میں نے کچھ نا سمجھتے ہوئے برجستہ سوال کر دیا۔

"سب خیریت تو ہے نا؟"

میرے اس طرح پوچھنے پر وہ چارپائی سے اُٹھا اور ہم دونوں کو گھر کے اندر لے آیا۔ سامنے گھر کی خواتین اور دو لوگ اور بھی موجود تھے۔ اس نے اپنی ہم عمر بڑھیا کو مخاطب کیا۔ "زبیدہ یہ تمہاری عرشی سے ملنے آئے ہیں۔"

اس بزرگ کے لہجے کی رقت کو میں نے محسوس کرتے ایک بار پھر وہی سوال دہرایا کہ عرشی ٹھیک ہے نا؟" اس بار عرشی کی والدہ نے جواب دیا۔

"بیٹا آپ کیسے جانتی ہیں میری عرشی کو؟"

"تقریباً چار ماہ ہو چکے ہیں۔ وہ میرے پاس کام کر رہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

دوسری خواتین میں سے ایک اُٹھ کر اندر گئی اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک فریم تھا، جس میں عرشی کی مسکراتی ہوئی بڑی سی تصویر تھی۔ "ہاں یہی تو ہے عرشی!" میں نے اس کی والدہ کی طرف دیکھتے ہوئے تائید کی۔ جب اس بزرگ کی طرف دیکھا تو وہ اپنے آنسو صاف کر رہا تھا۔

"آپ کچھ بتائیں گے مجھے؟" میں نے زچ ہوتے ان سب کو مخاطب کیا تو عرشی کی والدہ نے بڑے دکھ سے جواب دیا۔

"بیٹا عرشی کو تو فوت ہوئے دو سال سے زیادہ کا عرصہ بیت رہا ہے۔ اس نے زہریلی گولیاں نگل کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا۔ اسے اپنی طلاق کا دکھ تھا اور اپنے شوہر کی دوسری شادی کا بھی اس لیے اس نے خودکشی کر لی تھی۔"

میں چکرا کر رہ گئی۔ عابد بھائی بھی پریشانی کے عالم میں میری طرف دیکھ رہے تھے۔ تو کیا اس سارے عرصے میں ہم ایک روح کے ساتھ رہتے رہے؟"

میں نے دل میں سوچا پھر اس کے گھر والوں کے ساتھ گاؤں کے قبرستان میں آئے۔ عرشی کی قبر پر اس کا نام اور تاریخ وفات اپنی آنکھوں سے پڑھتے فاتحہ خوانی کی اور اپنے پاس رکھے اس کی تنخواہ کے پیسے نکال کر اس کے والد کے سپرد کیے اور واپسی کے لیے چل پڑے۔

☆☆......☆☆



ہانڈی

شائستہ انور

اس معصوم دوشیزہ کی دہشت ناک کہانی جسے کسی اور کے نام کی موت مل گئی تھی

''ڈاکٹر صاحب! میں کچھ زیادہ تو نہیں جانتی لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ہے اور جب......'' زینیا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ڈاکٹر نومیر بول پڑے۔

''اور جب...... جب آپ اسے سوچتی ہیں تو وہ سامنے ہوتا ہے۔'' ان کی مسکراہٹ واضح تھی۔

''سوری ڈاکٹر! میں نے یہ کب کہا؟ آپ میری پوری بات سن تو لیں۔''

''پچھلے 80 منٹ سے کیا کر رہا ہوں؟''

''اوہ! پورا پورا حساب رکھتے ہیں اپنے وقت کا۔'' زینیا بھی مسکرا دی۔

''محبت کی ہے کبھی آپ نے؟'' ڈاکٹر نومیر نے اچانک سے سوال کیا تو اسے لگا' اس کی نشست کے نیچے زمین میں ارتعاش پیدا ہونے لگا ہو۔ ایک دم سے اسے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے پھوٹتے محسوس ہوئے۔ نومیر نے فوراً گھنٹی بجائی اور جن کی طرح قاصد آبنوسی دروازے سے برآمد ہوا۔

''پانی کا گلاس بدل دو' ٹھنڈا لے آؤ۔'' قاصد نے پیشنٹ کے آنے پر جو گلاس پیش کیا تھا' وہ جوں کا توں میز پر دھرا تھا۔ وہ خاموشی سے گلاس اٹھا کر باہر چلا گیا اور پھر فوراً ہی ٹھنڈا پانی میز پر رکھ کر چلا گیا۔ آبنوسی دروازہ پھر سے بند تھا مگر شاید زینیا میں اب بات کرنے کی سکت نہ تھی۔ غٹاغٹ پانی کا پورا گلاس حلق میں انڈیل کر اس نے اعصاب بحال کیے ''تو پھر ہم بات شروع کریں؟'' ڈاکٹر نومیر نے اب پھر سے منقطع سلسلہ جوڑنا چاہا تھا۔

''میں پہلے ہی آپ کے 89 (نواسی) منٹ لے چکی ہوں۔ اب اگلی میٹنگ پر بات کریں گے۔'' مسکراتے ہوئے زینیا نے اجازت طلب کی تھی۔ ڈاکٹر نومیر نے بھی مسکرا کر اسے اگلی دفعہ آنے کی دعوت دی اور پھر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسری میں پھنسا کر میز پر ٹکائے بیٹھ گیا۔

''محبت...... ہاں یہ پوائنٹ بڑا ٹھوس ہے۔ لگتا ہے' محترمہ کے ساتھ محبت کا معاملہ ہے یا ہو سکتا ہے' دل کی توڑ جوڑ...... خیر' جو بھی ہے' کیس ہے یہ پیچیدہ۔'' اور پھر وہ کسی فائل کو کھول کر کیس اسٹڈی کرنے لگا۔

ڈاکٹر نومیر کا شمار شہر کے مشہور سائیکولوجسٹ میں ہوتا تھا۔ بعض لوگوں پر خدا کی خاص مہربانی

ہوتی ہے۔ نومیر کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں تھا۔ بہت جلد' بہت نوجوانی میں ہی اس کے نام کا ڈنکا بجنے لگا تھا حالانکہ اس فیلڈ میں اس کا تجربہ اتنا نہ تھا مگر ذہن اور اس کی خاص صلاحیت اس کی چھٹی حس نے بڑے بڑے پیچیدہ مسئلوں کو چٹکی بجاتے ہی حل کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خان زوہیب کپاڈیہ نے بھی اپنی اکلوتی بیٹی کی پراسرار خاموشی کے علاج کے لیے ڈاکٹر نومیر ہی کا انتخاب کیا تھا۔ خان زوہیب کپاڈیہ کی بتائی گئی باتوں میں ان کی بیٹی سے مل کر نومیر کو بالکل یقین نہ آیا۔ زینیا کپاڈیہ تو مستقل بولتی رہی تھی' 80 منٹ' کیا بہت نہیں ہوتے؟ کسی بات کو بات سے بڑھ کر بولنے میں تو اس نے نومیر کو بھی چونکا دیا تھا۔

.......•......•......•



رات کا جانے کون سا پہر تھا' ہواؤں کی شائیں شائیں نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ درختوں پر لگے پتے جھر جھرا رہے تھے۔فضا میں اچانک سے گھنگھروؤں کی آواز اس ماحول کو تھوڑی دیر کے لیے مزید پراسرار کرتی اور پھر ماحول کی پراسرار گمبھیرتا رات کے سینے میں اپنے پنجے گاڑ دیتی۔ کچھ ہی دیر پہلے کی تو بات تھی' فضا میں دو محبت کرنے والوں کی سانسوں کے جلترنگ بج رہے تھے۔ پورے چاند کی رات تھی اور اس رات میں تو دیوانے دل مدہوش ہو ہی جایا کرتے ہیں۔

''میرے پیر چھوڑ دو پلیز......'' اس نے کالی ناگن سی زلفیں جو کہ بدمست ہوا سے اِدھر اُدھر بکھر کر چاند چہرے کو ڈھانپ چکی تھیں' چہرے سے ہٹا کر کہا۔

''کیوں مجھے گناہ گار کرتے ہو؟'' مگر جیسے وہ تو کچھ سن ہی نہ رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں یکدم آنسو آ گئے۔انسان چاہ کر بھی جب کچھ نہ کر پائے تو بے بسی سے بڑا دکھ کوئی نہیں ہوتا۔اس سمے وہ بھی اسی کیفیت سے دوچار تھی۔کھڑکی سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی سے صاف ظاہر تھا' بادلوں کے رتھ پر سوار پورا چاند مسکرا رہا تھا۔اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو راستہ بنا رہے تھے۔چہرے پر پھیلتی اَن گنت نمکین لکیریں سوکھتی ابھرتی جال سا پھیلا چکی تھیں مگر وہ بے بسی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی قدرت سے شکوہ کناں تھی۔

اچانک کھڑکی کا پٹ بڑی زور سے دھڑ دھڑایا جیسے یکلخت آندھی نے پوری طاقت سے اس منظر کے منہ پر طمانچہ رسید کیا ہو۔اس نے دھڑ دھڑ کرتے دل سے اسے خود سے جدا کیا اور آن کی آن میں منظر تبدیل ہو گیا' بس وہ تھی اور کمرے میں کو کتا سناٹا۔وہ بستر پر پڑی بری طرح ہانپ رہی تھی جیسے کہیں سے بہت تیزی سے دوڑتی ہوئی آ رہی ہو۔ اس کیفیت نے اسے ادھ موئی ہی تو کر دیا تھا جیسے اور پھر آنسوؤں نے رات کے سینے میں رین بسیرا کر لیا۔اس کا تکیہ بھیگتا چلا جا رہا تھا۔

•......•......•......•

''ہیلو بیٹا' ہاؤ آر یو سوئیٹی؟''

''فائن ڈیڈ......!''

''اور بتاؤ' کیا چل رہا ہے؟''

''تھنگ ڈیڈ' آپ سنائیں۔''

خان زوہیب کپاڈیہ اسے ایک عرصے بعد اس طرح باتیں کرتا دیکھ کر حیران ہوئے بنا نہ رہ سکے تھے یعنی ڈاکٹر نومیر کا جادو چل ہی گیا' وہ اپنی دانست میں سوچتے' ناشتہ کرنے لگے۔''میری بیٹی خوش ہے اور بس کچھ نہیں چاہیے مجھے۔ اسی طرح بولتی رہا کرو۔خاموش ہوتی ہو تو عجیب سا فیل ہوتا ہے مجھے جیسے میں تمہیں خوش نہیں رکھ پا رہا ہوں۔''

''اوہ' کم آن ڈیڈ......آئندہ شکایت نہیں ہوگی آپ کو۔'' زینیا اتنا کہہ کر سنجیدگی سے ناشتے سے انصاف کرنے لگی۔

''او کے سوئیٹی' Have a good day.'' خان زوہیب کپاڈیہ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے صوفے پر رکھا کوٹ اٹھا کر پہنا اور بریف کیس اٹھا کر زینیا کے پاس آ گئے۔

''او کے بیٹا' ٹیک کیئر۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے کار پورچ میں جانے کے لیے نکلے۔زینیا ان کے پیچھے تھی' وہ باپ کو دفتر روانہ ہونے تک اُن کے ساتھ رہی اور پھر جونہی کمرے میں داخل ہوئی تو مسکرا کر رہ گئی۔وہ اس سے پہلے اس کی کرسی پر براجمان تھا۔وہ اداس صورت لیے اس کے پیروں پہ لپٹ کر رونے لگا۔زینب کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور وہ فوراً اسے گود میں لیے کار میں آ گئی۔

•......•......•......•

''آیئے محترمہ' آپ بتایئے' کیا حال ہیں؟'' ڈاکٹر نومیر نے زینیا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ اس نے گلاسز اتارے تو نومیر کو حیرت کا دھچکہ لگا۔

''کیا بات ہی' ایک تو آپ آئی ہیں پورے دو ہفتے بعد اور آپ کی سوجی ہوئی آنکھیں......کیا بات

ہے' بتایئے؟'' اسے اس کومل سی لڑکی سے عجیب سی الفت' انسیت محسوس ہوئی تھی۔ ایک بے نام سا جذبہ اسے دیکھتے ہی بیدار ہوتا تھا جسے وہ اپنا خام خیال جانتا تھا۔

''وہ......''

''جی' بولیے' کچھ بھی اندر دل میں نہ رکھیں' بول دیں۔''

''وہ......رانی کے پاس چلا گیا ہے' رانی اسے آنے نہیں دے رہی۔ وہ میرا ہے' بس میرا......'' زینیا یہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور نومیر اس کے بے ربط جملوں کا ربط جوڑنے لگا۔اس کی سمجھ میں یہ پیچیدہ لڑکی آ کے نہ دے رہی تھی۔وہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی رہی اور پھر بغیر کچھ کہے کمرے سے باہر نکلنے لگی۔نومیر اسے روکتا ہی رہ گیا مگر وہ نہ رکی۔

•......•......•......•

پورن ماشی کا چاند پورے آب و تاب سے چمک رہا تھا۔قدیم جنگل میں جوگی گورکھ کی استھان پہ بڑی رونق تھی۔اس کے دو چار بھگت بڑی شان سے اگنی پوجا میں مصروف تھے۔گورکھ ایک مٹی کی ہانڈی میں الو کی آنکھیں اور پر رکھ کر' السی کے پتے رکھ کر بیٹھا تھا اور قریب ہی اس کا بھگت شورے اونٹ کے سینے کی سوکھی ہڈی پیس کر سفوف بنا رہا تھا اور آخر میں سور کی ناک جو کہ بڑی مشکل سے حاصل کی گئی تھی' اس ہانڈی میں ڈالنا تھی۔سارا سامان مکمل تھا۔گورکھ نے شورے کو آواز دی۔

''بالک' اسی سمھو پھ ارپن کر دے با۔ سے بیتے جائے ہے۔چاند کے گپھا سے نکلنے کے بعد ہمارے آدیش میں کیول آدھا گھنٹہ رہ جاوے گا' جلدی کر پتر......''

''مہاراج' بس آ کھری جھٹکا دیو ہوں۔''

اور پھر شورے جلدی سے اونٹ کی ہڈی کا سفوف لے آیا جسے گورکھ نے جاپ پڑھتے ہوئے پوری ہانڈی میں پھرایا اور پھیلا دیا اور پھر اس نے الو کا خون ہانڈی کے کناروں پر پھیلا دیا اور پھر سور کی ناک بیچ میں رکھی اور سیہ کا کانٹا اس ناک میں بھونک کر اوپر سے نشاستہ بھر کر ہانڈی کے ڈھکن کو درخت کی قدیم گوند سے جوڑ کر ہانڈی پیک کر دی۔

''اے کالی ماتا......اب ای سارا تھارے واسطے اے' او کنیا کے پاس ہمارا باگڑ بلا دل لگا بیٹھا ہے۔او کالی ماتا' ہم کا واپس او ہمارا باگڑ بلا دلائی دیو اور اس کنیا کو رام رام ستے کر دیو۔'' اور پھر بھگت اور سوامی مل کر جاپ پڑھتے آگ کے اوپر ہانڈی ٹانگے رقص کرنے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہانڈی اڑنے لگی۔

•......•......•......•

''ابھی کل ہی تو زینیا میرے پاس آئی تھی۔''

ڈاکٹر نومیر کسی طرح یقین کرنے پر تیار نہ تھا مگر اخبار کی خبر تھی' نہ کرنے میں گنجائش ہی کہاں تھی۔''معروف صنعت کار خان زوہیب کپاڈیہ کی بیٹی زینیا کپاڈیہ گھر میں مردہ حالت میں پائی گئی۔''

ڈاکٹر نومیر فوراً اپنی حیرت کی گٹھڑی اٹھائے خان زوہیب کے گھر چل پڑا۔

•......•......•......•

جنگل میں آگ کی طرح یہ خبر پورے شہر کا احاطہ کر چکی تھی۔نومیر' خان صاحب کے گھر پہنچا تو فوراً اس نے خان صاحب سے زینیا کے کمرے میں جانے کی درخواست کی۔ خان صاحب کی حالت ٹھیک نہ تھی مگر انہوں نے ملازمین سے ڈاکٹر صاحب کی معاونت کی درخواست کی۔

زینیا کے کمرے میں کوئی بے ترتیبی نہ تھی' سب کچھ نک سک سے پڑا تھا۔ اچانک نومیر کی نظر کمرے کی کھلی کھڑکی پر پڑی۔اس نے باہر جھانک کر دیکھا' ایک ٹوٹی ہوئی ہانڈی کے علاوہ اسے لان میں کچھ نظر نہ آیا تھا۔

•......•......•......•

جنازہ تیار تھا مگر......ڈولی کے پائے سے ایک بلا چپٹا تھا جو بری طرح دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ وہ سفید' نیلی آنکھوں والا مقناطیسی کشش رکھنے والا بلا......بڑی مشکل سے اسے وہاں سے ہٹایا گیا۔

قبرستان میں قبر تیار ہوئی اور زینیا کو لحد میں جیسے ہی اتارنے لگے، سفید بلے نے قبر میں چھلانگ لگا دی۔

سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، سب نے ہی کوشش کی کہ بلا قبر سے نکل جائے لیکن بلا قبر میں جاتے ہی غائب ہو چکا تھا۔ اپنا سا اطمینان کرنے کے بعد زینیا کو قبر میں اتار دیا گیا مگر بلا ......وہ قبر میں ہی غائب ہوا تھا اور اسے قبر میں جاتے سب نے دیکھا تھا مگر نکلتے......؟؟

•......•......•......•

ڈاکٹر نومیر کا کہنا ہے کہ زینیا کی موت کے بعد وہ کئی بار خان صاحب کے گھر گیا۔ اس نے لان میں پڑی ہانڈی اٹھوا کر سمندر میں پھنکوا دی تھی۔ ہانڈی سے عجیب بساند پھوٹ رہی تھی جسے وہ آج بھی اپنے نتھنوں میں محسوس کرتا ہے تو اس کا جی مالش ہونے لگتا ہے مگر ایک عجیب اتفاق ہے، زینیا کے کمرے اور لان میں اس جگہ جہاں ہانڈی ٹوٹی پڑی تھی، ایک سفید بلا نیلی نیلی مقناطیسی آنکھوں والا ہمیشہ وہاں دیکھا گیا ہے۔

وہ کب آتا ہے، کب جاتا ہے کوئی نہیں جانتا مگر پورن ماشی کی رات کو قبرستان کے باہر بیٹھ کر پوری رات اس کے رونے کی گواہی خود گورکن اور اردگرد کے لوگ دیتے ہیں۔

دور، کہیں بہت دور، گورکھ سوامی کا بھی اسی رات دیہانت ہو گیا تھا جس شب زینیا کی موت اس کی بھتیجی ہانڈی کے زیر اثر واقع ہوئی تھی اور وہاں بھی سفید، نیلی نیلی مقناطیسی آنکھوں والا بلا پایا گیا تھا۔

وہ بلا ہے یا بلا، یہ راز، راز تو نہیں مگر یہ طے ہے کہ زینیا سے عشق اس بلے نے ہی کیا تھا اور وہ بلا، گورکھ کی قید سے آزاد ہونے والا ایک بہت بڑا جن تھا جو اپنی محبوبہ کی تلاش میں بلا بن کر گھوم رہا تھا اور گورکھ نے اسے جن سے بلا بنا دیا تھا۔

ڈاکٹر نومیر کو یہ راز ایک پہنچے ہوئے اُس بزرگ نے بتایا جو کہ اچانک سے ایک دن اُس کے کلینک میں آیا اور اُس کے ذہن میں اٹھتے تشنہ سوالات کی قید سے اسے آزاد کر گیا تھا۔

☆☆......☆☆

محبت!



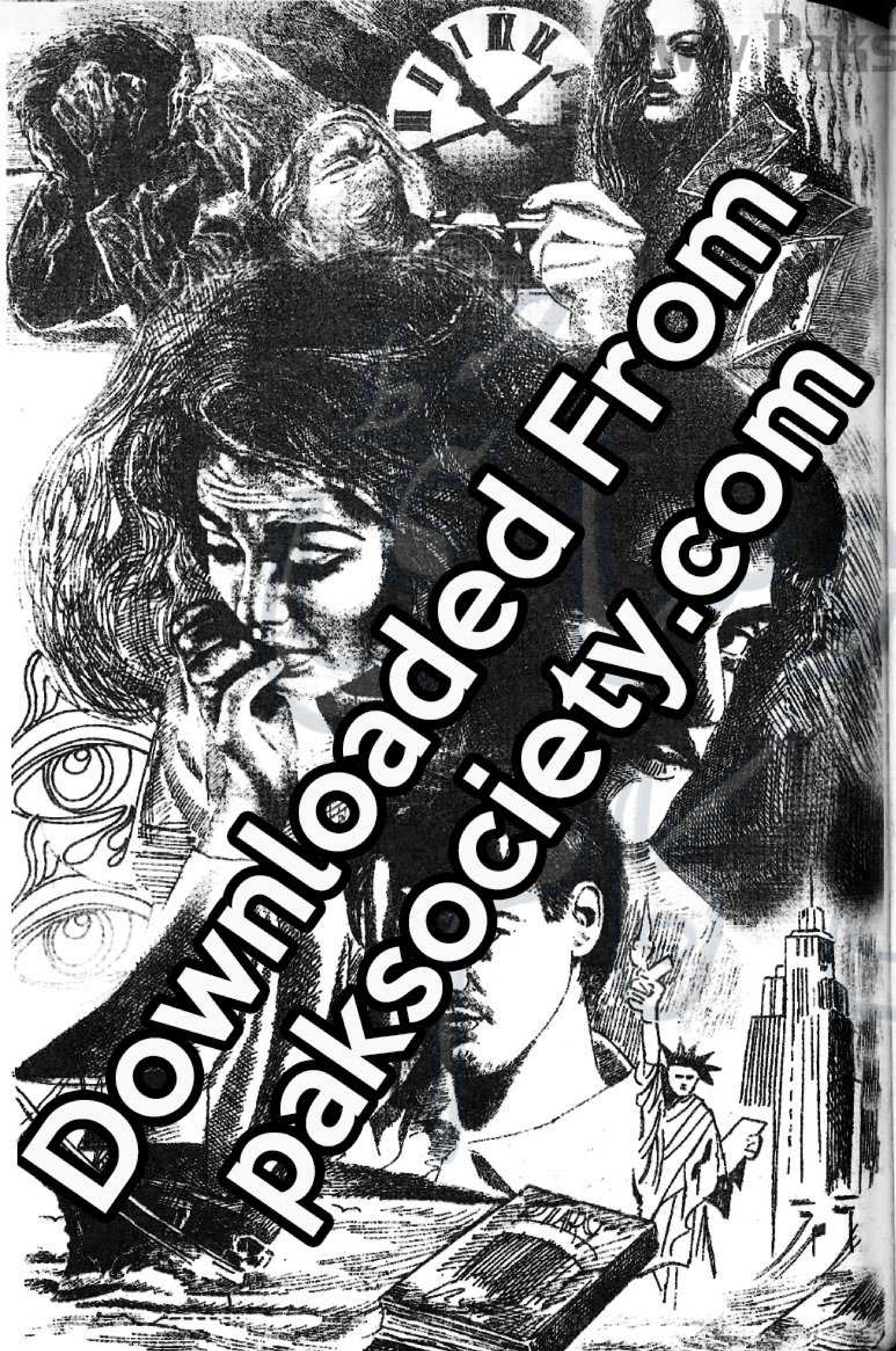
ساتھیو!......زیرِ نظر تصویر دیکھیے۔

آج کا زمانہ بھلے ہی جتنی بھی ترقی کر لے۔ آسمان کی بلندیوں کو چھو لے۔ آکاش کو زمین پر لے آئے......لیکن محبت کی آغوش کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

والدین خدا کی نعمت ہیں تو بہن بھائی رب کی طرف سے عطا کردہ وہ رحمت ہیں۔ جو اپنی محبت کے پَروں کو چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے وار کھتے ہیں۔

بہن بھائیوں کی محبت کی مثال......زیرِ نظر تصویر میں نمایاں ہے۔ آنکھ کے کیمرے کو Zoom کریں اور محبت کی اتھاہ گہرائیوں کو اپنے دل میں محسوس کر کے دیکھیے۔

ہمیں یقین ہے اک قطرہ محبت آپ کی آنکھ سے ضرور باہر آئے گا۔



ہم شکل

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور قلم کار، ایم اے راحت کے قلم کا جادو

قسط نمبر: 18

خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشترکہ خاندان پر مبنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرد ہے۔ خاندان کی بزرگ دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ اُن کے قصوں اور ٹوٹکوں سے ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن قصوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے سات ''ہم شکل'' بنائے ہیں۔

ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی۔ ہسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برین ٹیومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نذر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دیے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔

دلاور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلاور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کرلیتی ہے۔ دلاور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلاور شاہ زیب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر رُکتی ہے تو ایک مجمع اُسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو ''عالی'' کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ مجمع میں موجود ایک بزرگ اُسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے سات ہم شکل والی یعنی کہ ایک اور ''ہم شکل'' اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہوجاتا ہے۔

گھر پہنچنے کے بعد شاہ زیب کو معلوم پڑتا ہے کہ ''عالی'' جو اس گھر کا بیٹا ہے وہ شاہ زیب کا ہم شکل ہے اسٹیشن والی لڑکی جس کا نام نشاط ہے وہ عالی کی بیوی ہے عالی نشاط سے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب شاہ زیب کو عالی سمجھ کر سب گھر والے اور نشاط سمجھانے کی اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ زیب نے بڑی مشکل سے ان کو یہ بات باور کرائی کہ وہ عالی نہیں شاہ زیب ہے جس کی شکل عالی سے مشابہ ہے۔ بہرکیف عالی کے خاندان والوں کو جب شاہ زیب کی حقیقت معلوم ہوئی تو وہ اس

کے احسان مند ہوگئے اور شکریہ ادا کرتے اس سے اس کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ شاہ زیب نے بتایا کہ اس کی دادی ماں نے ایک بار کہا کہ ہر انسان کے سات ہم شکل ہوتے ہیں بس میرا دل چاہا کہ اپنی زندگی میں اپنے ہم شکلوں کو تلاش کروں اور یقین کریں کہ مجھے میرے دو ہم شکل مل گئے ایک دلاور اور آپ کا عالی اور تیسرا میں اور اب چوتھے ہم شکل کی تلاش ہے۔

عالی کے گھر والے اس کو خاصی رقم دے کر رخصت کرتے ہیں۔ شاہ زیب اپنے تیسرے ہم شکل عالی کے بعد وہاں سے نکل کر ایک فور اسٹار ہوٹل میں جاتا ہے۔ اب شاہ زیب کی زندگی میں سیزارو آجاتا ہے۔ وہ برطانیہ کے ایک خفیہ گینگ سے منسلک ہے۔ جس نے سیزارو کو ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ ابھی شاہ زیب سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُسے کوروتی ٹکرا جاتی ہے۔ کچھ بندے اُسے زبردستی اُس جگہ پہنچا دیتے ہیں جہاں پر ڈینیل نے کوروتی کو رکھا ہوا ہے۔

اب آگے ملاحظہ کیجیے

''میرا نام جوشان ہے اور میں برطانوی باشندہ ہوں۔'' اس نے کہا۔

شاہ زیب اور شوراک اچھل پڑے، پھر شاہ زیب نے کہا ''لیکن برطانوی بھائی یہ تم روسیاہ کیسے ہوگئے؟''

''میرے چہرے پر میک اپ ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''واقعی کمال کا میک اپ ہے۔ لیکن کیا تم مقامی زبان بھی جانتے ہو؟''

''اچھی طرح۔'' اس نے جواب دیا۔

''وہ کون سی مصیبت تھی جس کی بنا پر تم برطانیہ چھوڑ کر یہاں آباد ہوگئے؟''

''خزانہ... سونے کی چمک، ہیروں کی جگمگاہٹ انسان سے اس کی عقل چھین لیتی ہے، شیکال کا وہی روایتی خزانہ مجھے یہاں لے آیا ہے جس کی تلاش میں تم یہاں پہنچے ہو۔ انحراف کرنے کی کوشش مت کرنا۔ میں تمہاری بات پر یقین نہیں کروں گا۔ صحرائے اعظم کے ان ہولناک علاقوں کا سفر کر کے یہاں آنے والے کسی چکر میں ہی آسکتے ہیں، تفریحاً کوئی اتنے خطرات مول نہیں لے سکتا۔''

''چلو ٹھیک ہے یہ اعتراف کر لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے کہ ہم بھی خزانے ہی کی تلاش میں آئے ہیں، لیکن مسٹر جوشان، آپ کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔''

''تم تصور نہیں کر سکتے کہ یہاں تک پہنچنے کے لیے مجھے کیا کیا کچھ کرنا پڑا اور کیا کیا قربانیاں دینا پڑی ہیں۔ میرے ساتھ چھ افراد اور بھی تھے اور وہ چھ کے چھ ہلاک ہوگئے۔''

''اور تمہیں زندہ رہنے کے لیے یہ روسیاہی اختیار کرنا پڑی۔''

''ہاں.. اس کے سوا چارۂ کار نہیں تھا، میں تقریباً چار سال سے ان لوگوں کے درمیان ہوں''

''میرے خدا، چار سال، لیکن تمہارے پاس اس کوفی کی موجودگی، کیا یہ چار سال پرانی کوفی ہے۔'' شاہ زیب نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا وہ مسکرانے لگا پھر بولا۔

''ذہین آدمی ہو، لیکن یہ کوفی چار سال پرانی نہیں ہے، شیکال کے اس خزانے کے سلسلے میں بہت سے گروہ یہاں آکر ہلاکت کا شکار ہو چکے ہیں، کوفی کے یہ چار بڑے پیکٹ میں نے ایک گروہ ہی سے حاصل کیے تھے۔ یہاں کے باشندے اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، یہ ڈرائی فروٹس اور یہ تمام چیزیں بھی انہی کا عطیہ ہیں۔''

''تو کیا یہاں باہر سے آنے والے لوگوں کو قتل کر دیا جاتا ہے؟''

''یہ ایک طویل کہانی ہے، اگر تم مجھے اس بات کا اطمینان دلا دو کہ میرے ساتھ مکمل تعاون کرو گے تو میں تمہیں یہ کہانی سنا سکتا ہوں۔''

''پیارے بھائی، اس سے پہلے جن گروہوں سے تم نے یہ کوفی وغیرہ حاصل کی تھی انہیں تم نے اپنے ساتھ تعاون کے لیے آمادہ نہیں کیا تھا؟'' شاہ زیب نے دوسرا ٹیڑھا سوال کر دیا۔ جوشان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، پھر اس نے کہا۔

''نہیں مجھے اس کا موقع ہی نہ مل سکا اور نہ ہی کوئی ان وحشیوں کے چنگل سے نجات حاصل کر کے مجھ تک پہنچ سکا ہے، تم پہلے دو افراد ہو جنہوں نے یہ جرأت اور ہمت کی ہے۔''

شاہ زیب نے مسکراتی نگاہوں سے شوراک کو دیکھا، لیکن شوراک کا چہرہ ستا ہوا تھا، شاہ زیب سمجھ گیا کہ وہ اس وقت کس احساس کا شکار ہے، باہر سے آنے والوں کے لیے موت کا تذکرہ سن کر اس کے ذہن میں یہ احساس جاگا ہے کہ کہیں مسٹر گرج اور سونارا کو بھی قتل تو نہیں کر دیا گیا۔ بہرطور شاہ زیب اس داستان کو سننے کے لیے بے چین تھا جو مسٹر جوشان سنانا چاہتے تھے۔ چند لمحات کے بعد جوشان نے کہا۔

''دوستو! میرا تعارف ہو چکا ہے تم سے.. کیا اب بھی اپنے بارے میں بتانا پسند نہیں کرو گے؟''

''کیوں نہیں مسٹر جوشان، میرا نام شاہ زیب ہے اور یہ...'' شاہ زیب نے شوراک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ میری دوست سونارا ہیں۔'' ان الفاظ پر شوراک کے چہرے پر ایک اطمینان پھیل گیا تھا جسے شاہ زیب محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا مطلب تھا کہ شوراک نہیں چاہتی تھی کہ اسے شوراک کی حیثیت سے متعارف کرایا جائے۔

''تمہارا تعلق ایشیا سے ہے۔'' جوشان نے سوال کیا۔

''اس میں کوئی شک نہیں ہے، تمہارے خدوخال ایشیائی ہیں اور یہ لڑکی غالباً امریکن ہے۔''

''تمہارا یہ سوچنا بھی بالکل درست ہے۔''

''ویسے اس کے چہرے میں ایک عجیب بات پائی جاتی ہے، خیر میڈم سونارا، میں آپ کو بھی خوش آمدید کہتا ہوں، اگر آپ آرام کرنا چاہتے ہوں تو میں مداخلت نہیں کروں گا، ویسے میرا خیال ہے آپ انہی گرفتار ہونے والوں میں سے ہیں جو ابھی حال ہی میں آخری بار شیکال پہنچے ہیں۔''

''تمہارا کہنا بالکل درست ہے مسٹر جوشان، کیا تم اپنی بہترین صلاحیتوں سے کام لے کر ہمیں یہ بتا سکتے ہو کہ ہمارے بقیا ساتھی کہاں گئے، میری مراد ایک لڑکی اور ایک بوڑھے ساتھی سے ہے'' شاہ زیب نے کہا۔

وہ مایوس ہو کر ہونٹ سکیڑ کر بولا۔

''افسوس نہیں... میری معلومات اب اتنی وسیع بھی نہیں ہیں۔ میں اپنے طور پر ان کے درمیان جی رہا ہوں اور اس کے لیے مجھے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں، تم سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''کاش... ہمیں ان کے بارے میں معلوم ہو جاتا ویسے یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ وہ باہر سے آنے والوں کو قتل کر دیتے ہیں۔''

''اس کے پس پردہ ایک المیہ کہانی ہے۔''

''آہ ان ویرانوں میں بھی المیے بکھرے ہوئے ہیں۔''

''المیے کہاں نہیں ہوتے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شوراک بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی، ویسے بھی یہ لڑکی عام طور پر مسکرانے کی عادی نہیں تھی اور شاہ زیب نے اسے زندگی کی دلچسپیوں سے دور پایا تھا۔

شاہ زیب کی فرمائش پر جوشان نے اپنی کہانی سنائی اس نے کہا کہ وہ ایک مہم جو ہے اور اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ شیکال کے خزانے کی تلاش میں تھے، ان میں سے دو ساتھی راستے کی مصیبتوں کا شکار ہوگئے، باقی صرف پانچ افراد شیکال تک پہنچ پائے تھے۔ شیکال میں انہیں گرفتار کر لیا گیا اور جوشان کے چاروں ساتھیوں کو ہلاک کر دیا گیا

افراد شیکال تک پہنچ پائے تھے۔ شیکال میں انہیں گرفتار کرلیا گیا اور جوشان کے چاروں ساتھیوں کو ہلاک کر دیا گیا مگر جوشان ان کے چنگل سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگیا، جوشان نے کہا۔

''میرے دوست تم نہیں جانتے کہ زندگی بچانے کے لیے مجھے کیسی کیسی اذیتوں اور صعوبتوں سے گزرنا پڑا ہے۔''

☆☆☆

شاہ زیب کو جوشان کی گفتگو میں بڑا لطف آرہا تھا اس نے کہا۔

''واقعی بڑی سخت جدوجہد کی آپ نے؟''

''زندگی کے لیے انسان نجانے کیسی کیسی سخت جدوجہد کرتا ہے؟'' مسٹر جوشان نے جواب دیا

''خیر پھر کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں بس اس کے بعد یہاں کے بارے میں مجھے مکمل صورت حال معلوم ہونے لگی، خزانے کا علم مجھے آج تک نہیں ہوسکا، لیکن شیکال کے اندر کی زندگی سے مکمل طور پر واقفیت حاصل کر چکا ہوں۔''

''لیکن شیکال میں تو کسی عورت کی حکمرانی تھی۔'' شوراک بول پڑی۔

''تمہاری باتیں بالکل درست ہیں ڈیئر سونارا میں تمہیں ایک ایسی حیرت انگیز بات بتاؤں گا کہ تم اس پر یقین نہیں کرسکو گی۔''

''حیرت انگیز باتوں کو ترتیب وار بتاتے جایئے۔ ہمیں لطف آرہا ہے۔'' میں نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا اور مسٹر جوشان مسکرانے لگے۔

''یہاں کی حکمران ایک عورت ہے، میسی سوناٹا ہے اس کا نام، وہ بوڑھی ہوچکی ہے، شیکال میں بیرونی دنیا کے لوگوں سے صرف میسی سوناٹا کی وجہ سے نفرت کی جاتی ہے، دراصل بہت پہلے کبھی کسی زمانے میں میسی سوناٹا کو ایک بیرونی دنیا کے نوجوان سے محبت ہوگئی اور ان دونوں نے شادی کرلی، لیکن بیرونی دنیا کا وہ نوجوان میسی سوناٹا سے مخلص نہیں تھا ان کی ایک بیٹی بھی پیدا ہوگئی اور میسی سوناٹا بہت اچھی زندگی گزارنے لگی، لیکن اس کے محبوب نے اس سے بیوفائی کی اور اپنے چند دوستوں کے ساتھ فرار کے منصوبے بناتا رہا اور بالآخر ایک دن وہ یہاں سے اپنی بیٹی کو لے کر فرار ہوگیا، اس کے دوست اس کی بیٹی کو لے کر نکل گئے، لیکن وہ شخص گرفتار ہوگیا اور اس کے بعد شیکال کے قانون کے مطابق سے موت کی سزا دی گئی۔''

شوراک کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے کرب کے آثار ابھر آئے، لیکن اس وقت مسٹر جوشان اس کی جانب متوجہ نہیں تھے۔

''پھر کیا ہوا؟'' شاہ زیب نے سوال کیا۔

''اپنے محبوب کی بیوفائی سے میسی سوناٹا نیم پاگل سی ہوگئی اور اس کے بعد اسی طیش کے عالم میں اس نے شیکال کا یہ قانون بنادیا کہ باہر کی دنیا سے کوئی بھی شخص آئے اسے قتل کردیا جائے، وہ اپنے اس قبیلے میں کسی اور لڑکی کے ساتھ ایسی بیوفائی نہیں چاہتی تھی، وہ قانون آج تک یہاں رائج ہے۔''

''لیکن میسی سوناٹا کہاں ہے، کیا وہ زندہ ہے؟'' شوراک نے پوچھا۔

''ہاں ابھی تک میسی سوناٹا ہی کی حکومت ہے، لیکن ان دنوں کچھ اور پرلطف واقعات پیش آرہے ہیں۔''

''وہ کیا؟''

''میسی سوناٹا یہاں سے کچھ فاصلے پر اپنی اقامت اختیار کرچکی ہے اور اب چونکہ وہ بوڑھی ہوگئی ہے اور اس کی کوئی اولاد نہیں ہے، چنانچہ اس کی موت کے بعد کوئی نیا شخص ہی قبیلہ شیکال کا سردار بنے گا، جبکہ میسی سوناٹا نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کی بیٹی شوراک یہاں واپس آئے گی اور اسی قبیلے پر حکومت کرے گی، اس دعوے کی بنیاد ایک بوڑھی جادوگرنی ہے جو بہت لمبی عمر کی مالک ہے اور اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ میسی سوناٹا کی بیٹی شوراک واپس آئے گی اور شیکال پر اسی کی حکومت

ہوگی وہ کسی بھی عمر میں یہاں واپس آجائے، لیکن لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر وہ میسی سوناٹا کی زندگی میں واپس نہ آسکی تو پھر حکومت اس کے لیے نہیں رہے گی اور سرداری کسی اور کو منتقل کردی جائے گی، بوڑھی جادوگرنی نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ میسی سوناٹا کی زندگی میں ہی واپس آئے گی۔ میسی سوناٹا اس کا انتظار کررہی ہے اگر کبھی یہاں کوئی بیرونی شخص یا قافلہ آجاتا ہے تو اس میں شامل کسی عورت کو قتل نہیں کیا جاتا بلکہ مردوں کو قتل کردیا جاتا ہے۔ میسی سوناٹا اپنی بیٹی شوراک کی منتظر ہے اور اس کی آس میں جی رہی ہے یہ ہے وہ عجیب وغریب کہانی میں سمجھتا ہوں ڈیئر شاہ زیب کہ اگر کوئی بھی میسی سوناٹا کی بیٹی کو اس کے حوالے کردے تو میسی سوناٹا اپنے ہاتھوں سے شیکال کا خزانہ اس شخص کو دے دے گی کیونکہ یہ خزانہ یہاں کے لوگوں کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔''

''خوب، بہت خوب...'' شاہ زیب نے گہری نگاہوں سے مسٹر جوشان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور جو حیرت انگیز بات میں آپ کو بتا رہا ہوں مسٹر شاہ زیب اسے سن کر آپ شدت حیرت سے اچھل پڑیں گے۔''

''بتایئے میں اچھلنا چاہتا ہوں۔'' شاہ زیب نے اسی انداز میں کہا۔

مسٹر جوشان شوراک کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے ''آپ کی یہ ساتھی لڑکی شوراک، میسی سوناٹا کی ہو بہو ہم شکل ہے۔ میسی سوناٹا یقینی طور پر عالم جوانی میں ایسی ہی رہی ہوگی، یہ حیرت انگیز شکل دیکھ کر میرے دل ودماغ پر کیا بیتی، آپ اس کا تصور نہیں کرسکتے۔''

شاہ زیب نے حیرت زدہ نگاہوں سے شوراک کو دیکھا اور پھر ایک گہری سانس لے کر مسٹر جوشان کو دیکھنے لگا۔

''میں نے اپنی حفاظت کے لیے یہاں بندوبست کررکھا ہے، کئی بار اس جال میں ایسے لوگ پھنس چکے ہیں جنہوں نے یہ سوراخ تلاش کرلیے تھے لیکن میرے لیے ان کی ہلاکت ضروری ہوتی ہے تاکہ میرا راز ان غاروں سے باہر نہ چلا جائے۔''

''اوہ... گویا آپ نے یہ جال اسی لیے لگایا ہوا تھا۔''

''ہاں میں زندہ رہنا چاہتا ہوں اور میرے دل میں آج بھی یہ خواہش جاگ رہی ہے کہ شیکال کا خزانہ مجھے مل جائے، چاہے وہ کتنی ہی مقدار میں ملے، لیکن ملنا چاہیے اور بس اس کے بعد میں اپنی دنیا میں واپس چلا جاؤں گا، چنانچہ اس لیے اپنی زندگی کا تحفظ ضروری ہے اور میں اب تک آٹھ قتل کرچکا ہوں۔''

''سبحان اللہ.... اچھی خاصی مہارت معلوم ہوتی ہے۔''

''نہیں میرے دوست، یہ سب کچھ مجھے بحالت مجبوری ہی کرنا پڑا، لیکن میں ان اقتدار پسندوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی زندگی داؤ پر لگا کر اپنی اقتدار کو چاٹتے رہتے ہیں۔''

''تو آپ کچھ اور کہہ رہے تھے؟''

''ہاں... میں نے جال میں تمہیں پھنسا ہوا دیکھا اور یقینی طور پر اپنا یہ راز باہر نہ جانے دیتا اگر تمہارے ساتھ یہ لڑکی نہ ہوتی۔''

''کیا مطلب؟''

''جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ یہ لڑکی میسی سوناٹا کی ہم شکل ہے اور اسی کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک نیا منصوبہ جاگا ہے۔''

''منصوبہ کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''کیا ہم اسے شوراک کی صورت میں میسی سوناٹا کے سامنے پیش نہیں کرسکتے؟''

شاہ زیب نے آنکھیں بند کرلیں، شوراک کو شوراک کی صورت میں دھوکہ دہی کے طور پر میسی سوناٹا کے سامنے پیش کیے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے، بہرطور یہ کافی دلچسپ بات تھی لیکن ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں شاہ زیب نے فیصلہ کرلیا تھا کہ جوشان کو حقیقت سے آگاہ کرنا غلط ہوگا ہاں اگر وہ اپنے طور پر جو کچھ کرنا چاہ رہے ہیں وہی کریں تو اس

سلسلے میں ان سے تعاون کیا جاسکتا ہے، پھر شاہ زیب نے مسٹر جوشان سے کہا۔

"لیکن مسٹر جوشان، کیا میسی سوناٹا میری دوست سونارا کو شوراک کی حیثیت سے قبول کرلے گی"

"اگر مس سونارا اس سلسلے میں ہم سے تعاون کریں تو یقیناً ایسا ہوسکتا ہے، اس کی ذمہ داری مجھ پر چھوڑ دی جائے۔"

"کیا آپ ہمیں سوچنے کا موقع دیں گے مسٹر جوشان؟"

"تم لوگ اپنے آپ کو یہاں بالکل محفوظ تصور کرو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہاں تمہیں تلاش کرنے والا کوئی نہیں پہنچ سکتا، میں تمہیں سوچنے کے لیے تمہاری ضرورت کے مطابق وقت دے سکتا ہوں۔"

"اگر آپ ایک کام اور کرسکیں مسٹر جوشان تو میں ذاتی طور پر آپ کی شکر گزار رہوں گی" شوراک نے کہا۔

"ہاں کہو، تم میرے لیے انتہائی قیمتی حیثیت رکھتی ہو۔"

"ہمارے ساتھ دو افراد اور تھے، ایک لڑکی اور ایک بزرگ، براہ کرم صرف یہ بات معلوم کرکے ہمیں بتاؤ کہ ان دونوں کا کیا ہوا، وہ کہاں ہیں؟"

"ہرچند کہ یہ ایک مشکل کام ہے لیکن میں تمہارے لیے اسے انجام دینے کی کوشش کروں گا، آؤ اب تمہیں ایک ایسی جگہ دکھادوں جہاں تم آرام سے وقت گزار سکتے ہو، کھانے پینے کی بالکل فکر مت کرنا، میرے پاس ایسی اشیاء کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جو تم دونوں کو پسند آئیں گی۔" مسٹر جوشان نے کہا اور اس کے بعد وہ ان دونوں کو اٹھا کر اس غار سے ملحق ایک اور چھوٹے سے غار میں لے گئے جہاں انہوں نے غالباً اپنی آسائشوں کا بندوبست کر رکھا تھا، یہاں کی زمین پر بہترین گھاس کا بستر موجود تھا اور اس کے ساتھ ہی پانی کا انتظام بھی تھا، مسٹر جوشان ہمیں چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ مسٹر جوشان کے اس انکشاف سے گرج کی کہانی کی بھی تصدیق ہوگئی تھی، کافی دیر خاموشی میں گزر گئی اور اس کے بعد شوراک نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مسٹر شاہ زیب، میں بہت زیادہ ذہین نہیں ہوں اس سلسلے میں آپ کا مشورہ چاہتی ہوں، آہ کاش۔ مسٹر گرج ہمارے ساتھ ہوتے اور اس وقت یہ انکشافات ہوتے تو مجھے کس قدر خوشی ہوتی، لیکن میں ان کے لیے بے حد پریشان اور افسردہ ہوں۔"

"میں جانتا ہوں شوراک، مسٹر گرج نے تمہارے سلسلے میں زبردست قربانیاں دی ہیں، ہوسکتا ہے ہمیں جوشان کے ذریعے مسٹر گرج کے بارے میں معلومات حاصل ہوجائیں، لیکن اب اس سلسلے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

"میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں، ویسے تم نے نہایت ذہانت سے کام لیا کہ میرا نام سونارا بتایا اور اسے میری حقیقت نہیں بتائی، ویسے یہ جان کر مجھے انتہائی رنج ہوا کہ میرا باپ اس دنیا میں نہیں ہے، ویسے مسٹر گرج اسے بہت چاہتے تھے اور ان کے دل میں ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ وہ دوست کی امانت اسے واپس کردیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انہیں اس خزانے میں دلچسپی تھی جسے وہ بحالت مجبوری چھوڑ چکے تھے، لیکن کاش میں اس سلسلے میں ان کی کوئی مدد کرسکتی۔ البتہ میں یہ چاہتی ہوں کہ جو کچھ یہ شخص کہہ رہا ہے اس پر جس قدر جلد ممکن ہو، عمل کیا جائے، ہوسکتا ہے میری اصل حیثیت مجھے مل جانے کے بعد مسٹر گرج اور ان کی بیٹی کی کچھ مدد کرسکوں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے، لیکن ہمیں اسکے ہر پہلو پر غور کرنا چاہیے پہلے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ مسٹر جوشان تمہیں شوراک ثابت کرنے کے لیے کیا پروگرام رکھتے ہیں، ہم ان کے پروگرام پر غور کریں گے۔"

"یقیناً... میں نہیں چاہتی کہ میرے ساتھ ساتھ تم کسی مصیبت کا شکار ہوجاؤ۔"

"مم... میں۔" شاہ زیب نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیا تمہیں مسٹر جوشان کی یہ بات یاد نہیں کہ بیرونی دنیا سے آنے والے مردوں کو قتل کردیا جاتا ہے۔"

"ارے باپ رے..." شاہ زیب کے حلق سے کراہتی ہوئی آواز نکلی "واقعی میں بھی تو مرد ہی ہوں۔ اب تو مجھے اپنی زندگی کا بھی خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔"

"اسی لیے تو میں چاہتی ہوں کہ جس قدر جلد ممکن ہوسکے مسٹر جوشان کے پروگرام کو عملی جامہ پہنادیں بہتر ہے، میں اس لیے خاموش ہوگئی کہ تم سے اس بارے میں مشورہ کرلوں، ورنہ شاید میں اسی وقت اس بات کا فیصلہ کرلیتی کہ میں مسٹر جوشان کے پروگرام پر عمل کرتے ہوئے شوراک بننے کے لیے تیار ہوں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے، مسٹر جوشان سے دوسری ملاقات پر مکمل تعاون کا فیصلہ سنادیں گے"

شوراک خاموش ہوگئی اس کے بعد وہ مسلسل دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھی رہی تھی، نجانے کتنا وقت گزر گیا، بہرطور تقدیر ان کو یہاں لے آئی تھی ورنہ اگر باہر ہوتے تو نجانے کیا ہوتا، یہ ابھی تک پتا نہیں چل سکا تھا کہ مسٹر گرج وہاں سے خود فرار ہوئے اپنی بیٹی کو لے کر یا پھر ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا، پھر یہ لوگ بے چینی سے مسٹر جوشان کی واپسی کا انتظار کرنے لگے اور پھر بھوک لگنے لگی۔ شاہ زیب نے بے تکلفی سے باہر آکر وہ تمام چیزیں دیکھیں جو کھانے پینے کی تھیں اور اس کے بعد کافی تیار کرنے لگا، کافی کی سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں بلند ہورہی تھی کہ مسٹر جوشان کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ایک لمحے کے لیے تو یہ لوگ بھونچکے سے ہوگئے تھے، لیکن مسٹر جوشان کو دیکھ کر سکون ہوا مسٹر جوشان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، انہوں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ تم نے بہت ہی اچھا کیا کہ خود ہی اپنے لیے انتظامات شروع کردیے میری طرف سے تمہیں مکمل اجازت ہے کہ یہاں جو کچھ بھی موجود ہے اسے استعمال کرو۔"

"شکریہ مسٹر جوشان...... ہاں آپ بتائیے ان دونوں کے بارے میں کچھ پتا چل سکا؟"

"وہ دونوں وہاں سے فرار ہوگئے ہیں، یہ بات میں نے معلوم کرلی ہے۔"

"تو کیا ہو گرفتار نہیں ہوئے؟"

"نہیں۔" مسٹر جوشان نے جواب دیا اور پھر بولے "وحشی انہیں تلاش کررہے ہیں۔"

"میرے خدا، کاش وہ ان کے ہاتھ نہ آئیں۔" شوراک آہستہ سے بولی۔

مسٹر جوشان کافی دیر تک ان دونوں سے گفتگو کرتے رہے، انہوں نے شاہ زیب کو ہر طرح تعاون کا یقین دلایا اور بولے۔

"جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کی تکمیل تمہارے لیے بہت سودمند ثابت ہوگی، تم اطمینان رکھو۔" شاہ زیب نے گردن ہلادی تھی،

پھر مسٹر جوشان بھی ان دونوں کے ساتھ کھانے میں شریک ہوگئے۔ کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے، بہرحال ان لوازمات سے فارغ ہونے کے بعد وہ تینوں اس چھوٹی سی رہائش گاہ میں آگئے۔ مسٹر جوشان ایک جگہ بیٹھتے ہوئے بولے۔

"یہ معلوم ہونے کے بعد کہ تم لوگ میری تجویز سے متفق ہو مجھے بہت خوشی ہوئی ہے، میں بلند و بانگ دعوے تو نہیں کرتا البتہ اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہماری تجویز مکمل طور سے کامیاب ہوگئی تو ہم بہترین خزانہ لے کر یہاں سے فرار ہوجائیں گے، میسی سوناٹا اپنی بیٹی کے لیے بہت ہی مضطرب ہے، بوڑھی جادوگرنی ساریہ کے نام سے پہچانی جاتی ہے اور ساریہ نے یہ پیشگوئی کی تھی کہ جب میسی سوناٹا بڑھاپے کی منزل میں داخل ہوجائے گی تو شیکال کی سربراہی کے لیے اس کی بیٹی شوراک خود بخود وہاں پہنچ جائے گی، بوڑھی نے اپنے اس دعوے کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیا ہے اور ایک خانقاہ میں رہتی ہے اس نے اپنے اوپر تمام آسائشیں حرام کرلی ہیں اور اسی طرح عبادت کرتی ہے، اس کا خیال ہے کہ اس کی یہ عبادت رنگ لائے گی اور دیوتا کسی نہ کسی طرح شوراک کو اس خانقاہ میں بھیج دیں گے، تب وہ شوراک کو میسی سوناٹا کے سامنے پیش کرے گی، اس کے اس دعوے کا ابتداء میں بہت مذاق اڑایا گیا، لیکن اسے میسی سوناٹا کی حمایت حاصل ہے اور میسی سوناٹا اس کا ہر طرح خیال رکھتی ہے، چنانچہ یوں ہوگا ڈیئر سونارا کہ میں تم اور ہمارا دوست شہزادہ وہاں چلیں گے، ہم چالاکی سے تمہیں اس خانقاہ میں پہنچادیں گے اور اس کے بعد تمہیں اداکاری کرنا ہوگی، تم اپنے آپ کو شوراک ظاہر کروگی

اور بوڑھی کو یقین دلا دو گی کہ تم واپس آ گئی ہو اس کے بعد ظاہر ہے بوڑھی تمہیں میسی سوناٹا کے سامنے پیش کرے گی، تمہیں اس طرح کا اظہار کرنا ہے اور تم جانتی ہو کہ تمہاری بہترین اداکاری ہی ہماری زندگیوں کی ضمانت بن سکتی ہے، اس دوران ہم خانقاہ سے زیادہ دور نہیں رہیں گے اور جب تم میسی سوناٹا پر اپنا اعتماد قائم کر لو تو پھر ہمیں طلب کر کے ہماری سفارش کرنا اس طرح ہمیں خزانہ حاصل ہو جائے گا۔ پھر وہ راستے میں جانتا ہوں جہاں سے ہم واپس اپنی دنیا میں جا سکتے ہیں میں اس کا تمام بندوبست کر لوں گا یہ ذمہ داری تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

شوراک نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے لیکن ہم اپنی منزل کی جانب کب روانہ ہوں گے؟"

"کل رات کو، مجھے چوبیس گھنٹے کا وقت اور دے دیا جائے، اس دوران میں وہ تمام تیاریاں کر لوں گا جس کے تحت ہم آسان راستوں سے پہاڑوں کے دوسری جانب جا سکتے ہیں۔"

شوراک نے گردن ہلا دی کافی دیر تک مسٹر جوشان ان سے گفتگو کرتے رہے اور پھر واپس چلے گئے، ان کے جانے کے بعد شوراک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے مسٹر شاہ زیب کیا بوڑھی سارہ کی پیشگوئی غلط ثابت ہوئی؟"

"میں سخت حیران ہوں، بلکہ اس وقت میں اسی انداز میں سوچ رہا تھا طریقہ کار کچھ بھی ہو جادوگرنی کی پیشگوئی تو بالکل درست رہی۔"

"ہاں میں بہت چھوٹی سی عمر میں اپنے اس قبیلے سے نکل گئی تھی، لیکن میرے بزرگ میرے محترم میرے محسن اور میرے سب کچھ مسٹر گرج نے مجھے اپنے قبیلے کے رسم و رواج اور وہاں کی روایتوں سے لاعلم نہیں رکھا مجھے بہت ہی احتیاط کے ساتھ افریقی زبان سکھائی گئی تا کہ جب میں اپنے قبیلے میں پہنچوں تو کسی کے لیے اجنبی نہ رہوں۔"

شاہ زیب گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ بلاشبہ اس سلسلے میں مسٹر گرج کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، عجیب و غریب انسان تھے اگر ان کے دل میں صرف خزانے کے حصول کی خواہش تھی تو انہوں نے اتنا طویل عرصہ انتظار کیوں کی، اگر اپنے دوست کی محبت ان کے دل میں تھی تب بھی اس کے لیے انہیں مضطرب ہونا چاہیے تھا، نجانے کونسی قوت انہیں آج تک اس کام کے لیے مجبور کرتی رہی تھی۔ شاید یہ بوڑھی جادوگرنی کی پیشگوئی ہی کا کوئی جادوئی اثر ہو۔ شاہ زیب یہی باتیں سوچتا رہا تھا۔

وہ لوگ یہاں وقت گزارتے رہے یہاں کوئی دقت نہیں تھی، ویسے بیرونی طور پر ہوشیار رہنا پڑا تھا۔ خاص طور سے ان اوقات میں جب مسٹر جوشان یہاں موجود نہیں ہوتے تھے۔ پھر وہ وقت آ گیا جب مسٹر جوشان شاہ زیب اور شوراک کے پاس پہنچ گئے، وہ اپنے ساتھ بہت سا ساز و سامان لائے تھے۔

انہوں نے کئی جڑی بوٹیوں سے وہی محلول تیار کیا تھا جس نے انہیں روسیاہ کر دیا تھا اور اب وہ خصوصاً شاہ زیب کو اپنے جیسا بنانے پر تلے ہوئے تھے، اس کا اظہار انہوں نے کیا تو شاہ زیب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"مسٹر جوشان، اپنے بارے میں آپ کو بتا دوں تو آپ ان معاملات کو بھول کر مجھ پر ریسرچ کرنے بیٹھ جائیں گے، مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ میں زندگی کے نجانے کون کونسے مرحلوں سے گزر چکا ہوں اب اگر یہ روسیاہی بھی مقدر میں ہے تو آپ یہ سیاہی بخوشی میرے وجود پر تھوپ دیجیے۔"

"مسٹر شہزادہ یہ بے حد ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر تم دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ کر سفر نہیں کر سکو گے، کہیں بھی اپنی اصل حیثیت سے ان لوگوں کی نگاہوں میں آ گئے تو تو تمہارا حشر بھی ان بیرونی افراد سے مختلف نہیں ہوگا جو بے کسی کی موت مر چکے ہیں۔"

شاہ زیب نے گھبرا کر جلدی سے اپنا لباس اتار دیا تا کہ مسٹر جوشان اس پر طبع آزمائی شروع کر سکیں اور درحقیقت لطف ہی آ گیا تھا، ایک بڑے برش نما چھال سے شاہ زیب کے جسم پر سیاہی رنگ گئی یہ براؤن مائل سیاہی تھی جو مقامی لوگوں کے رنگ سے مطابقت رکھتی تھی اور بلاشبہ اس کا اثر اتنا پکا تھا کہ آدمی تصور بھی نہ کر سکے، البتہ اس نے ڈوبتے ہوئے لہجے

میں مسٹر جوشان سے کہا۔

"کیا میری یہ روسیاہی کبھی دور بھی ہو سکے گی؟"

مسٹر جوشان مسکرا دیے پھر بولے "ہاں کیوں نہیں اس کا توڑ بھی موجود ہے، لیکن عام انداز میں یہ سیاہی نہیں اتر سکے گی۔"

شاہ زیب نے گردن ہلا دی تھی۔ مسٹر جوشان اپنی ماہرانہ کارروائیوں میں مصروف رہے اور شاہ زیب کے نقش و نگار بھی تبدیل ہو گئے۔ پھر انہوں نے کسی جانور کی کھوپڑی کی آٹھ ہڈیوں کی مالک شاہ زیب کے گلے میں ڈال دی۔

"یہ یہ کیا۔" شاہ زیب نے الجھتے ہوئے کہا۔

"چپ چاپ رہیے جناب وحشی صاحب۔" جوشان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر الٹے سیدھے موتی، پتوں کا ایک تاج سا بنا کر شاہ زیب کے سر پر سجا دیا گیا اور ایک جانور کی کھال بدن کے زیریں حصے پر منڈھ دی گئی، گویا اب شاہ زیب کا بناؤ سنگھار ہو چکا تھا، شاہ زیب نے شوراک کی طرف دیکھا وہ میٹھی نگاہوں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی شاہ زیب سے اس کی نگاہیں ملیں وہ بے اختیار مسکرا دی، تب شاہ زیب نے جوشان سے کہا۔

"ایک بات تو بتائیے مسٹر جوشان، کیا مقامی خواتین یہ رنگ و روپ نہیں رکھتیں، آخر مردوں پر ہی کیا قیامت ٹوٹی ہے، کیا میڈم سونارا کے لیے کوئی میک اپ ضروری نہیں ہے؟"

"یہ ایک دلچسپ سوال ہے جس کا جواب کچھ یوں ہے، اتفاق ہے کہ یہاں جتنی حکمراں خواتین رہیں ان کا تعلق کسی نہ کسی بیرونی مرد سے ضرور رہا اور اس کے بعد جو ان کی اولاد پیدا ہوئی وہ مخلوط شکل رکھتی تھی۔ موجودہ میسی سوناٹا سے پہلے کی عورت کے بارے میں تو میں نہیں جانتا لیکن میسی سوناٹا یہاں کی تمام خواتین سے مختلف ہے، بس یوں سمجھ لو کہ میڈم سونارا کا بڑھاپا، اسی طرح یہاں کی دوسری لڑکی جو حکمران بنے گی انہی کی شکل و صورت سے مطابقت رکھتی ہو گی، اس کا بارہا تذکرہ بھی آیا ہے اور سنا گیا ہے کہ میسی سوناٹا کی بیٹی اپنی ماں کی ہم شکل ہے۔"

"خوب...." شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے شوراک کی طرف دیکھا اور وہ جھینپ گئی، وہ شاہ زیب کی مسکراہٹ کا مطلب سمجھ گئی تھی، تاہم شاہ زیب نے آہستہ سے کہا۔

"اگر اتفاق سے میڈم سونارا کو یہیں رہنا پڑے تو پھر آنے والی نسلوں کی حکمران بھی کوئی متنازعہ شخصیت نہیں ہو گی۔"

شوراک خاموش رہی تھی، بہرطور مسٹر جوشان فارغ ہو گئے اور اب شاہ زیب ایک اعلیٰ پائے کا وحشی لگ رہا تھا۔ مسٹر جوشان نے ایک نیزہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"اب کم از کم اس خطے کا کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم مقامی آدمی نہیں ہو۔"

"لیکن مقامی زبان...."

"اوہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اشاروں کی زبان ساری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور پھر اس نسل میں بھی گونگے لوگوں کا وجود ہے۔"

"یہی میرے لیے مناسب ہو گا۔" شاہ زیب نے کہا۔

"اور اب مس سونارا، براہ کرم آپ لباس تبدیل کر لیجیے، ہر چند کہ آپ کو یہ لباس عجیب محسوس ہو گا لیکن آپ اسے مجبوری تصور کریں۔"

لباس دیکھنے کے قابل تھا، عجیب قسم کے جانوروں کے بالوں یا شاید کسی اور چیز سے یہ لباس بنایا گیا تھا، بس تھوڑا سا حصہ اوپری بدن کے لیے تھا باقی جسم پتوں سے چھپا دیا گیا تھا۔

"اس طرح آپ کو ہمارے ساتھ سفر کرنے میں آسانی ہو گی، ویسے جب آپ کو شوراک کی حیثیت سے پیش کیا جائے گا تو اس وقت آپ کے جسم پر دوسری قسم کا لباس ہو گا اس کا بندوبست بھی میں نے کر لیا ہے۔"

''ہمیں روانہ کب ہونا ہے؟''

''بس اب سے تھوڑی دیر کے بعد۔'' مسٹر جوشان نے کہا۔

اس کے بعد مسٹر جوشان نے کھانے پینے کی چند چیزیں اپنے پاس محفوظ کیں، نہایت اعلیٰ قسم کی کافی پی گئی اور اس کے بعد ان آسائشوں کو خیر باد کہہ دیا گیا جنہوں نے یہ بھلا دیا تھا کہ یہ لوگ صحرائے اعظم کے ایک انتہائی غیر مہذب حصے میں ہیں، پھر یہ لوگ غاروں ہی کے ذریعے باہر نکل آئے۔ درحقیقت مسٹر جوشان کی زندگی اسی لیے محفوظ تھی کہ انہوں نے یہاں بے شمار سرنگیں اور غار دریافت کر لیے تھے۔ ایک طویل ترین سرنگ میں انہیں تقریباً پینتالیس منٹ چلنا پڑا اور اس کے بعد وہ لوگ اس کے دہانے سے باہر نکل آئے۔ پہاڑیوں کا سلسلہ تاحد نگاہ پھیلا ہوا تھا اور ان لوگوں کو اسی سلسلے کے درمیان سفر کرنا تھا۔ مسٹر جوشان نے بتایا کہ اس طرح یہ لوگ بستی سے کافی دور نکل آئے ہیں۔

شاہ زیب نے شوراک کے چہرے پر جذبات کے سائے لرزتے دیکھے تھے، نجانے کتنی طویل زندگی کے بعد وہ اپنی ماں کے حضور جا رہی تھی، یہ بات تو جوشان کے فرشتوں کے علم میں بھی نہیں تھی کہ جس لڑکی کو وہ مصنوعی شوراک کی حیثیت سے لے جا رہا ہے وہ اصل میں بھی وہی لڑکی ہے، جس حیثیت سے وہ اسے پیش کرنا چاہتا ہے، اب پیش کار کا مسئلہ تھے کہ یہ پیشکاری کس طرح ہوتی ہے اور مسٹر جوشان اپنی مرضی کے مطابق کامیاب ہو بھی پاتے ہیں یا نہیں۔

سفر جاری رہا، پہاڑوں سے گزرنے کے بعد یہ لوگ جنگلوں میں داخل ہو گئے۔ خوش قسمتی تھی کہ راستے میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جس سے ہمیں کسی قسم کا خطرہ لاحق ہوتا اور اس کے بعد جب یہ لوگ ایک بلندی سے ڈھلان میں اترے تو شاہ زیب اور شوراک نے ڈھلان کے انتہائی سرے پر ایک بستی آباد دیکھی۔ اسے کوئی بستی کہنا تو حماقت تھی۔ یہ ایک وسیع و عریض شہر تھا، یہ دوسری بات ہے کہ اونچی نیچی اور کئی کئی منزلہ عمارتوں پر مشتمل نہیں تھا، ہاں یہاں کچی مٹی اور پہاڑی پتھروں سے مکانات ضرور بنائے گئے تھے، لیکن ان مکانات کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی، زیادہ تر گنبد نما جھونپڑے تھے جو عجیب و غریب نظارے پیش کر رہے تھے اور ان جھونپڑوں کی وسعت کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ ایک بہت بڑا کشادہ تھا جس میں یہ بستی پھیلی ہوئی تھی، اطراف میں ڈھلان اور ناقابل عبور پہاڑ تھے یقینی طور پر بستی سے باہر جانے کے لیے جو راستے بنائے گئے ہوں گے انہیں انہی پہاڑوں کو کاٹ کر ترتیب دیا گیا ہوگا۔

کچی مٹی اور پتھروں سے بنی ہوئی عمارتوں کے بارے میں مسٹر جوشان نے بتایا کہ یہ شیکال کے ان معزز لوگوں کی رہائش گاہیں ہیں جو کسی نہ کسی طور حکومت میں دخل رکھتے ہیں، پھر انہوں نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور وہ جو ایک سفید سی جگہ نظر آ رہی ہے وہ خانقاہ ہے جہاں بوڑھی جادوگرنی ساریہ رہتی ہے اور ہمیں اس خانقاہ تک پہنچنا ہے۔''

''کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ ہم اسی جگہ سے ڈھلان عبور کرتے جہاں خانقاہ موجود ہے۔؟'' شاہ زیب نے سوال کیا۔

''نہیں ان ڈھلانوں سے اترتے ہوئے ہمیں دیکھا بھی جا سکتا ہے۔''

''ہم یہاں اس غار میں پوشیدہ ہو جائیں گے جو چند گز کے فاصلے پر نظر آ رہا ہے اور پھر رات کی تاریکیاں پھیلنے کے بعد اپنا بقیہ سفر طے کریں گے، ویسے جس جگہ کا تم تذکرہ کر رہے ہو وہ ایسی نہیں تھی جہاں سے نیچے اترا جا سکے۔ نیچے اترنے کے لیے یہی جگہ مناسب ہے اور تم خود دیکھ لو کہ اس خانقاہ کے اوپر جو پھیلی ہوئی پہاڑی ہے وہاں ایسی جگہ نہیں ہے کہ ہم وہاں پاؤں جما کر نیچے اتر سکیں۔ اس جگہ سے اترنا زندگی کا خطرہ مول لینے کے مترادف تھا، چنانچہ میں نے یہ جگہ منتخب کی ہے۔''

''یوں لگتا ہے مسٹر جوشان جیسے آپ پہلے بھی یہاں آ چکے ہوں۔''

''ہاں شیکال کے سارے اطراف میں دیکھ چکا ہوں اور اس کی وجہ تم بہتر جانتے ہو۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''خزانے کی تلاش، میں نے ہر وہ جگہ دیکھ ڈالی ہے جہاں خزانہ موجود ہونے کے امکانات تھے۔''

جوشان کی بات پر شوراک اور شاہ زیب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے، بہر حال ڈھلان میں تھوڑا سا اترنے کے بعد یہ تینوں اس پہاڑی کٹاؤ میں جا چھپے جو ان کو دوسروں کو نگاہوں سے پوشیدہ رکھ سکتا تھا۔ یہاں سے بستی میں ہونے والی کارروائیاں دیکھی جا سکتی تھیں۔ ایک باقاعدہ دنیا آباد تھی، ایک باقاعدہ زندگی تھی، جھونپڑوں کی ترتیب قطاروں میں تھی اور ان کے درمیان کشادہ جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ علاقے میں جگہ جگہ ترتیب سے درخت بھی لگائے گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں کی زندگی میں ایک ترتیب ہے، لیکن وہ ابتدائی حصہ وہاں بے ترتیبی سی تھی، غالباً اسے اس لیے چھوڑ دیا گیا ہوگا کہ وہاں بیرونی لوگ پہنچ جاتے تھے اور ان سے نمٹنے اور انہیں روکنے کے لیے وہاں بے ترتیبی ہی مناسب تھی۔

وقت گزرتا رہا اور پھر شام کے سائے بستی میں اتر آئے، بستی میں جگہ جگہ چراغ روشن ہو گئے اور رات کی تاریکی میں وہ بستی بہت عجیب لگنے لگی، ناقوسوں کی آوازیں آ رہی تھیں، گویا یہاں عبادت بھی کی جاتی تھی، یہ لوگ وقت کا انتظار کرتے رہے اور اس کے بعد جوشان کے اشارے پر اپنی جگہ سے نکل آئے، اب ان کا رخ اس خانقاہ کی جانب تھا جو دور سے اب بھی سفید نظر آ رہی تھی یہ غالباً سفید پتھروں سے بنائی گئی تھی، پتا نہیں یہاں اور بھی لوگ موجود تھے یا نہیں، دور سے چھوٹی نظر آنے والی خانقاہ اندر سے کافی وسیع تھی اور یہاں سے نیچے جانے کے لیے پتھروں میں سیڑھیاں تراشی گئی تھیں جو نیچے گہرائیوں تک لے جاتی تھیں۔ ان لوگوں کی نگاہوں میں بوڑھی جادوگرنی کی نجانے کیا حیثیت تھی، بہرطور ایک ایک قدم سنسنی خیزی کا حامل تھا، سونارا یا شوراک جانتی تھی کہ اسے بوڑھی کے سامنے جا کر کیا کرنا ہے، اور اس وقت ظاہر ہے شاہ زیب اور جوشان اس کے ساتھ نہ ہوں گے، لیکن اس بات سے جوشان واقف نہیں تھا کہ شوراک وہاں جا کر کیا کرے گی؟''

یہ لوگ خانقاہ کے عقبی حصے سے اندر داخل ہو گئے، بہت سکوت چھایا ہوا تھا وہاں، اندر ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی، سامنے ہی ایک لمبی آگ کی لکیر نظر آ رہی تھی جس میں سرخ سرخ انگارے دہک رہے تھے اور انگاروں کے عقب میں ایک منحنی سا وجود نظر آ رہا تھا، یہی بوڑھی جادوگرنی ساریہ تھی، اس کے سامنے کوئی سفید سی چیز رکھی ہوئی تھی جو یقینی طور پر لوبان نہیں تھی، وقفے وقفے سے وہ آگ میں یہ تمام چیزیں ڈالتی جا رہی تھی اور آگ سے ہلکا ہلکا دھواں خارج ہو رہا تھا اور یہ بو اسی دھوئیں کی تھی جو بالکل ناگوار نہیں تھی، غالباً کوئی خاص قسم کی پسی ہوئی شے تھی جس سے یہ خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ شوراک نے شاہ زیب کی جانب دیکھا پھر جوشان کو دیکھنے لگی اور پھر آہستہ سے بولی۔

''میرا خیال ہے آپ لوگوں کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔''

''قطعی نہیں، ہم وہاں جانا بھی نہیں چاہتے، دیکھو ہم اس جگہ پوشیدہ ہو جاتے ہیں یہاں سے ہم وہ سب کچھ بھی دیکھ سکیں گے جو تم کرو گی اور اس کے بعد تمہاری معاونت بھی کرتے رہیں گے۔''

جوشان نے جس جگہ کا انتخاب کیا تھا وہ واقعی یہاں سے دور نہیں تھی اور جوشان اور شاہ زیب نہ صرف یہاں سے شوراک کی کارروائی دیکھ سکتے تھے بلکہ اس کی آواز بھی سن سکتے تھے اور یہ جگہ محفوظ بھی تھی چنانچہ دونوں اس جگہ پوشیدہ ہو گئے۔ شوراک دبے قدموں چلتی ہوئی آگ کے پیچھے جا کھڑی ہوئی، یہاں داخل ہونے سے پہلے اس نے وہ لباس بھی پہن لیا تھا جسے جوشان اپنے ساتھ لایا تھا کیونکہ اسی لباس میں شوراک کو بوڑھی جادوگرنی کے سامنے پیش ہونا تھا اور بلاشبہ اس وقت آگ کے پس منظر میں کھڑی ہوئی شوراک کوئی آسمانی دیوی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ شاہ زیب نے اس کے چہرے پر ایک عجیب سی تمکنت ایک عجیب سا وقار دیکھا تھا اور دل ہی دل میں اس بات کا معترف ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ شوراک عام لڑکیوں سے مختلف ہے۔ بہر حال ان دونوں کی نگاہیں شوراک ہی پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر دفعتاً بوڑھی ساریہ نے بہت سی خوشبو آگ میں ڈالی اور اس بار بلند ہونے والا دھواں بہت زیادہ تھا، اس کے ساتھ ہی ساریہ نے اپنے سامنے پڑے ہوئے پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بجانے شروع کر دیئے۔ وہ بڑی دیوانگی کی کیفیت میں پتھروں کے یہ ٹکڑے بجا رہی تھی اور اس کے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں، شاہ زیب نے ان آوازوں کو سنا تو سہی لیکن سمجھ نہیں پایا جبکہ جوشان کے انداز میں ایک عجیب سی حیرت پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ زیب نے سرگوشی کے انداز میں اس سے اس حیرت کی وجہ پوچھی تو وہ آہستہ سے بولا۔

"جانتے ہو بوڑھی ساریہ کیا کہہ رہی ہے؟"

"جانتا تو تم سے پوچھتا" شاہ زیب نے کہا۔

"وہ کہہ رہی ہے اے مقدس خوشبو۔ اے مقدس ہواؤ... اے جلتی ہوئی آگ، اے چمکتے ہوئے تارو۔ اے جگمگاتے ہوئے چاند۔ اے پتھرو... مجھے بتاؤ... میرا خواب پورا ہوگا یا نہیں جو کچھ میں نے کہا وہ ممکن ہے یا نہیں، ہاں یہ میرے لیے آخری لمحات ہیں میں زندگی کی آخری سانسیں گن رہی ہوں، اگر مقدس ملکہ کو میں اپنے دعوے کی تصدیق پیش نہ کرسکی تو بدنام ہو جاؤں گی میرا جادو ناکارہ قرار دیا جائے گا اور مجھے جھوٹا کہا جائے گا، میں چاہتی ہوں کہ میرا سچ ثابت کردو، مقدس ہواؤ.. میرا سچ ثابت کردو، میں جھوٹی مرنا نہیں چاہتی، اسے میرے سامنے بھیج دو، مجھے حکم دو مقدس ہواؤ کہ میں اسے کہاں تلاش کروں، آہ یہ لمحات میرے لیے بے حد قیمتی ہیں، اگر میں اسے پاگئی تو زندگی پاؤں گی ورنہ مرنے کے بعد بھی میری روح ان چٹانوں میں بھٹکتی پھرے گی۔"

شاہ زیب کو یہ الفاظ بے حد عجیب محسوس ہوئے تھے، اس کا مطلب تھا کہ بوڑھی اس لمحے خاص طور سے اس بات کی توقع کر رہی تھی کہ شوراک اس کے سامنے آجائے گی، بوڑھی نے ایک بار پھر سامنے رکھا خوشبودان اٹھالیا اور اس میں سے خوشبو انگاروں پر ڈالنے لگی، تب ہی شوراک کے منہ سے ایک آواز نکلی وہ مدہم لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی اور یہ زبان یقینی طور پر مقامی تھی، اس بار بھی جوشان کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار ابھرے تھے۔

"ارے ارے یہ لڑکی یہ زبان جانتی ہے۔؟"

شاہ زیب جواب دیئے بغیر ادھر دیکھتا رہا، جیسے ہی شوراک کے منہ سے الفاظ نکلے، بوڑھی ساریہ دیوانہ وار کھڑی ہوگئی، اس نے اپنے دونوں ہاتھ سیدھے کیے اور دہکتے ہوئے انگاروں پر رکھ دیئے، اس کے چہرے سے مسرت پھوٹ رہی تھی، تب ہی شوراک نے تیزی سے آگے بڑھ کر بوڑھی جادوگرنی کے دونوں ہاتھ انگاروں سے ہٹالیے اور بوڑھی کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی، وہ اپنی زبان میں کچھ کہہ رہی تھی۔ شاہ زیب کے پوچھنے پر جوشان نے اسے بتایا۔

"آہ آگئی تو ہواؤں کی بیٹی تو آگئی، ملکہ زادی مجھے یقین تھا تو آئے گی، آہ وقت نے مجھے سچا ثابت کردیا، ساریہ کے لیے اس سے حسین موقع زندگی میں کبھی نہیں آیا تو آگئی میری بچی، تو نے میری لاج رکھ لی" اس نے آگے بڑھ کر شوراک کو سینے سے لگالیا۔ شوراک اس کے جلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی بوڑھی نے پھر کچھ کہا اور جوشان نے شاہ زیب کو اپنی زبان میں بتایا

"آہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے جارہی تھی، میں سوچ رہی تھی کہ جھوٹی ہونے کے بجائے میرا مرجانا بہتر ہے، یہ زخم کچھ نہیں ہیں، یہ کچھ بھی نہیں ہیں، تو آگئی مجھے زندگی کی ساری خوشیاں مل گئیں، لوگو شیکال کے لوگو... تمہاری ملکہ تمہارے درمیان آگئی، ساریہ سچ بولتی ہے اور تم یہی کہنا کہ ساریہ سچی تھی، میرا سارا جادو اسی وقت کے لیے تھا، آ میری بچی، میں اعلان کرادوں میں بتادوں کہ مقدس ملکہ ہمارے درمیان آگئی ہے، شیکال کے سونے والو، آج کی رات سونے کی نہیں جاگنے کی رات ہے۔ جشن منانے کی رات ہے۔"

بوڑھی ساریہ دیوانہ وار اچھل رہی تھی، اس کے کمزور بدن میں نجانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی وہ شوراک کا ہاتھ پکڑے ہوئے ایک جانب بھاگی۔ جوشان اور شاہ زیب یہ اندازہ نہیں لگاپائے تھے کہ وہ اسے کہاں لیے جارہی ہے ویسے یہ باہر جانے کا راستہ نہیں تھا بلکہ کچھ بلندی کچھ سیڑھیاں سی تھیں جسے عبور کرنے کے بعد وہ کسی مخصوص جگہ پہنچ گئی، یہاں سے یہ لوگ اسے نہیں دیکھ سکتے تھے، جوشان نے شاہ زیب کا بازو دباتے ہوئے کہا۔

"تمہاری دوست نے تو کمال ہی کردیا، وہ اس سے افریقی زبان میں بات کررہی تھی، میں اس کے الفاظ تو نہیں سن سکا، لیکن بوڑھی کا انداز یہی بتاتا تھا جیسے اس نے شوراک کی آمد کا اعلان سنا ہو۔"

شاہ زیب نے خاموشی ہی اختیار کررکھی تھی، البتہ اب یہ لوگ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں سے یہ لوگ اس تمام صورت حال کا نظارہ کرسکیں۔ بہرحال یہ لوگ بھی سیڑھیاں چڑھنے لگے، سیڑھیاں بلندی تک گئی تھیں، لیکن ایک راستہ

درمیان سے کٹتا تھا اور وہ ایک چٹان پر جاکر ختم ہوتا تھا، ابھی یہ لوگ چٹان تک نہیں پہنچے تھے کہ بوڑھی ساریہ کی آواز ابھری، جبکہ جوشان شاہ زیب کا مترجم بنا ہوا تھا، بوڑھی کہہ رہی تھی۔

"شیکال کے سونے والو، سو رہے ہو، سونا بہتر نہیں ہے جاگو کہ جاگنے والی رات آگئی، آؤ اس خانقاہ کی طرف اور ساریہ کے سچ کی تصدیق کرو اور سنو تمہاری دیوی تمہارے درمیان آگئی ہے، دیکھو میں تمہارے سامنے اپنا سچ پیش کررہی ہوں۔"

اس کی کمزور آواز اس قدر نہیں تھی کہ بستی تک پہنچ جاتی، چنانچہ اس نے کچھ اور کارروائی کی اور چند ہی لمحات کے بعد ایک بھیانک آواز فضا میں گونجنے لگی، یہ نرسنگھے کی آواز تھی، غالباً کسی بہت بڑے نرسنگھے کو پھونکا جارہا تھا اور اس آواز کے اثرات بستی والوں پر فوراً ہی ظاہر ہوگئے، بستی کے زیادہ تر لوگ سوچکے تھے روشنیاں بجھ گئی تھیں، لیکن نرسنگھے کی مسلسل گونجنے والی آواز سے لوگ جاگنے لگے تھے اور ہر گھر میں روشنی ہوتی جارہی تھی، لوگ اس نرسنگھے کی آواز کو کسی آفت کا پیش خیمہ سمجھے تھے، پھر آہستہ آہستہ لوگوں کو جھونپڑوں سے نکلتے ہوئے دیکھا گیا، وہ ٹڈی دل کی طرح اپنے اپنے جھونپڑوں سے باہر نکل کر ایک دوسرے سے چہ میگوئیاں کررہے تھے، بہر طور یہ لوگ سکتے کی سی کیفیت میں جائزہ لیتے رہے، جوشان بھی بالکل خاموش اس عجیب و غریب منظر کو دیکھ رہا تھا، جہاں تک نگاہیں کام کررہی تھیں وہاں تک انسان ہی انسان نظر آرہے تھے، پھر کچھ مشعلیں تیزی سے خانقاہ کی طرف دوڑتی ہوئی نظر آئیں اور جوشان نے شاہ زیب سے کہا۔

"بہتر ہے کہ تھوڑی سی آڑ میں ہو جاؤ، اس وقت سب کی نگاہیں اسی طرف لگی ہوئی ہیں، ہم سے تھوڑی بلندی پر سونارا بوڑھی کے ساتھ موجود ہے۔"

شاہ زیب نے جوشان کی ہدایت پر عمل کیا آنے والے گھوڑوں پر سوار تھے، ان کی تیز رفتاری سے یہی اندازہ ہوتا تھا۔ وہ بستی کے دوسرے سرے سے آرہے تھے اور ان کے لیے راستہ چھوڑا جارہا تھا، جوشان نے آہستہ سے کہا۔

"ہوسکتا ہے ان آنے والوں میں میسی سوناٹا بھی شامل ہو۔"

شاہ زیب اور جوشان ان لوگوں کو دیکھتے رہے، چھ گھوڑے سوار تھے ساتواں سوار ان سے کسی قدر آگے گھوڑے پر سفر کررہا تھا، تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے بالآخر اس راستے پر آگئے جہاں سے خانقاہ کی سیڑھیاں آتی تھیں اور پھر شعلوں کی روشنی میں اس قدآور عورت کو دیکھا گیا جو گھوڑے سے اتر کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہی تھی، بقیہ چھ افراد بھی اس کے عقب میں چلے آرہے تھے، یہ عورت میسی سوناٹا کے علاوہ بھلا اور کون ہوسکتی تھی، رات کی تاریکی میں اس کے خدوخال تو نظر نہیں آرہے تھے لیکن اس کی چال میں بڑی مستعدی تھی اور وہ تیزی سے خانقاہ کی سیڑھیاں عبور کرتی ہوئی اوپر آرہی تھی۔

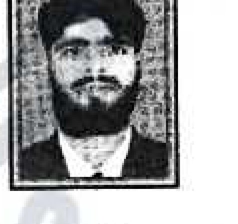
اوپر سے بوڑھی چیخ رہی تھی۔ "شیکال کی ملکہ دیکھ ساریہ نے تیری عزت رکھ لی، دیکھ ساریہ نے اپنا کیا ہوا وعدہ پورا کردیا، دیکھ اس کے سچ کی تصویر تیرے سامنے ہے، ساریہ جھوٹ نہیں بولتی، شیکال کی ملکہ مقدس دیوی تیرے سامنے آگئی۔ تیری بیٹی میرے پاس موجود ہے، اپنی رفتار میں تیزی پیدا کر۔" اور اس کے بعد وہ غالباً اس راستے سے نیچے اترنے لگی جس سے چڑھ کر وہ اوپر پہنچی تھی۔

شاہ زیب اور جوشان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ پھر اس جگہ پہنچ جاتے جہاں سے ان واقعات کا نظارہ اور تجزیہ کیا جاسکتا، تاہم انہوں نے ایک ایسی جگہ منتخب کی جہاں سے کدی نہ کسی حد تک کچھ نہ کچھ تو نظر آئے۔ پھر میسی سوناٹا سیڑھیاں عبور کرکے خانقاہ کے دروازے سے اندر داخل ہوگئی۔ چہرے کا کروفر وقار اور تمکنت بالکل جوانوں جیسی تھی اور انداز سے ہی پتا چلتا تھا کہ وہ کسی قبیلے کی ملکہ ہے۔

(زندگی کے پیچیدہ راستوں میں اپنے ہم شکلوں کی کھوج میں نکلے
شاہ زیب کی آخری منزل کیا ہوگی......؟ جاننے کے لیے آخری قسط کا انتظار کیجیے)



سرخ لیموں



محمد یوسف لغاری

اس نوجوان نے جادو ٹونے کو کھیل سمجھ کر ایک ایسی غلطی کر ڈالی جس کا خمیازہ اسے تاعمر بھگتنا پڑا

میں اس وقت ملتان پلیٹ فارم پر موجود تھا اور سردیوں کی بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی اس لیے پلیٹ فارم پر اکا دُکا مسافر تھے اور دُوسرا یہ کہ میرے جن دوستوں نے میرے ساتھ ڈیوٹی پر جانا تھا ان کی سیٹیں بھی بک تھیں۔ اُن کی ابھی کال آئی تھی کہ بارش کی وجہ سے وہ سب ایک ہی مشترکہ پلان بنا چکے تھے کہ ہم نے آج نہیں جانا کیونکہ ایک تو یہ کہ سردیوں کی بارش تھی اور دوسرا صبح سے شروع ہوئی تھی اب شام کے پانچ بجنے والے تھے مگر بارش دوپہر میں ذرا دیر کے لیے تھمی اور پھر اپنی پوری آب تاب کے ساتھ شروع ہوگئی۔ سردی جسم کو چیر کو اندر جا رہی تھی، میں نے بھی اپنے آپ کو لپٹا ہوا تھا۔ اس وقت پلیٹ فارم پر جتنے بھی مسافر موجود تھے سب کے سب سردی کی شدت سے بچنے کے لیے ایک طرف کونوں میں دبکے ہوئے تھے مگر میں ایک اکیلا واحد برآمدے میں اپنی کچھ یادوں کو اپنے دل میں دبانے کے لیے مونگ پھلی سے دل بہلا رہا تھا۔ میں ہمیشہ اسٹیشن پر وقت سے پہلے پہنچ جاتا پھر پلیٹ فارم میں مسافروں کی گہما گہمی میں مصروف ہوجاتا اور پھر گاڑی آجاتی اور میں اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہوجاتا۔ میری مونگ پھلیاں ختم ہو چکی تھیں۔ میں نے چھلکے اور کاغذ ایک طرف ساتھ پڑے ڈبے میں ڈالے اور بنچ سے اُٹھ کر چہل قدمی شروع کر دی۔ ابھی میں چل پھر ہی رہا تھا کہ ایک نسوانی آواز مجھے اپنے عقب سے سنائی دی۔

''اسلام علیکم !!'' میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں ایک نقاب پوش لڑکی نے مجھے پکارا تھا۔

''جی جی وعلیکم السلام !!'' میں نے حیرانگی سے کہا، کیونکہ میں اس کو پہچان نہ پایا تھا۔

''میں نازیہ ہوں، عبدالکریم کی بیٹی، آپ احسان ہیں نا؟؟'' اس نے کہا۔

''نازیہ!'' میرا ذہن یکدم دس سال پیچھے چلا گیا۔ ''وہ نازیہ!!''

''جی میں احسان ہی ہوں اور آپ کیسی ہیں۔'' میں نے بہت اذیت سے پوچھا۔

''جی میں ٹھیک ہوں اور آپ یہاں کیسے۔'' نازیہ نے مجھ سے پوچھا۔

''میں جاب کرتا ہوں تو میں اِدھر ملتان دوستوں کے پاس آیا ہوا تھا پھر ہم سب یہاں سے اکٹھے جاتے ہیں اور آپ ادھر کیسے؟'' میں نے نازیہ سے پوچھا۔

''جی میں ٹھیک ہوں اور میں اپنے شوہر کے پاس جا رہی ہوں۔ وہ آرمی میں ہوتے ہیں۔''

گاڑی آنے میں تھوڑی دیر تھی ہم بنچ پر بیٹھ گئے۔ شدید سردی تھی۔ اُس کے پاس ابھی لی گئی ایک ٹکٹ تھی جب کہ میرے پاس اکانومی کلاس کے کئی ٹکٹ تھے وہ بھی اضافی مقدار میں، تو میں نے اس کو اپنے کمپارٹمنٹ میں آنے کو کہا جس پر وہ تھوڑی سی ضد کے بعد مان گئی۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین کی آواز سنائی دی پھر چند لمحوں بعد ٹرین ہمارے سامنے تھی۔ سب مسافر جلدی سے اپنا سامان اُٹھانے لگے، ہم نے بھی اپنا سامان اٹھایا اور ڈبے کی جانب بڑھ گئے۔ ہماری ٹکٹیں ریزرو تھیں اس لیے ہمارے طرف کوئی مسافر نہ آیا سو ہم نے اپنا سارا سامان کونے میں رکھا اور میں نے اپنا سر سیٹ سے ٹکا لیا یہاں گرم ڈبہ تھا، سردی کی شدت بہت کم تھی۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین چل پڑی۔ میں نے سیٹ پر سر رکھا اور آنکھیں موند لیں اور یادِ ماضی میں گم ہوگیا۔

☆......☆......☆

میں بچپن سے ہی ایک نمبر کا شرارتی تھا اور اپنے اندر بھرپور مزاح رکھتا تھا اس لیے محفلوں کی جان ہوا کرتا تھا۔ اوٹ پٹانگ کام کرنا اور زیادہ تر جنوں بھوتوں کی کہانیاں پڑھنا میرا شوق تھا حتیٰ کہ یہ شوق میرا ایف اے تک جاری رہا۔ جنوں بھوتوں کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر میرا بھی دل کرتا کہ کاش میرے پاس بھی ایک جن یا کوئی طاقت ہوتی تو میں بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیتا اور دنیا کو حیران کر دیتا مگر ایسا ممکن نہ ہوسکا۔

پھر میرے ہاتھ ایک منتروں کی کتاب بھی لگی جس کو صبح شام پڑھنے کے باوجود بھی میرے ہاتھ کچھ نہ لگا اور پھر میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جو مجھے آج تک نہیں بھولتا۔

میں نے ایف اے کے پیپر دیے اب فراغت ہی فراغت تھی، تو سوچا کیوں نہ ملتان تایا جی کے پاس چلتے ہیں۔ ملتان میں تایا کے رشتہ داروں کے علاوہ ہمارے اور بھی کافی رشتہ دار رہتے تھے اس لیے میں



اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ ملتان چلا گیا۔ چند دن تو دعوتیں کھائیں پھر ہر روز دوسرے رشتہ داروں کے لڑکوں کے ساتھ زمینوں پر گھومنے پھرنے نکل جاتے۔

ایک دفعہ ہم سب زمینوں پر الگ الگ گھوم رہے تھے۔ میں گھومتے گھومتے لیموں کے درخت کی طرف جا نکلا وہاں میں نے دیکھا کہ ایک عجیب شکل کا لڑکا بیٹھا ہوا ہے اور اس نے ایک ہاتھ میں لیموں پکڑا ہوا ہے اور دوسرے ہاتھ میں پتا نہیں کیا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔

''اوئے لیموں چوری کرتا ہے تُو؟؟'' میں نے غصے سے اس لڑکے کو پکارا۔

مگر وہ ڈھیٹ بن کر خاموش بیٹھا رہا اور منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

''اچھا ایک منٹ رُک میں اپنے دوستوں کو بلا کر لاتا ہوں۔'' میں لیموں کے درخت سے پیچھے ہٹ آیا اور تیز آواز لگا کر اپنے کزن امجد کو بلایا وہ تھوڑا دور تھا، میں نے اس کو ساری بات بتلائی، ہم جیسے ہی دوبارہ اس درخت پر پہنچے تو وہ لڑکا اپنی جگہ پر نہیں تھا۔

''یہ کہاں گیا؟'' میں نے حیرانگی سے کہا۔

''جب تم مجھے بلانے گئے تو ڈر کے مارے بھاگ گیا ہوگا۔''

یہ بات یہیں ختم ہوگئی۔

☆......☆......☆

ہم چند دنوں بعد ہم پھر زمینوں پر گئے تو میں بے خیالی میں گھومتے گھومتے پھر اس لیموں کے درخت کے نیچے آگیا۔ میں نے اپنی جیب سے چاقو نکالا اور ابھی لیموں کے درخت سے لیموں کاٹنے ہی والا تھا کہ میری نظر نیچے پڑی۔ میں دیکھا کہ ایک رومال پڑا ہوا تھا میں نے جلدی سے اس کو کھول کر دیکھا تو اس میں ایک لیموں تھا۔

''اس کا کیا مطلب؟؟ کاٹنے پر ہی کچھ پتا چلے گا۔'' میں نے خود ہی سوچا۔

ابھی میں اس کو کاٹنے ہی لگا تھا کہ اچانک ایک طرف سے زور کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''اس کو مت کاٹیے گا۔''

میں نے سامنے دیکھا تو وہی عجیب سا لڑکا کھڑا تھا۔ وہ منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ اُس کے پڑھنے پر ایسے لگا جیسے بڑبڑا رہا ہو۔

''کیوں تیرے چاچے کا کھیت ہے۔ ایک تو چوری کرتا ہے دوسرا بدمعاشی کرتا ہے۔'' میں نے اپنے مخصوص اسٹائل میں کہا۔

ابھی میں پھر اس کو کاٹنے ہی والا تھا وہ پھر منت کرنے لگا کہ اس کو نہ کاٹو مگر پھر اچانک اس کے ہونٹ ہلنے لگے۔

مگر میں نے ایک نہ سنی اور لیموں کو کاٹا تو یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ اس کے اندر سے سرخ لہو نکلنا شروع ہوگیا تھا۔

''اوہ تو یہ بات ہے۔ تم لیموں کے زریعے کوئی جادو کرتے تھے۔'' میں بڑبڑا ہی رہا تھا کہ اچانک اس نے قریب آکر مجھ سے وہ سامان کھینچ لیا۔

''یہ تم کو کیسے نظر آگیا اور تم نے اس کو کیوں کاٹ دیا۔'' وہ لڑکا بے حد افسوس ناک لہجے میں بولا۔

''ایک تو ہمارے لیموں چوری کرتے ہو اور پھر اس پر تعویز وغیرہ کرتے ہو اور الٹا سوال بھی مجھ سے کر رہے ہو اس دن تو تم بھاگ گئے تھے آج میں تمہیں بھاگنے نہیں دوں گا۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''میری دنیا تو تم نے اجاڑ دی ہے مگر ایک بات یاد رکھنا۔ تم نے یہ لیموں کاٹ کر اچھا نہیں کیا۔ اس کا حساب تمہیں دینا پڑے گا۔ چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ درختوں کے جھنڈ میں گھستا ہی چلا گیا۔

میں نے جلدی سے امجد اور دیگر دوستوں کو بلایا۔ وہ سب آئے، ہم نے اس جھنڈ میں اس کا پیچھا کیا مگر حیرانی کی بات تھی کہ وہ ہمیں کہیں بھی نظر نہ آیا۔ مگر میں نے ان کو لیموں کے سرخ لہو والی اور جو اس نے مجھے کہا تھا کہ حساب دینا پڑے گا وہ بات بالکل نہیں بتائی تھی۔ کیونکہ سرخ لہو والی بات پر مجھے ایک شرارت سوجھ رہی تھی۔

ہم مزید کوئی بیس دن ملتان رہے اور پھر ہماری اپنے شہر لیہ واپسی ہوگئی۔

☆......☆......☆

لیہ پہنچے تو ایک بہت بڑی خوش خبری ہماری منتظر تھی کہ ابو کے بہت ہی قریبی رشتہ دار، چاچا کریم کی بڑی بیٹی فاریہ کی شادی تھی۔ یہ فاریہ، نازیہ کی بہن تھی۔ اور ہم دونوں کے گھر والے نازیہ اور میری شادی کرنا چاہتے تھے، تو اس لیے میرے لیے یہ بڑی خوش خبری تھی کہ ہم نازیہ کے گھر جا رہے ہیں۔

ہم شادی سے دو دن پہلے پہنچ چکے تھے۔ ہمیں شادی میں ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا کہ یہ شہر سے آئے ہوئے ہیں کیونکہ ان کا گھر دیہات میں تھا۔

رات کو شادی کی رونق عروج پر تھی۔ امی نماز کے بعد دعا مانگ رہی تھیں کہ چاچا کریم کی بیوی امی سے اداس لہجے کہنے لگی کہ باجی دعا کرنا۔ فاریہ کا پانچ تولے زیور چوری ہوگیا ہے مل جائے۔''

''کیا، کیسے۔'' امی اور میرے منہ سے تقریبا ایک ساتھ نکلا۔

''کچھ پتا نہیں ہم نے آج ہی دیکھا تو وہاں نہیں تھا۔'' چاچی نے جواب دیا۔

''اچھا ٹھیک ہے آپ میرے ساتھ آئیں اور یہ بتائیں کہ زیور کس جگہ پڑے تھے۔''

''اس کمرے میں، اور بکس میں۔'' انہوں نے کمرے میں آتے ہی مجھے بتلایا۔

''اس زیور کے بارے میں کس کس کو پتا تھا کہ اس بکس میں پڑا ہے۔'' میں نے سوال کیا۔

جن جن کو پتا تھا انہوں نے نام بتا دیے۔ اندر کمرے میں تمام خواتین، دلہن فاریہ اور نازیہ سب مجھے دل چسپ اور حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے جن کو پتا ہے ان سب کو ادھر بلائیں مگر میری کوئی بات نہیں کرنی۔''

چاچی باہر چلی گئی تھوڑی دیر بعد آئی تو ان کے ساتھ کچھ عورتیں تھیں، میں سب کو غور سے دیکھتا رہا۔

پھر نہ جانے کہاں سے میرے اندر ایک ایسی بولنے کی طاقت آگئی جو مجھ سے کہہ رہی تھی کہ فلاں نے چوری کی ہے۔

''چاچی اس عورت کا نام!'' میں نے ایک عورت کی طرف اشارہ کیا۔

''بیٹا یہ نسیمہ ہے مگر یہ ہماری قریبی رشتہ دار ہیں۔''

''جی چاچی اس نے ہی زیور چرائے ہیں، پوچھو اس سے۔''

''نہیں میں نے نہیں چرائے۔'' وہ عورت چلاتے ہوئے بولی۔

''چاچی اس کا گھر کہاں ہے۔''

''ادھر قریب ہی ہے۔''

''ٹھیک ہے پھر پولیس اور سارے مہمانوں کو بلا کر سب چلتے ہیں۔ جب زیور مل جائیں گے۔ بے عزتی بھی ہوگی اور جیل بھی۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ یہ عورتیں تمہارے ساتھ چلتی ہیں تاکہ تم کو خود ہی زیور دے سکیں تاکہ یہ بے عزتی اور جیل سے بچ سکے۔''

وہ پولیس اور بے عزتی کا سن کر ڈر گئی اور فوراً مان گئی کہ اس نے زیور چرایا ہے جو اس کے گھر پڑا ہے اور وہ دینے کو تیار ہے۔

''یہ کیا یوسف بھائی! آپ کو کیسے پتا چلا کہ زیور اس کے پاس ہے۔'' اُن سب کے جانے کے بعد اچانک فاریہ نے مجھ سے پوچھا۔

''اصل میں میرے قبضے میں جن بھوت ہیں، وہی مجھے سارا کچھ بتاتے ہیں۔ ایک جن کے ذمے ایک کام لگایا ہے کہ کسی کے دل کو قابو کرنا ہے مگر بولتا ہے کہ سر یہ مشکل کام ہے۔'' میں نے نازیہ کی طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں کہا اور باہر نکل آیا۔

باہر آکر مجھے کچھ بھی سمجھ نہ آیا کہ یہ سب میں نے کیسے کیا اور وہ عورت کیا واقعی چور تھی۔ اگر چور تھی پھر میرے ذہن میں اس بات کا اشارہ کیوں اور کیسے آیا، کہ وہ چور ہے...... میں جتنا زیادہ سوچتا جاتا دماغ اتنا زیادہ الجھتا جاتا۔

☆......☆......☆

شادی کا ہنگامہ ختم ہو چکا تھا کل رات جو میں نے زیور برآمد کیے تھے اس واقعے سے میری اچھی خاصی

شہرت ہو چکی تھی۔ یہ دیہات کا سادہ سا ماحول تھا۔ یہاں کے رہنے والے زیادہ تر اس بات پر یقین کرتے تھے کہ ہم پر تعویز کرانے گئے ہیں کوئی کہہ رہا تھا کہ ہم پر جادو ہے اور ان سب کے بیچ میں ہیں ''عامل بابا'' بن کے بیٹھا تھا جس کو جناتی دنیا کی الف ب کا بھی پتا نہیں تھا بس پتا تھا تو صرف کہانیوں کی حد تک۔ ہر عورت یہ چاہتی تھی کہ میرا مسئلہ پہلے حل ہو۔ ان کی سادہ لوحی پر میرا دل چاہ رہا تھا ادھر ایک پیری فقیری کا آستانہ ہی کھول لیا جائے اور خوب پیسے کماؤں کیونکہ ان بے چاری عوتوں کے اتنے مسائل نہ تھے جتنے ڈر وخوف تھے۔ ان کے مسائل حل کرنے کے لیے بچپن میں پڑھی گئی جنوں بھوتوں کی کہانیاں خوب کام آ رہی تھیں۔

میں نے ہر عورت سے کہا کہ میں جو تمہیں علاج بتاؤں گا ابھی میرے سامنے کرنا ہوگا بس اس کی صرف ایک ہی خوارک ہے اور یہ فی سبیل اللہ ہے۔ اور اس کے بارے میں کسی اور عورت کو اگر بتایا کو اس علاج کا اثر ختم ہو جائے گا۔'' مطلب سب کا علاج ایک ہی تھا، مگر عورتیں ایک دوسرے سے بے خبر تھیں۔ مجھے وہ لڑکا اور لیموں والا واقعہ یاد تھا میں سرخ سیاہی کو لیموں میں انجکشن کے ذریعے داخل کر دیتا پھر وہ عورت کو دے دیتا اس کو کہتا کہ تمہارے اوپر تعویز تھے مگر میں نے اپنے عمل سے ان سب کو اس لیموں میں بند کر دیا ہے۔ اب تم اس کو کاٹو۔''

پھر وہ اس کو کاٹتی تو جیسے ہی سرخ سیاہی نکلتی۔ میں عورت کو کہتا کہ دیکھو یہ تمہارے حاسدین کے کام جنھوں نے تم پر جادو وغیرہ کروایا اس کا خون نکل رہا ہے وہ سب فنا ہو گئے۔ اب تم پر کوئی تعویز نہیں۔'' جس سے وہ عورت حیران ہو کر خوش خوش چلی جاتی۔

بس اس طرح ہی ہم نے کسی کو کس طرح مطمئن کیا اور کسی کو کس طرح اپنی چرب زبانی سے، باتوں سے مطمئن کیا۔ آخر شادی کا تیسرا دن سب مہمان رخصت ہو گئے۔ فاریہ آپی بھی آئی ہوئی تھی، نازیہ اور وہ باتیں کر رہی تھیں تو مجھے بھی ان سے باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔

''یوسف بھائی بہت شہرت سن رہی ہوں میں آپ کی۔ یہ کیا چکر ہے؟'' فاریہ آپی نے مجھ سے کہا۔

میں ابھی جواب دیتا کہ اچانک نازیہ بیچ میں بول پڑی۔

''فاریہ آپی اس سے بولیں کہ پلیز یہ کمرے سے باہر چلا جائے۔ اس نے کل سے جب یہ تعویزوں والا کام شروع کیا ہے، مجھے سخت الجھن ہو رہی ہے۔'' اس نے تھوڑا غصیلے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے میڈم جی ہم کمرے سے تو کیا، ہم تو آج شام کو ہی گھر جا رہے ہیں۔ پھر اداس ہوتی رہنا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اداس ہوتے ہیں میرے دشمن۔'' وہ باہر جاتے زور سے ہوئے بولی۔

جب ہم شام گھر کو آ رہے تھے نازیہ بخار میں تپ رہی تھی اور میرا دل کٹ رہا تھا مگر کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم وہاں مزید نہیں رک سکتے تھے کیونکہ ابو کے آفس کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔

☆......☆......☆

واپس آ کر میں بہت اداس رہا۔ مجھے پتا تھا کہ اب گاؤں میں ہمارا چکر دو ماہ بعد لگے گا۔ یہ دو ماہ میں نے بہت مشکل سے کاٹے کیونکہ ابو کی روٹین تھی کہ ہم چاچا کریم کے ہاں دو ماہ کے بعد ہی جاتے تھے۔

اور پھر ہم دو ماہ بعد چاچا کریم کے گھر تھے، سب نے خوشی بہت کا اظہار کیا مگر نہ جانے کیوں نازیہ اداس تھی یا اس کو میرے آنے کی خوشی نہیں ہوئی۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آ سکی۔

شام ہوئی تو کسی طرح ارد گرد کی عورتوں کو میرے آنے کی بھنک پڑ گئی۔ میں بھی ''عاملیت'' کا سامان ساتھ لایا تھا، وہی سرخ سیاہی اور لیموں دیا اور بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔

اس پورے دن میں مجھے تھوڑی دیر کے لیے نازیہ باہر نظر آئی باقی مجھے وہ سارا دن نظر نہ آئی۔

دوسرے دن ہم صبح ہوتے ساتھ ہی کچھ اور رشتہ داروں کے گھر چلے گئے۔ جب چند گھنٹے کے بعد واپس آئے تو نازیہ باہر بیٹھی تھی پھر کچھ دیر تک تو باہر

بیٹھی رہی پھر اندر کمرے میں چلی گئی۔ اس کی کیا وجوہات تھیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آ سکا۔ کیا وہ میرے تعویزوں والے کام کرنے پر ناراض تھی یا کچھ اور وجہ تھی۔ شام کو ہماری واپسی تھی اور میں ایک تجسس، پریشانی میں گھر لوٹ آیا۔

☆......☆......☆

اگلا چکر ابو کی مصروفیت کی وجہ سے جلدی نہ لگ سکا۔ ہم تقریباً چار ماہ بعد آئے۔ اس دفعہ فاریہ آپی بھی آئی ہوئی تھیں۔ چند گھنٹے تو نازیہ ہمارے پاس موجود رہی مگر پھر وہی حال......

میں نے مجبور ہو کر فاریہ آپی کو سارا حال بتایا اور تعویز والی بات پر معذرت بھی کی کہ میں آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔ پلیز آپ نازیہ سے بات تو کریں کہ اس سے بات کیے ہوئے مجھے چھ ماہ ہو گئے ہیں۔''

فاریہ آپی نے مجھے شام نے کو بتایا کہ ایسی کوئی بات نہیں بس وہ ذرا پڑھائی میں مصروف ہوتی ہے۔''

''مگر آپی پڑھائی تو پہلے بھی ہوتی تھی، اب کوئی خاص پڑھائی تھوڑی ہے۔'' میں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا، مگر کچھ بات نہ بن سکی۔

ہم دو دن بعد لوٹ آئے اور میں اس آس پر لوٹا کہ ہم پھر کب جائیں گے؟

☆......☆......☆

جب ہمارا اس دفعہ چاچا کریم کے ہاں جانے کا ارادہ بنا تو میرا یونیورسٹی کا فنکشن تھا جس کو چھوڑنا ناممکن تھا اور میں دوسری طرف نازیہ کا رویہ دیکھ چکا تھا تو مجبوری کی بنا پر چاچا کریم کی طرف نہ جا سکا۔ اور یہ سوچ لیا کہ چلو اگلی دفعہ ہی سہی۔

دوسرے دن گھر والوں کی واپسی ہوئی تو آتے ہی میں بھائی کو کونے میں لیے گیا اور نازیہ کا حال پوچھا تو بھائی نے حیرانگی سے کہا کہ وہ اس دفعہ تو بالکل ٹھیک تھی سارا دن ہمارے ساتھ رہی حتیٰ کہ اس نے ہماری وجہ سے اپنے کالج سے بھی چھٹی کی تھی۔''

یہ بات میرے لیے حیران کن تھی کہ وہ صرف میرے سامنے نہیں آ رہی تھی اور پڑھائی کا تو اس نے محض بہانا کیا تھا۔ تو میں نے سوچا کہ اس بار جا کر نازیہ سے ہر صورت لازمی بات کروں گا۔

اگلی بار جب ہم پہنچے تو صورت حال بالکل ویسی کی ویسی تھی تو میں نے تہیہ کیا کہ دوبارہ ادھر نہیں آؤں گا مگر یہ بات میری سمجھ میں نہ آ سکی کہ آخر میرا جرم کیا تھا۔

☆......☆......☆

وقت گزرتا گیا اور نازیہ سے بات کیے ہوئے مجھے ڈیڑھ سال گزر گیا۔ بھائی کی زبانی مجھے پتا چل جاتا کہ میری غیر موجودگی میں سب کچھ ٹھیک ہوتا ہے۔ ایک دفعہ چکر لگایا تو نازیہ کا وہی رویہ رہا تو میں نے بالکل ہی جانا چھوڑ دیا اور میرا معقول بہانہ وہاں نہ جانے کا یہ بھی تھا کہ میری جاب ہو چکی تھی تو میں نہیں آ سکتا۔ مگر پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جو شاید مجھے کبھی نہ بھولے۔ نازیہ کے بھائی کی شادی تھی سب گھر والے جا رہے تھے۔ میرا جانا بھی لازمی تھا۔ تو اس موقعے پر دونوں گھر والوں نے میری اور نازیہ کی منگنی کا سوچا۔ میرے لیے تو یہ بہت بڑی خوش خبری تھی مگر پریشانی اس بات کی تھی کہ نازیہ نے تو مجھ سے ڈیڑھ سال سے بات نہیں کی تھی۔ کیا وہ مان جائے گی۔

شام کو میں نے الگ سے فاریہ آپی کو بلایا اور کہا کہ آپی آپ کو پتا ہے میری اور نازیہ کی منگنی کی بات چل رہی ہے مگر کیا وہ راضی ہے؟''

''ہاں بھیا امی نے مجھے کہا ہے کہ تم نازیہ سے پوچھو کیونکہ امی، ابو اور میں بھی یہی چاہتی ہوں مگر میں نے نازیہ سے بات کی ہے اس نے ''ناں'' میں جواب دیا ہے۔'' فاریہ آپی نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''مگر آپی کوئی وجہ تو ہوگی نا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں میں نے نازیہ سے پوچھا تھا تو اس نے کہا کہ وہ یہ منگنی یا شادی ہرگز نہیں کر سکتی کیونکہ اس سے آپ دونوں کی زندگیوں کو خطرات لاحق ہیں۔''

''ٹھیک ہے آپی کوئی بات نہیں بس نازیہ سے کہیں کہ میری صرف ایک بات سن لے۔''

''وہ کیا بھائی؟'' آپی نے کہا۔

''آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ کی شادی پر کھوئے ہوئے زیور والی چور کو پکڑا تھا۔ پھر عورتوں

کے کچھ جناتی مسائل ہوئے تھے وہ حل کر کے دیتا تھا۔ اب اگر نازیہ نے کہا ہے کہ اس کی منگنی یا شادی سے ہم دونوں کی زندگیوں کو خطرات ہیں تو آپ ایک لیموں لے آنا میں آپ کو اُس پر ایک خاص عمل پڑھ دوں گا۔ اس لیموں میں ہماری آنے والی ساری زندگی کے خطرات ہوں گے۔ نازیہ چھری سے خود اس کو رات کی تنہائی میں کاٹے گی۔ اس سے سرخ خون نکل جائے گا۔ جو اس بات کی نشانی ہوگا کہ ہماری آنے والی زندگی سے خطرات نکل گئے ہیں۔ پلیز آپی میں نازیہ سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''مگر بھائی یہ کیسے ممکن ہے؟'' فاریہ آپی نے کہا۔

''آپی آپ کو میری بات پر یقین نہیں۔ کیا آپ کو یاد نہیں میں نے آپ کے زیور کیسے برآمد کیے تھے۔ اصل میں یہ سب میرے ساتھ ایک نیک بزرگ کی دعا کا نتیجہ ہے تو میں وہی کلام پڑھتا ہوں۔ تو یہ سب کچھ ہو جاتا ہے میں کچھ بھی غلط نہیں کرتا اور میرا مقصد غلط نہیں ہے۔'' میں نے بہت بڑا جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ میں نے شام کو آپی کو لیموں دیا مگر اس دفعہ اس میں کوئی سرخ سیاہی نہیں ڈالی تھی کہ اگر اس کو کاٹا جائے تو اس میں کچھ بھی نہ ہو تو میں یہ کہوں گا یہ دیکھو کہ ہماری آنے والی زندگی میں کوئی خطرات نہیں پھر چاچی کو بولوں گا کہ چند اُن عورتوں کو لے آؤ جب انہوں نے مجھے لیموں دیے اور میں نے واپس کیے انہوں نے کاٹے تو ان میں سرخ خون تھا۔ اسطرح نازیہ کے پاس جو لیموں ہوگا وہ بھی سفید ہوگا، اس طرح میرا مقصد کامیاب ہو جائے گا۔

پھر رات ہوگئی مجھے صبح کا شدت سے انتظار تھا۔

اگلے دن شادی تھی۔ نازیہ تو کہیں نظر نہ آئی مگر جیسے ہی فاریہ آپی کو دیکھا تو ان سے پوچھا تو ان نے کہا کہ نازیہ نے سختی سے منگنی وغیرہ سے منع کر دیا ہے اور اس کو شدت سے بخار ہے۔

''مگر آپی کیا انہوں نے وہ لیموں کاٹا تھا؟؟''

''ہاں کاٹا تھا۔ اس میں سے ایسے خون نکلا جیسے کسی کو ذبح کیا جا رہا ہو۔''

''کیا آپی میں لاؤ'' چلا اُٹھا۔

''ہاں تمہیں یقین نہیں آتا یہ دیکھو میں کمرے سے اٹھا کر لاتی ہوں۔ وہ میں نے تمہارے لیے ہی رکھا ہوا ہے۔''

آپی تھوڑی دیر بعد آئیں تو ان کے ہاتھ میں شاپر تھا جو انہوں نے مجھے دیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے شاپر کو کھولا پھر اندر لیموں کپڑے میں سرخ ہوا پڑا تھا۔ میں نے جیسے ہی کٹے ہوئے لیموں کو کھولا سرخ خون کا فوارہ نکلا جو میرے ہاتھوں کو لال کرتا ہوا زمین پر گرا۔ اب صورت حال عجیب تھی اگر میں لیموں کو بند کرتا خون بند ہو جاتا اگر لیموں کو کھولتا تو خون ایسے نکلتا جسے کوئی تازہ خون۔ میں خوف زدہ ہو چکا تھا۔ میں نے جلدی میں اس لیموں کو ساتھ بہتے کھال کے پانی میں ڈالا اور خود اندر شادی والے گھر کی طرف بھاگا۔

میں اچھا خاصا ڈر گیا تھا کہ کیا چکر ہے۔ میں چاہتا تھا ہم جلد از جلد اِدھر سے نکلیں۔ یہ شکر تھا ہم نے آج ہی آنا تھا تو ہم گھر واپس آ گئے۔

گھر واپس آتے ہی مجھے خوف کی وجہ سے اگلی کئی دن بخار رہا۔ مگر میری سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ میں نے سفید لیموں دیا تھا تو اس کی یہ حالت کیسے ہوگئی......

☆......☆......☆

اس واقعے کے تین سال بعد میرے ساتھ ایسا ویسا کچھ نہ ہوا اور جاب کی وجہ سے میں بھی مکمل طور پر ملتان شفٹ ہو گیا تھا۔ اس بار جب میں گھر آیا تھا یہ خبر سننے کو ملی کہ نازیہ کی شادی کے ساتھ ابو کے ایک اور رشتہ دار کی بھی شادی ہے۔

مجھے نازیہ کی شادی میں کوئی دلچسپی نہ تھی میں نے سوچا کہ دوسری شادی میں شرکت کر لی جائے اور گاؤں کا سیر سپاٹا بھی ہو جائے گا۔

مگر ادھر کیا حسین اتفاق ہوگا۔ مجھے خود بھی پتا نہیں تھا۔ ہوا یہ کہ جب ہم اپنی کار میں شادی پر پہنچے میں بھائی کو نازیہ کی شادی پر لے جانے کی بجائے زبردستی دوسری شادی پر لے گیا۔ پھر ہم وہاں سے فارغ ہونے کے بعد جیسے ہی چاچا کریم کے گھر کے راستے پر آئے تو ایک سجی سنوری کار کھڑی تھی جس کا ڈرائیور اس سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ اور ارد گرد سارے ہمارے جاننے والے بندے کھڑے تھے۔

ڈرائیور نے ہمیں دیکھ کر رکنے کا اشارہ کیا۔

ہم گاڑی روک کر نیچے اترے، پتا چلا کہ اسٹارٹ نہیں ہو رہی۔

میں نے جیسے ہی ان کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا اندر ایک طرف فاریہ آپی، درمیان میں دلہن بن کر بیٹھی نازیہ، ساتھ نہ جانے کون تھا۔ سب کی توجہ باہر کار کی طرف تھی جبکہ جو حیران کن بات تھی وہ یہ تھی کہ نازیہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

میں اپنی توجہ ہٹائی اور کار اسٹارٹ کرنے لگا۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد کار اسٹارٹ ہوگئی۔ میں کار سے باہر نکل آیا اور اداس آنکھوں سے نازیہ کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا اور اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ وہ آج اتنے سالوں بعد مجھے دیکھ کر کیوں مسکرائی ہے۔ کچھ پوچھ سکا نہ بتا سکا۔ بس خاموش نظروں سے دھول اڑاتی کار کو دیکھتا رہا تھا۔

☆......☆......☆

ٹرین کی زوردار آواز نے مجھے یکدم نیند سے بیدار کر دیا۔ میں اٹھ بیٹھا کوئی اسٹیشن آیا تھا یخ سردی تھی میں بھاگ کر پکوڑے لے آیا۔

نازیہ اب شادی شدہ تھی، اس کا احترام اب بھی میرے دل میں تھا مگر کچھ سوال مچل رہے تھے اور پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

''احسان ایک بات پوچھوں۔'' اچانک نازیہ نے خود ہی لب کھولے۔

''ہاں پوچھو۔'' میں نے کہا۔

''کیا تم واقعی تعویزوں والا کام جانتے تھے۔''

''نہیں میں بالکل بھی نہیں جانتا تھا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس کے بارے کچھ بھی پتا نہیں تھا۔''

''تو پھر تمہیں یاد ہوگا کہ فاریہ آپی کی شادی پر وہ زیور تم نے کس طرح تلاش کیے تھے۔'' نازیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہاں زیور والی بات تو مجھے بھی یاد ہے مگر اتنے سالوں بعد تم نے دوبارہ یاد کروائی ہے۔ اس بارے مجھے کچھ علم نہیں کہ میں نے اس عورت کو کیسے پکڑا تھا۔ میں آج بھی حیران ہوں کہ مجھے کیسے پتا چلا کہ وہ عورت یہ ہے، مگر اس واقعے کے بعد میرے ساتھ جو کچھ ہوا اس بات کی سمجھ نہیں آئی۔'' نازیہ نے مجھ سے کہا۔

چند باتیں تو میں نے بھی تم سے پوچھنی تھیں؟

''کیا۔'' نازیہ نے جواباً کہا۔

''نازیہ اب تم شادی شدہ ہو۔ میں تمہارا احترام کرتا ہوں مگر میں وہ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں جو مجھے گذشتہ دس سالوں سے تکلیف دے رہی ہیں کہ تمہارا رویہ میرے ساتھ اتنا کیوں بدل گیا تھا۔ تم نہ جانے اتنی بدل کیوں گئی تھیں۔ ہو کیا گیا تھا۔ تم میری شکل دیکھنا پسند بھی نہیں کرتی تھیں۔ میں جب بھی آتا میری نظروں سے دور ہو جاتی تھیں۔ ناں اور جب میرے گھر والے آتے تو تم ان کے سامنے بیٹھی رہتی تھیں، یہ معمہ آج تک میری سمجھ میں نہ آسکا۔ نہ جانے میرا ایسا کیا قصور تھا جس کی سزا تم نے مجھے دی۔'' میں نے بولتے ہوئے کہا کیوں کہ آج مجھے ہر سوال کا جواب چاہیے تھا۔

''جواب ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جس پر یقین نہیں کرو گے۔ جس رات تم نے زیور برآمد کیے اس سے اگلے دن مجھے تم سے خوف آنے لگا، پھر بخار ہو گیا پھر جب تم ہر دفعہ آتے تو مجھے تمہارے سائے سے بھی خوف آتا کیونکہ تمہارے سر پر ایک بڑا سا اژدھا بیٹھا ہوتا تھا اس کی خوفناک آنکھیں ہوتیں یا اس میں سرخ لیموں ہوتے تھے۔ اب مجھے یہ پرانی بات یاد نہیں......ایک دفعہ میں نے کسی لڑکی کو کہا کہ تمہارے سر پر کیا ہے تو اُس نے کہا کچھ بھی نہیں ہے۔ جب کہ مجھے وہ صاف نظر آتا۔ میں جدھر جاتی وہ مجھے گھورتا رہتا اس لیے میں نے تمہارے سامنے آنا چھوڑ دیا پھر جب تم نے مجھے کاٹنے کے لیے لیموں دیا تھا اس سے

کے کچھ جناتی مسائل ہوئے تھے وہ حل کر کے دیتا تھا۔ اب اگر نازیہ نے کہا ہے کہ اس کی منگنی یا شادی سے ہم دونوں کی زندگیوں کو خطرات ہیں تو آپ ایک لیموں لے آنا میں آپ کو اُس پر ایک خاص عمل پڑھ دوں گا۔ اس لیموں میں ہماری آنے والی ساری زندگی کے خطرات ہوں گے۔ نازیہ چھری سے خود اس کو رات کی تنہائی میں کاٹے گی۔ اس سے سرخ خون نکل جائے گا۔ جو اس بات کی نشانی ہو گا کہ ہماری آنے والی زندگی سے خطرات نکل گئے ہیں۔ پلیز آپی میں نازیہ سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''مگر بھائی یہ کیسے ممکن ہے؟'' فاریہ آپی نے کہا۔

''آپی آپ کو میری بات پر یقین نہیں۔ کیا آپ کو یاد نہیں میں نے آپ کے زیور کیسے برآمد کیے تھے۔ اصل میں یہ سب میرے ساتھ ایک نیک بزرگ کی دعا کا نتیجہ ہے تو میں وہی کلام پڑھتا ہوں۔ تو یہ سب کچھ ہو جاتا ہے میں کچھ بھی غلط نہیں کرتا اور میرا مقصد غلط نہیں ہے۔'' میں نے بہت بڑا جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ میں نے شام کو آپی کو لیموں دیا مگر اس دفعہ اس میں کوئی سرخ سیاہی نہیں ڈالی تھی کہ اگر اس کو کاٹا جائے تو اس میں کچھ بھی نہ ہو تو میں یہ کہوں گا یہ دیکھو کہ ہماری آنے والی زندگی میں کوئی خطرات نہیں پھر چاچی کو بولوں گا کہ چند اُن عورتوں کو لے آؤ جب انہوں نے مجھے لیموں دیے اور میں نے واپس کیے انہوں نے کاٹے تو ان میں سرخ خون تھا۔ اسطرح نازیہ کے پاس جو لیموں ہو گا وہ بھی سفید ہو گا، اس طرح میرا مقصد کامیاب ہو جائے گا۔

پھر رات ہو گئی مجھے صبح کا شدت سے انتظار تھا۔

اگلے دن شادی تھی۔ نازیہ تو کہیں نظر نہ آئی مگر جیسے ہی فاریہ آپی کو دیکھا تو ان سے پوچھا تو ان نے کہا کہ نازیہ نے سختی سے منگنی وغیرہ سے منع کر دیا ہے اور اس کو شدت سے بخار ہے۔

''مگر آپی کیا انہوں نے وہ لیموں کاٹا تھا؟؟''

''ہاں کاٹا تھا۔ اس میں سے ایسے خون نکلا جیسے کسی کو ذبح کیا جا رہا ہو۔''

''کیا آپی میں لا۔'' چلا اُٹھا۔

''ہاں تمہیں یقین نہیں آتا یہ دیکھو میں کمرے سے اٹھا کر لاتی ہوں۔ وہ میں نے تمہارے لیے ہی رکھا ہوا ہے۔''

آپی تھوڑی دیر بعد آئیں تو ان کے ہاتھ میں شاپر تھا جو انہوں نے مجھے دیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے شاپر کو کھولا پھر اندر لیموں کپڑے میں سرخ ہوا پڑا تھا۔ میں نے جیسے ہی کٹے ہوئے لیموں کو کھولا سرخ خون کا فوارہ نکلا جو میرے ہاتھوں کو لال کرتا ہوا زمین پر گرا۔ اب صورت حال عجیب تھی اگر میں لیموں کو بند کرتا خون بند ہو جاتا اگر لیموں کو کھولتا تو خون ایسے نکلتا جیسے کوئی تازہ خون۔ میں خوف زدہ ہو چکا تھا۔ میں نے جلدی میں اس لیموں کو ساتھ بہتے کھال کے پانی میں ڈالا اور خود اندر شادی والے گھر کی طرف بھاگا۔

میں اچھا خاصا ڈر گیا تھا کہ کیا چکر ہے۔ میں چاہتا تھا ہم جلد از جلد اِدھر سے نکلیں۔ یہ شکر تھا ہم نے آج ہی آنا تھا تو ہم گھر واپس آ گئے۔

گھر واپس آتے ہی مجھے خوف کی وجہ سے اگلی کئی دن بخار رہا۔ مگر میری سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ میں نے سفید لیموں دیا تھا تو اس کی یہ حالت کیسے ہو گئی......

☆......☆......☆

اس واقعے کے تین سال بعد میرے ساتھ ایسا ویسا کچھ نہ ہوا اور جاب کی وجہ سے میں بھی مکمل طور پر ملتان شفٹ ہو گیا تھا۔ اس بار جب میں گھر آیا تھا یہ خبر سننے کو ملی کہ نازیہ کی شادی کے ساتھ ابو کے ایک اور رشتہ دار کی بھی شادی ہے۔

مجھے نازیہ کی شادی میں کوئی دلچسپی نہ تھی میں نے سوچا کہ دوسری شادی میں شرکت کر لی جائے اور گاؤں کا سیر سپاٹا بھی ہو جائے گا۔

مگر ادھر گیا حسین اتفاق ہو گا۔ مجھے خود بھی پتا نہیں تھا۔ ہوا یہ کہ جب ہم اپنی کار میں شادی پر پہنچے میں بھائی کو نازیہ کی شادی پر لے جانے کی بجائے

زبردستی دوسری شادی پر لے گیا۔ پھر ہم وہاں سے فارغ ہونے کے بعد جیسے ہی چاچا کریم کے گھر کے راستے پر آئے تو ایک سجی سنوری کار کھڑی تھی جس کا ڈرائیور اس سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ اور ارد گرد سارے ہمارے جاننے والے بندے کھڑے تھے۔

ڈرائیور نے ہمیں دیکھ کر رکنے کا اشارہ کیا۔

ہم گاڑی روک کر نیچے اترے، پتا چلا کہ اسٹارٹ نہیں ہو رہی۔

میں نے جیسے ہی ان کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا اندر ایک طرف فاریہ آپی، درمیان میں دلہن بن کر بیٹھی نازیہ، ساتھ نہ جانے کون تھا۔ سب کی توجہ باہر کار کی طرف تھی جبکہ جو حیران کن بات تھی وہ یہ تھی کہ نازیہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

میں اپنی توجہ ہٹائی اور کار اسٹارٹ کرنے لگا۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد کار اسٹارٹ ہو گئی۔ میں کار سے باہر نکل آیا اور اداس آنکھوں سے نازیہ کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا اور اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ وہ آج اتنے سالوں بعد مجھے دیکھ کر کیوں مسکرائی ہے۔ کچھ پوچھ سکا نہ بتا سکا۔ بس خاموش نظروں سے دھول اڑاتی کار کو دیکھتا رہا تھا۔

☆......☆......☆

ٹرین کی زوردار آواز نے مجھے یکدم نیند سے بیدار کر دیا۔ میں اٹھ بیٹھا کوئی اسٹیشن آیا تھا یخ سردی تھی میں بھاگ کر پکوڑے لے آیا۔

نازیہ اب شادی شدہ تھی، اس کا احترام اب بھی میرے دل میں تھا مگر کچھ سوال مچل رہے تھے اور پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

''احسان ایک بات پوچھوں۔'' اچانک نازیہ نے خود ہی لب کھولے۔

''ہاں پوچھو۔'' میں نے کہا۔

''کیا تم واقعی تعویزوں والا کام جانتے تھے۔''

''نہیں میں بالکل بھی نہیں جانتا تھا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس کے بارے کچھ بھی پتا نہیں تھا۔''

''تو پھر تمہیں یاد ہو گا کہ فاریہ آپی کی شادی پر وہ زیور تم نے کس طرح تلاش کیے تھے۔'' نازیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہاں زیور والی بات تو مجھے بھی یاد ہے مگر اتنے سالوں بعد تم نے دوبارہ یاد کروائی ہے۔ اس بارے مجھے کچھ علم نہیں کہ میں نے اس عورت کو کیسے پکڑا تھا۔ میں آج بھی حیران ہوں کہ مجھے کیسے پتا چلا کہ وہ عورت یہ ہے، مگر اس واقعے کے بعد میرے ساتھ جو کچھ ہوا اس بات کی سمجھ نہیں آئی۔'' نازیہ نے مجھ سے کہا۔

چند باتیں تو میں نے بھی تم سے پوچھنی تھیں؟

''کیا۔'' نازیہ نے جواباً کہا۔

''نازیہ اب تم شادی شدہ ہو۔ میں تمہارا احترام کرتا ہوں مگر میں وہ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں جو مجھے گذشتہ دس سالوں سے تکلیف دے رہی ہیں کہ تمہارا رویہ میرے ساتھ اتنا کیوں بدل گیا تھا۔ تم نہ جانے اتنی بدل کیوں گئی تھیں۔ ہو کیا گیا تھا۔ تم میری شکل دیکھنا پسند بھی نہیں کرتی تھیں۔ میں جب بھی آتا میری نظروں سے دور ہو جاتی تھیں۔ ناں اور جب میرے گھر والے آتے تو تم ان کے سامنے بیٹھی رہتی تھیں، یہ معمہ آج تک میری سمجھ میں نہ آسکا۔ نہ جانے میرا ایسا کیا قصور تھا جس کی سزا تم نے مجھے دی۔'' میں نے بولتے ہوئے کہا کیوں کہ آج مجھے ہر سوال کا جواب چاہیے تھا۔

''جواب ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جس پر یقین نہیں کرو گے۔ جس رات تم نے زیور برآمد کیے اس سے اگلے دن مجھے تم سے خوف آنے لگا، پھر بخار ہو گیا پھر جب تم ہر دفعہ آتے تو مجھے تمہارے سائے سے بھی خوف آتا کیونکہ تمہارے سر پر ایک بڑا سا اژدھا بیٹھا ہوتا تھا اس کی خوفناک آنکھیں ہوتیں یا اس میں سرخ لیموں ہوتے تھے۔ اب مجھے یہ پرانی بات یاد نہیں...... ایک دفعہ میں نے کسی لڑکی کو کہا کہ تمہارے سر پر کیا ہے تو اُس نے کہا کچھ بھی نہیں ہے۔ جب کہ مجھے وہ صاف نظر آتا۔ میں جدھر جاتی وہ مجھے گھورتا رہتا اس لیے میں نے تمہارے سامنے آنا چھوڑ دیا پھر جب تم نے مجھے کاٹنے کے لیے لیموں دیا تھا اس سے

بھی سرخ لہو نکلا تو مجھے یقین ہو گیا تمہارے قبضے میں کوئی پراسرار قوت یا جن ہے۔''

''کیا واقعی ایسا ہی تھا۔'' میں حیرت سے کہا۔

''ہاں بالکل مگر کیا تمہیں اس بارے کوئی علم نہیں تھا۔'' نازیہ نے حیرت سے کہا۔

''اُف نہیں میں، میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں اس بارے میں بالکل بھی نہیں جانتا تھا لیکن پھر تمہاری بارات جارہی تھی تو اتفاق سے گاڑی خراب ہو گئی تھی تو میں ٹھیک کرنے کے لیے اندر آیا تو تم اس وقت کیوں مسکرائی تھیں۔''

''جیسے ہی کار خراب ہوئی سب کار سے باہر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں نے شیشے سے باہر کی طرف جھانکا تو تم نظر آتے دکھائی دیے مگر اس دفعہ مجھے تم سے کوئی خوف نہ آیا اور نہ ہی تمہارے سر پر کوئی اژدھا وغیرہ تھا۔ تو اب تم مجھے پلیٹ فارم پر ملے تو بھی کوئی خوف نہ ہوا پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ اژدھا ہی میرا دشمن تھا۔ جس سے شاید تم جنوں بھوتوں کو پکڑتے رہے تو تم نے اپنی حفاظت کے لیے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔'' نازیہ نے کہا۔

''نہیں نازیہ میرا یقین کرو۔ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا۔'' میں نے اس کو اپنا یقین دلانے کی بہت کوشش کر مگر وہ نہیں مانی۔

ٹرین کی رفتار اب دھیمی ہو رہی تھی۔

نازیہ کی منزل آ گئی تھی۔ وہ اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ ٹرین بالکل ساکت ہو گئی۔ نازیہ نے اپنا سامان اٹھایا اور نیچے اتر گئی۔ میں اس کو دوسری بار کھو رہا تھا وہ بھی کوئی اپنا سچ بتائے بنا کیونکہ میرے پاس کہنے کے لیے لفظ ہی نہ تھے!!!

☆......☆......☆

ٹرین تھوڑی دیر کے بعد پھر چل پڑی۔ میں شیشے سے باہر کے منظر کا نظارہ کر رہا تھا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرے ساتھ کوئی بیٹھا ہے۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو وہاں ایک عجیب سا شخص بیٹھا ہوا نظر آیا۔ پتا نہیں وہ کب اندر آیا تھا۔

''بھائی شاید آپ غلط سیٹ پر بیٹھ گئے ہیں کیونکہ یہ سیٹیں بک ہیں۔'' میں نے اس آدمی سے بہت پیار سے بات کرتے ہوئے کہا۔

''جانتا ہوں احسان صاحب یہ سیٹیں بک ہیں۔ مگر آج آپ کے ساتھ بیٹھنے اور بات کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔'' اس عجیب وغریب آدمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کک کیا مطلب تم کون ہو؟؟ اور میرا نام کیسے جانتے ہو اور مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہو۔'' میں نے تھوڑا غصیلے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''بس ایک بہت پرانا قرض باقی تھا۔''

''کیسا قرض!'' مجھے سخت الجھن ہوئی۔

''یاد کرو جب تم بچے تھے اور اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں گئے تھے۔ تمہیں ان کی زمینوں سے لیموں کے درخت کے نیچے سامان میں جو چیزیں ملی تھیں، اس میں ایک لیموں بھی تھا۔ تم نے اس کاٹ ڈالا تھا حالانکہ کوئی تم سے کتنی مرتبہ کہتا رہا تھا کہ اس کو مت کاٹو مگر تم نے اس کی ایک نہ سنی اور اس لیموں کاٹ ڈالا اور اس میں سے لہو بھی نکلا تھا۔ یاد ہے نا یہ بات۔'' اس نے مجھ سے کہا۔

''ہاں، ہاں یاد ہے مگر وہ تو بہت پرانی بات ہے۔ وہ تو کوئی لڑکا تھا اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''وہ لڑکا میں ہی ہوں اور تمہارے لیے وہ پرانی بات ہو گی میرے لیے جیسے کل کی بھی نہیں بلکہ آج کی بات ہے کیونکہ تمہاری وجہ سے میری ''شکلا'' ہمیشہ کے لیے مجھ سے کھو گئی۔ ہم اس دنیا کے لوگ نہیں تھے۔''

''تو آپ کون تھے اور یہ شکلا کون تھی؟ آپ پوری بات بتلائیں۔'' مجھے سخت الجھن ہو رہی ہے۔'' میں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

''ہم اُس دنیا کے لوگ ہیں جس میں تم بہت دلچسپی رکھتے تھے اور عورتوں کو تعویز بنا کر دیتے تھے مگر اس بارے پتا کچھ بھی نہیں تھا، یعنی پراسرار دنیا۔ ایک دفعہ ہم سب اپنے پورے خاندان کے ہمراہ اس دنیا میں آئے۔ ہم ابھی تمہاری دنیا کی سیر کر ہی رہے تھے کہ ہماری دنیا پر ہمارے دشمنوں نے حملہ کر دیا۔

ہمارے لوگ اس قدر جلدی میں گئے کہ میں اور میری ہونے والی محبوبہ ادھر ہی رہ گئے۔ پھر ہمارے دشمن ہمارے سارے خاندان کو مارنے کے بعد ہماری تلاش میں زمین پر اترے۔ میرے والد زخمی تھے انہوں نے مجھے خبر کر دی۔ میں نے جلدی سے ایک خاص عمل سے شکلا کو اس لیموں میں بند کر دیا۔ جس کو تم نے کاٹا تھا اور اپنے آپ کو بھی ان کی نظروں سے چھپا لیا۔ دشمنوں نے ہمیں تلاش کیا مگر ہم ان کو نہ مل سکے۔ وہ واپس چلے گئے۔ اب شکلا کو لیموں سے نکالنے کے لیے ایک خاص عمل اور ٹائم چاہیے تھا۔ میں نے اپنی شکل وصورت انسان والی کر لی تھی اور عمل اس لیموں والے پیڑ کے نیچے ہی کرنا ضروری تھا بدقسمتی سے ایک دن میں لیموں درخت کے نیچے ہی بھول آیا۔ اگر جس دن وہ لیموں بھول جاؤ تو دوبارہ اٹھانے نہیں جاتا تھا ......تو جس دن وہ لیموں تمہارے ہاتھ لگا وہ میرے عمل کا آخری دن تھا۔ میں عمل پڑھنے کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی روک رہا تھا اور اپنا عمل بھی مکمل کر رہا تھا۔ ابھی میرے چند الفاظ باقی تھے کہ تم نے لیموں کاٹ ڈالا مگر درحقیقت لیموں نہیں میری ''شکلا'' کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔ میرے انتقام کی آگ اتنی تھی جس کا تصور تم کر بھی نہیں سکتے تھے، مگر یاد ہے میں نے تم کو کیا کہا تھا کہ اس کا حساب تمہیں دینا پڑے گا۔ میں شکلا کا انتقام لینے کے لیے دن رات تمہارے ساتھ چپک گیا۔ پھر مجھے تمہاری نازیہ نظر آئی۔ یہیں سے میرا انتقام شروع ہوا۔ وہ زیور کس نے چوری کیے۔ عورت کون تھی۔ یہ بات میں نے تمہارے ذہن میں ڈالی۔ اژدھا بن کر میں تمہارے سر پر موجود رہتا تھا، اور نازیہ کو خوابوں میں آ کر میں نے ہی ڈرایا کہ تم نے احسان سے شادی کی تو تمہارے آنے والی زندگی میں خطرات ہیں اور تم کو یاد ہو گا کہ تم نے سادہ لیموں ہی دیا تھا نازیہ کو تو اس میں نے میں نے خون بھر دیا تھا۔ جس کے بعد سے وہ مزید ڈر گئی تھی اور اُس نے تم سے شادی کے لیے انکار کر دیا تو مجھے سکون ملا۔'' اس نے اداس لہجے میں مجھے تمام تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

میں خاموش ہو کر صرف اس کی شکل دیکھتا رہا تھا۔ میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''مگر کاش تم مجھے پہلے مل لیتے۔ سب باتیں نازیہ کے سامنے بتا دیتے تاکہ اس کو میری باتوں کا یقین آ جاتا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں میں تمہارے سامنے جان بوجھ کر نہیں آیا اور اس کو سچ نہیں بتایا اور تم پر ایک خاص عمل کر دیا ہے کہ تم بھی اب اس سے کبھی مل نہیں سکو گے۔ تاکہ تمہیں ساری زندگی احساس رہے کیونکہ تم نے تعویز کے نام پر کئی جھوٹ بولے تھے۔ وہ بھی اس وقت جب تم بچے نہیں تھے۔ ایک بات یاد رکھنا، ہماری جناتی دنیا بہت وسیع دنیا ہے۔ اس میں شر بھی ہے، بد بھی ہے اور اچھائی بھی ہے۔ اور یہ ہماری دنیا کوئی ایسی عام طاقت نہیں کہ جو تمہاری دنیا کے ہر دعوے دار کے قبضے میں آ جائے گی۔'' پھر اس کے بعد اس نے ایسا قہقہہ لگایا جس کی آواز سے مجھے ایسے لگا جیسے کئی ٹرینیں آپس میں ٹکرا گئی ہوں اور مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

☆......☆......☆

ٹرین کے وِسل کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے گذشتہ حالات پر غور کیا۔ میں اتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ میں جلدی سے اٹھا، باہر جھانکا میری منزل آ گئی تھی۔ میں جلدی سے اپنا سامان اٹھا کر باہر لے آیا۔

میں مجرم نہ ہونے کے باوجود بھی مجرم تھا نازیہ کا بھی اور شکلا کا بھی۔ اور اب اس جرم کی سزا مجھے ساری زندگی برداشت کرنا تھی۔ میں نے ٹرین سے اُترتے وقت کھڑکی کے شیشے پر اپنا عکس دیکھا تو مجھے 1100 والٹ کا جھٹکا لگا تھا۔ میرے سر پر واضح طور پر ایک اژدھا، سرخ لیموں جیسی آنکھیں لیے گھور رہا تھا۔

میں اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔ کیونکہ اب مجھے اس اژدھے سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا بلکہ میں 'شکلا' کے محبوب پر ہوئے ظلم پر اپنے خدا سے دل ہی دل میں معافی مانگ رہا تھا۔ بے شک خدا کی مخلوق کا شمار نہیں۔ خدا مجھے معاف کرے گا اور اِس عفریت سے نجات دلائے گا۔ یہ یقین میرے دل میں دور تک گھر کرتا جا رہا ہے۔ آپ بھی میرے لیے ضرور دعا کیجیے گا۔

☆☆......☆☆



سنپولیے



علی حسنین تابش

حاسدوں کے شر سے نکلی ایک روح فرسا خوف بیتی

میں ششدر سا ہو کر رہ گیا۔ لوگوں کا اِک بہت بڑا ہجوم تھا۔ حد نظر تک بے شمار لوگ ہی لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ لمحوں کے بعد اک زور دار نعرہ ''کلمۂ شہادت'' گونجتا اور لوگ اپنے قدم بڑھاتے ہوئے منزل کو رواں دواں ہو جاتے۔

معمول کی اِک صبح تھی اور میں اپنے کلینک پر جا رہا تھا۔ گھر سے کچھ ہی فاصلے پر بڑا چوک آتا تھا۔ اس ہجوم کا رُخ بھی اسی چوک کی طرف تھا۔ میرے دماغ میں بہت سے سوالات جنم لیتے اور کافور ہوتے رہے۔ ایسی کونسی بڑی شخصیت وفات پا چکی جس کے جنازے میں اتنے لوگ شامل ہیں؟ ایسے بہت سے سوالات کا جھرمٹ میرا طواف کرتا رہا۔ خیر میں بھی ان لوگوں میں شامل ہو گیا۔ یہ بڑا ہجوم چوک میں سے ہوتا ہوا مین روڈ پہ پہنچ گیا۔ اب اس کا رُخ قبرستان کی طرف تھا۔ سب لوگ میت کو کندھا دینے کی غرض سے اِک دوسرے کو پیچھے کی طرف دھکیل رہے تھے۔ میرے قدم بھی بے خودی میں اس ہجوم میں آگے بڑھتے گئے۔ اِک بزرگ بھی میرے ساتھ ہی ہاتھ میں لاٹھی پکڑے ہوئے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ان کے لب مسلسل حرکت میں تھے۔ پہلے سوچا ان سے پوچھتا ہوں لیکن پھر خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد وہ بزرگ خود مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''بیٹا! تمہارے من میں بہت سے سوال ہیں۔ کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟'' ان کی بات سے میں بہت حیران ہوا کہ انہیں کیسے معلوم پڑا؟ میں نے ان سے کپکپاتے ہونٹوں سے پوچھا۔

''بابا جی! یہ کون فوت ہوا ہے؟'' اس سے زیادہ میں کچھ اور نہ کہہ سکا۔ انہوں نے اِک نگاہ مجھ پہ ڈالی اور لمبی سانس لی۔

''لگتا ہے تم اجنبی ہو یا پھر اس پُراسرار واقعے کے بارے میں نہیں جانتے۔'' میں نے بابا جی کی طرف دیکھا اور ان کو بتایا کہ میں یہاں کا ہی رہنے والا ہوں مگر اس واقعے سے ناآشنا ہوں جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں۔ اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

''بتاؤں گا میں تمہیں سب کچھ جنازہ پڑھنے کے بعد۔'' بابا جی نے کہا اور ہم دونوں ہی خاموش ہو گئے۔ میرے دماغ میں یہ الفاظ بار بار برقی لہروں کی طرح چکر کاٹتے رہے ''پُراسرار واقعہ''۔ بے چینی تو پہلے ہی تھی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ہم چلتے گئے اور قبرستان پہنچ گئے۔ ساتھ میں ہی جنازہ گاہ تھی۔ میت کو جنازگاہ میں رکھ دیا گیا۔

جب جنازہ پڑھایا گیا تب معلوم پڑا کہ یہ عورت تھی۔ تدفین کے بعد بابا جی میرے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اِک حیرت کا جھٹکا اور لگا اُس عورت کی قبر عام قبروں سے چار فٹ لمبی تھی۔ لگتا تھا ۹ یا ۱۰ فٹ لمبی قبر تھی۔ یہ چیز مجھے اور حیرت کی وادیوں میں لے گئی۔ سب لوگ واپس جا رہے تھے اور ہر کوئی اِک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ مجھ پہ حیرت کے دریچے کھلتے گئے۔ بابا جی نے کہا۔

''بیٹا! تم شہر میں کہاں رہتے ہو اور تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے اپنا نام اور کلینک کا ایڈریس بتا دیا۔ وہ میرے ابو کے پرانے دوست نکلے۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ



اِک لمبا عرصہ سعودی عرب میں گزار کر آئے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ مجھے پہچان نہ سکے تھے۔ کیونکہ جب انہوں نے مجھے دیکھا میں ایک سال کا تھا۔ بابا جی میرے ساتھ چلتے چلتے روڈ تک آ گئے تھے۔ بابا جی مجھ سے اجازت لے کر کہنے لگے۔

''تم سے مل کر خوشی ہوئی اب مجھے اجازت دو میں باقی لوگوں کے ساتھ واپس جاؤں۔'' لیکن میں نے ان کو روک لیا اور کہا۔

''بابا جی! آپ نے مجھے اس عورت کے بارے میں نہیں بتایا؟ آپ میرے ساتھ کلینک پہ چلیں۔'' بابا جی راضی ہو گئے اور ہم کلینک پر آ گئے۔ میری کولیگ پہلے سے موجود تھی۔ میرے کہنے پر چائے منگوائی گئی۔ اب میں بابا جی کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''بابا جی اب بتائیں یہ عورت کون تھی؟'' بابا جی نے گہری سانس لی اور کہنے لگے۔

''بیٹا! یہ اِک عجیب و غریب سی کہانی ہے۔'' اتنا ہی کہا تھا کہ چائے آ گئی اور بابا جی نے اپنی بات جاری رکھی۔

''سکینہ کا تعلق امیر گھرانے سے تھا۔ سکینہ دو بھائیوں سے چھوٹی اور سب کی لاڈلی تھی۔ سب گھر والے اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس کی پرورش تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا گیا۔ لاہور کے ایک اچھے پرائیویٹ اسکول میں سکینہ کو داخل کروایا۔ وہ ایک ذہین لڑکی تھی۔ ہر سال اپنی کلاس میں ٹاپ کرتی تھی۔ اس کی کزنیں اس سے جلا کرتی تھیں۔ سکینہ کو اس بات کی پروانہ تھی۔ وہ اپنی پڑھائی میں مکمل طور پر

مگن تھی۔ اسکول سے ٹیوشن اور رات کو بھائیوں کے ساتھ پارک جانا اس کے معمول میں شامل تھا۔ سکینہ زندگی خوشگوار انداز میں جی رہی تھی۔

☆......☆......☆

سکینہ نے میٹرک میں ٹاپ کیا تو اس کے سب گھر والے بہت خوش ہوئے۔ سکینہ نے اس خوشی کے موقع پر بڑی دعوت کی خواہش ظاہر کی۔

اس کے والدین راضی ہو گئے۔ اس پارٹی میں سکینہ کی تمام سہیلیاں، اساتذہ اور رشتے دار شامل تھے۔ دونوں بھائیوں نے بھی اپنی لاڈلی بہن کو قیمتی تحائف دیے۔ وہ دن بھی آگیا جس دن پارٹی تھی۔ سکینہ کی سب کزنیں اس کی یہ کامیابی دیکھ نہ سکیں۔ اور حسد کی آگ میں اس قدر جھلسیں کہ سکینہ کی ساری زندگی تباہ کر ڈالی۔

پارٹی کے روز جب سکینہ اپنے خاص مہمانوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ اس کی اک کزن سب کے لئے مشروب لائی اور ایک خاص گلاس سکینہ کے ہاتھ میں بھی تھما دیا۔ جسے سکینہ نے خوشی سے پی لیا۔ اس کی کزن کے چہرے اور آنکھوں میں اک چمک نے انگڑائی لی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے مقصد کی تکمیل ہو گئی ہو۔ پارٹی ختم ہوئی اور سب مہمان جا چکے تھے۔ رات کو سکینہ اپنے بھائیوں کے ساتھ ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ اس کے سر میں بڑا سخت چکر آیا اور وہ اک جھٹکے سے زمین پہ جا گری۔ دونوں بھائیوں نے جلدی سے اسے اٹھایا اور کمرے میں بیڈ پر لٹا دیا۔ ایک نے ڈاکٹر کو فون کیا۔ ڈاکٹر جلدی سے دوڑا دوڑا آیا۔ چیک کرنے پہ اس نے بتایا" زیادہ مسئلہ نہیں ہے۔ سر میں چکر آیا ہے تھکان کی وجہ سے۔ آرام کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر تو سب کو مطمئن کر کے جا چکا تھا۔ سکینہ کی طبعت کچھ نارمل تھی۔ لیکن جو انہونی ہونی تھی وہ تو ہو ہی چکی تھی۔ کزن کا پلایا ہوا مشروب اپنا کام کر چکا تھا۔ رات گئے سکینہ کو اس قدر گرمی محسوس ہوئی کہ برداشت نہ ہو سکی۔ حالانکہ کمرے میں اے سی لگا ہوا تھا۔ گرمی اتنی بڑھ گئی کہ سکینہ کے پسینے چھوٹنے لگے۔ بے چینی بڑھتی گئی۔ سکینہ نے فوراً نہانے میں عافیت سمجھی۔ وہ نہانے چلی گئی۔ نہاتے وقت اس کے بال ہاتھوں میں آنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سارے بال جھڑ گئے۔ اس کا سر بالکل گنجا ہو چکا تھا۔ اس کی چیخیں سن کر اس کی امی کمرے کی طرف بھاگیں۔ واش روم کا دروازہ کھولتے ہی اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ بھی اپنے حواس کھو بیٹھیں۔ بہت مشکل سے سکینہ کی امی نے خود پہ قابو پایا۔ سکینہ زور زور سے روئے جا رہی تھی۔ امی نے اُس کو تسلی دی اور کپڑے پہنا کر کمرے میں لے آئیں۔

☆......☆......☆

اُس کی حالت دیکھ کر گھر کے سب لوگ بے حد پریشان تھے۔ سکینہ کو اِک چپ سی لگ گئی۔ وہ سارا دن کمرے میں بند بس چھت کو ہی گھورتی رہتی تھی۔ ہوا میں وہ پتا نہیں کس سے باتیں کرتی تھی۔ اس کی اس حالت سے والدین اور بھائی بہت پریشان تھے۔ مقامی ڈاکٹروں سے علاج کرواتے ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ کوئی شفاء یابی نہ ہو سکی۔ بہت سے آئلز استعمال کروائے لیکن مایوسی کا ہی سامنا رہا۔ اس کے بال واپس نہ لوٹ سکے۔ یہاں تک کہ اس کی یاداشت بھی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ پریشانی دن بدن بڑھتی چلی گئی۔ سکینہ کے والدین نے اب انگلینڈ سے علاج کروانے کا فیصلہ کیا۔ وہ سکینہ کو لے کر انگلینڈ چلے گئے۔

کافی علاج کے باوجود نا اُمیدی کا ہی سامنا کرنا پڑا۔ وہ وطن واپس لوٹ آئے۔ سکینہ کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ اس کا علاج اب عاملوں سے شروع کروایا گیا۔ کوئی آسیب کا سایا بتائے تو کوئی کہے اس پہ جن عاشق ہے۔ ہر عامل اس معصوم بچی پہ اپنے ہی قانون مسلط کرتا رہا۔ ہر در سے نا اُمید ہو کر وہ گھر بیٹھ چکے تھے۔ لیکن رب کریم کے در سے ان کو آج بھی شفاء کی اُمید تھی۔

☆☆☆

اک روز وہی کزن اور اس کے گھر والے سکینہ کے گھر آئے۔ اس کے دل میں آج بھی ترس کا نام تک نہ تھا۔ کہنے لگی اک بہت بڑے بابا ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے علاج سے شفاء یابی ہو جائے۔" سکینہ کے والدین تو پہلے ہی ایسی ضیاء کے متلاشی تھے کہ جس سے ان کی اندھیر نگری میں اُجالا ہو سکے۔ سکینہ کی امی نے اس سے اس بابا

کا ایڈریس پوچھا تو سکینہ کی کزن نے کہا۔ "نہیں نہیں ان کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان سے بات کروں گی۔" اس کے دماغ میں اک اور شیطانی سوجھ رہی تھی۔

چند دن بعد وہ پھر آئی تو کہنے لگی۔

"آنٹی بابا نے کہا کہ اک بڑا سا سانپ مار کر زمین میں دبائیں۔ اس پر سرسوں اگائیں۔ جب وہ پک جائے تو اس کا تیل نکلوا کر سکینہ کے سر پہ لگائیں۔ بابا بتا رہے تھے کہ سیاہ لمبے اور گھنے بال آئیں گے۔"

سکینہ کی امی اس بے رحم کزن کی باتوں میں آگئیں۔ انہوں نے اک بہت بڑا سیاہ سانپ منگوا کر اپنی زمینوں میں دفن کروا دیا۔ اب اس پہ سرسوں اگائی گئی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ یہی حال اب سکینہ کے والدین کا تھا۔ وہ اپنی جان، اپنی بیٹی کو ہر حال میں ٹھیک دیکھنا چاہتے تھے۔ اللہ اللہ کر کے انتظار کے دن ختم ہوئے۔ سرسوں کا تیل نکلوا کر سکینہ کے سر پہ لگایا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے لمبے اور سیاہ بال آنے لگے۔ جو تیزی سے بڑھنے لگے۔ بالوں کے بڑھنے کی تیزی دیکھ کر سب حیران تھے۔ اس دوران سکینہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ اس کی آواز میں اس قدر درد تھا کہ جیسے برہنہ اندام کو کانٹوں پہ لٹا کر گھسیٹا جائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے بال پورے بیڈ پر پھیلتے گئے۔ حیران کن بات یہ کہ اسکے بال آگے سے دو شاخہ ہوتے گئے۔ پھر وہ سنپولیے بنتے گئے۔ ان سنپولیوں کی آنکھیں آگ کے شعلوں کی طرح جل رہی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر سب پہ خوف و ہراس اور سکتہ طاری ہو گیا۔ انہی سنپولیوں نے سکینہ کے بدن کو کاٹنا شروع کر دیا۔ اس کی آواز، چیخ و پکار اس قدر دردناک تھی کہ کوئی بڑے سے بڑے دل والا بھی اس دردناک آواز کو نہ برداشت کر سکے۔ سکینہ کی چیخیں بلند ہوتی گئیں۔ اب تو محلے والے بھی کوٹھی میں جمع ہو گئے۔ یہ ہولناک منظر کوئی بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ کچھ لوگ بے ہوش ہو گئے۔ کچھ لوگوں پہ ایسا سکتہ طاری ہوا کہ دیر تک وہ کچھ نہ بول سکے۔ چند گھنٹوں بعد یہ قیامت تھمی۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور سب لرز کر رہ گئے۔ کمرے میں ہر طرف بال ریشہ نما ہو کر اُڑ رہے تھے۔ سکینہ کا نامکمل جسم بیڈ پر پڑا تھا۔ اس کے پاؤں الٹے ہو چکے تھے۔ ہاتھوں کی انگلیوں کی جگہ سنپولیے نمودار ہو چکے تھے۔ یہ ہولناک منظر دیکھ کر سکینہ کے والدین بے ہوش ہو گئے اور اب وہ کومہ میں ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کے جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکے۔ یہ ان کا آبائی قبرستان ہے۔ اس لیے میت کو یہاں لایا گیا ہے۔ یہ خبر تیزی سے پھیل گئی۔

یہ ہجوم بھی سکینہ کو دیکھنے کے لیے اکٹھا ہوا ہے۔ مگر ان کو روک دیا گیا۔ جب اس کا سر ہی نہ تھا تو لوگوں کو کیا دکھاتے۔

کہانی سنتے وقت مجھ پہ بھی سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ میرا ہاتھ چائے کے کپ سمیت ایک جگہ جامد تھا۔ بابا جی مسلسل روتے ہوئے اور اس معاشرے کے حاسد لوگوں کو بددعائیں دے رہے تھے۔ بابا جی نے بتایا کہ قبر پانچ فٹ بنائی تھی۔ تدفین کے بعد وہ دس فٹ کی ہو گئی۔ اس بات سے بابا جی اور میں حیرت زدہ تھے۔ جانے اس میں کیا راز ہے۔ مجھے دلی صدمہ ہوا۔ مجھے رہ رہ کر سکینہ کی کزن پہ بہت غصہ آ رہا تھا۔ اس نے آخر ایسا کیوں کیا؟ سکینہ نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ بہت سے الجھن میں ڈالنے والے سوالات میرے ذہن میں آ رہے تھے۔

بابا جی نے بتایا کہ وہ ان کی بھانجی تھی۔ جس کزن کی وجہ سے یہ سب ہوا۔ سکینہ کے بھائی نے اسے گولی مار دی۔ اب وہ جیل میں ہے۔ میں نے بابا جی کو حوصلہ دیا۔ ان کے آنسو صاف کیے۔ چند منٹ بعد انہوں نے مجھ سے اجازت لی۔ پھر وہ دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ لیکن میں دیر تک سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن رہا۔

کچھ دن بعد بازار میں بابا جی سے اتفاقی ملاقات ہوئی۔ خیریت دریافت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ سکینہ کے والدین بھی اس دنیا سے پردہ کر گئے ہیں۔ سکینہ کے ایک بھائی کو سزا موت ہو گئی۔ دوسرا ان تمام غموں کی مالا گلے میں پہنے زندگی کے پہیے کو آگے دھکیل رہا ہے۔

اک بار پھر سے سوالات نے میرے ذہن کا حصار باندھنا شروع کیا۔ ایک لڑکی کی وجہ سے کتنی زندگیاں برباد ہوئیں......؟

☆☆......☆☆



تمہارے ساتھ ساتھ!

نازیہ بتول رضا

ان جنات کا قصہ خاص جو انسانوں کے دوست بن کر رہنا چاہتے تھے

اُس وقت رات کے دس یا ساڑھے دس کا عمل رہا ہوگا۔ لائٹ حسب معمول نہیں تھی۔ میرے دونوں بیٹے سات سالہ احمد اور پانچ سالہ امجد سو رہے تھے۔ جبکہ دونوں بڑی بچیاں دادی کے ساتھ برابر والے کمرے میں سو رہی تھیں۔ چونکہ بچے صبح اسکول کی وجہ سے جلدی سو جاتے تھے اور میں رضا (شوہر) کے انتظار میں جاگتی رہتی تھی۔

میں بیڈ پر لیٹی ٹارچ کی روشنی میں 'سچی کہانیاں' پڑھ رہی تھی۔ یہ میرا اب بھی معمول ہے کہ میں دوپہر میں سونے لیٹوں یا رات میں میرے لیے مطالعہ بہت ضروری ہے۔ ورنہ میری کھانا ہضم نہیں ہوتا۔

ہاں تو میں ذکر کر رہی تھی کہ میرے دونوں بیٹے سو رہے تھے کہ ایک دم احمد ہڑبڑاتا اور روتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ وہ نجانے کس کو دیکھ رہا تھا۔ ہوش میں بالکل نہیں تھا۔ میں جلدی سے اُٹھ کر اس کے پاس گئی۔

''احمد کیا ہوا بیٹا سو جاؤ۔'' میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھاتے ہوئے کہا جو نجانے کہاں جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا اور ڈرا سہما سا ہو رہا تھا۔ میرے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اچانک روتے روتے بولا۔

''ماما...... ماما یہ اتنا لمبا کیسے ہوگیا؟'' میرے تو ہوش اڑ گئے نجانے اسے کیا نظر آ رہا تھا، بہرحال میں نے اس پر آیت الکرسی پڑھ کر دم کیا اور لٹا دیا۔ وہ فوراً ہی گہری نیند میں چلا گیا، جیسے اٹھا ہی نہ تھا لیکن میری نیند اُڑن چھو ہو چکی تھی۔ کیونکہ یہ آج پہلی بار نہیں ہوا تھا بلکہ جب سے میں اوپر شفٹ ہوئی تھی احمد کبھی کبھار ڈر کے اُٹھ جایا کرتا تھا۔ میں نے ہمیشہ اس پر دم کر کے سلا دیا تھا۔ لیکن اب تو وہ مستقل ایک ہفتے سے برابر دس سے گیارہ کے درمیان اُٹھا کرتا تھا اور پھر میرے دم کرنے پر چپ چاپ سو جایا کرتا تھا۔ جیسے کہ آج ہوا تھا۔ میں بُری طرح سے گھبرا گئی تھی۔

رضا بھی اب تک نہیں لوٹے تھے۔ میں نے فوراً رضا کو فون ملایا۔ رضا نے بھی اُسی وقت ریسیو کیا۔ رضا کی آواز سنتے ہی میں رونے لگی اور انھیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی پریشان ہو گئے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے میں نے احمد کے ڈر کے بارے میں جب بھی بتایا وہ ٹال گئے اور مجھے بھی یہ کہتے ہوئے تسلی دی کہ کوئی بات نہیں بچے اکثر خواب میں ڈر جاتا کرتے ہیں۔ تم آیت الکرسی پڑھ کر دم کر دیا کرو۔''

''لیکن کب تک؟'' میں نے رضا سے کہا۔ ''پلیز آپ اس بات کو معمولی نہ سمجھیں بلکہ احمد کے لیے کوئی ڈر سے بچاؤ کا تعویذ لائیں۔ یا احمد کو کسی اچھے بابا کو دکھائیں۔ مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا ہے۔ یہ کام آپ کو آج اور ابھی کرنا ہے۔''

''اچھا بابا ٹھیک ہے تم پریشان مت ہو میں ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر رضا نے فون رکھ دیا۔

میں احمد کو دیکھنے لگی۔ وہ بہت پرسکون سو رہا تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔

مجھے یاد ہے جب ہم سرجانی ٹاؤن والے گھر میں شفٹ ہوئے تھے تو ماموں سسر نے بتایا تھا کہ ان گھر میں جنات کی پوری فیملی رہتی ہے۔ لیکن مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ میں سمجھی کہ شاید انھوں نے مجھے ڈرانے کے لیے ایسا کہا ہے لیکن اب جبکہ یہ سب ہو رہا تھا تو کچھ کچھ شبہ ہو رہا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھی کہ میں کیا کروں کہ رضا کی کال آ گئی وہ بولے۔

''نازیہ میں نے ابھی ایک دو لوگوں سے معلوم کیا ہے۔ ایک دوست نے مجھے حافظ صاحب کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ تھوڑا بہت علم بھی جانتے ہیں اور فی سبیل اللہ دم وغیرہ کرتے ہیں۔ میں ابھی ان ہی کے گھر جا رہا ہوں۔ ان کو لیتا ہوا آتا ہوں، ٹھیک ہے۔ تم پریشان مت ہو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

رضا نے مجھے تفصیل بتاتے ہوئے تسلی دی تو مجھے کچھ سکون ملا کہ اب احمد بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ میں پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔ تقریباً دس پندرہ منٹ کے بعد گیٹ بجا، میں زینے تک آئی لائٹ بھی آ چکی تھی۔ گیٹ ماموں نے کھول دیا تھا۔ جو نیچے نانی ساس کے ساتھ رہتے تھے۔ رضا گھر میں داخل ہو رہے تھے اور ان کے ساتھ کوئی تھا۔ میں جلدی سے بچوں کو کمرے میں چلی گئی۔ رضا حافظ صاحب کو لے کر بیڈروم میں چلے گئے۔ جہاں احمد سو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد حافظ صاحب کی تلاوت کی آواز آنے لگی۔ وہ دھیمی آواز میں پڑھ رہے تھے اس لیے سمجھ نہیں سکی۔ میں دروازے کی اوٹ میں کھڑی جھانک رہی تھی کہ کیا ہوتا ہے۔

''حافظ صاحب نے کہا تھا کہ اگر جنات کا کچھ اثر ہوگا تو بچہ اُٹھ بیٹھے گا ورنہ نہیں۔'' اور قاری صاحب کے تلاوت کرنے سے احمد اُٹھ بیٹھا تھا۔ حافظ صاحب مسکرانے لگے۔ انھوں نے شفقت سے



احمد کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے دوبارہ سلا دیا۔ وہ پھر سے پرسکون ہو کر سو گیا۔ جبکہ حافظ صاحب رضا کو لے کر باہر چلے گئے۔ میں بیڈروم میں گئی۔ احمد سو رہا تھا۔ میں بے چینی سے رضا کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگی۔ رضا جب واپس آئے تو مجھے زیادہ فکر مند نہیں لگے۔ میں نے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے تو دھیرے دھیرے بتانے لگے۔

''ہمارے بیڈروم میں ایک جنات کی فیملی رہتی ہے۔ ان کا ایک چھوٹا بچہ بھی ہے۔ یہ فیملی مسلمان ہے اور اچھی ہے۔ تم جانتی ہو کہ ہمیں انھوں نے کبھی پریشان بھی نہیں کیا اور نہ ہی کبھی ڈرایا دھمکایا۔''

پھر تائیدی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے میکانکی انداز میں سر ہلایا تو وہ پھر بتانے لگے۔

''دراصل وہ بچہ تھوڑا شرارتی اور کھیل کود کا شوقین ہے اور وہ ہمارے احمد کو دوست بنانا چاہتا ہے۔ اسی لیے جب احمد رات کو سوتا ہے تو وہ کھیلنے کے موڈ میں احمد کے پاس آتا ہے اور اسے جگا دیتا ہے۔ جبکہ احمد ڈر جاتا ہے لیکن اچھی بات یہ ہے کہ صبح اُٹھ کر احمد سب بھول بھی جاتا ہے اور اسے رات کا کچھ یاد نہیں رہتا۔ ایسا ہی ہے ناں؟''

رضا پوچھنے لگے تو میں نے بتایا کہ میں جب احمد سے صبح پوچھتی ہوں کہ رات میں ڈر کیوں اُٹھے تھے۔ تو وہ صاف انکار کر دیتا ہے کہ نہیں ماما میں تو رات میں نہیں اُٹھا، تو میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ لیکن میں بہت پریشان ہوں کہیں یہ بچہ ہمارے احمد کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ میں نے ہولتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں نہیں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ وہ صرف کھیلنے کی غرض سے آتا ہے۔ بہرحال یہ حافظ صاحب نے احمد کے پینے اور نہانے کے تعویذ دیے ہیں۔ یہ تعویذ پینے کے ہیں۔ یہ پینے کے پانی میں ملا دو اور یہ تعویذ نہانے کے ہیں۔ احمد کو ایک تعویذ روز پانی میں ڈال کر نہلانا ہوگا اور ہاں یہ ایک تعویذ احمد کے گلے میں موم جامہ کر کے ڈالنا ہے۔ تم ذمہ داری سے صبح یہ سارے کام کر لینا اور پریشان مت ہونا۔ جب ہم انھیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے تو وہ بھی ہمیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔ بس یہ سمجھ لو کہ اللہ کی بہت سی مخلوق میں سے وہ بھی ہیں۔ اب سکون سے سو جاؤ او کے!''

رضا نے لمبی تقریر کے بعد کہا تو میں سونے لیٹ گئی۔ لیکن ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔

پھر صبح اُٹھ کر میں نے پینے کے پانی میں تعویذ ڈالا بچے جب اسکول سے آئے تو میں نے احمد کو تعویذ کے پانی سے نہلایا اور اس کے گلے میں تعویذ بھی ڈال دیا۔ سارا دن گزر گیا پھر سے رات ہو گئی۔ سب بچے سو گئے۔ میں اور رضا، احمد کے لیے جاگتے رہے۔ دس بجے کے بعد ہم چوکنے ہو گئے تقریباً گیارہ بجے احمد اُٹھ بیٹھا اور روتا ہوا کمرے سے باہر جانے لگا۔ وہ نجانے کیا کیا بڑبڑا رہا تھا۔ رضا اور میں تیار تھے میں نے جلدی سے احمد پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونکی اس کو پکڑ کر لٹا دیا تو وہ پرسکون ہو کر سو گیا۔ جیسے اٹھا ہی نہ تھا۔ میں پریشان نظروں سے رضا کو دیکھنے لگی۔ رضا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے تسلی دی اور سونے لیٹ گئے اور مجھے بھی سونے کی تاکید کی۔ میں بہت دیر تک جاگتی رہی۔ ایک عجیب سا احساس تھا کہ ہمارے کمرے میں ہمارے علاوہ بھی کوئی فیملی رہتی ہے کہ وہ بھی جنات کی فیملی...... اور ایک جن زادہ میرے بیٹے سے دوستی کرنا چاہتا ہے، اس کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے۔ یہ سب رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا۔ لیکن میں اپنے خدا کی ذات سے مطمئن تھی کہ وہ کبھی میرے ساتھ غلط نہیں ہونے دے گا۔ میں ہر نماز کے بعد بچوں پر دم کرتی تھی۔ شاید اسی لیے ہم سب محفوظ تھے۔ انہی سوچوں میں نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

خواب میں دیکھا کہ میں اور احمد ایک ویران سی جگہ پر ہیں کہ دو میاں بیوی اور ایک چھوٹا بچہ میرے سامنے آتے ہیں۔ بچہ تقریباً ڈیڑھ سال کا ہے۔ باؤنسر میں لیٹا ہے۔ ان تینوں کا قد بھی چھوٹا ہے۔ بچہ اچانک اچھل کر باپ کے کاندھے پر بیٹھ جاتا ہے۔ میں حیران ہوتی ہوں تو اب بچے کی ماں بڑے پیار

سے اپنے بیٹے کو دیکھتے ہوئے بتاتی ہے کہ یہ ہمارا بیٹا ہے اور یہ بہت شرارتی ہے۔ ہر وقت کھیلنا چاہتا ہے۔ لیکن ہم آپ کو کبھی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

میری ایک دم آنکھ کھل گئی گو کہ خواب ڈراؤنا نہیں تھا لیکن میں دہل کر رہ گئی تھی۔ میں نے چاروں جانب نظر گھما کر دیکھا۔ سب بے خبر سو رہے تھے۔ میں نے بچوں کے ماتھے پر پیار کیا تو بے حد سکون ملا۔ اللہ پاک نے ماں بھی کیا چیز بنائی ہے۔ تکلیف بچے کو ہوتی ہے اور نیند ماں کی اڑ جاتی ہے۔ کاش بچے بھی بڑے ہو کر ماں باپ کا ایسے ہی احساس کریں، میں نے صدقِ دل سے کہا اور مطمئن ہو کر لیٹ گئی۔

صبح فجر میں گڑگڑا کر اللہ پاک سے اپنے شوہر اور بچوں کی سلامتی مانگی جو میرا معمول تھا۔ پھر بچوں پر دم کیا اور اسکول بھیجنے کی تیاری کرنے لگی۔

بچے حسبِ معمول کسمساتے ہوئے اُٹھے اور اسکول جانے کی تیاری کرنے لگے پھر بچوں کے جانے کے بعد میں نے کچن وغیرہ سمیٹ کر رضا کو اٹھایا۔ رضا نے اٹھتے ہی پوچھا۔

''بچے اسکول چلے گئے۔''

''جی۔''

''روتے ہوئے تو نہیں گئے۔'' یہ ان کا روز کا سوال تھا۔

''نہیں۔'' پھر میں مدعے پر آئی۔ ''رضا میں نے خواب میں اس فیملی کو دیکھا جو ہمارے گھر میں ہمارے ساتھ رہتی ہے۔''

رضا چونکتے ہوئے بولے۔

''اچھا کیا دیکھا؟''

میں نے خواب من وعن سنا دیا تو رضا مطمئن انداز میں گردن ہلانے لگے اور بولے۔

''میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تم خوامخواہ پریشان ہوتی ہو۔ اب تو مطمئن ہو ناں۔''

''جی! لیکن رضا وہ سب بہت خوب صورت تھے، چھوٹے قد کے تھے۔ لیکن روشن چہرے والے تھے۔''

''اصل میں وہ تمہارے خواب میں اپنے اصل چہرے کے ساتھ تو نہیں آئے ہوں گے۔ ورنہ تم ڈر جاتیں اور وہ مسلمان ہیں اسی لیے اُن کے چہرے روشن ہیں۔''

''ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''اچھا اب چلو جلدی سے ناشتا وغیرہ بناؤ میں تب تک نہا کر تیار ہو جاؤں۔'' رضا اٹھتے ہوئے بولے۔ میں مطمئن انداز میں کچن میں چل دی۔

☆☆☆

دن اسی طرح گزر رہے تھے۔ احمد رات میں کبھی اُٹھتا میں دم کر کے دوبارہ سلا دیتی۔ وہ بے خبر سو جاتا اور صبح اسے کچھ یاد نہ ہوتا۔ میں دوپہر میں بچوں کو سلانے لٹاتی، چھوٹے اسجد کو عادت تھی کہ میں جب تک اس کے پاس نہ لیٹ جاؤں وہ سوتا نہیں تھا اور اب تک اس کی یہی عادت ہے۔ ہاں تو میں اسجد کو سلا رہی ہوتی سلانے کے بعد لاؤنج میں جاتی تو احمد اکیلا بیٹھا کھلونوں سے کھیل رہا ہوتا۔ میں سمجھ جاتی کہ یقیناً وہ بچہ بھی احمد کے ساتھ کھیل رہا ہوگا۔ میں سارے کھلونے سمیٹ کر احمد کو سلاتی لیکن پھر لاؤنج میں آتی تو کھلونے مجھے بکھرے ہوئے نظر آتے۔ میں پھر سمیٹ دیتی۔

ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ میں حسبِ معمول صبح سویرے اُٹھی نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر باہر نکلی تو لاؤنج سے باہر کرسی پر نظر ٹھہر گئی۔ میں ہکا بکا کرسی کو دیکھ رہی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ ہمارے پورشن میں دو کمرے اور لاؤنج کے بعد ایک چھوٹی سی کھلی جگہ تھی جسے ہم رات میں ٹھنڈی ہوا کھانے کے لیے بطور صحن استعمال کرتے تھے۔ اس میں ایک چھوٹا سا پلنگ اور ایک کرسی رکھی تھی، پھر جب ڈینگی پھیلا تو رضا نے بچوں کی حفاظت کے خیال سے پورا کھلا حصہ نیٹ سے ڈھک دیا تھا کہ اس میں جھری کے برابر بھی جگہ خالی نہ تھی اور اب میرے سامنے رکھی کرسی پر بہت سارا تارکول پڑا تھا۔ تارکول سے بھری تھیلی تھی جو کرسی پر الٹی ہوئی پڑی تھی۔ میں حیرانگی سے کبھی اس تارکول کو دیکھتی اور کبھی گرین جالی کو جس کے اندر سوراخ برابر بھی جگہ نہ تھی۔ میں حیران تھی کہ یہ تارکول آیا کہاں سے؟ جبکہ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں رات کے

ایک بجے تک اسی کرسی پر بیٹھ کر رضا سے باتیں کر رہی تھی اور جب تک میں سوئی تھی ایسا کچھ نہیں تھا، یہیں قریب روڈ بھی نہیں بن رہا تھا پھر آخر یہ تارکول آیا کہاں سے۔

میں نے گھوم گھوم کر سب جگہ سے دیکھ لیا لیکن یہ تارکول کا معمہ حل نہ ہوا۔ پھر بچے اُٹھے وہ بھی اسے عجوبے کی طرح دیکھنے لگے۔

''ارے ماما یہ کیا چیز ہے؟'' احمد کو تجسس ہوا۔

''تارکول ہے بیٹا اسے چھوڑو آپ تیار ہو جاؤ جلدی سے۔''

''یہ کیا ہوتا ہے ماما۔''

''ارے بیٹا اس سے سڑک بنتی ہے جس پر گاڑیاں چلتی ہیں۔'' میں نے بتایا۔

''اچھا تو یہ ہمارے گھر میں کہاں سے آیا؟'' احمد جیسے بال کی کھال نکالنے پر تلا تھا اور باقی سب بھی معلومات میں اضافے کے لیے گھیرا بنائے کھڑے تھے۔

''بیٹا آ گیا ہوگا کہیں سے کسی بچے نے کھیل کھیل میں ہمارے گھر میں پھینک دیا ہوگا۔'' میں نے بچوں کو ٹالا۔

''لیکن ماما کہاں سے ہمارا گھر تو سب طرف سے پیک ہے۔''

میرے ذہن میں مچلتا ہوا اب بچوں کی زبان پر تھا۔ میں کیا جواب دیتی بڑی مشکل سے جان چھڑوائی پھر بچوں کے اسکول چلے جانے کے بعد نیچے ماموں سے پوچھا۔

''کیا آپ تارکول لائے ہیں گھر میں؟''

تو وہ بولے۔ ''نہیں بیٹا میں کیوں لاؤں گا۔''

اب تو میرا دماغ گھوم گیا۔ پھر میں نے اوپر بلا کر انھیں کرسی پر پڑا تارکول دکھایا تو وہ بھی حیران رہ گئے۔ پھر کہنے لگے۔

''حیرت ہے یہ تارکول یہاں کیسے آیا ہمارے گھر سے دو اسٹاپ دور سڑک تعمیر ہو رہی ہے وہاں تک تو گلی کے بچے بھی نہیں جاتے ہوں گے۔'' وہ حیرت میں ڈوبے نیچے چلے گئے اور میں سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو یہ بھی ہمارے گھر میں رہنے والے بچے کی کارستانی ہے۔ میں سر جھٹک کر کام میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

پھر ایک ہفتے تک کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ میں اور رضا مطمئن تھے۔ پھر ایک رات میں بیڈ روم میں بچوں کے ساتھ سو رہی تھی جبکہ رضا لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ میں سیدھی کروٹ لے کر لیٹی تھی جبکہ بچے میری الٹی طرف تھے اچانک میری آنکھ کھلی مجھے لگا جیسے کوئی بچہ پیار میں میری گردن پر انگلیاں چلا رہا ہے۔ میں سمجھی اسجد میرے پاس آ کر لیٹ گیا ہے۔ میں نے مندی مندی آنکھوں سے دیکھا۔ کمرے میں اس وقت جب اسجد نے پیچھے سے مجھ پر اپنا پیر رکھا۔ میرا حلق خشک ہونے لگا۔ اسجد اگر پیچھے ہے تو یہ میرے پاس کون لیٹا ہے۔ میں جھٹک سے اُٹھ بیٹھی۔ اب وہاں کوئی نہ تھا۔

میں نے چیخ ماری رضا بھاگتے ہوئے آئے، آتے ہی لائٹ جلائی۔

''کیا ہوا؟'' رضا پوچھ رہے تھے اور میری نظریں اسی جگہ ٹکی تھیں جہاں ابھی کوئی بچہ تھا لیکن اب وہ جگہ خالی تھی۔ احمد اور اسجد میرے پیچھے بدستور سو رہے تھے۔

''رضا ابھی یہاں کوئی تھا۔''

''کہاں؟، یہاں تو کوئی نہیں ہے، تمہارا وہم ہوگا۔''

''نہیں رضا میں نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے بلکہ میری آنکھ اسی وجہ سے کھلی تھی کہ میری گردن پر مجھے کسی کے ہاتھ محسوس ہوئے تھے۔ پھر میں نے اسے اپنے پاس لیٹے ہوئے بھی دیکھا۔ پہلے تو میں اسے اسجد سمجھی لیکن اسجد تو میرے الٹے ہاتھ پر تھا۔ دیکھیں ابھی بھی سو رہا ہے۔''

میں خوف سے رو پڑی تھی۔ کسی بھی انسان خاص طور پر عورت کے لیے کسی بھی غیر انسانی مخلوق کا دیکھنا بہت خوف کی علامت ہے۔ ہر چند کہ میں جانتی تھی کہ ہمارے کمرے میں ہمارے ساتھ ایک غیر انسانی مخلوق بھی رہتی ہے لیکن وہ کبھی میرے سامنے نہیں آئے تھے۔ تو میں مطمئن تھی۔ لیکن اب اپنے سامنے دیکھنے کے بعد میرا خوف سے بُرا حال

تھا۔ رضا نے مجھے تسلی دی۔

''ارے نازیہ تم ایک بچے سے ڈر گئیں، یقیناً وہ تمہارے پاس سونے آیا ہوگا لیکن تم ڈر گئیں تو اسے جانا پڑ گیا۔'' رضا ہنسی میں اڑا رہے تھے مجھے غصہ آ گیا۔

''میرا مذاق اڑا رہے ہیں ابھی اگر آپ کے پاس آیا ہوتا تو پوچھتی۔''

''نہیں بھئی میرے پاس کیوں آئے گا۔ تم سے دوستی ہے تمہارے ہی پاس آئے گا۔''

''اچھا چلو سو جاؤ میں صبح حافظ صاحب سے مشورہ کروں گا۔''

پھر میں نے خود پر اور بچوں پر آیت الکرسی پڑھ کر دم کیا اور سو گئی۔

تعویذ کا فائدہ یہ ہوا کہ احمد کے ڈر کر اٹھنے میں کمی آ گئی تو میں بھی پر سکون ہو گئی۔

☆☆☆

پھر کچھ عرصے بعد ہم نے وہ گھر شفٹ کر لیا۔ ہم دوسری جگہ چلے گئے تو رضا کہنے لگے۔

''یار میں سوچ رہا ہوں ذرا گھر کا چکر لگا آؤں۔'' ہم تو شفٹ ہو گئے تھے لیکن نیچے کے پورشن میں نانی ماموں رہتے تھے۔ انھوں نے وہ گھر ہیں چھوڑا تھا۔ میں نے کہا۔

''ہاں ضرور جائیں اور ذرا اوپر کے پورشن (جو ہمارا تھا) میں بھی چکر لگاتے آئیے گا۔ وہاں اب کیا حالات ہیں۔''

رضا۔ اوکے'' کہہ کر روانہ ہو گئے۔ تو میں گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد رضا واپس آئے میں نے خیر خیریت پوچھی تو کہنے لگے۔

''نازیہ ہمارے یہاں چلے آنے سے وہ لوگ بہت ڈسٹرب ہو گئے ہیں۔''

''کون لوگ؟'' میں حیرانگی سے بولی۔

''وہی تمہارے پڑوسی جنات کی فیملی۔''

''مگر کیوں؟ اور آپ کو کیسے پتا۔'' میں الجھ گئی تھی ان کی باتوں سے۔

''ارے بھئی میں ابھی گھر گیا تھا تو ماں اور خالہ بتا رہے تھے کہ جس دن ہم یہاں آئے ہیں اسی دن رات کو بہت شور شرابے سے خالہ کی آنکھ کھلی۔ اوپر ہمارے پورشن میں کوئی اٹھا پٹخ کر رہا تھا۔ خالہ آواز سننے اور دیکھنے کہ یہ کیسا شور ہے۔ نیچے لاؤنج میں گئیں تو ان کی الماری کے اوپر رکھا سارا سامان دھڑا دھڑ خود بخود نیچے گر گیا۔ جیسے کسی نے غصے میں پھینکا ہو۔ خالہ اور ماموں حیران تھے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ بہرحال تھوڑی دیر بعد سکون ہو گیا۔'' رضا نے مجھے تفصیل بتائی تو میں ہکا بکا رہ گئی۔

''یقیناً وہ ہمارے شفٹ ہونے سے ناراض ہیں پھر اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔''

''کرنا کیا ہے۔'' رضا بولے۔ ''میں اوپر کے پورشن میں جا کر بول آیا ہوں کہ یہاں خالہ ماموں کو تنگ نہ کیا جائے بلکہ اگر ہمارے ساتھ رہنا ہے تو میرے ساتھ چلیں جہاں میں رہتا ہوں آپ لوگ بھی وہیں میرے ساتھ رہیں۔''

''آپ کا کیا خیال ہے وہ آئے ہوں گے آپ کے ساتھ؟'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''ہاں تو کیا مضائقہ ہے اگر وہ آ بھی جائیں تو انھوں نے کبھی ہمیں نقصان نہیں پہنچایا بلکہ بقول حافظ صاحب کے وہ ہمیں فائدہ ہی پہنچائیں گے کیونکہ وہ ہم سے خود دوستی کرنا چاہتے ہیں۔''

رضا ٹھیک ہی کہہ رہے تھے انھوں نے کبھی ہمیں تنگ نہیں کیا تھا بلکہ شاید آئندہ وہ کچھ فائدہ ہی دے سکتے تھے۔

''چلیں ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔''

اور پھر دوسرے دن جب میں احمد کو اسکول کے لیے اٹھانے لگی تو احمد نے نیند میں مجھ سے کہا۔

''ماما تین لوگ ہمارے گھر میں آ گئے ہیں۔'' میں نے حیرانگی سے اسے دیکھا میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کس کی آمد کی اطلاع دے رہا ہے۔ میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا۔'' اور بچوں کو اسکول بھیجنے کی تیاری کرنے لگی۔

☆☆☆



دوسری دنیا کا آخری عشق!

منعم اصغر

اس دوشیزہ پر بچپن ہی میں ایک جن عاشق ہو گیا تھا مگر وہ......

رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ جب اسما کی آنکھ کھل گئی۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے ہمیشہ کی طرح ہی یہ آج بھی محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ کسی نے اسے گہری نیند سے زبردستی جگایا ہو۔ اس نے ہاتھ سے ماتھے پہ آیا پسینہ صاف کیا اور آہستہ سے اُٹھ کر بلب کا بٹن دبایا۔ پل بھر میں پورا کمرہ روشنی میں نہا گیا۔ اس نے سکون کا سانس لیا مگر یہ سکون بھی عارضی ہی ثابت ہوا۔ اس کے کمرے کی کھڑکی جو کہ باہر کی طرف کھلتی تھی اور وہاں سے کھیت صاف نظر آتے تھے۔ اس نے وہاں نظر ڈالی تو وہ کھلی ہوئی تھی اور اسی لمحے اُسے ایک تاریک سایا اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔ ڈر کے مارے اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ آہستہ آہستہ کانپتے ہونٹوں کے ساتھ درود شریف اور آیت الکرسی کا ورد کرنے لگی۔

☆☆☆

میرے ساتھ یہ پہلی بار ہرگز نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے جب میں پندرہ سال کی تھی اور نہم جماعت میں پڑھتی تھی۔ میرے دو بھائی اور ہم دو بہنیں تھیں۔ میں ڈیرہ غازی خان کے ایک قریبی گاؤں میں پیدا ہوئی۔ ابو گاؤں میں ہی کھیتی باڑی کرتے تھے۔

میں جس گاؤں میں پیدا ہوئی۔ وہاں یہ بات زبان زدعام تھی کہ اس گاؤں میں جنات کا بسیرا ہے اور جس بستی میں، میں رہتی ہوں۔ وہاں بھی تقریباً ہر دوسرے بندے پر جنات ہیں۔ خیر ہماری بستی کے تھوڑا دور مٹی سے بنی ایک کوٹھی تھی۔ جس میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جو مٹی سے بنا ہوا تھا اور ہمیشہ بند ہی رہتا تھا۔ اس کے اردگرد اینٹوں کی دیواریں تھیں اور وہاں کسی کو بھی جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بڑوں کا کہنا تھا کہ وہ جگہ بھاری ہے اور وہاں کسی بُرے سائے کا بسیرا ہے۔ اس لیے وہاں کوئی عورت تو کیا رات میں مرد بھی جانے سے ڈرتے تھے۔ وہ جگہ دن میں بھی بہت پُراسرار لگتی تھی۔ بستی سے تھوڑا دور کھیتوں میں وہ کوٹھی واقع تھی۔ اردگرد کھیت اور درمیان میں وہ کوٹھی...... اس کے قریب ہی ایک بڑا اور گھنا سا درخت جسے دیکھتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ جس زمین پر وہ کوٹھی اور درخت تھا اس زمین کا مالک کئی بار اس کوٹھی کو ختم کرنے کی کوشش کر چکا تھا مگر کوئی بھی وہ کوٹھی توڑنے اور درخت کاٹنے کو تیار نہ تھا۔ اس



نے کئی بار مولوی کو بلا کر وہاں قرآن مجید پڑھوا کر اس سائے کو ختم کروانے کی کوشش بھی کی گئی۔ مگر قرآن مجید شروع کرتے ہی وہاں سے ایسی خوفناک آوازیں آنا شروع ہو جاتیں کہ روح تک کانپ اُٹھتی تھی، سو وہ آج تک اسے ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو پائے تھے۔ خیر مجھے بھی وہاں جانے سے منع کیا گیا تھا اور میں وہاں جاتی بھی نہیں تھی۔ مگر میری قسمت مجھے وہاں تک لے گئی۔

☆☆☆

اس دن عید کا دن تھا اور ہم خوب تیار شیار ہو کر، خوشبو لگا کر باہر سیر کو نکل پڑے۔ میرے ساتھ میری بہن اور گاؤں کی لڑکیاں بھی تھیں۔ ہم گھومتے گھومتے پتا نہیں کیسے اس جگہ پہنچ گئے تھے۔ مگر کسی نے دھیان ہی نہ دیا اور ہم اس درخت کے سائے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اسی دوران ہم نے جو مونگ پھلیاں لے رکھی تھیں، وہ سب ختم ہو گئیں اور پھر ہلکی سی ہوا چلی، اور اس درخت کے پتے زور سے پھڑ پھڑائے، اس آواز پر سب نے اوپر دیکھا اور سب ہی خوف سے لرز گئیں۔ اس طرف تو کسی نے دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ ہم آخر کہاں بیٹھے ہیں۔ پھر سب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ یک دم بھاگنا شروع کر دیا اور ان سب میں، میں سب سے زیادہ خوف زدہ تھی اور پوری جان لگا کر بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ایک دم زور سے گری اور پھر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

☆☆☆

جب میری آنکھ کھلی تو میں اپنے گھر میں تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا کہ اگر میں ابھی بھی وہاں ہوتی تو مر چکی ہوتی مگر پھر جو میں نے سنا میرے ہوش اڑ گئے۔

''اسماء تمھیں پتا ہے تم پورے دو دن بعد ہوش میں آئی ہو۔ ہم سب کتنے ڈر گئے تھے۔ جب تم بے

ہوش ہوگئی تھیں تو میں بھاگ کر گھر سے ابو اور ماموں کو بُلا لائی تھی مگر ہم وہاں پہنچے تو تم زمین کی بجائے اوپر درخت پر لٹکی ہوئی تھیں اور اب ہوش میں آ رہی ہو۔‘‘

یہ سب سن کر میں بہت ڈر گئی تھی۔ مگر پھر سب مجھے خوش رکھتے تو میں بھی یہ سب بھولتی چلی گئی۔

☆☆☆

اس کے بعد کئی بار میں نے ایک کالا سیاہ سایا دیکھا تھا۔ جو میرے کمرے کی کھڑکی کے پاس سے اندر آتا دکھائی دیتا تھا۔ اور پھر مجھے یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے کوئی ہر وقت میرے آس پاس موجود رہتا ہے اور پھر میں آہستہ آہستہ اس کی عادت ہوتی چلی گئی۔ تنہائی میں میں اس سے باتیں کرنے لگتی۔

’’تم جو بھی ہو مجھے نظر تو نہیں آتے مگر مجھے پتا ہے کہ اللہ کا ایک خاص کرم ہے مجھ پر اس لیے تو تم ہر وقت میرے قریب رہتے ہو۔ تم بہت اچھے ہو۔ ہمیشہ میرے پاس ہی رہنا۔‘‘ میں بس ایسے ہی کہہ دیا کرتی تھی۔ کبھی یہ وہم وگمان میں بھی نہ ہوتا تھا کہ میں اس سے باتیں کرکے اپنے لیے کتنی مشکلیں کھڑی کر رہی ہوں۔ میں تو یہ بھی نہ سوچتی کہ وہ ہے کیا؟ بس یہ سوچتی کہ میرا وہم ہے۔ پھر اصل حقیقت تو تب پتا چلی جب میں پندرہ سال سے بیس سال کی ہوئی اور میری شادی طے ہوگئی۔

☆☆☆

اس دوران میں بہت ہی خوش تھی مگر ایک رات وہ ہوا جو میں کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی۔

اُس رات میں سوئی ہوئی تھی۔ رات کا تیسرا پہر تھا جب ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں سے وہ سایا اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس رات پہلی بار مجھے اس سے خوف آیا تھا پھر وہ سایا آہستہ سے چلتا ہوا میرے قریب آیا اور میں سُن ہو کر رہ گئی۔ اس دوران صرف مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ وہ سایا انسانی شکل اختیار کر چکا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں جیسے اپنی مرضی سے ہل بھی نہیں پا رہی۔

پھر میں نے خود کو کہتے سنا تھا۔

’’تم ہمیشہ سے میرے ساتھ رہے ہو اور میں صرف تمہاری ہوں صرف تمہاری۔‘‘ پھر وہ اسی راستے سے باہر نکل گیا جیسے آیا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح میری طبیعت عجیب سی تھی، نہ کھانے میں دل لگا اور نہ ہی گھر کے کسی کام میں۔ پتا نہیں کیسے مگر اب مجھے یہ احساس ہوگیا تھا کہ کچھ تو ہے میرے ساتھ اور میں نے یہ بات اب تک کسی کو بتائی بھی نہیں تھی۔ اگلی رات پھر وہی ہوا تھا مگر اب یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی اور پورے گھر کو میری کیفیت پتا چل گئی تھی۔

☆☆☆

اس رات بھی میں اپنے کمرے میں اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ سوئی تھی کیونکہ اب بقول اماں کہ تیری شادی ہونے والی ہے اس لیے اب اکیلی نہ سویا کر۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب کھڑکی کھلنے کی آواز آئی اور میری دونوں آنکھیں کھل گئیں۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور میں ڈر سے کانپنے لگی۔ مگر میں آہستہ سے اُٹھی اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ رات کے اندھیرے میں وہ کوٹھی اور درخت دکھائی تو نہ دینے چاہیے تھے مگر وہ دونوں میں آسانی سے دیکھ سکتی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہو۔ میں آہستہ سے مڑی اور بنا پلکیں جھپکائے گھر سے باہر نکل کر کھیت کی طرف جانے لگی۔

اس کے بعد مجھے تو کچھ یاد نہ رہا مگر میری بہن نے بتایا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اس نے کھڑکی سے مجھے کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ وہ سب کو جگا کر میرے پیچھے لے آئی۔ میں آہستہ سے اس درخت کے نیچے گئی اور اس کے گلے لگ گئی۔ گھر والے یہ دیکھ کر بہت ڈر گئے تھے۔ سب نے مل کر مجھے اتنا زور سے کھینچا۔ مگر پتا نہیں مجھ میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ میں ایک انچ نہ ہلی، پھر تھوڑی دیر بعد میں نے

زمین پر بیٹھ کر زور سے ہنستی ہنستی بے ہوش ہوگئی۔

☆☆☆

صبح آنکھ کھلی تو کچھ یاد نہ تھا مگر میرے جسم کی ہڈی ہڈی درد کر رہی تھی۔ صبح ہی ابو پیر جی کو بلا لائے تھے۔ اُن بابا کا نام تو مجھے یاد نہیں مگر وہ بہت ہی قابل ہستی تھے۔ پورا گاؤں ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ خیر اسی صبح یہ ظاہر ہوگیا کہ میرے اوپر کوئی سایا ہے۔ گھر والے بہت پریشان ہوگئے تھے اور میرے سسرال والے جو کہ رشتے میں میرے پھوپا پھوپی تھے۔ وہ بھی بہت پریشان تھے اور جب تک یہ ظاہر نہیں ہوا تھا کہ میرے اوپر کوئی سایا ہے۔ تب تک میں اتنی نہیں ڈرتی تھی مگر اب تو ہر موڑ پہ ڈر میرے ساتھ ساتھ تھا اور اب میں پہلے جیسی اسما نہیں رہی تھی۔ اب تو میں کوئی سو سال کی بیمار بوڑھی دکھائی دینے لگی تھی۔ واش روم جاتی تو لائٹ چلی جاتی، کچن میں جاتی تو دو دو امیاں (والدہ) دکھائی دینے لگتیں۔ پھر وہ پیر جی آئے اور انھوں نے بتایا کہ سادگی سے میرا نکاح کر دینا چاہیے مگر چونکہ پھوپی کو بھی سب پتا تھا اس لیے وہ بھی کچھ پریشان ہوگئی تھیں۔ پھر ابو نے منت کی کہ میری جوان بیٹی ہے اس طرح برباد ہو جائے گی اور بالآخر پھوپو مان گئیں اور اس طرح جمعرات کی شام کو میری سادگی سے نکاح کرکے رخصتی کر دی گئی۔

☆☆☆

کہا تو یہ گیا تھا کہ شادی ہوتے ہی مجھے تمام مسائل سے چھٹکارا مل جائے گا۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ شادی کی پہلی رات جو کئی دعاؤں اور مرادوں کے بعد آتی ہے۔ شادی جیسے رشتے کے بارے میں سوچتے ہی دل میں میٹھی سی لہر دوڑ جاتی ہے مگر میں جانتی تھی کہ کچھ تو ہوگا ہی اور پھر وہی ہوا۔

سہیل جونہی میرے قریب ہوئے یکے بعد دیگرے تین تھپڑ ان کے منہ پر پڑے تھے اور پھر ہر دفعہ ہی یہی ہوا۔ اس وقت مجھے خود سے زیادہ سہیل پر ترس آ رہا تھا۔

اگلی صبح پیر جی خود تشریف لائے تھے اور سب سنتے ہی وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے اور اگلے دن آنے کا کہہ کر چلے گئے۔

☆☆☆

اگلے دن وہ آئے تھے تو ان کے ساتھ ایک اور بھی پیر تھے اور ساتھ میں کچھ گاؤں کے مرد بھی تھے۔ پیر جی نے مجھے کہا تھا کہ پانچ وقت کی نماز ادا کرنا۔

مگر پانچ وقت کی تو کیا میں تو ایک وقت کی نماز بھی نہ ادا کر پاتی تھی اور ہفتہ ہفتہ نہاتی تک نہ تھی۔ اس دن پیر جی نے بہت مشکل سے مگر اس سائے کو قابو کر ہی لیا تھا اور انھوں نے اسے مجھے چھوڑنے کے لیے کہا مگر وہ نہ مانا اور پھر اپنی اصل شکل میں آ گیا۔

لمبے لمبے اور بکھرے بال، بدنما چہرہ، بڑے بڑے دانت، جسے دیکھتے ہی کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔ پھر پیر جی نے اُس سے پوچھا تو اس نے کہا۔

’’میں نے اسے بچپن میں دیکھا تھا۔ عید کے دن اور تب سے میں اسے اپنا سمجھتا ہوں اور یہ بھی مجھ کو اپنا سمجھتی ہے اور تُو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں اسے لے جاؤں گا یہاں سے اور تب تک نہیں جاؤں گا یہاں سے جب تک یہ ساتھ نہ چلے گی۔‘‘ ایک دم سے تیز تیز آندھی چلنے لگی مگر پیر جی نے شاید آج اسے ختم کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اس لیے وہ اطمینان سے بولے۔

’’اوہ اچھا تو اب جنوں کی بھی لو اسٹوری ہونے لگی، خیر تیرے لیے یہی بہتر ہے کہ تُو یہاں سے چلا جا کیونکہ جائے گا تو تیرا باپ بھی۔ تُو نہیں جانتا کہ میں کتنا خطرناک ہوں۔‘‘ انھوں نے کہا اور کچھ پڑھ کر اس پر پھونک ماری۔ پل بھر میں وہ آگ میں جلنے لگا۔

اس کی دردناک آواز سے کان پھٹنے لگے اور زور زور سے آندھی چلی تھوڑی دیر بعد سب کچھ صاف ہوگیا۔

پیر جی نے مجھے ایک تعویذ دیا جسے میں ہمیشہ اپنے پاس رکھتی ہوں اور پیر جی کو دعا دیتے نہیں تھکتی۔

اب تو اللہ کے کرم سے میرے دو بچے ہیں اور میں دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھتی ہوں اور ٹیپ میں کیسٹ لگا کر ہر روز سورۃ یٰسین کی پورے گھر میں تلاوت کرتی ہوں۔ اب پھر سے کوئی ایسا واقعہ رونما نہ ہوا اور نہ ہی اب ڈر لگتا ہے۔

☆☆☆



آٹھ کہانیاں' اک کردار!

فرح انیس

کراچی سے ایک دوشیزہ کے ساتھ پیش آنے والی پراسرار انہونیاں

میرا نام رباب علی ہے۔ مجھے شروع سے ہی پراسراریت میں دلچسپی رہی ہے۔ جہاں پر آسیب وغیرہ ہوتا ہے، مجھے خود بخود محسوس ہو جاتا ہے۔ میری زندگی میں بھی ایسے واقعات گزرے ہیں جن کا تعلق پراسراریت سے ہے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب میری عمر سات سے آٹھ سال تھی۔ جس گھر میں ہم رہتے تھے۔ وہاں ویسے تو سب کچھ ٹھیک تھا پر اکثر وہاں یہ میرے ساتھ ایسا ہوتا کہ آدھی رات گزر جانے کے بعد مجھے نیند میں محسوس ہوتا کہ کوئی میرا نام رباب کہہ کر پکار رہا ہو۔

میں اٹھ کر اپنے کمرے سے نکل کر ٹیرس پر آجاتی۔ ہمارے ٹیرس سے سامنے کی جانب ایک گھر دکھائی دیتا تھا۔ جو نجانے کب سے بند پڑا ہوا تھا۔ اس گھر کا ہمارے گھر سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ رات کے اندھیرے میں جب ہر طرف خاموشی کا راج ہوتا، اس گھر سے مجھے اپنے نام کی پکار صاف سنائی دیتی اور میں کھڑی ایک ٹک اس پرانے گھر کی جانب دیکھا کرتی۔ جب تک وہ آواز آتی رہتی میں کھڑی رہتی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے میرے قدموں کو جکڑ لیا ہو۔ فجر ہوتے ہی آواز کا سلسلہ رک جاتا اور میرے قدم ڈھیلے پڑ جاتے اور پھر میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ جاتی۔

☆☆☆

اب ہم دوسرے گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ اس وقت میری عمر گیارہ سال تھی۔ ڈبل اسٹوری پر بنا ہوا وہ بنگلہ میرے پاپا کو کافی پسند آیا تھا اور انھوں نے وہ گھر خرید لیا تھا۔ جس دن وہ ہمیں گھر دکھانے لے کر گئے، داخلی دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی میری نگاہ صحن میں لگے نیم کے درخت پر پڑی۔ مجھے عجیب سا احساس ہوا کہ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''بھوت بنگلہ'' جس پر میرے پاپا نے مجھے خفگی سے گھورا۔

وہ گھر کافی خوب صورت بنا ہوا تھا۔ پر نجانے کیوں مجھے اور میری مما کو اس گھر سے وحشت ہوتی تھی۔ ہمارے خوف کو دیکھتے ہوئے پاپا نے ہمارے ایک روحانی بزرگ کو بلوایا۔ انھوں نے پورا گھر دیکھا، قرآنی آیات کا نقش اوپر اور نیچے گھر میں لگوایا اور کہا۔

''جو تھے ہم نے ان کو باندھ دیا ہے، پر آپ دھیان رکھیے گا۔''

ہم لوگوں کی رہائش نیچے گھر میں تھی، اوپر کا گھر بس سیٹ کیا ہوا تھا۔ مجھے اوپر والے پورشن میں زیادہ مزا آتا اور میں وہاں گھنٹوں اکیلی کھیلتی رہتی۔ حالانکہ کئی بار مما سے ڈانٹ بھی پڑی کہ نیچے رہا کرو میرے ساتھ پر میں ان کی باتیں اَن سنی کر کے ہر وقت اوپر گھر میں کھیلتی رہتی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا کہ اوپر میں اکیلی نہیں ہوں اور بھی بہت سارے لوگ ہیں۔ اب کھیل کے دوران مجھے واش روم سے پانی گرنے کی آواز صاف سنائی دیتی۔ جب میں جا کر واش روم میں دیکھتی تو واش روم کے فرش گیلے ہوتے۔ صاف لگتا تھا کہ ان کو استعمال کیا گیا ہے۔ جبکہ اوپر کے واش روم بھی استعمال میں نہ تھے۔

ایک رات ایک بجے میں صحن میں بیٹھی تھی کہ صحن میں لگے درخت میں سے مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔ میں آواز پر غور کرتی ہوئی جوں ہی درخت کے پاس گئی تو درخت میں سے بھاری اور تیز آواز میں سے کسی نے 'رباب' کہا۔ میں خوف سے بدحواس ہو کر اندر گھر کی جانب بھاگی۔

ہمارے اوپر والے پورشن جو بیڈ روم ہے اس بیڈ کے نیچے ہر وقت ایک موٹی کالی سیاہ بلی بیٹھی رہتی تھی۔ اس بلی کو بھی کسی نے نیچے سے اوپر یا اوپر سے نیچے آتا نہیں دیکھا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اوپر کے ٹیرس کا دروازہ اور کھڑکیاں سب بند رہتی تھیں۔ اس بلی نے اس بیڈ کے نیچے بھی کوئی گندگی نہیں کی، بس ہر وقت اس بیڈ کے نیچے بیٹھی ہوئی سب کو گھورتی رہتی تھی۔ اس کو بھگانے کی بھی بہت کوشش کی گئی پر وہ وہاں سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔ عجیب سی پراسراری کشش تھی اُس کی آنکھوں میں۔ مجھے ہمیشہ اُسے دیکھتے ہوئی لگتا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر......

☆☆☆

ایک دن ہمارے گھر میں دعوت تھی۔ رات جب سب مہمان چلے گئے تو میں اور مما ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ ٹی وی لاؤنج سے جاتی اوپر گھر کی جانب سیڑھیوں پر مما کی نظر تھی۔ ان کو اس طرف دیکھتے پا کر میری نگاہیں



سیڑھیوں پر گئیں تو سیڑھیوں کے ساتھ دیوار پر ایک بچے کا سایا آتا جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ جس پر مما بولیں۔

"رباب بیٹا اوپر کوئی بچہ رہ گیا ہے۔ جاؤ لے کر آؤ۔"

اوپر جا کر میں نے گھر کا کونا کونا دیکھ لیا پر وہ مجھے بچہ دکھائی نہ دیا۔ اس ہی طرح کبھی ایسا ہوتا کپڑے تبدیل کرنے کے لیے کپڑے لا کر صوفے پر رکھو تو کپڑے ساتھ رکھے کپڑوں کے اسٹینڈ پر لٹکے دکھائی دیتے۔

☆☆☆

ہمارے پڑوس میں ایک بچی رہتی تھی۔ پانچ سے چھ سال کی۔ میں اکثر اس بچی کو اپنے گھر بلا لیتی تھی۔ وہ مجھ سے کہتی کہ میرا ایک دوست ہے جو میرے ساتھ کھیلتا ہے اور میرے ساتھ سب جگہ ہوتا ہے۔"

ایک بار میری مما کو کام سے کہیں جانا تھا۔ میں نے اس بچی کو بلا لیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ مما نے چاول بنائے تھے کھانے میں کہ تم دونوں کھا لینا۔ میں نے چاول بڑی پلیٹ میں نکال کے لے آئی۔ پہلا نوالہ لیتے ہی چاولوں میں تیز مرچیں لگنے لگیں۔ مجھے ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ اس بچی کے لیے کچھ اور بنا لوں ایک تو اس میں اتنی تیز مرچیں ہیں کہ میں نہیں کھا پا رہی تو یہ کیسے کھائے گی۔ اوپر سے وہ بچی کھاتی بھی بہت کم تھی۔ چاول کی پلیٹ دیکھ کر وہ میرے پاس آ گئی اور مجھ سے کہنے لگی۔

"آپی میرا دوست بھی کھائے گا کھانا۔"

مجھے اس کی بات پر زور سے ہنسی آ گئی۔ میں نے شرارت سے کہا۔

"چلو بلاؤ اپنے دوست کو۔" میرے کہنے پر اس نے ہاتھ کے اشارے سے کسی کو بلایا۔ اس کے ہاتھ کے اشارے پر میں اس جانب دیکھنے لگی۔ پر مجھے اب بھی کوئی دکھائی نہیں دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بچی اپنے برابر زمین پر ہاتھ مارنے لگی کہ یہاں بیٹھو۔ میں ابھی تک اس کی بات پر ہنس رہی تھی کہ میرے دیکھتے دیکھتے اس نے چاولوں پر بچی نے ڈھیر ساری چٹنی ڈالی اور کچھ ہی لمحوں میں چاول کی پوری پلیٹ خالی کر دی۔ میں جو ابھی بیٹھی ہنس رہی تھی۔ اب گھبرائی ہوئی اس بچی کو دیکھ رہی تھی۔

اب وہ بچی میری میری طرف دیکھ رہی تھی کہ آپی اور چاول دو۔ میرے دوست کو بھوک لگی ہے۔"

میں نے اور چاول دیے تو وہ بھی جلدی جلدی کھانے لگی۔ تیز مرچوں کی وجہ سے جن چاولوں کا دوسرا نوالہ مجھ سے نہیں لیا گیا وہ بچی اس کی دوسری پلیٹ کھا گئی تھی۔ اب میں چپ چاپ خوف میں گھری ایک کونے میں بیٹھی تھی اور وہ بچی پورے گھر میں کھیلتی پھر رہی تھی۔ مغرب کی اذان جیسے ہی شروع ہوئی وہ بچی ہاتھ آگے بڑھا کر باری باری سب کو سلام کرنے لگی۔ میرے پاس آ کر وہ بولی۔

"آپی سب کو سلام کرو۔" میرے پاس کھڑی ہوئی وہ ہاتھ آگے بڑھا کر سلام کرنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی سے ہاتھ ملا رہی ہے۔ میں اس کی اس حرکت سے کافی دہشت میں آ گئی تھی۔ وہ بچی غصے میں مجھ سے بولی۔

"آپی! سلام کرو۔" میری آنکھوں میں خوف و بے بسی سے آنسو آ گئے تھے۔ میں ڈر کر بھاگتے ہوئے اسٹور میں بند ہو گئی۔ وہ بچی اسٹور کا دروازہ بُری طرح پیٹے جا رہی تھی۔

کھول دروازہ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز تک کافی بھاری ہو گئی تھی۔ میں شدت سے دعا کر رہی تھی کہ کوئی آ جائے۔ تھوڑی دیر بعد مما گھر آئیں تو میری جان میں جان آئی۔

☆☆☆

کچھ عرصے بعد ہم نے وہ گھر بھی چھوڑ دیا۔ میرے پاپا کا کسی کام سے اُدھر جانا ہوا تو جس گھر میں ہم رہتے تھے اس گھر کے سامنے جو صاحب رہائش پذیر تھے۔ ان کی میرے پاپا سے اچھی بات چیت تھی۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب آپ لوگ اس گھر میں رہائش پذیر تھے۔ میں بھی ٹیرس پر آ جاتا تھا۔ ایک رات بارہ بجے میں اپنے ٹیرس میں کھڑا تھا کہ میری نگاہ آپ کے ٹیرس پر پڑی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس ٹیرس میں ایک عورت سفید کپڑے پہنی کھڑی ہے۔ اکثر میں بھی رات کو اپنے ٹیرس آتا تو کبھی مجھے لمبے لمبے سائے دکھائی دیتے۔ آپ کے ٹیرس میں، کبھی وہ عورت سفید لباس میں۔ میں نے آپ کو بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ کہیں آپ لوگ اور خوف زدہ نہ ہو جائیں اور جو اس پرانے گھر میں نئے لوگ آئے تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ رات ہوتے ہی برتنوں کے گرنے کی آوازیں آتیں اور عورتوں اور بچوں کے رونے کی آوازیں پوری رات آتیں۔ ہم اس نقش پاک کی بدولت ان آسیبی مخلوقات کے شر سے محفوظ رہے تھے، پر جب ہم وہ اتار کر لے آئے اور وہ مخلوق جو بندھی ہوئی تھی ظاہر ہو کر اب نئے لوگوں کو پریشان کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

ایک بار میں اپنی نانی کے گھر اپنی کزن کے ساتھ رہی۔ نانی کے پاس میں اور میری کزن روحیلہ تھی۔ رات تین بجے تک ٹی وی لاؤنج میں ہم دونوں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ باتیں کرتے کرتے ہم دونوں وہیں سو گئیں۔ ابھی ہمیں سوئے ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ میری کزن روحیلہ سامنے بیڈ روم کے دروازے پر کھڑی مجھے اشارے سے بلا رہی ہے۔ میں نیند سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے اشارے سے بلانے پر میں نے دور سے پوچھا کہ کیا ہوا۔ وہاں کیوں کھڑی ہو۔"

مگر وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے ہاتھ سے اپنی طرف آنے کا کہہ کر اندر بیڈ روم کی جانب چلی گئی۔ نانی ٹی وی لاؤنج میں رکھے تخت پر سو رہی تھیں اور میرے اور روحیلہ کے سوا گھر میں اور کوئی نہ تھا۔ میں بے زاری سے اپنی جگہ بیٹھی تھی۔ مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا کہ منہ سے کچھ بول بھی نہیں رہی اور ساتھ حیرت بھی ہوئی کہ اتنی بہادر کب سے ہو گئی روحیلہ کہ اتنی رات میں سامنے بیڈ روم میں ہے۔ جس کی لائٹ بھی بند تھی۔ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ روحیلہ پھر بیڈ روم کے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ اندر کمرے سے نکل کر اب وہ جلدی جلدی اشارے سے اپنے پاس آنے کا کہنے لگی۔ میں غصے سے کھولتی ہوئی کھڑی ہوئی کہ اس کا دماغ درست کرتی ہوں ابھی کہ کھڑے ہوتے ہوئے میری نگاہ کچھ فاصلے پر سوئی ہوئی روحیلہ پر پڑی۔ خوف سے میرا سانس رکنے لگا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے بیڈ روم کی جانب نگاہ کی تو وہاں کوئی نہ تھا۔ پوری رات میں نے تکیے میں منہ چھپائے، خوف سے گزاری کہ اگر میں وہاں بیڈ روم تک چلی جاتی تو پتا نہیں پھر میرا کیا حال ہوتا یا وہ آسیبی مخلوق میرا کیا حشر کرتی۔

☆☆☆

میری خالہ جن کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ میری نانی کے ہاں اپنی عدت گزار رہی تھیں۔ جس دن خالہ عدت سے نکل کر اپنے گھر گئیں اس رات تین بجے میری نگاہ نانی کے صحن میں گئی تو وہاں میرے مرحوم خالو سفید لباس میں کھڑے مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆

میں جس اسکول میں پڑھتی تھی وہ کافی پرانا اسکول تھا۔ وہاں کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں زبردست آسیب ہے۔ اس اسکول سے میری خالہ نے بھی پڑھا ہوا تھا۔ وہ بتاتی ہیں کہ ایک بار میں جلدی اسکول پہنچ گئی تھی۔ جس وقت میں اسکول پہنچی اس وقت کم طالب علم تھے۔ جو اسکول میں موجود تھے۔ میں اپنی کلاس میں چلی گئی کلاس خالی تھی۔ میں ڈیسک پر بیٹھ کر اپنی کاپی میں کام کر رہی تھی کہ میرے ہاتھ سے پین چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ میں پین اٹھانے کی غرض سے نیچے جھکی تو خوف کے مارے میری ہچکی بندھ گئی۔ جس ڈیسک پر میں بیٹھی تھی اس سے آگے والے ڈیسک کے نیچے ایک عورت بیٹھی نظر آئی۔ نہایت بھیانک ترین چہرہ، لمبے سفید بال بکھرے ہوئے تھے۔ میری سانس میرے سینے میں اٹکنے لگی تھیں۔ میں گرتی پڑتی کلاس روم سے باہر کی جانب بھاگی تو سامنے سے میری دوست آتی دکھائی دی۔ میں نے روتے ہوئے اسے ساری بات بتائی۔ وہ زبردستی میرا ہاتھ پکڑ کر اندر کلاس میں اس ڈیسک کی طرف لے کر آئی جہاں میں نے وہ ہولناک منظر دیکھا تھا۔ پر اب وہاں کوئی نہ تھا۔

مجھے چونکہ شروع سے ہی ایسی باتوں میں دلچسپی رہی ہے۔ میں فطرتاً ڈرپوک بہت ہوں پر پھر بھی مجھے ان باتوں کے بارے میں کھوج لگانے کا بہت شوق تھا۔

یہ میرا اسکول کا آخری دن تھا کہ میری دوست کہنے لگی۔ "چلو گراؤنڈ میں چلتے ہیں۔ ہماری وین بھی دیر سے آنا تھی۔"

سارا اسکول خالی ہوگیا تھا بس ایک دو آیا اور دروازے پر چوکیدار تھا۔ دونوں آیا بھی پرنسپل کے آفس کے باہر بیٹھی باتیں کررہی تھیں۔ ہم دونوں گراؤنڈ کی جانب چہل قدمی کررہے تھے۔ گراؤنڈ اسکول کے کافی کونے میں بنا ہوا تھا۔ ہمارا اسکول بہت بڑا تھا۔ اس گراؤنڈ میں سب ہی بہت کم جاتے تھے۔ اس گراؤنڈ میں ایک جگہ کونے میں برگد نیم اور بیر کے درخت لگے ہوئے تھے۔ ہم دونوں باتیں کرتی ہوئی ان درختوں کی جانب بڑھ رہی تھیں کہ میری نگاہ درخت کے پاس پڑی ہڈیوں پر پڑی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خوف محسوس ہوا۔ میری دوست کا بیر کھانے کو دل چاہنے لگا۔ میں درخت پر چڑھ کر اس کے لیے بیر توڑنے ہی والی تھی کہ دو ہاتھوں نے زور سے مجھے دھکا دیا۔ میں زور سے زمین پر آکر گری۔ زمین پر گرنے سے چوٹ میرے دونوں ہاتھوں پر لگی تھی، جس سے خون نکلنے لگا تھا۔ اب اس درخت کے پتے تیز تیز ہلنا شروع ہوگئے۔ میں اور میری دوست بُری طرح سے ڈر گئی۔ ہم اس گراؤنڈ سے نکل کر اپنی کلاس میں آکر گیٹ بند کرکے بیٹھ گئیں۔ ابھی ہم نے اپنے حواس بحال ہی کیے تھے کہ کلاس روم کی لائٹیں بند ہونا شروع ہوگئیں۔ ہم دونوں سہیلیاں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑی ہوئی تھیں کہ کلاس روم کے باہر سے بہت سارے اسٹوڈنٹس کے بھاگتے ہوئے جوتوں کی آوازیں آنے لگی۔ ہم دونوں نے گھبرا کر گیٹ کھولا تو جوتوں کی تیز آواز ہمارے قریب آرہی تھی جب کہ کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم دونوں دوستوں نے وہاں سے دوڑ لگائی اور اسکول کا گیٹ کراس کرگئیں، جہاں ہماری وین والے انکل آچکے تھے۔

تھوڑے ہی دن بعد ایک خبر ملی کہ اسکول کی ایک لڑکی واش روم گئی اور جب کافی دیر ہوگئی وہ نہیں آئی تو سب کو تشویش ہونے لگی۔ جب گیٹ توڑا گیا تو وہاں وہ لڑکی مردہ حالت میں پائی گئی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف سے باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور چہرہ پورا سفید ہورہا تھا، جیسے کسی نے اس کا خون پیا ہو۔ جب میں نے اور میری دوست نے یہ خبر سنی تو خدا کا شکر ادا کیا کہ اُس دن ہم دونوں بڑی مصیبت سے دوچار ہونے سے بچ گئی تھیں۔

☆☆☆

جس یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں وہاں کے ایک پرانے چوکیدار ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ یہاں رات کے وقت وہی صبح کا سماں ہوتا ہے۔ جس طرح آپ لوگ صبح پڑھنے آتے ہو۔ اسی طرح وہاں رات بارہ بجے شور اٹھتا ہے۔ ویسے ہی تیز تیز قدموں کی آوازیں۔ بس کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہوتا پر زمین پر ان کے لمبے لمبے سائے دکھائی دے رہے ہوتے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ یونیورسٹی میں رات دو بجے ایک دلہن چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔ ان باتوں کا ذکر میں نے اپنی یونیورسٹی فرینڈ سے کیا تو اس نے بتایا۔

ایک رات اس کا کزن اور اس کے دو دوست دوسرے دن کی فنکشن کی تیاری میں لگے تھے۔ ان کو رات کے بارہ بج گئے جب وہ کام سے فارغ ہوکر آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں۔ سائنس ڈپارٹ کے باہر ایک لڑکی برگد کے درخت سے ٹیک لگائے کتابیں کھولے بیٹھی تھی۔ میرے کزن کی نگاہ اس لڑکی پر پڑی تو خوف کی سرد لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ کیونکہ یہ وہ لڑکی تھی جس نے کچھ ماہ پہلے خودکشی کرلی تھی۔ وہ سائنس ڈپارٹ میں پڑھتی تھی اور بہت ہی ذہین لڑکی تھی۔

استاد کی ڈانٹ پر دلبرداشتہ ہوکر اس نے اپنی جان دے دی تھی اور اس کے علاوہ بہت سے لوگوں نے اس لڑکی کو وہاں بیٹھے دیکھا۔

ایک بار مجھے خود اس درخت کے پاس سے نسوانی قہقہے کی آواز سنائی دی۔ پر میں دوبارہ ان معاملات میں نہیں پڑی اور نہ ہی میں نے کبھی دوبارہ ان باتوں کی کھوج لگائی۔ کیونکہ جس طرح ہم اللہ کی مخلوق ہیں، وہ بھی اسی طرح اللہ کی مخلوق ہیں اور ہمیں کوئی حق نہیں یوں مداخلت کرنے کا کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ ہماری ایک چھوٹی سی حماقت یا حرکت ہمارے لیے خود زندگی بھر کا روگ بن سکتی ہے۔ میں شکر ادا کرتی ہوں اللہ کا کہ اس نے مجھے بڑے نقصان سے بچایا۔

☆☆☆



اِک پل میں سب کچھ

زہت ناز

ایک دوشیزہ کے ساتھ پیش آنے والا عجب قصہ، جو یقیناً آپ کی نیند اُڑا دے گا

"اقلیمہ کیا سوچ رہی ہو؟" اقلیمہ نے یک دم چونک کر ماں میں واپس آتے ہوئے بولی۔

"کچھ نہیں بس دادا یاد آگئے تھے۔" جب اس نے سامنے دیکھا تو ڈر گئی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کے سارے واقعات جھماکے سے اس کے ذہن میں آگئے۔

آج سنڈے تھا اور کل کتابوں کے درمیان مارچ 2014ء کا شمارہ سچی کہانیاں نظر آگیا تھا۔ تو اس نے جب الٹ پلٹ کرکے دیکھا تو اس کی کچھ کہانیاں



باقی تھیں۔ آج ناشتے سے فارغ ہو کر شمارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ کہانیاں بہت دلچسپ اور سبق آموز تھیں کچھ کچھ ڈر بھی لگ رہا تھا۔ امی کی آواز آئی اقلیمہ گیٹ اچھی طرح بند کرلو۔ مجھے کچھ کام ہے، باہر جارہی ہوں۔"

وہ رسالہ لیے کمرے سے نکلی گیٹ لاک کر کے لاؤنج میں ہی بیٹھ کر شمارہ ابھی شروع ہی کیا تھا کہ ڈور بیل بج اٹھی۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو دوپہر کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ گیٹ پر گئی تو ماسی کی بیٹی کھڑی تھی۔

میں نے پوچھا کہ آج تو تمہارا دن نہیں ہے اور تمہاری امی کہاں ہیں؟" اُس نے جواب کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کل کی چھٹی کی تھی اس لیے آج مجھے کام پر بھیجا ہے۔"

اس سے قبل بھی کئی مرتبہ ماسی کی بیٹی مہک ان کے گھر کام کر چکی تھی تو اس نے اس کو اندر بلا لیا۔

عام طور پر اس کی امی ماسی سے کام کرواتی تھیں۔ لیکن اس وقت امی گھر پہ موجود نہیں تھیں۔ اس نے اس سے کہا کہ تم پہلے برتن دھولو۔" رسالہ اس کے ہاتھ میں تھا جانے کیوں۔ وہ بار بار رسالے کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے اگنور کیا اور اس سے دوبارہ کہا کہ تم برتن دھولو لیکن مہک کا پورا دھیان رسالے کی طرف ہی تھا۔ اچانک اس نے کہا۔

"باجی کیا میں یہ رسالہ دیکھ سکتی ہوں؟" وہ کچھ ڈسٹرب لگ رہی تھی۔ اس کو کچھ خاص پڑھنا نہیں آتا تھا۔ اقلیمہ نے رسالہ اس کو دے دیا۔ وہ کافی دیر تک سرورق دیکھتی رہی پھر اوراق پلٹ کر اندر کی تصاویر دیکھنے لگی۔ اقلیمہ اُٹھ کر واش روم چلی گئی۔ میں جب واپس آئی تو دیکھا کہ کرسی پر ایک کالے رنگ کی بلی بیٹھی ہے اور مہک نظر نہیں آرہی۔ اس نے آواز دی۔ "مہک تم کچن میں ہو؟" اس نے محسوس کیا کہ بلی مجھے غیر معمولی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اس نے اس کی طرف سے نگاہ ہٹائی اور سوچنے لگی کہ یہ بلی کہاں سے آئی۔ کیونکہ باہر والے دروازے اور کھڑکیوں پر تو جالی لگی ہے۔ بلی گھر کے اندر نہیں آسکتی تھی لیکن یہ بلی!!

اچانک اسے کچھ خطرہ محسوس ہوا۔ ابھی گھر پہ کوئی موجود نہیں ہے۔ اس کی عادت تھی کہ میں جب بھی واش روم جاتی تو وضو کر لیتی۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں پر وضو کا پانی موجود تھا۔ ہاتھ ابھی خشک نہیں ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھوں کو جھٹکا تو چند قطرے بلی پر پڑے اور وہ دھوئیں کے مرغولے میں تبدیل ہو گئی۔

"کیا کر رہی ہو؟ اقلیمہ!!" بھاری سی آواز آئی۔

"ایسا کچھ نہ کرو کہ مجھے اصل روپ میں آنا پڑے۔ ورنہ تم ڈر جاؤ گی۔ مجھے ولی محمد نے تمہاری حفاظت پر مامور کیا ہے۔"

"میری حفاظت!!"

"ہاں تمہاری حفاظت! اور یہ اس وقت کی بات ہے جب تم اس دنیا میں بھی نہیں آئی تھیں۔" ولی محمد تو میرے دادا کا نام ہے۔ ولی محمد!! میرے دادا......!! پوری فلم اقلیمہ کے ذہن میں چلنے لگی۔ اس نے اپنے دادا کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا اور وہ ان سے بہت عقیدت رکھتی تھی۔ آج بھی ان کے نام کا فاتحہ اقلیمہ کے گھر میں ہوتا تھا۔ ہر سال ان کی برسی منائی جاتی تھی اور ان کے نام پر نذر و نیاز اور غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔

اقلیمہ کی دادی نے بتایا تھا کہ اس کے دادا، دو بھائی تھے۔ ولی محمد اور محمد زبیر! دونوں ساتھ رہتے تھے۔ ان کا تعلق انڈیا سے تھا۔ یہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کے ہونہار طالب علم تھے۔ انڈین گورنمنٹ کی طرف سے ولی محمد کو اسکالرشپ بھی ملی تھی اور وہ انگلینڈ بھی گئے۔ محمد زبیر پڑھ لکھ کر جج بنے اور ولی محمد نے پی ایچ ڈی کیا لیکن نہ جانے کیوں ولی محمد دنیا داری سے دور ہونے لگے۔ ان کو پڑھ لکھ کر کمانے کی دھن ہونی چاہیے تھی۔ اچھی جاب اور گھر پر توجہ دینی چاہیے تھی لیکن!! اس کے برعکس وہ اپنی عبادات پر زیادہ توجہ دینے لگے۔ رات رات بھر کی عبادت اور کئی کئی مہینوں تک گھر سے غائب رہ کر وہ نہ جانے کہاں کہاں بھٹک کر، کیا تلاش کر رہے تھے۔ گھر والے پریشان تھے کہ ولی محمد کو پڑھ لکھ کر اپنی فیملی کو سپورٹ کرنا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس انھوں نے تعلیم سے فارغ ہو کر اپنی زمینیں اور جائیداد غریب رشتہ داروں میں تقسیم کر دیں اور جنگل جنگل بھٹکنے لگے۔ ان کے اندر طلب کا ایک دریا موجزن تھا۔ جنگل میں بھی ان کی کرامات ظاہر ہونے لگیں۔ ان کی اولاد بھی ایک ہی تھی اور تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ جبکہ بیگم بھی صابر و شاکر تھیں اور اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں کہ کبھی مالی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ولی محمد جب بھی گھر آتے اور کوئی بیمار ہوتا تو ان کی دعا سے ٹھیک ہو جاتا تھا۔ ان کے بھائی اکثر ان سے کہتے۔

"ولی محمد یہ جو تمہاری حرکتیں ہیں ناں تم اگر مر بھی جاؤ گے تو ہمیں خبر تک نہیں ہو گی۔"

اس مرتبہ ولی محمد نے بڑے اعتماد سے اپنے بڑے بھائی کو اطمینان دلایا کہ زبیر بھائی آپ فکر نہ کریں۔ آپ

کو پتا چل جائے گا بس میرے مرنے کے بعد میرے نام کا فاتحہ ضرور کروا دیا کیجیے گا۔ یہ میرے لیے بھی بہتر ہو گا اور آپ کی خیر و برکت میں بھی اضافہ کرے گا۔"

"یہ تم کیسی باتیں کرتے ہو ولی! میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ میں تم سے پہلے جاؤں گا۔"

"یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کس کا بلاوا پہلے آتا ہے۔ اللہ کے پاس جانے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔ بس ہمیں اپنے اعمال درست رکھنی چاہیے۔"

☆☆☆

شام کا وقت تھا۔ محمد زبیر لاؤنج میں بیٹھے اپنا کیس اسٹڈی کر رہے تھے۔ وہ ایک مشہور جج تھے۔ وہ بڑے انہماک سے اپنے کام میں مصروف تھے کہ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا ان کے پاس آیا، ایک بھینی بھینی سی خوشبو کے ساتھ!! انھوں نے نظریں اٹھائیں تو سامنے فرش پر ان کو خون کا قطرہ نظر آیا۔ وہ قطرے کو دیکھنے لگے تو اس سے آگے کئی قطرے نظر آئے۔ وہ دیکھنے کے لیے اُٹھے کہ یہ قطرے کہاں سے آرہے ہیں؟ گول گول قطرے لائن سے فرش پر نظر آرہے تھے۔ وہ قطروں کے ساتھ ساتھ گھر سے باہر نکل گئے۔ جنگل پہنچ گئے۔ انڈیا میں اس وقت آبادی اتنی نہیں تھی اور گھروں کے قریب ہی جنگل پائے جاتے تھے۔ قطروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ جب جنگل کے درمیان پہنچے تو بھائی کو دیکھا۔ وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ بھائی کو دیکھا تو وہ لیٹ گئے۔ کلمہ پڑھا اور ان کی روح پرواز کر گئی...... اور قطرے غائب ہو گئے۔

محمد زبیر جو نذر نیاز اور فاتحہ کو نہیں مانتے تھے۔ ان کو وصیت کی تھی کہ میرے نام کی فاتحہ کرنا۔ وہ جس سال بھول جاتے تھے تو کمرے میں خون کے قطرے نظر آتے تھے۔ ابھی پچھلے مہینے ہی دادا کے نام کا فاتحہ ہوا تھا۔

"اقلیمہ کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے اپنے حواسوں کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ ایک دیو قامت جن اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا اوپری دھڑ چھت سے بھی اوپر نکلا ہوا تھا اور وہ اس کے گھٹنوں سے بھی نیچی تھی۔

"بھائی تم نیچے تو آؤ میں تم سے باتیں کیسے کروں؟ تمہارا نام کیا ہے؟ تم اتنے دن کہاں تھے؟ تم کیا کرتے ہو؟ پلیز تم کیا کرو گے؟" نہ جانے کہاں سے اقلیمہ کے اندر اتنی ہمت آگئی تھی کہ اسے بالکل بھی ڈر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ دیو ہیکل جن ایک دھوئیں کے مرغولے میں تبدیل ہو گیا اور دھواں سامنے "منی پلانٹ" میں جذب ہو گیا۔ اقلیمہ نے لاؤنج میں جہاں کھڑکی سے روشنی آتی تھی۔ وہاں منی پلانٹ کا پودا لگایا تھا۔ جو دیکھنے میں بہت خوب صورت لگتا تھا اور ایک خوش گوار تاثر ابھرتا تھا۔ اچانک پودے میں سے آواز آئی۔

"میرا نام جسیم ہے۔ میرے والد کا انتقال دو سال قبل ہوا ہے۔ مرتے وقت انھوں نے تمہاری حفاظت کی ذمہ داری مجھے سونپی تھی۔ انھیں تمہارے دادا نے اس کام پر مامور کیا تھا۔ قدرت کو تم سے کچھ کام لینا ہے۔"

اقلیمہ نے محسوس کیا کہ واقعی وہ جب بھی گھر سے باہر نکلتی ہے تو ایک خوشبو کا جھونکا اُس کے ساتھ چلتا ہے اور کبھی کبھی اس کی بھینی بھینی خوشبو تیز محسوس ہوتی ہے۔ اقلیمہ نے اس خوشبو پر کبھی کوئی خاص دھیان نہیں دیا. کیونکہ اس سے اس کو کبھی ڈر محسوس نہیں ہوا۔

بھاری آواز میں جسیم نے بتایا کہ میرے والد نے مجھے ہدایت کی تھی کہ جب تمہاری عمر کے 7 کے تین پھیرے مکمل ہو جائیں تب۔ مجھے ظاہر ہوتا ہے۔" اور اقلیمہ کو ایک حیرت انگیز خوشی ہوئی کہ واقعی کل 6 مارچ کو اس کی برتھ ڈے ہے اور وہ 21 سال کی ہو رہی ہے۔ یعنی 7 سال کے 3 پھیرے۔

جسیم نے پھر کہا کہ مجھے تمھیں صرف ایک بات کہنی ہے۔ اب میں اگلے پھیرے پر ظاہر ہوں گا۔ ابھی یہ بتانا ہے کہ قرآن پاک کی کسی ایک سورۃ کو اپنا دوست بنا لو۔ اس کو پڑھ کر یقین کرلو کہ ہر مشکل آسان ہوگی اور حفاظت رہے گی۔" اور واقعی اس بات میں جانے کیا راز چھپا تھا کہ اقلیمہ کو اپنے ذہن و دل میں ایک سکون سا اترتا محسوس ہوا کہ اب قرآن کی ایک سورۃ سے دوستی ہی اس کے لیے ایک اچھوتا تصور تھا۔

جسیم یہ کہہ کر پھر دھوائیں کا مرغولہ بن کر غائب ہو گیا اور اقلیمہ یہ سوچ رہی تھی کہ...... دادا نے اس کے متعلق کیا جانا؟؟ قدرت کو اس سے کیا کام لینا ہے؟؟ اور قرآن کی ایک سورۃ سے دوستی!!! اب تک وہ اس کشمکش و پیچ میں مبتلا ہے۔ مگر جسیم نے جو کہا وہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ خدا کے کلام میں ہر آفت سے حفاظت کا راز پوشیدہ ہے۔ بس یقین کرنے کی دیر ہے۔

☆☆☆



مہانتا ناگ

تحسین جونیجو

زہریلی دنیا سے امرت بھری تحریر قدرت کا عجیب رنگ دکھاتی ایک کتھا

''اُف کیا مصیبت ہے اماں؟ ہوا کیا اچانک سے جو یوں تھپڑوں کی بوچھاڑ کردیتی ہیں۔ کئی دن سے میں دیکھ رہی ہوں۔ بغیر کسی وجہ کے آپ یہ برتاؤ کیوں کر رہی ہیں؟'' زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پہ پڑا تو وہ تلملا کر رہ گئی۔

''نہ تو تیرا باپ آئے روز مجھے پیسے دے کر جائے گا جو میں نئے مٹکے اور چارپائیاں لیتی پھروں؟''

''ارے اماں کیسے سمجھاؤں، میں بھلا کیوں کراتے ہی مٹکے اور چارپائیاں توڑوں گی۔ اس کے سوا ہے کیا اپنے گھر میں جو میں ایسی حرکتیں کرنے لگی؟''

''کم بخت ماری تو بتا چھوٹی اور بلال کے علاوہ گھر میں ہے کوئی جو یہ کام کرسکے؟ کنزیٰ تو پہلے ہی وہ بچی ہے چارپائی کیسے توڑ پائے گی۔ بلال یہ کام کرے گا نہیں، اب کوئی باہر کا بندہ تو آکر کرنے سے رہا یہ سب۔''

مسلسل کئی دن سے نیامت بی بی اور اس کی بہو صفوراں کے بیچ یہ جنگ جاری رہی، نیامت بی بی یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھیں کہ کوئی اور بھی یہ کام سرانجام دے سکتا ہے۔

''بات سن چھوکری! آخری بار کہہ رہی ہوں، ان حرکتوں سے باز آجا ورنہ اس گھر میں رہنے نہیں دوں گی۔''

''اللہ پاک کی قسم اماں میں خود حیران ہوں کہ یہ سب کر کون رہا ہے۔ پانی کا مٹکا میں بھر کر رکھ دیتی ہوں، تو کچھ دیر میں ہی مٹکا ٹوٹا ہوا ملتا ہے۔ خدا کے لیے میری بات کا یقین کرو اماں۔'' اب صفوراں ہاتھ جوڑے کھڑی ہوگئی۔ تو نیامت بی بی کے اوسان خطا ہوگئے کہ آخر کو یہ کر کون رہا ہے۔

☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا جب نیامت بی بی اپنے کچے جھونپڑے نما بوسیدہ کمرے میں لکڑیوں سے بنی چھت کو گھورتی یہی سوچ رہی تھی کہ ہم غریبوں کے ساتھ کر کون رہا ہے، اگر ماں باپ نے تعلیم سے نوازا ہوتا تو میں اس کی مدد سے جان سکتی تھی کہ یہ چکر کیا ہے۔

اِدھر صفوراں بھی اب پریشان رہنے لگی تھی۔ وہ نماز اور قرآن پاک پابندی سے پڑھا کرتی تھی۔ کئی دن سے ساس اور بہو کی لڑائی دیکھ کر وہ محظوظ ہوتا رہا، کہ ایک ان پڑھ گوار سے وہ بگاڑ کچھ نہیں سکتی مگر دوسری والی کے پاس اللہ کا علم ہے۔ جس سے وہ خود بھی پریشان سا رہنے لگا کہ یہ تنگ آکر کچھ بھی کرسکتے ہیں۔

☆☆☆

''نیامت ...... نیامت۔'' اچانک سے اپنا نام سن کر تنہائی میں وہ بوکھلا سی گئی۔

''سن اے نیامت۔'' اب کی بار وہ اُٹھ کے بیٹھ گئی۔ کہ کس نے نام پکارا۔ خالی کمرے میں نظریں دوڑانے لگی۔ کسی کا وجود نہ پاکر وہ ڈر وخوف سے کانپنے لگی۔ چارپائی سے اٹھنے میں بھی ناکام ہی رہی۔

''ارے ڈر کیوں رہی ہو نیامت! میں ہوں۔''

''ک...... کون ہو تم کہاں سے آئے ہو...... سامنے کیوں نہیں آتے؟''

''تمہارے سامنے ہی تو ہوں۔ یہ دیکھو ذرا اوپر روشن دان میں لیکن ڈرنا نہیں۔''

جیسے ہی نیامت نے نظریں دوڑائیں تو نظریں جم سی گئی۔ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ لمبا موٹا سیاہ سانپ پھن اٹھائے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ باہر دروازے کی طرف لپکی کہ اس نے پھر روک دیا۔

''ٹھہرو۔ ڈرو مت، میں تمھیں کچھ نہیں کہوں گا۔'' یہ سن کر وہ رک گئی۔

''بات سن میرا تعلق قوم جنات سے ہے۔ کچھ دن پہلے میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ تو تمہارا چھوٹا سا کچا صاف ستھرا مکان آلودگی سے پاک مجھے بہت پسند آیا تو رکنا پڑا۔ سکون، اطمینان تھا اس گھر میں تو مجھے شرارت سوجھی کہ کچھ دن یہاں قیام کروں، تم اور تمہارا گھر بہت پسند آیا، تمہاری بہو بھی بہت اچھی ہے۔ اس کا قصور کوئی نہیں جو کچھ بھی ہو رہا ہے سب میں کر رہا تھا۔ مگر اب نہیں کروں گا۔ تم مجھ سے کچھ لمحے بات کیا کرو۔ جتنی بھی دولت چاہیے مل جایا کرے گی۔''

''خدا کے لیے ہم غریب لوگ ہیں، ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ یہاں سے چلے جاؤ اپنی دنیا میں۔ ہمیں یہاں سکون سے رہنے دو۔'' وہ التجائیں کرنے لگی۔

''دیکھو نیامت بی بی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں چلا جاؤں گا، بس کچھ دن تک۔ تمہاری دنیا بھی بہت اچھی ہے مزہ آرہا ہے مجھے۔ اب کوئی حرکت نہیں کروں گا۔'' یہ کہہ کر وہ لمحوں میں غائب ہوگیا تو نیامت بی بی کی جان میں جان آئی۔ چیخ چیخ کر صفوراں کو آواز لگائی۔ فوراً سے صفوراں کمرے



میں پہنچ گئی۔

''بی بی اماں کیا ہوا! طبیعت ٹھیک تو ہوں نا اماں؟''

''ہاں صفوران وہ سب حرکتیں تم نہیں کر رہی تھیں۔ وہ کر رہا تھا۔''

''وہ؟ وہ کون اماں۔''

''وہ، وہ سانپ، سانپ؟''

''کیا کہہ رہی ہو اماں؟'' نیامت بی بی نے روشن دان کی طرف انگلی اٹھائی۔

''وہاں وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے اماں آپ نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہوگا۔''

''ضدمت کر چھوکری کوئی خواب نہیں دیکھا میں نے۔ جاگتی آنکھوں سے سب دیکھا ہے۔ بہت لمبا موٹا سانپ آج دکھائی دیا ہے۔ مجھ سے بات بھی کی ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو اماں! سانپ بھی بھلا بات کرتے ہیں کیا؟''

''ہاں وہ کوئی عام سانپ نہیں جنات سے تعلق ہے اس کا۔'' نیامت بی بی اب اسے تفصیل سے بتانے لگی۔

''یقین نہیں آ رہا مجھے اماں؟'' ایک بار پھر نیامت بی بی نے اُسے دو تھپڑ جڑ دیے۔

''اری او بے غیرت تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟''

''ن...... نہیں اماں...... م...... مگر مگر......''

''کیا مگر مگر لگا رکھی ہے۔ دیکھنا ایک دن تمہیں بھی نظر آ جائے گا پھر مگر مگر کرتی رہنا۔ مگر مچھ کی اولاد۔'' اتنا کہہ کر نیامت بی بی کمرے سے چلی گئیں۔

صفوراں بے چاری بنی جاتی ہوئی اماں کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

ایک دن نیامت بی بی کسی کام کا کہہ کر پڑوس میں صفوراں کو ایک آدھ گھنٹے تک آنے کا کہہ کر چلی گئی۔ گھر پر اکیلی صفوراں ہی تھی۔ تو ایک انجانی آواز نے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ اجنبی آواز سن کر صفوراں حیرانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھتی رہی مگر کسی کو نا پا کر سہم گئی۔

''سنو صفوراں میں وہی ہوں جو اس دن نیامت کے پاس آیا تھا۔ آج میں اسے پیر جٹ سائیں کے مزار لے گیا تھا جو یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ وہ وہاں بیٹھی ہے اسے جا کر لے آؤ۔''

''لیکن تم اسے کیسے لے گئے اور کیوں؟''

''میری مرضی میں جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ اگر چاہوں تو ابھی اسے یہاں لے کر آؤں۔ تمہارے سامنے مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ تم لوگ خود جا کر دیکھو تو جان لو کہ میں کیا ہوں اور کیا کر سکتا ہوں۔''

کوئی جواب دیے بغیر صفوراں بھاگتی ہوئی پڑوس میں گئی۔ تو پتا چلا نیامت بی بی ابھی تو یہاں تھی چند منٹ پہلے انھیں پتا ہی نہیں چلا کب اور کیسے یہاں سے چلی گئی۔ باتیں کرتی کرتی اچانک اُٹھی اور بغیر بتائے جانے کہاں چلی گئی۔''

صفوراں گھر آ کر بلال کو سب کچھ بتانے لگی جسے سن کر بلال بھی پریشان سا ہو گیا۔ پھر بلال پیدل ہی پیر جٹ سائیں کے مزار کی طرف چلا گیا۔ (پیر جٹ سائیں کا مزار ہمارے گاؤں سے کچھ ہی فاصلے پر ہے کہ پیدل بھی جا سکتے ہیں)

مزار پر پہنچ کر بلال نے دیکھا کہ اماں وہاں بیٹھی ہوئی تھیں۔

''ارے اماں آپ یہاں کیسے آئیں؟''

''بس بیٹا میں خود نہیں جانتی کہ کیسے یہاں آئی ہوں۔ میں تو پڑوس میں عورتوں سے باتوں میں مصروف تھی، پھر پتا ہی نہیں چلا کہ کب......'' بلال ماں کو لے کر گھر آ گیا۔

یہ جان کر کہ اماں واقعی پیر جٹ سائیں کے مزار پر تھیں صفوراں بے ہوش ہو گئی۔

بہت مشکل سے جب اسے ہوش آیا تو وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔ بلال نے اُسے سمجھا کر مطمئن کیا۔

ابھی ایک دن بھی سکون سے نہ گزرا تھا کہ پھر سے سانپ کی پھنکار نے بے سکونی پیدا کر دی۔

''اللہ خیر کرے وہ پھر سے آ گیا۔ پتا نہیں اب کیا کرے گا۔''

''نیامت جی کیسی ہیں آپ؟''

''تم پھر آ گئے۔ اپنی دنیا میں تمھیں کوئی چین نہیں یا کوئی ملا نہیں جو یہاں ہمارا جینا حرام کرنے چلے آئے؟''

''پسند تو بہت ہے مجھے ہماری دنیا مگر یہاں مزہ آ رہا ہے۔ بہت تھوڑے ہی دن یہاں ہوں پھر تم سکون سے رہنا۔''

''اچھا مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی۔'' اب نیامت بی بی کا ڈر کچھ حد تک کم ہو گیا تھا۔

''جنات میں تو اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ کنواری لڑکیوں پر عاشق ہوتے ہیں۔ پھر تمھیں مجھ بڑھیا میں کیا نظر آ گیا۔''

''ہاں تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے۔ بس تمہارے گھر میں بہت سکون تھا۔ ایسا سکون میں نے کبھی اس دنیا میں نہیں دیکھا۔ تو مجھے گمان سا ہونے لگا کہ کہیں یہ ہماری تو ہی دنیا نہیں۔ لیکن یہ صرف گمان ہی رہا۔ اس لیے چند دن کے لیے رکنا پڑا۔''

''اچھا بس دیکھ لیا نا سکون، اب اپنی دنیا میں چلے جاؤ۔ میری چھوٹی بیٹی بھی ہے۔ اگر اس نے تمھیں دیکھ لیا تو خوف زدہ ہو جائے گی، پھر کیا کروں گی میں۔'' نیامت بی بی نے اپنی پریشانی ظاہر کی۔

''ٹھیک ہے میں اس کی موجودگی میں نہیں آؤں گا، تم بے فکر رہو، اپنا خیال رکھنا پھر آؤں گا۔'' اتنا کہہ کر وہ لمحوں میں غائب ہو گیا۔

یہ اس کا روز کا معمول بن گیا کب کیسے کہاں سے آتا اور چلا جاتا یہ سمجھنے سے دل و دماغ قاصر ہی رہتا۔

☆☆☆

گھر میں روپے پیسے کی بہت تنگی تھی، جس سے وہ سب اکثر پریشان رہتے تھے۔ بلال کھیتی باڑی کرتا، وہاں سے گندم اور چاول آ جاتے۔ ایک بھینس بھی پال رکھی تھی۔ دودھ خریدنا نہیں پڑتا تھا۔ لسی اور خالص مکھن سے گزر بسر ہو جایا کرتی تھی۔ کسی کو کوئی شکوہ نہیں ہوتا تھا کہ جہاں پتھر کے مکان ہوں وہاں پتھر کے دل بھی بن جاتے ہیں۔ اس لیے سب اپنے کچے مکان میں ہنسی خوشی رہ رہے تھے۔ پیسے سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے مگر سکون نہیں، جس سے وہ مالا مال تھے۔

صبح نیند سے بیدار ہوتے ہی کنزیٰ ضد کرنے لگی کہ مجھے نئے کپڑے لینے ہیں۔ اس وقت سوائے چند روپوں کے نعمت بی بی کے پاس کچھ تھا نہیں کہ اسے کپڑے دلواتی۔ بڑے بکس میں رکھے کپڑے نکالنے گئی کہ اسے دوں تا کہ اور وہ چپ ہو جائے گی اور راضی بھی۔

جوں ہی نعمت بی بی نے پیٹی کا ڈھکن اوپر اٹھایا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہائے اللہ اتنے سارے روپے...... پوری پیٹی بھری پڑی تھی۔ کہاں سے آئے یہ تو میرے سنبھالنے سے بھی زیادہ ہیں، ایک ڈھیر ہی تو تھا روپوں کا۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

''رکھ لو نیامت سارے تمہارے لیے ہیں۔'' وہ پھر سے پہنچ گیا۔

''اچھا تو یہ سب تم نے......'' اب نیامت خوشی سے اس کی جانب دیکھتی رہی تھی اور ساتھ ہی روپوں کو بھی۔

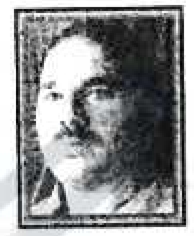
''ہاں جی بالکل سب رکھ لو اور عیش کرو زندگی بھر۔''

اب نیامت بی بی کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ یہ کہہ کر وہ سانپ غائب ہو گیا اور پھر کبھی نظر نہ آیا۔ اب یہ تو بتانے والی بات نہیں کہ اس واقعے کے بعد سے نیامت بی بی کے دن پھر گئے اور اُس سانپ کو خدا نے وسیلہ بنا کر اس گھر میں خوشحالی دے دی تھی۔ سچ کہتے ہیں، خدا کی قدرت کے آگے کوئی پیش ـــ۔ نہیں چلتی وہ جب چاہے، جس کے چاہے دن پھیر دے۔

☆☆☆



آٹھویں خوفناک کہانی



آدم خور

ملک صفدر عباس اعوان

جہانیاں سے، اُس شخص کا قصہ حیرت جو آدم خور بن کر زندہ انسان کھاتا تھا

وہ پیدل چلتے چلتے تھک سا گیا تھا۔ پاؤں پتھر جیسے شل سے ہونے لگے اور ساتھ ہی ٹانگوں میں شدید درد ہونے لگا تھا۔ مگر وہ پیروں کو زبردستی دھکیلتے ہی جارہا تھا کہ مجبوراً تھکن کے باعث ایک جگہ کھڑے ہوکر وہ ہانپنے لگا۔ اس نے سامنے نگاہ دوڑائی اردگرد دور دراز تک پھیلا ہوا جنگل، جس میں اُگے ہوئے دیوقامت درخت آسمان سے باتیں کررہے تھے۔ درخت اتنے گھنے تھے کہ دن میں سورج کی روشنی بمشکل ہی زمین پر پڑتی۔ اب تو دن ڈھل کر شام میں تبدیل ہوچکا تھا۔ اس لیے جنگل میں اندھیرا کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ اوپر سے جا بجا اگی خاردار جھاڑیوں میں چلنا دوبھر تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے جنگل میں چلتے ہوئے اس کے کئی بار پاؤں جھاڑیوں میں الجھے تھے۔ نوکیلے کانٹوں نے پاؤں کو کافی حد تک زخمی کردیا تھا۔ اس نے کئی بار مٹی سے بہتے خون کو صاف کیا تھا اور جنگل میں آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ مگر وہ جنگل تھا یا شیطان کی آنت جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ہولناک سنسنان کسی قبرستان کی طرح خاموش جنگل...... جس میں کسی ذی روح کا نام ونشان نہیں تھا۔ رہی سہی کسر آسمان پر سیاہ کالے گرجتے مگر بادلوں کی آواز نے پوری کردی تھی۔ بادلوں کی زوردار گرج اور چمکتی آسمانی بجلی نے جنگل کے ماحول کو اور بھی خوفناک بنادیا تھا۔ یہ ماحول کا اثر تھا، اس کا دل سینے میں پھڑ پھڑانے لگا۔ اسے مزید آگے چلنا تھا مگر اب تھکاوٹ سے، پاؤں کے زخم کی وجہ سے مزید چلنا محال تھا۔ وہ مجبوراً بدن کو سہارا دیے ٹانگوں کو بمشکل گھسیٹتے ہوئے ایک درخت کے بڑے سے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بادلوں کی گرج اور زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ بارش ہونے کے قریب تھی اس کے چہرے پر درد واذیت کے تاثرات اور آنکھوں میں آنسو اچانک ہی امڈ آئے تھے۔

''نوراں کہاں ہے تُو......؟ کہاں گم ہوگئی ہے؟'' وہ بے اختیار بول پڑا۔

''دیکھ تیرا بالا تیرے لیے کتنا پریشان ہے۔ اس جنگل میں تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے، دیکھ تیرے بالے کی کیا حالت ہوگئی ہے۔ نوراں گھر میں بچے تیری راہ تک رہے ہیں۔ تُو نہ ملی تو تیرے بغیر جی نہیں پائیں گے۔ اور میں...... بھی......!!''

اس نے آنکھیں آستین سے صاف کیں۔ اور زور زور سے نوراں...... نوراں...... پکارنے لگا۔ جنگل میں کتنی تیزی سے اس کی آواز گونجتی اتنی ہی تیزی سے غائب بھی ہوجاتی۔ وہ کافی دیر پکارتا رہا۔ پھر تھک کر چپ ہوگیا۔

عجیب بے بسی، بے چارگی کے عالم میں آنسو دوبارہ اس کے چہرے کو بھگونے لگے۔

''نوراں پتا نہیں تُو زندہ ہے بھی یا نہیں۔ کہیں اس ہولناک جنگل نے تجھے نگل ہی نہ لیا ہو۔''

اچانک ہی اس کی اس سوچ نے اس کے دل کو اتھل پتھل کرکے رکھ دیا۔ اس کا جسم کسی خشک تنے کی طرح کانپ سا گیا۔

''نہیں...... مجھے یقین ہے وہ زندہ ہے۔ مجھے ہمت کرنا ہوگی۔ مجھے اُسے ڈھونڈنا ہوگا۔ اور میں اس کو جلد ڈھونڈ لوں گا۔'' وہ درخت کا سہارا لے کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اچانک ہی تیز آسمانی بجلی چمکی پورے جنگل میں روشنی سے پھیل گئی اور ساتھ بارش شروع ہوگئی تھی۔

☆☆☆

اقبال عرف بالا جنگل کے پار مغرب کی طرف بسے ایک چھوٹے سے گاؤں جلال آباد کا رہائشی تھا۔ جو ہنسی خوشی زندگی بسر کررہا تھا۔ گھر میں پیار کرنے والی بیوی تھی، دو چھوٹے معصوم بچے تھے۔ گاؤں میں چند ایکٹر کی زرعی زمین تھی۔ جس کو محنت سے کاشت کرکے ہر موسم میں اچھی فصل لیتا تھا۔ جس سے آمدنی بھی اچھی آجاتی اور گھر کے لیے اناج بھی خاصا بن جاتا۔ زندگی بغیر کسی فکر کے بڑی آرام وسکون سے گزر رہی تھی، کہ اچانک اس کی ہنستی بستی زندگی میں ایسا بھونچال آیا کہ اس کے گھر کا سارا امن وسکون اپنے ساتھ ہی لے اڑا۔

اس کا بڑا لڑکا جو ابھی اسکول جانے کی عمر کا ہی ہوا تھا۔ اچانک بیمار ہوگیا۔ گاؤں کے حکیم سے اس کو دکھا کر دو وقت کی دوائی کھلائی۔ بالے اور اس کی بیوی نوراں کو پکی امید تھی کہ حکیم کی دوائی سے افاقہ ہوجائے گا۔ پھر حکیم کے کہنے کے مطابق بخار معمولی تھا۔ زیادہ پریشانی کی بات نہیں تھی۔ دو دن مزید گزر گئے۔ لیکن مصیبت تھی جو ٹلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ حکیم کی دوائی سے ذرا برابر افاقہ نہ ہوا۔ بخار تھا جو تیز ہوکر سر پر چڑھ گیا تھا کہ اچھا خاصا بولتا چالتا اس لڑکا کیسے چارپائی ہی پکڑ لی تھی۔ چپ ہی سادھ لی



تھی۔ سوکھ کر کانٹا سا ہو گیا تھا۔

پریشانی کے عالم میں بالا گاؤں کے حکیم کے پاس پھر بھاگا۔ حکیم کو بھی تشویش لاحق ہوئی۔ لڑکے کا جسم بخار کی وجہ سے کسی بھٹی کی طرح تپ رہا تھا۔

''دیکھ بالے مجھے یہ معمولی بخار نہیں لگتا۔ ورنہ میری دی ہوئی ایک خوراک سے ہی بخار دور بھاگ جاتا ہے، مسئلہ کوئی اور ہی ہے۔ تُو ایسا کر اس کو شہر کے وڈے ہسپتال لے جا۔''

''وڈے ہسپتال۔'' حکیم کی بات پر بالا اور پریشان ہو گیا تھا۔ نوراں بھی کم فکر مند نہ تھی۔

''ہاں وقت ضائع نہ کر۔ تیرے لڑکے کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ بڑا وقت لگتا ہے۔ وڈے ہسپتال میں بھی اس کا اچھا علاج ہو سکتا ہے۔''

حکیم کے کہنے پر بالا اسی روز اُسے بیل گاڑی پر لاد کر اپنے لڑکے کو شہر کے ہسپتال لے گیا۔ جہاں تھوڑی بہت تگ و دو کے بعد اسے ہسپتال میں بھی داخل کر دیا گیا۔

چیک اپ کے بعد پتا چلا کہ لڑکے کو ٹائیفائیڈ بخار ہے۔ جو مزید بگڑ گیا ہے۔ جان جانے تک کا خطرہ ہے۔ لڑکے کو ہسپتال میں داخل کراتے ہی علاج شروع ہو گیا۔ حالانکہ سرکاری ہسپتال تھا۔ مگر پھر بھی ہسپتال میں دن بدن مہنگی دوائیاں و علاج کے خرچے بڑھتے جا رہے تھے۔ بالے کے پاس جو بچی کھچی جمع پونجی تھی وہ بھی علاج کی نذر ہو گئی۔

مجبوراً اس کو گاؤں کے زمیندار کے آگے ہاتھ پھیلانے پڑے۔ اس سے کچھ رقم ادھار لے کر وہ دوبارہ شہر روانہ ہو گیا۔ لیکن یہ رقم بھی کم تھی۔ جب مزید پیسوں کی ضرورت آن پڑی تو وہ دوبارہ زمیندار کے در پر گیا۔ تھوڑی تھوڑی رقم ہر بار لے کر وہ پورے ساٹھ ہزار کا مقروض ہو گیا تھا۔ اگرچہ لڑکے کے علاج پر رقم زیادہ لگ گئی تھی۔ مگر اس کو صرف اور صرف اپنے لڑکے کی فکر تھی کہ وہ جلد چنگا بھلا ہو جائے۔ نوراں بھی دن رات دعائیں کرتی۔

یہ ان دونوں کی دعاؤں کا اثر تھا کہ ہسپتال میں اچھے علاج کی بدولت چند ہفتوں میں ہی وہ تندرست و توانا ہو گیا تھا۔ بیماری دور چلی گئی تھی۔ وہ صحت کی طرف دوبارہ لوٹ آیا تھا۔

دونوں میاں بیوی کی خوشی دیدنی تھی۔ کچھ دن بعد ہی وہ ہسپتال سے اپنے لڑکے کو گھر واپس لے آئے۔ کچھ دن گزرنے کے بعد زمیندار اپنے پیسوں کا تقاضا کرنے لگا۔ بالے کے پاس تو دینے کے لیے پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ بالے نے خاصی منت سماجت کی کہ اب کی فصل تک ایک ایک پائی اس کو لوٹا دے گا۔ مگر زمیندار بضد رہا کہ زیادہ نہیں تو صرف ایک ہفتے کے اندر اس کی رقم لوٹا دے۔ ورنہ وہ زبردستی اس کی زمین اور اس کی فصل پر قبضہ کر لے گا۔ زمیندار کی دھمکی سے بالے کی راتوں کی نیند تک اڑ گئی۔

آخر کافی سمجھ بوجھ کے بعد اپنی بیوی نوراں کے کہنے پر بیلوں کی جوڑی کو سستے داموں ہی بیچ کر اس نے زمیندار کے سارے پیسے چکا دیے۔ مگر زندگی میں آزمائش کی گھڑی ابھی ٹلی نہیں تھی۔ بلکہ اگلی مصیبت تیار کھڑی تھی۔ پریشانی نے اس کے گھر کا راستہ ہی پکڑ لیا تھا۔

گھر میں اناج پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ پھر بیلوں کی جوڑی بیچنے کے بعد زمین پر کاشت کرنے کی رہی سہی امید بھی ختم ہو چکی تھی۔ پھر فصل کاشت کرنے کے لئے تھوڑے بہت پیسوں کی ضرورت تو تھی ہی۔ وہ تو بالکل ہی کنگال ہو چکا تھا۔ دن گزرنے لگے اور گندم کی بحالی کا وقت جاتا رہا۔ خالی پڑی زمین اس کا منہ چڑانے لگی۔ دو وقت کی روٹی بھی مشکل ہو گئی تھی۔

اس دن وہ دن چڑھے اٹھا۔ تو گھر میں نوراں کو نا پایا۔ شاید پڑوس میں گئی ہو...... اس نے خیال ظاہر کیا۔

نلکے پر منہ ہاتھ دھو کر اس نے ایسے ہی اپنے بڑے لڑکے سے پوچھ لیا۔

''طفیلے تیری ماں نظر نہیں آ رہی۔ کہاں گئی ہے؟''

''ابا ماں تو خالہ کو ملنے دوسرے گاؤں گئی ہوئی ہے۔ صبح ہوتے ہی نکل گئی تھی، کہتی تھی تیری خالہ سے کچھ پیسے لینے ہیں۔ گھنٹے دو گھنٹے میں واپس آ جاؤں گی۔ جنگل کے راستے سے جانے کا بول گئی ہے۔ ابا دوجا رستہ تو خراب ہے ناں۔''

''دوسرے گاؤں......'' بالا ایک دم پریشان سا ہو کر چارپائی پر جا بیٹھا۔ بات ہی پریشانی کی تھی۔

وہ جنگل آسیب زدہ تھا۔ یہ سبھی گاؤں کے افراد جانتے تھے۔ کوئی بندہ اس جنگل میں جاتا تو شاذ و نادر ہی واپس آتا۔ یہ سلسلہ کئی سالوں سے چل رہا تھا۔ کسی کو بھی گم شدہ افراد کے بارے میں کوئی خبر اب تک نہ ملی تھی کہ بندے آخر کار اچانک غائب کہاں ہو جاتے ہیں۔ پولیس بھی اس سلسلہ میں بُری طرح ناکام رہی تھی۔

گاؤں کے بوڑھوں کے مطابق جنگل میں آسیب پریت ہیں۔ یہ بات بھی حقیقت معلوم ہوتی تھی۔ مگر بدقسمتی کہ دوسرے گاؤں میں جانے کا شارٹ کٹ راستہ جنگل میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ اور دوسرا راستہ جنگل کے باہر سے ہو کر گزرتا تھا۔ وہ بہت لمبا راستہ تھا جو بنا کسی سواری کے عبور کرنا ممکن نہ تھا۔ پھر اس راستے میں نہر بھی آتی تھی۔ پے در پے انسانوں کے غائب ہونے پر گاؤں کے لوگوں نے اس راستے کو اپنا لیا تھا۔ مگر نہر میں باڑ آنے کی وجہ سے یہ رستہ دو ہفتوں سے بند تھا۔

نوراں کے جنگل جانے کا سن کر ہی بالا حواس باختہ ہو گیا تھا۔ وہ نوراں کے صحیح سلامت آنے کی دعائیں مانگتا دوپہر تک اس کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر نوراں واپس نہ آئی۔ بالے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بچوں کو اس نے رات کی بچی کھچی روٹی کھلائی۔ گھر میں آٹا نہیں تھا۔ خود اس نے کچھ نہیں کھایا۔ بچوں کو پاس پڑوس میں چھوڑ کر خود نوراں کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا تھا۔ مگر دوپہر سے شام اور اب رات ہو چلی تھی۔ جنگل میں نوراں کا کوئی نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پہلے ہی پتا کروا لیا تھا۔ نوراں دوسرے گاؤں پہنچ ہی نہیں پائی تھی۔

بارش نے اچانک ہی زور پکڑ لیا تھا۔ گھنے درخت کے نیچے کھڑے ہونے کے باوجود بھی اس کا بدن بھیگنے لگا تھا۔ اسے لگا کہ وہ مزید یہاں کھڑا رہا تو اس سردی میں اس طرح بارش میں بھیگ کر لازماً بیمار ہو جائے گا۔ اس نے ہر طرف ہی نگاہ دوڑائی۔ ہر طرف ہی اندھیرا پھیلا جس میں کچھ ہی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ آخر کرے تو کیا کرے۔ آسمان سے پانی گرنے کے ساتھ تیز ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ جس نے سردی میں مزید اضافہ کر دیا تھا کہ اچانک گرجتے بادلوں کے ساتھ آسمانی بجلی اتنی زور سے چمکی کہ جنگل میں ہر طرف روشنی سی بکھیر گئی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب بالے نے مشرق کی سمت درختوں کے گھنے جھنڈ کے پار کچھ مسافت پر پرانی سا قلعہ نما عمارت دیکھی۔ جس کو دیکھ کر بالے کو راحت کا احساس ہوا۔

اس طوفان سے بچنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ کسی طرح اس کھنڈر نما عمارت تک جا پہنچے۔ وہ بنا کوئی وقت ضائع کیے گھنے درختوں سے ہوتا ہوا وہاں جا پہنچا۔ وہ بہت پرانی خستہ سی پکی اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت تھی۔ جس کا دروازہ لکڑی کا تھا۔ وہ ٹوٹا پھوٹا دیمک زدہ دروازہ جس میں مکڑی نے جگہ جگہ جالے سے بن رکھے تھے۔ بالے نے اندھیرے میں دروازے کو ٹٹولا۔ وہ بند تھا۔ اگرچہ وہیں کھڑے ہوئے بھی وہ کافی حد تک بارش سے بچا ہوا تھا۔ مگر سردی تھی جو مسلسل بڑھ رہی تھی۔ اس کے جسم پر کپکپی سی طاری ہو گئی تھی۔ یہاں باہر یونہی سردی میں کھڑے رہنا کسی بے وقوفی سے کم نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ لکڑی کا دروازہ آخر کس طرح کھولے۔ دفعتاً اس پرانے قلعے کے اندر آگ کا الاؤ سا روشن ہوا۔ جس کی روشنی اس لکڑی کے ٹوٹے ہوئے دروازے سے باہر آنے لگی۔

اس سنسان جنگل میں جہاں کسی ذی روح کا نام و نشان نہیں تھا۔ پھر یہ اندر اچانک جلی آگ......

بالے کی روح تک لرز گئی تھی۔ زبان تالو سے جا لگی۔ سردی ہونے کے باوجود بھی اس کا سارا جسم پسینے سے تر ہو گیا۔ اسے گاؤں والوں کی باتیں یاد آنے لگیں۔

جنگل میں بھوت پریت، آسیب کی موجودگی جو جنگل میں داخل ہوئے کسی بھی انسان کو مار ڈالتے تھے کہ انسانوں کی ہڈیاں تک نہیں ملتی تھیں۔ بالے کو لگا آج وہ نہیں بچے گا۔ اچانک اس کو اندر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ کسی انسان کے قدموں کی آہٹ اور جلتی آگ کے ساتھ ہی کسی کے کھانسنے کی آواز نے اسے یہ بھی باور کرا دیا کہ اندر عمارت میں کوئی نہ کوئی ہے۔ آسیب بھوت پریت نہیں۔ بلکہ کوئی انسان۔ جو بُری طرح کھانس رہا تھا۔ لیکن کون؟؟

بالا کشش وپنج میں ہی کھڑا رہ گیا۔ شاید کوئی مسافر ہو۔ جو اس طرح طوفان سے بچنے کے لیے اس عمارت کی طرف آ گیا ہو۔ اور سردی کی وجہ سے آگ جلائی ہو۔ اچانک بالے کے ذہن میں اس کی آتی سوچ نے اس کا سارا ہی خوف ہوا کر دیا۔ میں تو ایسے ہی خوف زدہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔

اندر ہونا ہو کوئی انسان ہے مجھے بھی اندر جانا چاہیے۔ اس طوفان میں مزید باہر ٹھہرنا کافی اذیت ناک ہے۔ شاید وہ انسان نوراں کو ڈھونڈنے میں اس کی مدد کرے۔

کیا پتا پھر اس مسافر نے میری نوراں کو بھی اس جنگل میں دیکھا ہو۔ اس مسافر سے نوراں کے متعلق کوئی نہ کوئی سراغ مل ہی جائے گا۔ بالے کے دل کو امید سی بندھ گئی۔ وہ دوبارہ دروازے کو ٹٹول کر پھر دباؤ دے کر اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ دروازہ لازماً کھلے گا۔ اندر والا انسان بھی یہیں سے داخل ہوا ہوگا۔ بالے نے پہلے ہی جانچ لیا تھا کہ اس عمارت کا اکلوتا بیرونی دروازہ یہی تھا۔

بالے کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ تھوڑی سی کوشش سے ہی دروازہ بنا کسی آواز کے کھل گیا۔ وہ جلدی سے اندر داخل ہو گیا۔ اس کو سامنے ہی آگ کا الاؤ جلتا نظر آیا۔ ساتھ ہی الاؤ کے کوئی انسان......

بالے کو پہلی ہی نظر میں لگا کہ وہ کوئی اس کے اندازے کے مطابق مسافر ہی ہے۔ پر اس کے ہاتھ میں کوئی شے تھی۔ جس کو وہ آگ پر سینک رہا تھا۔ آگے بڑھ کے بالے کے قدم اچانک رک گئے۔ آگ کی دھیمی دھیمی روشنی عمارت میں پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ بھی نظر آنا مشکل تھا۔ بالے نے غور کیا۔ تو وہیں کھڑے ہوئے اس کے قدم جم سے گئے۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ اس انسان کے ہاتھ میں کھوپڑی تھی۔ انسانی کھوپڑی۔

بالے کو جاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ پھر اس کی نظروں کے سامنے ہی اس انسان نے کھوپڑی کو زمین پر رکھا اور اس میں ہاتھ ڈال کر چٹر چٹر کر کے کوئی شے کھانے لگا۔ یہ منظر اتنا کریہہ تھا کہ بالے کو لگا اگر وہ کچھ دیر مزید اس کو دیکھتا رہ گیا تو اس کو قے آ جائے گی۔ بنا کوئی آواز کیے وہ ساکت، دم سادھے وہ اپنے پاؤں پر ٹکا رہا۔ مگر خوف سے اس کا دل اچھل اچھل کر حلق میں آ رہا تھا۔ اس کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ بدروح ہے یا انسان کے روپ میں درندہ صفت جانور...... جو اس کی موجودگی سے بے خبر انسانی کھوپڑی کا مغز کھانے میں مصروف تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ کریہہ انسان آگ کے قریب ہی لیٹ گیا اور تھوڑی دیر بعد ڈراؤنے خراٹے لینے لگا۔ یہ سارا منظر بالے کے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس لیے بالے کے ایک لمحے میں سوچا کہ وہ فوراً ہی یہاں سے بھاگ جائے۔ مگر دماغ اس بات کی نفی کر رہا تھا۔ وہ عجیب کشش وپنج میں مبتلا تھا۔ مگر جلد ہی اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہاں سے کسی بزدل کی طرح ڈر کے نہیں بھاگے گا۔ بلکہ یہاں رہ کر اس ساری حقیقت کو جانچنے کی کوشش کرے گا۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ یہ کون ہے؟ اور آخر اس طرح کا قبیح فعل کرنے کا آخر اس کا مقصد کیا ہے؟

وہ احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا اس سوئے ہوئے وحشی درندے انسان کے قریب آ گیا۔ اور اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ وہ کوئی انسان تھا مگر انسان کہلانے کے لائق نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو بالا بھی دوبارہ ڈر گیا تھا۔ انتہائی بدصورت کالی سیاہ صورت سر اور داڑھی کے لمبے اور خون اور مٹی سے اٹے گندے بال، اس کے کپڑے بھی انتہائی گندے، میلے کچیلے، خون سے بھرے ہوئے تھے۔

اس کے وجود سے بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ گوشت اور خون کی ملی جلی بو...... جس سے بالے کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ بالے نے جلدی سے اپنے ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔

بنا ڈرے، غصے میں بالے نے ایک زوردار لات اس کے سینے پر دے ماری۔

وہ کریہہ مکروہ صورت انسان ایک زوردار چیخ کے ساتھ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ چند لمحے اپنے سامنے کھڑے ہوئے بندے کو دیکھتا رہا۔

''کون......کون...... ہے تُو؟''

وہ کریہہ انسان شدید بوکھلاہٹ، گھبراہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ بالے نے صاف محسوس کیا کہ اس خوف ناک نظر آنے والے درندے کی آواز میں خود خوف کی جھلک تھی۔ شاید وہ اپنے سامنے کسی دوسرے انسان کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا تھا۔

''تُو...... تُو...... کون ہے؟ آج تک اس کھنڈر میں کوئی زندہ انسان نہیں آیا۔ تُو...... تُو...... یہاں کیسے آ گیا۔'' وہ گندی مکروہ آواز میں چیختے ہوئے بولا۔

''پہلے تُو بتا غلیظ انسان...... یہ سب کیا ہے؟'' بالا اسی پر چڑھ دوڑا۔ ''میں نے تجھ کو کوئی مسافر جانا اور تجھ سے ملنے اس عمارت کے اندر چلا آیا۔ مگر...... تُو۔'' بالے نے ایک اور زوردار لات اس کو پھر سے دے ماری۔ بالے کو وحشت نفرت ہو رہی تھی اس کے بدبودار جسم اور اس کی اِدھ کھائی انسانی کھوپڑی سے۔ جس کو دیکھتے ہی بالے کو ابکائی آنے لگی تھی۔

''میں نے ابھی دیکھا ہے تُو نے انسانی کھوپڑی کھائی ہے۔ اوہ۔ میرے خدا۔'' الفاظ تھے جیسے بالا خود ہی بول کر کانپ اٹھا تھا۔

''تُو...... تُو نے ایسا کیوں کیا؟...... جلدی بول نہیں تو یہ ڈنڈا مار مار کر میں تیری جان لے لوں گا۔''

''نہیں...... نہیں...... مجھ پر رحم کر۔''

''بس اب اپنی زبان کھول ورنہ یہ ڈنڈا تیرا یہ مکروہ جسم کھول دے گا۔''

بالے نے ہوا میں پھر ڈنڈا لہرایا۔ تو اس کی زبان خود بخود چلنے لگی۔

''مجھے شروع سے ہی انسانی خون میں کشش محسوس ہوتی تھی۔ ایک عجیب قسم کا احساس جو انسانی خون کو دیکھتے ہی میرے جسم وجاں میں سرایت کرنے لگا۔ میں بے چین سا ہو جاتا تھا۔

میں یہاں سے مشرق کی طرف تقریباً آٹھ گاؤں چھوڑ کر آگے ایک پیر والا نامی گاؤں میں رہتا تھا۔ میرا تعلق عیسائی گھرانے سے تھا۔ میرا باپ سردار بوٹا مسیح گاؤں کا جانا مانا حکیم تھا۔''

''ایک منٹ...... ایک منٹ۔'' بالے نے اس کو ٹوکا۔

''حکیم سردار بوٹا مسیح۔ کیا واقعی؟'' سردار بوٹا بہت بڑا حکیم تھا۔ دنیا جانتی تھی اسے۔ بڑا اثر تھا اس کے ہاتھ میں۔ جو اس کے گاؤں کا حکیم تھا۔ یہ بات بالا بخوبی جانتا تھا۔

''ہاں...... وہی...... بڑی شفا تھی اس کے ہاتھ میں۔ بیمار کو ہاتھ لگاتے تو وہ اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ میرے باپ کی اتنی شہرت تھی کہ دور دراز گاؤں کے لوگ بھی شفا حاصل کرنے اس کے پاس آتے، معمولی بخار سے لے کر کٹے پھٹے بڑے بڑے جسم کے گھاؤ کو اپنے علاج کے ذریعے منٹوں میں ٹھیک کر دیتا تھا۔

میں اکثر دیکھتا۔ کئی زخموں سے چور مریض اس کے پاس آتے۔ جس کے بدن سے بے تحاشا خون بہہ رہا ہوتا۔ لال لال گاڑا خون جسے چھونے کو جی کرتا۔ زبان پر کھجلی ہوتی کہ چکھ کر دیکھو یہ ہوتا کیسا ہے۔ مگر اپنے باپ کے ڈر سے میں یہ سب کر نہ پاتا۔

میرے ساتھ والے بچے اکثر ڈر جاتے تھے۔ مگر میں واحد تھا، جس کو خون دیکھ کر عجیب راحت خوشی کا احساس ہوتا۔ مگر یہ حسرت عارضی ہی ثابت ہوتی۔ جب میرا باپ زخموں پر دوائی لگا کر پٹی کر دیتا۔ خون نکلنا بند ہو جاتا۔ اور خون کو چھونے اور چکھنے کی حسرت حسرت ہی رہ جاتی۔

مگر گھر میں جب بھی کسی مہمان کے آنے پر کوئی مرغی ذبح ہوتی۔ تو چوری سے اس کے خون کو چکھ کر لازماً دیکھتا۔ کبھی کبھی تو مرغی کا کچا گوشت بھی

چبا جاتا۔ مگر دل کو تسکین نہ ملتی۔ میں پیاسا کا پیاسا ہی رہتا۔

ایک بار میری ماں نے یہ سب دیکھا تو مجھے مارا تھا اور مجھے ایسے کام سے باز رہنے کا کہا۔ مگر میں کب ماننے والا تھا۔ مگر بات اس سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔

وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ اپنے بچپن کا دن...... بھری دوپہر کا وقت تھا۔ جب گھر کے پاس کھلے میدان میں بڑے سے بیری کے درخت کے پاس میں دوستوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیل رہا تھا۔ یہ میرا روز کا ہی معمول تھا۔ مگر اس دن میرے ساتھ غیر معمولی واقعہ ہوگیا۔ ایک لڑکا بنا کوئی بات ہوئے مجھ سے لڑ پڑا۔ وہ مجھے خوامخواہ ہی مارنے لگا۔ میں نے غصے میں سیخ پا ہوکر اس کے بازو پر زور سے کاٹ ڈالا تھا۔ جس سے اس کے بازو سے خون بہنے لگا تھا۔ میرے دانتوں میں بھی کچھ خون رہ گیا۔ جس کی وجہ سے پہلی بار میں نے انسانی خون کا ذائقہ چکھا۔ انوکھا۔ دلفریب نمکین ذائقہ۔ جو رگ و جان میں اتر گیا۔

ایسے لگا جیسے آج صدیوں کی پیاس سیراب ہوتی ہو۔

وہ لڑکا روتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔ اس کی ماں نے آکر شور ڈالا۔ مگر بات آئی گئی ہوگئی۔ دو تین دن گزرے کہ میرے دل میں بے چینی بے قراری سی اُٹھنے لگی کہ دوبارہ انسانی خون چکھوں۔ کافی دن میں اس مسئلے کا حل سوچتا رہا۔

پھر ایک دن میں نے خود ہی ایسا موقع تاڑ لیا۔ میں نے خود ہی جھوٹ موٹ کی لڑائی کرکے دوبارہ ایک دوسرے لڑکے کو بری طرح کاٹ لیا۔ کافی دیر اُس کی کلائی کو کاٹے رکھا۔ اور کلائی سے نکلتے خون کو چوستا رہا۔ میں اس کو چھوڑنے والا نہیں تھا۔ مگر درد سے چلاتے ہوئے لڑکے نے بڑی مشکل سے خود کو مجھ سے چھڑایا۔ ان میں سے ایک لڑکے نے میرے گھر جاکر میری شکایت لگادی۔ دوبارہ ویسی حرکت کرنے پر میرے باپ نے مجھے بہت مارا تھا اور میرا دوستوں سے کھیلنا بند کردیا۔

وقت گزرتا گزر گیا۔ ساتھ ہی میرا بچپن بھی گزر گیا۔ پادری سے مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے میں چرچ جانے لگا تھا۔ اور ساتھ چرچ کی صفائی ستھرائی پر مامور ہوگیا۔ تمام دن وہیں گزار کر شام ڈھلے ہی واپس آتا تھا۔ صبح شام یوں ہی جانے لگے۔ مگر میرے دل میں انسانی خون کی جو تشنگی، پیاس تھی، وہ جوں کی توں برقرار تھی۔ مگر اپنے باپ کے ڈر کی وجہ سے مجبور تھا۔ اپنے اردگرد۔۔۔۔ بھرے انسانوں کو دیکھتا۔ تو دل میں خواہش ہوتی کہ ان کے جسموں کو کاٹوں، ان کے خون سے اپنی برسوں کی پیاس کو سیراب کروں۔ یہ خواہش دن بدن بڑھتی ہی جارہی تھی کہ ایک دن وہ ہوا جو شاید نہیں ہونا چاہیے تھا۔

اس دن میں چرچ نہیں جاسکا تھا۔ گرمیوں کے سخت دن تھے۔ سورج آگ برسا رہا تھا۔ میں گھر میں تھا۔ دوپہر ہونے کے قریب تھی۔ کہ ایک عورت روتے ہوئے اپنے ہاتھوں میں آٹھ سال کے بچے کو اٹھائے ہوئے آن کھڑی ہوئی۔ بچے کا ہاتھ گھاس کاٹنے والی درانتی سے بُری طرح کٹ گیا تھا۔ عورت مسلسل روتے ہوئے اپنے بچے کو ہوش میں لانے کی کوشش کررہی تھی۔ بچہ بے ہوش تھا اور خون اس کے ہاتھ سے بُری طرح بہہ رہا تھا۔

انسانی خون کو دیکھ کر میری حالت پھر سے عجیب سی ہونے لگی۔ انسانی خون کی شدید پیاس کے باعث میری زبان خشک سی ہونے لگی۔ پیاس بجھانے کا یہ انمول موقع تھا۔ میرا باپ گھر نہیں تھا۔ وہ عورت بچے کو چارپائی پر لٹا کر میرے باپ کو باہر سے بلانے کے لیے بھاگی۔ میں چلتا ہوا بچے کے قریب آگیا۔ میں پہلے گرتا گاڑھا لال خون جس کو دیکھ کر بدن میں عجیب سی سرشاری بے قراری جاگ اٹھی تھی۔ عورت کے جلد آنے کا امکان نہیں تھا۔ بچہ ہنوز بے ہوش تھا۔ بے تابی سے میں نے بنا کوئی آس پاس کا خیال کیے اس کے زخم پر منہ رکھا اور خون چوسنے لگا۔ خون منہ میں جاتے ہی بدن میں انوکھی لذت کا احساس ہوا۔ دل کررہا تھا کہ اس بچے کا سارا کا سارا خون پی جاؤں۔ بُرا تب ہوا جب وہ عورت میرے باپ کو لیے

وہاں اچانک ہی آن پہنچی۔ ان دونوں کے لیے یہ منظر بڑا ہی جان لیوا تھا کہ میں انسان کا خون پی رہا تھا۔ عورت نے تو چیختے چلاتے باہر کی طرف دوڑ لگادی۔ میرے باپ کو چند منٹ کو سکتہ سا ہوگیا۔ پھر اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنے چھڑی سے میری درگت بنادی۔ وہ خود مجھے مارتے مارتے تھک گئے تھے۔ میری ماں شدید گھبرائی پریشان تھی۔ اسے شاید خبر نہ تھی کہ مرغی کا کچا گوشت کھانے والا اس کا بیٹا انسانی خون بھی پینے لگا ہے۔ مارنے کے بعد شدید غصے کی حالت میں ابا نے مجھے جانوروں کے بھوسے والے کمرے میں بند کردیا۔

پورے گاؤں میں یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ حکیم سردار کا اکلوتا بیٹا وحشی پاگل ہوگیا ہے۔ جانور بن چکا ہے۔

دو دن تک میں بھوکا پیاسا بھوسے والے کمرے میں پڑا رہا۔ میرے باپ نے مجھے کھانے کے لیے کوئی بھی چیز دینے سے سختی سے منع کیا ہوا تھا۔ میری ماں بھی مجبور تھی۔ میرے باپ کے آگے نہیں بول سکتی تھی۔

نجانے اور کتنے دن میرا باپ یونہی مجھے اس بھوسے والے کمرے میں بند رکھتا کہ آخرکار انوری کو اس بات کی خبر ہوئی تو وہ دوڑی دوڑی میرے گھر آئی۔ انوری میری ہونے والی منگیتر تھی۔ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس نے کسی طرح میرے باپ کو راضی کرکے بھوسے والے کمرے کی چابی لی اور کھانا ساتھ لیے میرے پاس آگئی۔ وہ مجھ سے بہت ناراض تھی۔

''یہ کیا حرکتیں کرنے لگا ہے۔ چنگا بھلا تھا۔ پاگل ہوگیا۔ تجھے پتا ہے سارے گاؤں والے تیرے متعلق کیا کیا باتیں کررہے ہیں۔ مجھے بھی تجھ سے ڈر لگنے لگا ہے۔ جب سے تیرے بارے میں یہ خبر سنی ہے۔''

''پتا نہیں انوری مجھے کیا ہوگیا تھا۔ مجھے خود پتا نہیں۔ پر تیری قسم اب ایسی حرکت کبھی نہیں کروں گا۔ تُو بس ابا سے بات کرکے مجھے اس جہنم سے نکال دے۔ میرا یہاں دم گھٹتا ہے۔'' میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔

''ہاں...... بات کرتی ہوں چاچے سے۔ تیری وجہ سے چاچی بھی بہت پریشان ہے۔ پر تجھے بھی وعدہ کرنا ہوگا۔ ایسی جانوروں والی حرکت پھر کبھی نہیں کرے گا۔ تجھے اپنا نہیں پر میرا خیال کرنا چاہیے تھا۔ میرے ماں باپ بھی شدید صدمے کی حالت میں ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ تیرے ساتھ میرا رشتہ ہی نہ توڑ دیں۔'' مگر میں خاموش اس طرف دیکھتا رہا۔

''اچھا چل کھانا کھا، مجھے پتا ہے تُو دو دن سے بھوکا ہے۔'' انوری نے روٹی اور ساتھ سبزی کا بنا ہوا سالن میری طرف بڑھایا۔ میری نظر کھانے سے ہوتی ہوئی اس کے آدھے آستین والے بازو پر جاٹکی۔ نرم۔ گداز گوشت خون سے بھرا اس کا بازو۔

دل میں پھر وہی عجیب سی بے چینی اور پیاس ابھرنے لگی۔ میں اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ انوری بنا اس بات کا دھیان کیے اپنی ہی باتوں میں مگن تھی۔ مگر میری نگاہ اس کے گداز بازو پر جو ٹکی تو پھر ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اندر کی بھوک جاگ اٹھی تھی۔ آنکھوں میں خون کا خمار سا چڑھنے لگا۔ میں نے بنا کچھ اور جانے جلدی سے اس کا بازو پکڑا اور سختی سے اپنے دانت اس کے بازو کے گوشت میں گاڑ دیے۔ انوری کے منہ سے دلخراش چیخ نکلی۔ درد اور خوف کے مارے کانپنے لگی۔ اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی چیخیں بلند سے بلند ہوتی جارہی تھیں۔ میں نے اپنے دانتوں کی سخت پکڑ سے اس کے بازو کا گوشت تک ادھیڑ دیا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو مجھ سے چھڑایا اور تیزی سے باہر کی طرف بھاگی۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ اب میرا باپ میری اس درندگی پر مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ مجھے جان سے مار دے گا۔ وہ مجھے پہلے ہی دھمکی دے چکا تھا۔ باپ کے آنے سے پہلے ہی میں تیزی سے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ میں بھاگتا چلا گیا نجانے کتنی دور...... کہ گاؤں بھی

پیچھے چھوٹ گیا۔ شام سے رات ہوگئی۔ مگر میں بھاگتا ہی رہا کہ بھاگتے بھاگتے کسی شے سے اتنی زور سے ٹکرا کر اوندھے منہ زمین پر جا گرا۔ سر پر چوٹ لگی اور میں ہوش کی وادی سے دور چلا گیا۔

سورج کی تیز جلا دینے والی تپش سے میری آنکھ کھلی۔ میں نے اردگرد دیکھا کہ میں ہوں کہاں؟ پر انکشاف ہوا کہ میں کسی جنگل میں ہوں۔ بہت بڑے گھنے سنسان جنگل میں جہاں میرے علاوہ دوسرے کسی انسان کا نام و نشان تک نہ تھا۔ بھوک سے میرا برا حال تھا۔ میں ایسی ہی جنگل میں گھومتا رہا۔ مگر کھانے کو کوئی شے بھی نہ ملی۔ ایک دن ایسے ہی مزید گزر گیا۔ پر میں جنگل میں ہی ڈیرا ڈال کر بیٹھ گیا۔ جاتا تو آخر کہاں جاتا۔ اپنے گاؤں کیا کسی بھی گاؤں میں جانے سے پہلے ڈرتا تھا کہ کہیں کوئی میرے باپ کو میری اطلاع نہ دے ڈالے۔

☆☆☆

اس شام میں نے جنگل کی ایک کچی سڑک جو جنگل سے ہو کر گزرتی تھی۔ اس پر تین عورتوں کو آتے ہوئے دیکھا۔ ان کے ساتھ چھوٹا سا لڑکا بھی تھا۔ عورتیں چلتی ہوئی آپس میں باتوں میں مگن تھیں۔ وہ لڑکا سڑک پر اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا کہ بے دھیانی میں اس کچی سڑک کے پاس بڑے سے پانی سے بھرے ہوئے گڑھے میں جا گرا۔ باتوں میں مشغول عورتوں کو کافی دور جا کر احساس ہوا کہ ان کے ساتھ لڑکا نہیں ہے۔ وہ واپس لڑکے کو ڈھونڈنے کے لیے دوڑیں کہ ان میں ایک کی نگاہ گڑھے پر جا پڑی۔ لیکن کافی دیر ہو چکی تھی۔ لڑکا گندے پانی میں ڈوب کر جان دے چکا تھا۔ وہ عورتیں روتی پیٹتی واپس مڑ گئیں۔ لاش کو دیکھ ہی مجھے بھوک کا احساس مزید ہونے لگا۔ میں نے جلدی سے اور بڑی مشکل سے گڑھے میں سے اس لڑکے کی لاش نکالی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ عورتیں اور بندوں کو لے کر یہاں دوبارہ نہ پہنچ جائیں۔ لڑکے کی لاش اٹھائے تیزی سے بھاگتا ہوا گھنے جنگل کی طرف آ گیا۔ میری شلوار میں تیز دھار چاقو پہلے ہی اڑسا ہوا تھا۔ اس چاقو کی تیز دھار سے میں نے اس کی گردن کاٹ ڈالی۔ گردن سے خون جاری ہوا تو میں غٹاغٹ خون پینے لگا۔ چاقو سے اس کا سینہ چاک کر ڈالا۔ دل، انتڑیاں سب باہر نکال لیں۔ چاقو سے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے پاس ہی خشک پتے اکٹھے کیے اور دو پتھروں کی مدد سے آگ جلا کر ان ٹکڑوں کو بھون کر کھایا۔

ساری بھوک پل بھر میں فنا ہو گئی تھی۔ احتیاط سے کام لیتے ہوئے باقی ماندہ لاش کو میں نے ویسا گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔ رہنے کا مسئلہ ہنوز تھا۔ جنگل میں گھومتے پھرتے ہوئے یہ قلعہ نما عمارات نظر آئی۔ تو رہنے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

☆☆☆

ایک ہفتے کے بعد ہی پھر میری بھوک جاگ اٹھی۔ سہ پہر کو میں اس کھنڈر سے باہر نکلا تو جنگل میں گھومتے ہوئے شومئی قسمت اسی کچی سڑک پر ایک بوڑھے آدمی اور ایک جوان لڑکی کو آتے ہوئے دیکھا۔ میں نے وہیں کھڑے ہوئے اندازہ لگا لیا کہ یہ جنگل میں کچی سڑک ایک راستہ ہے جو کافی گاؤں کو یہاں سے ملاتا ہے۔ شکار لازماً یہاں سے گزرتا تھا۔ بس مجھے گھات لگائے صحیح موقع کا انتظار کرنا تھا۔ شکار رات تو خود چل کر میرے پاس آ رہا تھا۔ میں درخت کی اوٹ لے کر چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ جب وہ بوڑھا آدمی اور وہ لڑکی میرے پاس سے گزرے تو میں اچانک ان کے سامنے آ گیا۔ میری گندی حالت اور میرے کپڑوں پر خون کو دیکھ کر وہ دونوں شدید ڈر گئے۔ پہلے پہل تو وہ کچھ نہ سمجھے۔ میں ان کو ڈرانے کے لئے زور زور سے چلانے لگا تو وہ حواس باختہ ہو کر واپس پیچھے کی طرف بھاگے۔ وہ بوڑھا کہاں بھاگ سکتا تھا۔ تھوڑی دور بھاگ کر بری طرح سے ہانپنے لگا اور زمین پر جا گرا۔ لڑکی کو میں نے جا لیا۔ وہ شدید گھبرائی ہوئی تھی۔ اور زور زور سے چلانے لگی تھی۔ میں نے زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ زمین پر جا پڑی۔ وہ برابر چیخ رہی تھی۔ میں نے زمین پر بڑا ایک وزنی پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس لڑکی کے منہ سے ہولناک چیخ نکلی اور تڑپ کر ساکت

ہو گئی۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ بھیجا باہر نکل آیا تھا۔ مجھے پتا چل گیا تھا کہ یہ کچی سڑک آنے جانے کا راستہ ہے۔ کوئی بندہ بھی عین موقع پر یہاں پہنچ سکتا تھا۔ میں نے بنا کوئی دیر کیے لڑکی کو بالوں سے گھسیٹتے ہوئے اس بوڑھے کے پاس آیا۔ دیکھا تو بوڑھا بھی دم توڑ چکا تھا۔ شاید وہ لڑکی کی عبرت ناک موت برداشت نہیں کر پایا تھا۔ بوڑھے کو بھی ساتھ کھینچتے ہوئے اس کھنڈر تک لے آیا۔

بوڑھے کو پرانی رسی سے باندھ کر اس برگد کی مضبوط شاخ پر الٹا لٹکا دیا۔ بوڑھے کی گردن چاقو کے ایک وار سے کاٹ ڈالی۔ شہ رگ کاٹتے ہی خون بہنے لگا۔ تو وہاں پڑے ہوئے ایک مٹی کے گھڑے کو نیچے رکھ دیا۔ خون اس میں جمع ہونے لگا۔ لڑکی کی بھی گردن کاٹ کر علیحدہ کی۔ بہتے خون کو جی بھر کر پی کر اس کے جسم کی کھال اتارنے لگ گیا۔ جسم کے تمام حصوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا تھا۔

اس طرح مجھے جنگل میں آئے کتنے ہی ماہ و سال گزر گئے۔ ہر پانچویں ساتویں دن اس طرح شکار کرتا اور اس طرح اذیت سے مار کر اس کے خون اور گوشت سے لطف اندوز ہوتا۔ مگر آہستہ آہستہ مجھے شکار ملنا بند ہو گیا۔ لوگ جیسے تیزی سے غائب ہو رہے تھے۔ سبھی گاؤں والوں کو اس بات کا اندازہ تو ہونے ہی لگا تھا کہ جنگل میں ضرور کوئی مسئلہ ہے۔ پھر گاؤں کے لوگ قدرے وہمی بھی تھے۔ مجھے بھی کسی سے اڑتی اڑتی خبر ملی جو میں نے ایک دفعہ ایک عورت کو مارتے ہوئے اس کے منہ سے سنی تھی کہ گاؤں والے جنگل میں بھوت آسیب کسی بدروح کی موجودگی بتا رہے ہیں۔ اور اس وجہ سے گاؤں کے سبھی لوگوں نے آہستہ آہستہ کر کے اس جنگل کے راستے سے گزرنا بند ہی کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ انھوں نے جنگل کے پار والا راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔ جہاں سے نہر جاتی ہے۔ یہ میرے لیے مسئلہ تھا۔ مجھے ایک ایک ماہ شکار نہ ملا۔ بچے کھچے گوشت اور خون پر گزارا کرنے لگا۔ پھر میں نے اس کا حل بھی سوچ لیا۔ کئی راتوں کی محنت کے بعد میں نے نہر کے کچے کنارے میں بڑا سا شگاف ڈال دیا۔ نہر سے باڑ کی وجہ سے وہ تمام راستہ پانی سے لبالب بھر گیا۔ میری یہ کوشش کافی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔ مگر تم نجانے کہاں سے یہاں ٹپک گئے۔“

یہ سب سن کر بالے کا منہ دیکھنے کے لائق تھا۔ اس کو اب اندازہ ہوا تھا کہ نزدیک دور سب گاؤں کے افراد اس درندے کے ہاتھوں لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔ بالے کے انگ انگ میں غصے انتقام کی آگ جلنے لگی۔

وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈنڈے سے اس درندہ نما انسان کے جسم پر زور زور سے وار کرنے لگا۔ اس وحشی کی خوفناک دل ہلا دینے والی چیخیں اس کھنڈر میں گونجنے لگیں تھی۔

”بدبخت جانور تُو نجانے کتنے معصوم بے قصور لوگوں کو اذیت سے مار کر ان کو اپنی خوراک بناتا رہا ہے۔ تجھے ایک لمحہ بھی کسی پر ترس نہ آیا۔ معصوم بچوں اور عورتوں کو بھی تُو نے نہیں چھوڑا۔“

وہ بولتے مسلسل اس کے گندے وجود پر ڈنڈے سے وار کرنے لگا۔ کہ ایک دم نوراں کا خیال آتے ہی اس کا ہاتھ رک گیا۔

”میری نوراں...... وہ بھی جنگل میں آئی تھی! کہیں اس درندے کی درندگی کا شکار......“ وہ بولتے بولتے رک گیا۔ ہاتھ پاؤں لرزنے لگے اور ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

”نوراں...... میری نوراں کہاں ہے۔ تو نے اسے بھی کیا...... میری نوراں کہاں ہے؟“ بالا اس کو ٹھوکر مارتے ہوئے غصے سے چیخ کر بولا۔

”نوراں...... کون نوراں؟“ وہ وحشی پوچھنے لگا۔

”میری بیوی نوراں! کمینے ذلیل جانور! وہ صبح اس جنگل میں آئی تھی۔ اسی کچی سڑک سے دوسرے گاؤں اسے جانا تھا۔“

”اچھا وہ عورت۔“ وہ وحشی اپنے جسم سہلاتا ہوا بولا۔

”وہ مجھے صبح جنگل میں ملی۔ میں اس کو اٹھا کر لے آیا اور......“

”اور کیا؟ تُو نے اسے مار دیا۔“ بالا بے ہوش ہونے کی کیفیت میں تھا۔

نہیں! وہ زندہ ہے۔ اسے باندھ کر رکھا ہے۔''

''کہاں؟...... کہاں ہے وہ۔'' بالے کے بدن میں خوشی سکون کی لہر دوڑ گئی۔ مگر نوراں کو دیکھنے، اس سے ملنے کی بے چینی مزید بڑھ گئی تھی۔

''وہ...... اس سامنے والے کمرے کے نیچے تہہ خانے میں۔''

بالا بنا کوئی اور بات کیے بھاگتا ہوئے کمرے کی طرف گیا۔ کمرے کے اندر سائیڈ میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ جو نیچے تہہ خانے تک جاتی تھیں۔ وہ دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتے ہوئے نیچے جا پہنچا۔ نیچے فرش پر بھی بڑا ہولناک منظر تھا۔ کئی انسانی پنجر انسانی کھوپڑیاں ہڈیاں جس کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اندر بکھرے ہوئے تھے۔ خون اور گوشت کی سخت بدبو میں میں سانس لینا تک محال تھا۔ بالے کو ایک سائیڈ پر اس کی نوراں نظر آئی۔ جس کے ہاتھ اور منہ کو کپڑے سے باندھا ہوا تھا۔ وہ بے ہوش پڑی تھی۔ وہ نوراں کو جاگنے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

نیم مردہ سی نوراں نے بمشکل اپنی آنکھیں کھولیں۔ اپنے سامنے بالے کو دیکھ کر وہ غیر یقینی سی حالت میں پھوٹ کر رو دی۔

''بالے...... تُو آ گیا...... مجھے یہاں سے لے جا بالے۔ وہ درندہ، وہ جانور مجھے مار دے گا۔ بالے وہ بڑا ظالم ہے۔ اس نے ہمارے گاؤں کے کئی بندوں کو مار دیا۔ بالے وہ آدم خور ہے۔'' وہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔

''تُو...... تُو فکر نہ کر نوراں! میں آ گیا ہوں۔ اب تجھے کچھ نہیں ہوگا۔ تُو فکر نہ کر تُو بس چل۔'' بالے نے سہارا دے کر اس کو اوپر اٹھایا اور وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھانے لگا۔

نوراں کی نظر بالے پر پڑی اور پھر بالے کے پیچھے...... ایک دم ہی نوراں کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ درندہ ان کے پیچھے کھڑا تھا۔

''بالے...... وہ درندہ۔''

بالے نے مڑ کے پیچھے دیکھنا چاہا مگر اس درندے انسان نے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا اس کے سر پر دے مارا۔ چوٹ کافی شدید تھی۔ اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا سا چھانے لگا۔ جلدی وہ ایک طرف گر کر کراہنے لگا۔ نوراں کے لیے بھی یہ سب ناقابل برداشت تھا۔ اپنے شوہر کی حالت کو دیکھ کر اس کی اپنی حالت خراب ہونے لگی۔ وہ درندہ وحشی ہنسنے لگا تھا۔

''چلا تو جتنا چلانا چاہتی ہے۔ پہلے تجھے اذیت سے تڑپا تڑپا کے ماروں گا۔ پھر تیرے اس شوہر کو، جس نے میرے کام میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کی ہے۔''

وہ اس کی طرف بڑھا۔ خوف سے نوراں دیوار سے جا لگی۔

یہ چاقو دیکھ رہی ہے۔ اس چاقو سے تیری گردن کاٹوں گا۔ تیرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کروں گا۔ مجھ سے پہلے غلطی ہوئی جو تجھے پکڑتے ہی فوراً مار دیتا تو میرا کام آسان ہو جاتا۔ چلو دیر سے ہی سہی مگر اب اپنی موت کے لیے تیار ہو جاؤ۔ وہ قہقہہ مارتے ہوئے چاقو لہراتے ہوئے نوراں کی طرف بڑھا۔ نوراں کو لگا اس کی موت قریب ہے۔ بالا خود زخمی ہو کر زمین پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ وہ اس کو کیسے بچا سکتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ بالے کو آوازیں دینے لگی۔

''بالے...... بچا لے مجھے...... یہ درندہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔'' وہ اس کو ہوش میں لانے کے لیے مسلسل چیختی رہی۔ یہ شاید اس کی آوازوں کا ہی اثر تھا کہ نیم بے ہوش پڑے بالے نے زور زور سے تین چار مرتبہ سانس لی۔ نوراں کی چیخیں مسلسل اس کے سوئے ہوئے دماغ پر ہتھوڑے برسا کر اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ پر سر پر لگی چوٹ آنکھوں کے گرد آتا اندھیرا اس کو ایسے کرنے سے روک رہا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ زمین سے اٹھ نہیں پائے گا۔ اس نے ایک دو بار دوبارہ کوشش کی مگر بے سود...... ادھ کھلی آنکھوں سے اپنے سامنے کا منظر۔ وہ وحشی درندہ نوراں تک پہنچ چکا تھا۔ غم اذیت غصے، انتقام چاروں احساسات کی ملی جلی کیفیت۔ اپنے سارے وجود کی ہمت اور جان کو یکجا

کر کے اس نے زوردار آواز سے نعرہ تکبیر بلند کیا پھر بعد میں خود کو اس کو پتا نہیں چلا کہ وہ خود کیسے اٹھا۔ کیسے بھاگتا ہوا اس وحشی کو جا لیا۔ وہ وحشی اس ساری صورت حال کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہاں تک کہ وہ سنبھل پاتا۔ بالے نے ایک زوردار گھونسا اس کے جبڑوں پر دے مارا۔ وہ بوکھلا کر دیوار سے جا لگا۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ بالے نے پھر اس کو اٹھنے کی مہلت نہ دی۔ اپنے پاؤں کی ٹھوکروں سے اس کی کریہہ گندی شکل کا مزید نقشہ بگاڑ دیا۔ خون اس کے منہ سے بھل بھل بہنے لگا۔ اس کے سارے دانت ٹوٹ چکے تھے۔ وہ کسی ذبح کیے ہوئے بھینسے کی طرح ڈکارنے لگا۔ مگر بالے کو اس پر ذرا برابر ترس نہ آیا۔ وہ درندہ تکلیف۔ درد سے مسلسل چیخ رہا تھا۔

''بالے مار اسے...... اور مار اسے یہ کسی کتے کی طرح بھونک بھونک کر مر جائے۔'' نوراں نے اس وحشی کے منہ پر تھونک دیا۔

''بڑی تکلیف بڑا درد ہو رہا ہے ناں...... آدم خور جانور۔ ان معصوم لوگوں کو یاد کر جن کو تُو نے بڑی اذیت سے مار دیتا تھا۔ جانوروں کی طرح ذبح کرتا تھا۔ ان کے بارے میں کبھی سوچا تھا۔'' بالے نے اسے مار مار کر ادھ مرا کر دیا۔

''تیرے لیے تو موت کی سزا بھی کم ہے۔ اس سے بھی بڑی کوئی سزا ہے وہ تجھے ملنی چاہیے۔''

بالے نے پاس پڑی رسی سے اسے اچھی طرح جکڑ کر باندھ دیا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے، وہاں سے بھاگنے کی بہت کوشش کی مگر بالے کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ بالا اور نوراں اس کو زبردستی گھسیٹتے ہوئے اس کھنڈر سے باہر لے آئے۔

باہر طوفان کب کا تھم چکا تھا۔ رات بھی ڈھل چکی تھی۔ صبح کا سورج اپنی آنکھیں کھولنے کو تیار تھا۔ جنگل سے ہوتے ہوئے جب وہ اپنے گاؤں پہنچے۔ تو دن کی سپیدی ہر سُو پھیل چکی تھی۔ گاؤں والوں کے لیے ان دونوں کی یہ زخمی حالت اور ساتھ ایک کریہہ انسان کا ہونا حیرت کا باعث تھا۔ پر جب بالے نے اپنے ساتھ ہونے والی تمام روداد ان کے گوش گزار کی تو گاؤں کے سبھی لوگ ششدر ہو کر رہ گئے تھے۔ اپنے پیاروں کے ساتھ ایسے اندوہناک حشر کا سن کر زار و قطار رونے لگے تھے۔ کئی بندوں سے ضبط نہ ہو سکا تو اس درندے نما انسان کو مارنے کے لیے بھاگے مگر بالے نے روک دیا۔

''اس کو جان سے مار کر ہم اپنے ہاتھ اس کے ناپاک غلیظ خون سے کیوں رنگیں۔ ہم کو اسے پولیس کے حوالے کرنا ہوگا۔ وہ ہی اس کو عبرت ناک سزا دے گی۔''

دو تین بندے پولیس کو خبر دینے بھاگے۔ جلدی وہاں پولیس آن پہنچی۔ ساری صورت حال پتا چل جانے کے بعد پولیس انسپکٹر نے بالے کو گلے لگا لیا۔ پولیس کے لیے بھی یہ کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

''شاباش بالے...... تو نے وہ کر دکھایا جو کسی بہادر مرد کو زیب دیتا ہے۔ تُو نے اس کو اپنی عقل اور بہادری سے پکڑ کر اپنے ساتھ کئی معصوم جانوں کو اذیت ناک موت سے بچا لیا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ تیرے اس کارنامے پر بہت خوش ہوئی ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میری پولیس ہیڈ آفس میں بات ہوئی ہے۔ اعلیٰ افسران بالا تجھے انعام و اکرام سے بھی نوازیں گے۔ ساتھ تجھے دو لاکھ کی خطیر رقم دینے کا ابھی اعلان کیا ہے۔''

''دو لاکھ۔'' بالے کے ساتھ نوراں کی خوشی دیدنی تھی۔

ان پیسوں سے ان کی کتنی مشکلیں حل ہو جاتی تھیں۔ بالا تو خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس رقم سے گھر میں اناج آ جاتا۔ بیلوں کی جوڑی خرید کر وہ دوبارہ اپنی زمین کو کاشت پھر سے خوشحال آسودہ زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ پولیس اس درندے کو لے کر چلی گئی۔

اگلے دن اس درندے کو اسی گاؤں میں سرعام پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔

☆☆☆



نویں خوفناک کہانی

کیسا یہ راز ہے؟

ارسہ سحر چوہان

اُس ہندو آرٹسٹ کی کتھا، جسے اس کے خوابوں نے بامِ عروج عطا کردیا

آج پھر ہر چودھویں چاند رت کی طرح وہ خوب صورت لڑکی سفید لباس میں ملبوس ایک پیڑ کے نیچے ایک ٹوکری میں سفید پھول اکٹھے کر رہی تھی کہ اچانک شنکر کو دیکھ کر خوش ہو کر مسکرائی اور درد بھری آواز میں بولی۔

''تم آگئے نیل! میں جانتی تھی کہ نیل تم ضرور آؤ گے۔ میرا انتظار ختم ہوا۔''

ساری کائنات کو سناتے ہوئے وہ زور سے بولی۔

''میرا نیل آگیا دیکھو۔'' پھر وہی سفید پھول وہ خوشی سے اپنے اوپر اُڑاتی ہوئی، برساتی ہوئی کسی مُورنی کی طرح رقص کرنے لگی۔ چاندنی رات میں دُور تنہا کسی باغ میں رقص کرتے ہوئے وہ دوشیزہ کتنی دلکش معلوم ہو رہی تھی۔ اچانک وہ ناچتے ناچتے رک گئی اور شنکر کے پاس آنے لگی۔ شنکر خوف کے مارے بھاگ نکلا۔ وہ تقریباً 30 کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا اور سارا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ اچانک شنکر سانس بحال کرنے کی نیت سے رُکا اور جھک کر گھٹنوں کے بل لمبے لمبے سانس لینے لگا، یہ سوچ کر کہ اب وہ اس لڑکی سے بہت دور نکل آیا ہے جیسے ہی اس نے اپنا چہرہ اوپر کیا وہ دوبارہ اس باغ کے سامنے تھا۔ تو کیا میں پھر سے واپس وہیں آپہنچا ہوں، جہاں سے میں بھاگ گیا تھا۔

یہ ماجرا دیکھ کر شنکر کی اوسان خطا ہوگئے، فوراً اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ جیسے میلوں دُور سے بھاگ کر آیا ہو۔

☆☆☆

رات کے 3 بجے تھے۔ آج پھر وہی سپنا، وہ لڑکی کون ہے؟ وہ سوچنے لگا۔ شنکر کو یہ سپنا پچھلے کئی سالوں سے ہر پونم کی رات کو نظر آتا تھا۔

شنکر ایک آرٹسٹ تھا۔ خدا نے اس کے ہاتھوں میں کمال قدرت دے رکھی تھی۔ اس کا کوئی نہیں تھا اس دنیا میں۔ اس کی بنائی تصویریں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھیں۔ لوگ دام نہیں بلکہ شنکر کا کام، محنت اور تصویروں کی حقیقی تخیلاتی دنیا میں کھو کر رہ جاتے، اس لحاظ سے شنکر کا شمار بڑے اور مشہور آرٹسٹ میں ہوتا تھا۔ گویا لوگ شنکر کے نام سے پیچھے بھاگتے تصویروں کو بعد میں دیکھتے پہلے ان کا دام ادا کرتے۔ وہ بھروسہ کرتے تھے کہ شنکر کی بنائی تصویر ہے، کچھ خاص ضرور ہوگا۔

☆☆☆

''راہول یار اپنی قسمت سے بڑا بے زار ہوں۔ رات پھر وہی سپنا۔ وہی لڑکی۔'' شنکر نے اپنے دوست راہول کو سب کچھ پہلے سے بتا کر کہا۔ راہول ایک تقدیر شناس انسان تھا۔

''آؤ شنکر تمہاری قسمت کا فیصلہ ان تاش کے پتوں سے کرتے ہیں۔''

یہ کہہ کر راہول نے شنکر کے سامنے تاش کے پتے الٹے ترتیب میں پھیلا دیے اور شنکر کو ان میں سے ایک پتا اٹھانے کا کہا۔ شنکر نے اُٹھا کر راہول کو دیا۔

لیکن ٹھیک تیسرے دن شنکر کو اس کے سینئر آرٹسٹ جن کے پاس وہ کام کرتا تھا کی طرف سے پیغام موصول ہوا جس میں انھوں نے کہا کہ اگلے مہینے کی 18 تاریخ کو بہت بڑی نمائش ہونے جارہی ہے جس کا نام ہے ''شاہکاروں کی تخلیق ہے''

نومبر کے اوائل دن تھے۔ سردیاں بھی تھوڑی بہت شروع تھیں۔ شنکر کو نہ صرف اس نمائش میں شرکت کرنے کا حکم ملا تھا بلکہ کوئی شاہ کار دنیا کے سامنے لانے کے احکامات بھی صادر کر دیے گئے



انھوں نے دو تین بار ایسا ہی کیا۔ راہول نے کہا۔

''یار اپنی تیاری کر لے تیری قسمت تجھے نئی جگہ بھیج رہی ہے، جہاں تجھے شاید تیرے سارے سوالوں کے جواب ملیں گے۔'' شنکر نے ہنس کر کہا۔

''مجھے ایسی دقیانوسی باتوں پر بالکل وشواس نہیں۔ فی الحال قریب قریب ایسا کوئی بھی موقع نہیں کہ میں کسی نئی جگہ جا سکوں۔'' یہ کہہ کر بات آئی گئی ہوگئی۔

تھے۔ شنکر کو دہلی جانے کا حکم بھی ملا۔ گویا تقدیر اپنا کھیل کھیل چکی تھی۔

نمائش میں صرف سترہ دن باقی تھی۔ ان سترہ دنوں میں شنکر کو دہلی جانا، پھر اپنے لیے ٹھکانہ تلاش کرنا اور پھر اچھا سا شاہکار لوگوں کی نظروں کے سامنے لانا تھا۔ دن بہت کم تھے۔ کیونکہ اس تقریبی نمائش میں بڑے بڑے فنکاروں اور لوگوں نے دنیا بھر سے شرکت کرنی تھی اور

خصوصاً وہ لوگ جو ماوراتی، تخیلاتی اور پُراسرار دنیا کے دلدادہ تھے۔ شرکت کرنے والے تھے۔

اس نمائش میں گیلفر نامی ایک آرٹسٹ ایک مورتی پیش کرنے والا تھا۔ وہ مورتی کسی لڑکی کی تھی جسے زمانہ قدیم میں کسی انتہائی قابل قدرتی مجسمہ ساز نے بنایا تھا، اور جس مورتی کو اس زمانے میں بہت حد تک سراہا گیا تھا۔ وہ مورتی زمانہ قدیم کے کسی نیل نامی مورتی ساز کی تخلیق تھی۔ جس میں 23 سالہ لڑکی ہاتھوں میں سفید پھول لیے اپنے لب سے ٹکرا کر مسکراتی نظروں سے آسمان کی لامحدود وسعتوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ تاہم مورتی کا مرکزی خیال ہی لوگوں کی جان نکال کر لے گیا تھا۔ لوگوں نے اس زمانے میں مورتی کو بہت نذرانے پیش کیے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انگریز اس مورتی کو اُٹھا کر اپنے عجائب گھر کی زینت بنانے کی غرض سے لے گئے تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ مورتی بنانے والے نے سب کچھ کر دیا گویا جان ہی نہ ڈال سکا۔ لوگوں کو مورتی اس حد تک مکمل لگی تھی۔ انگریزوں نے اس مورتی کو سونے چاندی کے زیورات سے آراستہ کیا ہوا تھا۔

وہ مورتی اُسی زمانے کی ایک گوہر نامی لڑکی کی تھی جسے سفید پھول بہت پسند تھے۔ اب اُسی مورتی کے چرچے ہو رہے تھے جو کہ اس ہونے والی تقریبی نمائش میں پیش کی جانی تھی۔ تو اب شنکر نے سوچا کہ کچھ خاص ہی بنانا چاہیے۔ نمائش میں پیش کرنے کے لیے شنکر نے بھی ابھی تک وہ مورتی نہیں دیکھی تھی۔ جس موررتی کے درشن کے لیے لوگ بڑے بے تاب تھے۔ لوگوں کی بے تابی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس مورتی کو خاصی پذیرائی ملنے والی ہے۔ شنکر نے خود سے سوچا۔

قدیم زمانے کی یہ مورتی صرف پتھر کی بنی ہوئی تھی۔ ایسا کیا تھا اس مورتی میں؟

☆☆☆

اگلی صبح شنکر دہلی پہنچ گیا۔ شنکر کے پاس صرف دو دن تھے۔ تیسرے دن صبح 9 بجے نمائش تھی۔ سب سے پہلے شنکر نے اپنا ٹھکانہ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اس کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ بالآخر ایک رات ہوٹل میں ٹھہرا، اگلی صبح شنکر پھر اپنے لیے مکان ڈھونڈنے نکلا۔ چلتے چلتے وہ ایک ویرانے میں پہنچ گیا۔ یہ جگہ ایک ایسے علاقے میں واقع تھی۔ جس میں کچھ جنگل کا گمان ہوتا تھا۔ یہاں پر تین چار مکان موجود تھے۔ شنکر ایک مکان میں داخل ہو گیا۔ دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ سے کھل گیا۔ شنکر اندر داخل ہوا۔ گھر بڑا پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔ کوئی موجود نہ تھا۔ آخر کار ایک ساٹھ سالہ بوڑھا سامنے آیا۔ شنکر نے اُسے دیکھتے ہی نمستے کہا اور بتایا کہ میرا نام شنکر ہے۔ میں دو دن کے لیے کرائے پر مکان لینا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟

''تم مشہور آرٹسٹ شنکر ہونا۔'' بوڑھے نے پوچھا۔

''جی میں وہی شنکر ہوں۔''

بوڑھے آدمی نے اسے مہمان خانے میں انتظار کرنے کو کہا اور خود جا کر اپنے مالک کو بتانے چلا گیا۔ شنکر کو انتظار کرتے ہوئے کافی دیر ہو گئی۔ شنکر نے اِردگرد کا طائرانہ جائزہ لیا تو اسے ایک پرانی سی ڈائری نظر آئی۔ شنکر نے وقت گزارنے کے لئے ڈائری اُٹھالی اور پڑھنے لگا۔ پہلے دو تین ورق کورے تھے چوتھے پہ کچھ لکھا تھا جو کچھ یوں تھا۔

''اکتیس دسمبر 1876ء''

آج وہ دوڑتی ہوئی آئی۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ اور کہنے لگی۔

''آج ہماری آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد ہم کبھی مل نہیں پائیں گے۔ وہ بغیر کچھ سنے بہت کچھ بول گئی تھی۔ اور مجھے پیچھے ہلکا سا دھکا دیا۔ میرے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر اور پھر کہا۔

''میری زندگی مسلسل بدلنے جا رہی ہے، میں بھی تمہاری طرح مجبور ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ روتی ہوئی بنا کچھ سنے بھاگ گئی۔ میرے ہاتھوں میں جو گلابی پھول تھے وہ سڑک پر ہی ہاتھوں سے چھوٹ گئے جو میں اُسے دینے کے ارادے سے لے گیا تھا۔ مگر ان گلابی پھولوں کا نصیب کسی حسینہ کے ہاتھوں کا لمس پانے کے بجائے سڑک کی زینت بنے۔''

شنکر نے کمرے کی اِردگرد کی چیزوں سے اندازہ لگایا کہ مالک مکان کوئی باذوق آدمی لگتا ہے۔ کیونکہ اس کمرے میں شنکر نے پیانو، رنگ برنگی روشنیاں، خوبصورت آتشدان اور قندیلیں اور دلکش پردوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ دیکھا تھا۔ اور سب سے حیرت انگیز بات کہ وہ شخص تن تنہا ویرانے میں رہتا تھا۔ تا کہ کوئی اسے تنگ یا اس کی ذاتی زندگی میں مداخلت نہ کرے۔ شنکر کو بھی اپنے شاہکار کو تخلیق کرنے کے لیے ایسی ہی سنسان جگہ کی تلاش تھی۔ عموماً شاعرانہ ذوق والے لوگ تنہائی پسند اور کم ملنسار ہوا کرتے ہیں۔ شنکر نے ڈائری کا ورق پلٹا ہی تھا کہ اچانک مالک مکان آ گیا۔ شنکر نے نمستے کہتے ہوئے معذرت کرتے ہوئے ڈائری رکھی اور مالک مکان نے مسکراتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بنا یہ جانے کہ اس کی ذاتی زندگی کے راز شنکر پر آشکار ہو چکے تھے۔ وہ ایک سنجیدہ انسان تھا۔

''میں اس شہر میں نیا ہوں، بالکل اجنبی ہوں۔ چھت چاہتا ہوں سر چھپانے کے لیے۔''

مالک مکان رضامند ہو گیا اور اپنے ساتھ والا گھر شنکر کو کرائے پر دے کر رخصت کر دیا۔ یہ مکان لکڑی کا بنا ہوا تھا، برسوں سے بند پڑا تھا۔ دھول مٹی سے اَٹا ہوا تھا، سوائے ایک پرانی الماری کے کچھ بھی نہ تھا۔

آدھا دن لگا کر شنکر نے مکان کو صاف ستھرا کیا۔ الماری کے دراز کو شنکر نے جیسے ہی کھولا اس میں سے دو تصویریں، اُدھ جلی سگریٹ اور سرخ ٹوٹی چوڑیاں پڑی تھیں۔ تصویریں ایک مرد کی اور ایک عورت کی۔ مرد 36 سالہ اور عورت 26 سالہ لگ رہی تھی۔ اور ایک خط بھی پڑا تھا شنکر نے خط کھولا، اس میں لکھا تھا۔

''ہمیں ایک دوسرے سے محبت کرنی چاہیے۔ نفرتوں اور غلط فہمیوں کی چنگاریوں نے ہمارے دماغوں اور ہماری زندگیوں کو جلا کر خاکستر بنا ڈالا ہے ہمیں مزید اپنی نفرتوں کو ہوا نہیں دینی۔ ہمیں ایک دوسرے سے محبت کرنی ہے۔''

☆☆☆

یہ خط 1872ء کا تھا۔ نفسِ مضمون سے اندازہ نہ ہو سکا کہ مرد کی طرف سے عورت کو لکھا گیا ہے یا عورت کی طرف سے مرد کو۔ شنکر نے خط کو واپس رکھتے ہوئے اپنا فوٹو فریم لگا کر نمائش میں پیش کرنے کے لئے کچھ خاکے کھینچنے لگا۔ کیونکہ شنکر کے پاس صرف ایک دن بچا تھا۔ پھر یہ سوچ کر سونے چلا گیا کہ کل مکمل کر لے گا۔ کچھ دیر بعد جب نیند نہ آئی تو سوچا تصویر بھی مکمل کر لوں مگر غنودگی چھانے لگی اس کے بعد جو ہوا اس کا شنکر کو کچھ علم نہ تھا۔ کوئی انجانی طاقت شنکر کے ہاتھوں سے خود بخود کام کروا رہی تھی۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ تصویر مکمل ہو گئی۔ شنکر نیند میں تھا اور تصویر کا اُسے ہوش تک نہ تھا۔

صبح شنکر کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے یہ دیکھ کر کہ تصویر ایک لڑکی کی تھی جو ہاتھ میں سفید پھول لیے اپنے لب سے ٹکرائے آسمانی وسعتوں کو مسکراتے ہوئے تک رہی تھی۔

''اوہ یہ تو وہی لڑکی ہے جو میرے سپنے میں آتی ہے اور مجھے نیل نیل کہہ کر پکارتی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے چند لکیریں ہی کھینچی تھیں، پھر یہ تصویر کب کیسے اور کس طرح مکمل ہوئی؟'' شنکر نے بے ساختہ کہا۔ اس کا دماغ پھٹنے والا تھا۔

یہ دن حیرت میں ہی گزرا تو شنکر نے سوچا کہ نمائش میں یہ ہی تصویر پیش کر دوں۔ کچھ نہ پیش کرنے سے تو بہتر ہی ہوگا۔

☆☆☆

اگلی صبح عجائب گھر میں لوگوں کا ہجوم بہت زیادہ تھا۔ لوگ جی کھول کر اس مورتی کو داد دے رہے تھے مگر جب شنکر نے اپنے فن کی نمائش کی تو حاضرین دنگ رہ گئے کہ جو مورتی میں لڑکی موجود تھی وہ عکس شنکر کی تصویر کا بھی تھا۔ ایک ہی انداز تھا دونوں کا۔ لوگوں نے جی بھر کر شنکر کو اور مورتی کو داد دی اور انعام و کرام سے نوازا۔

شنکر اب عالمی معیار کے ٹاپ کا آرٹسٹ میں شمار ہو چکا تھا۔ شنکر کے لیے یہ بات نا سمجھ میں آنے والی تھی کہ مورتی والی، شنکر کی تصویر والی لڑکی اور شنکر کے سپنے میں آنے والی لڑکی ایک ہی تھی۔ یہ ایک ایسا حیران کن راز تھا جس کے بارے میں شنکر پھر بھی نہ جان پایا۔ ہر پونم کی رات کو اُسے یہی سپنا آتا ہے۔ لیکن اب نوعیت مختلف ہے۔ وہ لڑکی اب اُس سے بہت خوش ہو کر ملتی ہے۔ مگر کیوں...... یہ کیوں اُس کی زندگی کے ساتھ لگا وہ راز ہے، جو شاید اس نے جنم میں اُس کے ساتھ ہی جائے گی۔ اور یہ Mystry وہ کبھی بھی نہ سلجھا پائے گا۔

☆☆☆



ہماری اُدھوری کہانی!



کشاف اقبال

اُس ریڈیو آر جے کی سچ بیتی، جس کا ملن اس جہاں میں اُدھورا رہ گیا تھا

وہ یکم فروری 2003ء کی خنک رات تھی۔ کارساز روڈ ہمیشہ کی طرح خاموش تھی۔ یوں جیسے کہ کوئی راز وہاں صدیوں کا دفن ہو۔ شاہراہِ فیصل کا وہ علاقہ میری ٹائم میوزیم، اریناکلب، نامور پرائیویٹ یونیورسٹی نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (NUST) اور پاکستان نیوی انجینئرنگ کونسل (PNEC) کی وجہ سے جس قدر بیش بہا سمجھا جاتا تھا۔ مجھے وہ اتنا ہی خوفناک اور نہاں رازوں سے بھرا علاقہ لگتا تھا۔ جیسے وہاں کے چپے چپے پر کوئی نہ کوئی راز صدیوں کا دفن ہو۔ ایک خوف تھا مجھے اس علاقے خاص طور پر اس پل سے جسے 'کارساز برج' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مگر یہ میری مجبوری ہی تھی کہ مجھے ہفتے کے تین دن اسی راستے پر گزرنا پڑتا تھا۔

میں، آر جے تسمیہ سلیم ہوں۔ جو فروری کی 14 تاریخ کو اپنا سرنیم تبدیل کرنے والی تھی۔ آج یکم فروری کی رات تھی۔ میں ہمیشہ کی طرح اپنے مڈنائٹ ریڈیو شو 'ملن کا سفر' کے لیے بیس منٹ لیٹ ہوگئی تھی۔ ایک تو مڈنائٹ ریڈیو شو، اوپر سے کارساز کا ٹریفک۔ میں یہ جاب ہرگز نہ کرتی اگر مجھے آر جے بننے کا شوق نہ ہوتا۔ ورنہ کارساز پر آنے کے بعد تو میری حالت تشویش ناک ہوجایا کرتی تھی۔ اللہ اللہ کرکے بالآخر میں نے بارہ بج کر پندرہ منٹ پر ریڈیو اسٹیشن پر چیک اِن کیا اور وہ ہمیشہ کی طرح میرے انتظار میں منیر ریڈیو اسٹیشن کے ریسپشن کے اردگرد جیب میں ہاتھ ڈالے چکر کاٹ رہے تھے۔

میں اور منیر پچھلے ایک سال سے 'ملن کا سفر' ساتھ کر رہے تھے۔ محبت اگر دل اور دماغ سے پتا کر لینے کے بعد کی جاتی تو شاید میں یہ بھی بتا دیتی کہ مجھے ان سے کب محبت ہوئی۔

''اسلام وعلیکم میری ہونے والی مسز منیر!'' مجھے دیکھتے ہی منیر کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ اُمڈ آئی۔ منیر! میرے ہونے والے شوہر اور اس کے ساتھ ساتھ میرے کو آر جے بھی تھے۔

''وعلیکم السلام! انتظار کر رہے تھے ناں میرا؟ مت کیا کریں میرا انتظار۔ میں تو ہمیشہ ہی دس پندرہ منٹ تاخیر سے آتی ہوں۔ آپ تب تک شو کا ماحول قائم کرلیا کریں۔ ہمارے شو کے فینز ویسے بھی بڑے ناراض رہتے ہیں۔ شو دیر سے شروع کرنے اور وقت سے دس منٹ قبل ختم کرنے پر۔'' میں ریسپشن پر حاضری دیتے ہوئے اُن سے مخاطب تھی۔

''اچھا اب نہیں کروں گا انتظار، 14 تاریخ تو ویسے بھی کافی قریب ہے۔ کیوں؟'' وہ میرے کانوں کے قریب آ کر بولے۔ ان کی آواز میں اپنائیت تھی، میرے لیے عزت تھی اور بہت ساری محبت۔ مجھے اُن کی آواز سے محبت تھی، اور اُن سے عشق۔

''کتنا مزہ آئے گا جب یہ سرپرائز نیوز ہم اپنے فینز کو سنائیں گے کہ ہم 14 تاریخ کو شادی کرنے جارہے ہیں۔ جلدی سے اسٹوڈیو چلیں ویسے بھی کافی میں نے آج کے لیے۔ ویسے ایک بات تو طے ہے، ہمارے فینز کو 'ملن کا سفر' سے محبت ہو نہ ہو، اس کے دو فرضی کردار عدیان اور عائزہ سے تو عشق سا ہوگیا ہے جیسے۔ کیوں؟ صحیح کہا ناں!'' ہم اسٹوڈیو پر دستک دے چکے تھے۔

''ہوں...... اِن فیکٹ ان کے عشق کا بخار تو اس قدر بڑھ گیا ہے۔ کہ یہ جاننے کے باوجود بھی کہ وہ دونوں کردار فرضی ہیں، وہ ان کی کہانی کو اصل سمجھنے



لیٹ ہوگئے ہیں۔ آج کی تھیم تیار کرکے لائے ہیں ناں آپ؟''

اسٹوڈیو کی جانب برق رفتاری سے قدم بڑھاتے اپنے دونوں ہاتھوں کو سردی کے باعث مسلتے ہوئے میں نے اُن سے دریافت کیا۔

''ہاں! تھیم بڑی زبردست قسم کی تیار کی ہے۔ لگے ہیں۔'' منیر میرے لیے کرسی سیٹ کرنے کے بعد مائیک کی چیکنگ کرنے لگے۔

''صحیح کہہ رہی ہو تم، پر آج تو سب اور بھی زیادہ یقین کرنے لگیں گے۔ عدیان اور عائزہ کی سرگزشت پر، یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ ہم دونوں بہت جلد ایک نئے رشتے میں گرہ لگانے جارہے ہیں، کیوں!''

'ملن کا سفر' آن ایئر ہو چکا تھا، اس لیے میں ان کی بات کا جواب نہ دے پائی۔

منیر نے رومانی گیت لائن اَپ کر دیا اور اب ہم دونوں اپنی باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے۔

منیر نے اسٹوڈیو کے انجینئر صاحب سے کہہ کر دو کپ کیپو چینو (Cappuccino) منگوائی اور ہم دونوں نے اپنے کانوں سے ہیڈ فونز اتار کر سامنے رکھ دیے۔

''منیر مجھے کارساز والے راستے اور خاص طور پر اس پل سے بہت خوف آتا ہے۔ ایسا کیا ہے وہاں؟ آپ بھی میری یہ بات سن سن کر پریشان ہو گئے ہوں گے۔ پر میں کیا کروں وہاں کوئی ایسی پراسراریت ہے جو مجھے اپنی جانب کھینچتی بھی ہے اور خوف بھی دلاتی ہے۔ معمول کے مطابق ایک بار پھر میں نے اپنے اندر چھپا کارساز والا خوف منیر کے سامنے ظاہر کیا۔

''کیوں ڈرتی ہو اس جگہ سے؟ مجھے تو وہ خاص رومانی اور پُرسکون جگہ لگتی ہے۔ وہاں کیسا ڈر بھلا اور یہ تو اچھا ہی ہوا ناں! تم ایک بار پھر واپسی میں میرے ساتھ چلو گی، ویسے بھی آج ہماری یہاں آخری رات ہے، اس کے بعد 14 فروری تک ہم مل نہیں سکیں گے اور نہ ہی 'ملن کا سفر' کر سکیں گے۔'' منیر میری نگاہوں پر گرتے بالوں کو اپنے ہاتھوں سے میرے کانوں کے پیچھے اڑسنے لگے۔

''ہوں!! ویسے بڑے دل والے ہیں ہمارے گھر والے جنھوں نے ہمیں آج کا آخری شو کرنے دیا، ورنہ شادی سے کچھ دن قبل تو کسی کے گھر والے منگنی شدہ جوڑوں کو ملنے بھی نہیں دیتے۔'' میں باتیں کرتے کرتے فیس بک پر موصول ہونے والے کومنٹس پڑھنے لگی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو، ہمارے گھر والوں کو ہم پر پورا اعتماد ہے ناں تبھی تو ہم آج یہاں ہیں۔ ویسے تم نے ایک بات نوٹ کی تسمیہ؟'' منیر اپنے جملوں کے آخر میں میرے لیے ایک سوال چھوڑ گئے۔

''کون سی بات؟'' کوفی کے دو کپ جس پر سے غائب ہوتا ہوا دھواں اُٹھ رہا تھا، ہمیں پیش کیے جا چکے تھے۔

''یہی کہ تم نے مجھے کبھی آئی لو یو (I Love you) نہیں کہا۔ جب بھی کہا صرف یہی کہا کہ مجھے آپ اچھے لگتے ہیں۔ میں آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں پر کبھی سیدھے منہ اظہارِ محبت نہیں کیا۔''

اُف! منیر نے مجھ سے کتنا کٹھن سوال کر لیا تھا، مجھ سے آج تک ہمت اکٹھا نہ ہو سکی منہ در منہ آئی لو یو کہنے کی۔ میں اِک پل کے لیے ہونق سی ہو گئی پھر کہنے لگی۔

''ہیڈ فونز لگا لیجیے کانوں میں۔''

''پر میری بات کا جواب تو دو تسمیہ، مجھے آج تمہارے منہ سے آئی لو یو سننا ہے بس!'' میں کانوں میں ہیڈ فونز لگا چکی تھی اس لیے اُن کی باتیں سننے سے قاصر رہی۔ ''اور اس خوبصورت گیت کے اختتام کے ساتھ ہم لیے چلتے ہیں آپ کو پھر سے پروگرام کی جانب۔''

اور پروگرام کے اختتام پر منیر نے بولنا شروع کیا۔

''فیس بک پر آپ کو منٹس دیکھ کر، آپ کے میسجز کے ذریعے آپ کا تجسس دیکھ کر ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ عدیان اور عائزہ کی اس گفتگو کے بعد ہم ڈنکے کی چوٹ پر اس خوش خبری کا اعلان کر دیں گے۔'' منیر نے اعلان کر دیا کہ ہم اس خوش خبری کا اعلان کچھ ہی پل میں کرنے والے ہیں۔

وہی بیک گراؤنڈ میوزک، بارش کے قطروں کی رم جھم اور وائلن کی موسیقی ایک بار پھر چلا دی گئی۔

''آپ تو بڑے بانورے ثابت ہوئے عدیان صاحب! محبت کرنے والوں کا بھلا کوئی ایک دن ہوتا ہے؟ یہ اپنے اظہار کے ہونے کے لیے 14 فروری جیسی تاریخ کا انتظار نہیں کرتی، اظہارِ محبت کسی بھی دن، کسی بھی لمحے کر دیتی ہے، پھر یہ وہ دن اظہارِ محبت کا، دو محبت کرنے والوں کے لیے 14 فروری کا دن بن جاتا ہے۔ سمجھے آپ!'' میرے منہ سے نکلے جملے اب مسکراہٹ کے لکھے جملے نہ تھے، منیر بھی یہ جملے سن کر ہکا بکا رہ گئے، اب کیا کہیں گے وہ، اب مزہ آئے گا ان کو تنگ کرنے میں، بہت تنگ کر لیا انھوں نے مجھے، پر اب میری باری تھی۔

''اس کا منشا یہ ہوا کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی مجھے فقط تمہارا انتظار کرنا پڑے گا؟ یہ انتظار صدیوں جیسا کیوں ہوتا ہے۔ میرے اللہ!'' تو یہ جملے اُن کے تھے، نہ کہ اسکرپٹ کے، پر دیکھا جائے تو اسکرپٹ انھوں نے ہی لکھی تھی۔ تو کیا جواب تک انھوں نے کہا وہ ان کے دل کی زبان تھی؟

''کیونکہ یہ انتظار ہوتا ہے! اور انتظار تو کرنا پڑتا ہے، ہم انتظار کرنا کبھی ترک نہیں کر سکتے، خاص طور پر کسی کے اظہارِ محبت کا! اب میری نظریں صرف ان پر تھیں اور ان کی مجھ پر، دوبارہ ہماری کیپو چینو، جس پر سے کچھ دیر قبل دھواں اُٹھ رہا تھا، اب بالکل سرد پڑ چکی تھی، پر اس کا ایک گھونٹ بھی اب تک ہم دونوں کے گلے میں نہیں اترا تھا۔ اس قدر محو تھے ہم 'ملن کا سفر' میں یا پھر ایک دوسرے میں۔

''اگر میں نے انتظارِ محبت کرنا چھوڑ دیا ناں، اور اس دنیا سے تمہارا اظہار سنے بغیر چلا گیا، تو بہت روؤ گی تم! سمجھیں!'' ان کی آواز میں محبت تھی اور الفاظ میں دھمکی، میں رہ نہ پائی اور کہہ بیٹھی۔

''میں بہت محبت کرتی ہوں آپ سے منیر، آئی رئیلی لو یو! پلیز ایسا مت کہیں۔''

تمام تر الفاظ آن ایئر جا چکے تھے۔ تمام سننے والوں نے ایک ایک لفظ سن لیا تھا۔ اظہارِ محبت ڈنکے کی چوٹ پر کیا جا چکا تھا۔ میں بالکل ساکت ہو گئی، یہ سوچنے کے بعد کہ میرے کہے تمام الفاظ آن ایئر جا چکے ہیں۔ میں دم سادھے اپنی کرسی پر ڈھے گئی۔

منیر نے سامعین کے لیے ایک گیت چلا دیا، پھر اپنے ہیڈ فونز رکھ کر کرسی پر اپنے دونوں بازوؤں کو سر کے پیچھے لے جا کر ٹیک لگائے مجھے مسکرا کر دیکھنے لگے، جیسے ان کا کوئی اولین مقصد پورا ہو چکا ہو۔

''آئی لو یو ٹو تسمیہ!' مجھے پتا نہیں چلا کہ انھوں نے میرے کانوں پر سے کب ہیڈ فونز ہٹائے اور میرے کانوں کے بالکل نزدیک آ کر جوابی اظہار پیش کرنے لگے۔

''آپ بہت وہ ہیں منیر، مجھے کوئی بات نہیں کرنی آپ سے، بھلا اس طرح کرواتا ہے کوئی کسی سے محبت کا اظہار؟ بات مت کریں آپ مجھ سے۔'' میں ہیڈ ڈاؤن کر کے بیٹھ گئی۔

''تسمیہ! جہاں محبت ہوتی ہے وہاں اظہار بھی ہوتا ہے اور جہاں اظہار نہ ہو، وہ محبت ادھوری رہتی

ہے۔ کچھ تشنگی سی رہ جاتی ہے اس میں۔ میں تمہارے کردار سے اچھی طرح واقف ہوں میری ہونے والی مسز منیر! مجھے پتا تھا تم کبھی اظہار کرنے والی نہیں ہو، اسی لیے مجھے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا۔ ویسے آج تم نے میرے یقین کو اور پختہ کر دیا کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو!'' وہ میرے پیچھے کھڑے تھے اور میرے کانوں کے قریب سر جھکا کر محبت کی زبان بول رہے تھے۔

میں اپنی کرسی پر سے فوراً اُٹھ گئی اور ان کے گلے لگ گئی۔ مجھے نہیں پتا کہ اس وقت مجھے کیا ہوا تھا۔ بس اُن کے کھونے کا ڈر بھی مجھے قبر میں اتار دیتا تھا۔

''منیر مجھے کبھی چھوڑ کر مت جایئے گا آپ کو قسم ہے میری!'' میں ان کے گلے پہلی بار لگی تھی اور جب انھوں نے مجھے خود سے لگایا تو میں نے خود کو بہت محفوظ پایا تھا۔

''تمہاری قسم! تمھیں کبھی تنہا کر کے نہیں جاؤں گا۔'' وہ مجھے اسٹوڈیو میں گلے لگا کر اپنی محبت کا یقین دلانے لگے۔ وہ اسٹوڈیو، جو ہمارے لیے اب ایک یادگار بن کر رہنے والا تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

''وہ...... وہ...... گیت ختم ہونے والا ہے، ہمیں 'ملن کا سفر' کا اختتام بھی کرنا ہے۔'' میں نے خود کو نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے دور کیا اور اپنی کرسی پر براجمان ہوگئی۔

''لیکن ایک بار پھر ہم آپ کے سامنے حاضر ہیں 'ملن کا سفر' میں آپ کو انتظار کروائے بغیر ہم آپ کو یہ خوش خبری سنانا چاہتے ہیں کہ...... کہ میں اور تسمیہ اس ماہ کی 14 تاریخ کو شادی کے بندھن میں بندھنے جا رہے ہیں۔ ہم شادی کر رہے ہیں۔'' منیر نے ہماری شادی کا اعلان بالآخر کر ڈالا۔

''جی ہاں! اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتے چلیں کہ آج کا شو ہمارا آخری شو ہے، 'ملن کا سفر' ہمارے لیے بہت بہت زیادہ خوب صورت ایکسپرنیس تھا۔ منیر کی باتوں کو میں لے آگے بڑھایا۔

''اور ہاں! یہ بات کہنا بجا ہوگا کہ 'ملن کا سفر' نے منیر اور تسمیہ کو ایک کرنے میں بہت زیادہ اہم کردار ادا کیا، خاص طور پر اس میں جنم لینے والے دو اہم کردار عدیان اور عائزہ نے جو بلاشبہ ہم دونوں تھے۔ یہ ہمارا بھلے آخری شو ہے مگر...... ہم نہیں تو ہمارے بعد کوئی اور اس سفر کو جاری رکھیں گے۔ آپ کو ہمارے بعد کوئی اور عدیان اور عائزہ مل جائیں گے جو کل کو 'ملن کا سفر' کا یہ سفر جاری رکھیں گے۔ پر یہ سفر کبھی ختم ہونے نہ پائے گا۔'' منیر نے مسکراتے ہوئے مجھے بولنے کا موقع دیا۔

''دلوں کی سرزمین کو تر ہونے کے لیے۔
کسی رم جھم کی ضرورت کہاں ہوتی ہے
عشق جب دونوں سمت عروج پر ہو تو
یہ آگ کا دریا بھی محبت کی برسات بن کر برسنے لگتا ہے۔

یہ تھی 'ملن کا سفر' کی ٹیگ لائن جو کبھی تبدیل نہ کی جا سکی کیونکہ ہمیں یہ لائنز دہرانے کی عادت سی ہوگئی تھی۔ ان چند سطور سے ہمیں محبت سی ہوگئی تھی۔ ان سطور کی ایک ایک سطر پر ہمیں یقین ہوگیا تھا۔

جانے انجانے میں اتنا کہوں گی کہ ہماری ازدواجی زندگی کے لیے آپ سب کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہے، دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔''

اور پھر ہم نے 'ملن کا سفر' اور عدیان اور عائزہ کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا۔

☆☆☆

آج 14 فروری کی رات تھی۔ ہماری شادی کی رات۔ میرے ہاتھوں پر ان کے نام کی مہندی رچی تھی اور میری دھڑکنوں پر ان کے نام کی سانسیں دم لے رہی تھیں۔ وہ آج باقی دنوں سے کہیں زیادہ فریش اور حسین لگ رہے تھے۔ نکاح کے دو بولوں کے بعد میں آفیشلی تسمیہ منیر بن گئی تھی۔ مسز منیر!

رخصتی ہو چکی تھی اور اب ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ مگر آج، ایک بار پھر مجھے اس خوفناک پُل پر سفر کرنا پڑا، اپنی شادی والی رات کو بھی۔ پتا نہیں یہ راستہ میری زندگی کا حصہ اب تک کیوں بنا رہا۔

ہم کارساز برج پر پہنچ چکے تھے۔ ٹریفک ذرا بھی جام نہیں تھا ان دنوں شادیاں رات دیر تک ہوا کرتی تھیں۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑے بیٹھے تھے۔ جبکہ میرے منہ پر پوری طرح گھونگھٹ تھا۔ اتنے میں سامنے سے ایک ٹرک آیا، جو رانگ وے پر چلا آ رہا تھا اور ہماری پھولوں سے سجی گاڑی اس سے جا ٹکرائی۔ گاڑی ٹرک سے ٹکرانے کے بعد کارساز کے پُل سے نیچے جا گری جہاں صرف ریل کی پٹری تھی اور کچی آبادی۔

☆☆☆

میری آنکھ کھلی تو میرے آس پاس عجیب و غریب قسم کی چیزیں تھیں، دوائیوں کی بدبو، ECG مشین اور میرے ہاتھوں میں لگی ڈرپ۔ میں اسپتال میں پڑی تھی۔ آنکھ کھولتے ہی میرے دماغ میں کارساز روڈ کی دھندلی سے تصویر ابھر آئی، ہماری شادی کی رات تھی، میں گاڑی میں بیٹھی تھی اور انھوں نے میرا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ منیر!

میں نے اپنے ہاتھوں میں لگی ڈرپ نکال پھینکی اور پورے اسپتال میں منیر منیر چلانے لگی۔ نرسیں مجھے پکڑنے لگیں پر میں حواس باختہ ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے سے کچھ فاصلے پر اپنے اور منیر کے گھر والوں کو پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھا تو دوڑ کر ان کے پاس چلی گئی۔

میری جان! میری تسمیہ تم ٹھیک تو ہو ناں؟ یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تُو نے میری بچی کو بچا لیا۔'' مجھے اس وقت کچھ یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہاں موجود لوگوں میں سے کون میرے ابو تھے اور کون میرے سسر مگر وہ آواز میری امی کی لگ رہی تھی۔

''منیر کہاں ہیں؟ کہاں ہیں میرے منیر؟ کوئی کچھ بولتا کیوں نہیں۔ میرے منیر کہاں ہیں۔'' میں نے بہت بُری طرح چلانا شروع کر دیا۔ پر کسی نے میرے سوال کا جواب نہ دیا۔ اتنے میں میرے سامنے سے ایک مردے کو لے جایا جا رہا تھا جس کے منہ کے اوپر چادر تھی۔ میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے اس چادر کو ہٹا دیا تو دیکھا کہ وہ مسکراتا ہو چہرہ میرے منیر کا تھا۔ مگر وہ اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ میں بیوہ ہوگئی تھی، شادی کی پہلی رات کو ہی میرا گھر اجڑ گیا تھا، میری سانسیں مجھ سے چھین لی گئی تھیں، کچھ نہیں بچا تھا میرے پاس۔ شادی کے بعد کے خواب جو ہم نے ساتھ دیکھے تھے، ہمارا ہنی مون، ہمارے بچے، سب کچھ چکنا چور ہوگیا تھا بس زمین پھٹنے کی دیر تھی جس میں مجھے دفن ہو جانا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز لوگ مجھے دلاسے دے کر جانے لگے، جبکہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ ان کے دلاسے میرے لیے کچھ نہ کر پائیں گے۔ میری عدت کے دن شروع ہوگئے تھے جو ہجر کے دنوں سے کہیں زیادہ دردناک اور جان لیوا تھے۔ مجھے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دی گئی۔ میں آج بھی اپنے سسرال میں موجود ہوں۔

رات کے ایک بجے جب سب سو گئے تھے، تب میری نند نے میرے کہنے پر میری مدد کی اور چوری چھپے اپنے ڈرائیور کے ساتھ مجھے وہاں بھیج دیا جہاں میں نے اپنی زندگی کے سب سے خوب صورت لمحات گزارے تھے۔

'ملن کا سفر' اسٹوڈیو، مائیک، ہیڈفونز، منیر کی کرسی۔ بقول مینجر صاحب ہمارے جانے کے بعد کوئی بھی 'ملن کا سفر' اور اس اسٹوڈیو میں جگہ نہ لے سکے گا۔ مجھے اب بھی اس اسٹوڈیو کے چپے چپے سے منیر کی خوشبو آ رہی تھی۔ ان کا میری جانب دیکھنا، مجھے اپنی حفاظت میں رکھنا اور...... مجھے اپنے گلے سے لگانا۔

شاید اللہ جانتا تھا کہ منیر مجھ سے ملن سے پہلے ہی جُدا ہو جائیں گے اس لیے شادی سے پہلے مجھے ان کو محسوس کروا دیا۔ میں بہت بُری طرح رو دیتی اگر تھوڑی دیر اور بھی اس اسٹوڈیو میں رہتی۔ اس لیے میں وہاں سے باہر آ گئی۔ میں نے مینجر صاحب اور بقیا تمام لوگوں سے پردہ کیا ہوا تھا۔

ایک بار پھر زندگی مجھے اس راستے پر لے چلی جہاں سے مجھے خوف آتا تھا اور بجا آتا تھا۔ اس راستے نے مجھے میرے منیر سے جدا کیا۔ ہمارے ملن کے سفر میں رکاوٹ بنا، اس راستے کے لیے میں جتنی بدعائیں کروں، کم ہیں۔

اب میں پُل کی اس جگہ آ گئی تھی جہاں سے

ہماری گاڑی نیچے گری تھی۔ پہلے تو میں پُل کے اوپر کھڑے ہو کر دیکھنے لگی، پھر کچھ دیر بعد پُل کے نیچے اتر کر اس جگہ چل پڑی جہاں ہماری گاڑی گری تھی۔ جس جگہ سے مجھے اتنی نفرت تھی آج میں اس جگہ کے دل میں کھڑی تھی۔ منحوس جگہ! اس حادثے کو صرف ایک ہی دن گزرا تھا اس لیے ہماری گاڑی وہاں سے اب تک اٹھائی نہ گئی۔

میں نے اظہارِ محبت کر تو دیا تھا منیر پھر آپ کیوں چلے گئے مجھے چھوڑ کر؟ جھوٹے ہیں آپ، دھوکے باز ہیں، میرے نام کی جھوٹی قسم کھائی آپ نے۔ میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی...... پر! ایسا تو تب ہوگا ناں جب میں زندہ رہوں گی۔ میں بھی خود کو مار دوں گی۔ نہیں رہنا مجھے آپ کے بغیر اس دنیا میں۔

''یہ 'ملن کا سفر' ہے جو صرف سانس کا کام نہیں کرتا۔ سانسیں تو مرنے کے بعد ہمارا ساتھ چھوڑ جاتی ہیں، یہ روح کا کام کرتا ہے، احساس کا کام کرتا ہے، اگر ہمارے چاہنے والے ہم سے بچھڑ بھی جائیں تو ان کی محبت بھری آواز ہمیں سنائی دیتی ہے۔''

یہ الفاظ تو منیر کے تھے، مجھے تو یہ الفاظ یاد بھی نہیں پھر یہ مجھے سنائی کیوں دے رہے تھے؟ میں نے نظریں اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو وہ پیچھے سے میرے پاس آرہے تھے، وہ منیر تھے، میرے منیر۔ شادی والی شیروانی پہن کر وہ میرے پاس آرہے تھے۔

''تم بہت محبت کرتی ہو ناں مجھ سے؟ مجھے اپنانا چاہتی ہو؟ ہمیشہ میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟'' وہ میرے قریب آکر مجھ سے پوچھنے لگے۔

''منیر آپ زندہ ہیں! خیر جو بھی ہے، میرے ساتھ چلیں، گھر والے بہت خوش ہوں گے آپ کو دیکھ کر۔'' ان کو دیکھ کر میرے مردہ جسم میں جان آگئی تھی۔ اور میں ان کے گلے لگ گئی، ٹھیک اسی طرح جس طرح 'ملن کا سفر' کے آخری دن لگی تھی۔ مگر یہ کیا ہوا؟ ان کے گلے لگنے کے چکر میں میں خود آپ کو ہی چھو گئی۔

''میں اب روح بن گیا ہوں تسمیہ، جو آج تمھیں دلاسا دینے یہاں آیا ہوں۔ تم بس میری باتوں کا جواب دو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، میری جان!'' ان کی آنکھوں میں میرے لیے پریشانی تھی۔

''ہاں! ہاں منیر بہت محبت کرتی ہوں آپ سے، ہمیشہ ساتھ رہنا چاہتی ہوں آپ کے۔'' میں نے روتے روتے ان سے کہا۔

''تو بس میرے لیے دو کام کرنا! اگر مجھے حاصل کرنا ہے تو میرے لیے دو قربانیاں دینا پڑیں گی۔'' انھوں نے میرے مہندی والے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''صرف دو قربانیاں؟ میں خود کو آپ کے لیے قربان کردوں اور آپ صرف دو کی بات کرتے ہیں؟'' میں نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

''یہی کام تو تمھیں نہیں کرنا۔'' وہ بولے۔

''تو پھر؟'' میں نے تجسس ظاہر کی۔

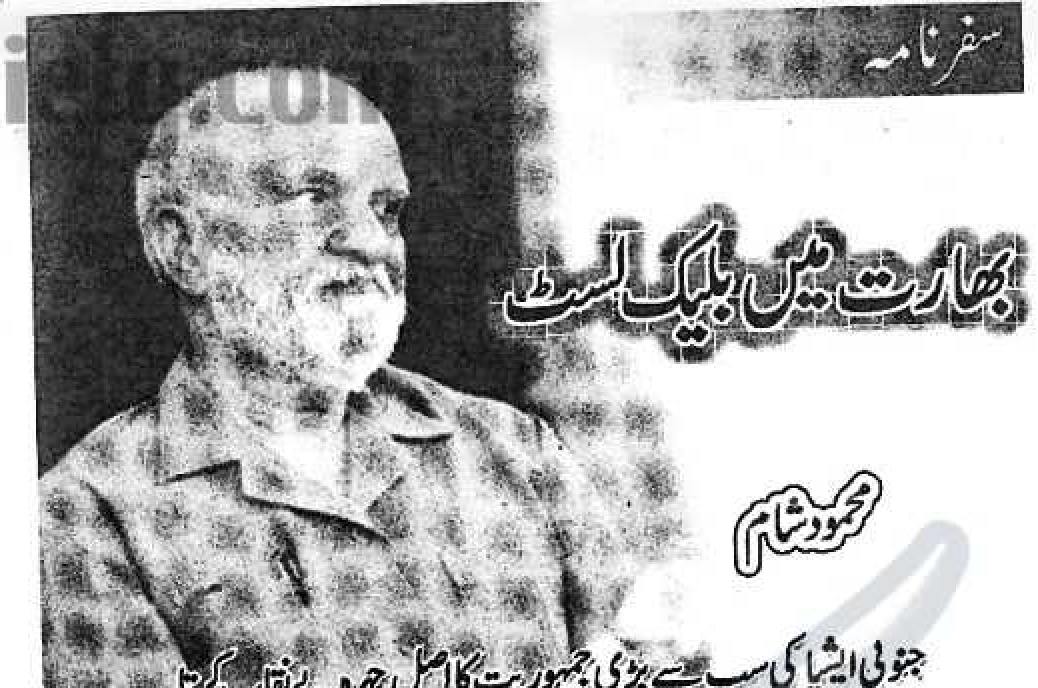
''پہلا کام یہ کہ تم کبھی خودکشی کرنے کی کوشش نہیں کروگی، نا ہی کبھی مرنے کی بددعا کروگی اور دوسرا کام تو تم ویسے بھی نہیں کروگی۔ پر میں تمہارے معاملے میں پوزیسو ہوں اس لیے کہہ رہا ہوں، چاہے پوری کائنات تمہاری دوسری شادی کروانا چاہے تم ہرگز نہ کرنا، تم صرف میری تسمیہ ہو، میری روح کی طرح ہو! میں تمہارا انتظار کروں گا اُس دنیا میں!''

وہ اپنے آخری کلمات دہراتے ہوئے غائب ہوگئے۔ پر اُن کی وہ ایک ملاقات ملن کی امید دے گئی، جینے کا سہارا دے گئی۔

☆☆☆

آج میں اڑتیس سالہ تسمیہ ہوں جس کی دنیا بھر نے شادی کروانا چاہی پر میں نے صاف انکار کردیا۔ اگر میں ہوں تو صرف منیر کی۔ اب مجھے صرف اپنی موت کا انتظار ہے۔ جو اللہ کی مرضی ہے، جب چاہے دے، تب ہمارا یہ ملن کا سفر کامل ہوجائے گا اور ہماری ادھوری کہانی مکمل ہوجائے گی ہم ایک ہو جائیں گے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

☆☆☆



بھارت میں بلیک لسٹ

محمود شام

جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اصل چہرہ بے نقاب کرتا۔
نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے، سفر نامہ بھارت

تیسرا حصہ

ایک شام پاک ہندوستی کے نام۔ ڈھل رہی ہے۔ رات بھیگنے لگی ہے۔ میں نے یہاں کے لیے خاص طور پر نظم لکھی ہے۔ جس کا ابھی کوئی عنوان نہیں دیا ہے۔ میں داد سمیٹتے ہوئے بیٹھ رہا ہوں نظم آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

رات کی کوکھ سے ہوتا ہے سویرا پیدا
جنگ کی راکھ سے ہی امن جنم لیتا ہے

ہو چکی رات بہت ہی لمبی
ہو چکی رات بہت ہی کالی
جنگ تو کتنے نگر پھونک چکی
کتنی ماؤں کے جگر کاٹ چکی

بہہ چکا کتنا لہو۔ گرم لہو۔ تازہ لہو
دشت وصحرا میں۔ پہاڑوں میں گلی کوچوں میں
رنگ لاتا ہی نہیں اب تو شہیدوں کا لہو

اب یہ لگتا ہے کہ تاریخ نے کروٹ بدلی
شل ہوئے ظلم وستم کے بازو
تھک گئے خون بہانے والے

خواہشِ امن تو ہر ذہن کی مجبوری ہے
اب تو ہتھیار بھی نادم ہیں ہلاکت پہ یہاں
یہ ہے وہ لمحہ جہاں جوش وجنوں بھی سوچیں

آزمائش ہے قیادت کی۔ تدبر کی۔ بصیرت کی
یہاں اب اگر جیت ہے تو صرف حقیقت کی یہاں

خواب کوشش سے حقیقت میں بدل سکتے ہیں
پر حقیقت۔ تو کبھی خواب نہیں بن سکتی
آیئے مان لیں۔ ہیں دونوں حقیقت ہم تم
اب ہمیں کوئی بھی خوابوں میں نہیں بدلے گا
سرحدیں خون سے لکھی ہوئی تقدیریں ہیں

سرحدیں دل میں ابھرتی ہوئی تصویریں ہیں
آیئے مان لیں ہیں دونوں حقیقت ہم تم
اب ہمیں کوئی بھی خوابوں میں نہیں بدلے گا

ایک طویل دن بیت چکا ہے۔ اس روز کتنے تاریخی واقعات گزرے ہیں۔ کتنے ہنگامے رہے ہیں۔ ٹی وی چینل بہت کچھ دکھاتے رہے ہیں۔ دکھا رہے ہیں۔ دلی سو رہی ہے۔ کل آگرے روانہ ہونا ہے۔

15 جولائی 2001ء

اتوار۔ صبح کی کرنیں۔ دریچے پر دستک دے رہی ہیں۔ آگرہ ہماری منزل ہے۔ اخبارات کل کے طویل دن کی خبروں اور تصویروں سے سجے ہیں۔ اور آج کے تاریخی دن کی اہمیت کو اجاگر کر رہے ہیں۔ امیدیں باندھ رہے ہیں۔ صدر پرویز مشرف۔ وزیراعظم واجپائی اپنے اپنے طیاروں سے آگرہ پہنچ چکے ہوں گے۔ ہم بسوں میں نکلے ہیں۔ ہوٹل سے پہلے دہلی سے باہر نکلنے میں ہی کئی گھنٹے لگ گئے ہیں۔ راستے میں چائے وغیرہ کے لیے رکے ہیں۔ اس درمیانی پڑاؤ کو بھی بھارت کی سیاحتی کارپوریشن نے ایک سیاحتی مرکز بنادیا ہے۔ اچھی چائے، اچھے کھانوں اور مشروبات کے ساتھ بھارت کی دستکاریوں کے شوروم بھی قائم کیے گئے ہیں۔ جو سیاح جلدی میں ہوتے ہیں۔ وہ جو چیز جہاں اچھی لگے۔ خرید لیتے ہیں۔ آگے کا انھیں پتا نہیں ہوتا کہ وقت ملے نہ ملے۔ چیز ملے نہ ملے۔

یہاں ہمارا قیام مغل شیرٹین میں ہے۔ یہ موریہ شیرٹین سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ کمروں کے لیے تو ابھی رش ہے۔ دیر لگے گی۔ جین ٹی وی والے پوچھتے پھر رہے ہیں کہ جنگ کے محمود شام کون ہیں۔ آیئے آیئے کچھ دیر کے لیے آپ سے بات کرنی ہے۔

''میں نے ابھی چیک ان بھی نہیں کیا۔ سامان بھی یہیں پڑا ہے۔''

''یہ ہمارا آدمی یہاں رہے گا۔ چل بے رامیش تو یہاں بیٹھ ہلنا نہیں۔'' آیئے شام جی۔ اور چھت پر چلنا ہے۔ انٹرویو لائیو جائے گا۔ یہ موبائل لیں یا اپنے گھر کا نمبر بتائیں۔ میں فون کر دیتا ہوں۔ وہ آپ کو دیکھ بھی لیں گے' سن بھی لیں گے۔

''نہیں بھائی ہمارے کیبل پر جین نہیں آتا۔''

''کھانا کھائیں گے آپ۔'' جین نے ہوٹل کے جس کمرے کو اسٹوڈیو بنا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں کھانا چل رہا ہے۔

''چائے پی لیں۔ آپ ابھی تو پہنچے ہیں۔ ہاں چائے چل جائے گی۔

''چائے ہاتھ میں لیے۔ ہم سیڑھیاں عبور کر رہے ہیں۔ چھت پر چینلوں نے خیمے لگائے ہوئے ہیں۔ سی این این، بی بی سی، زی، جین، اسٹار، سب موجود ہیں۔

مذاکرات سے کیا امیدیں ہیں۔

میں کہہ رہا ہوں کہ دونوں ملکوں کے غریب عوام واجپائی جی۔ اور پرویز مشرف صاحب کی چوٹی کانفرنس سے بہت سی امیدیں باندھے ہوئے ہیں۔ وہ سوچ رہے ہیں کہ ان کی سونی زندگی میں رونقیں آجائیں گی۔ اگر دونوں نے ان غریب لوگوں کو سامنے رکھا اپنے فیصلے کیے تو وقت اس کی دسترس میں ہوگا۔ اور اگر انھوں نے اس غریب کے دل کی آواز نہ سنی۔ تو تاریخ ان سے ناراض ہو جائے گی۔

واپس۔ استقبالیے پر۔ کمرے میں ابھی دیر لگے گی۔ ہم میڈیا سینٹر دیکھنے چلے آئے ہیں۔ بہت خصوصی انتظامات ہیں۔ بریفنگ ہال۔ جہاں سو سے زیادہ کیمرہ مینوں کے لیے الگ الگ جگہ مخصوص ہے۔ خبریں بھیجنے کے لیے کمپیوٹر فیکس مشین، فون، اردو کمپیوٹر کا بھی انتظام ہے۔

لیکن پاکستانی سفارت خانے نے اپنا انتظام الگ کیا ہوا ہے۔ جہاں انٹرنیٹ۔ فیکس، فون سب کچھ دست یاب ہے ساتھ ایک مختصر سا بریفنگ روم ہے۔

میڈیا سینٹر کے باہر لان میں بھی کچھ چینلوں نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ یہیں سے براہِ راست نشریات جاری ہیں۔ ششما سوراج آ رہی ہیں۔ دور درشن والوں نے انھیں کیمرے کے سامنے بٹھا دیا ہے۔ مذاکرات کی کیا خبر ہے۔ بڑے اچھے جا رہے ہیں۔ تمام مسئلوں پر بات ہو رہی ہے۔ سرحد پار دہشت گردی۔ داؤد ابراہیم پر بھی سبھی مسئلوں پر بات ہو رہی ہے۔ دور درشن والے والے نے کشمیر کا پوچھا ہی نہیں۔ ششما جی نے خود بھی ذکر نہیں کیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد بھارت کی ترجمان نروپو ما رائے آ رہی ہیں۔ انھوں نے چار سطر کا بیان پڑھا ہے۔

اور کہا ہے کہ بس یہی کافی ہے۔ وہ سوالات نہیں سنیں گی۔ چار سطر کے اس بیان کا اصول تو یہی ہوتا ہے کہ جب یہ طے ہو کہ مذاکرات کی ترجمانی ایک صاحب یا صاحبہ کریں گی۔ اور دونوں ملکوں کی طرف سے جو بھی مشترکہ یا متفقہ بیان طے ہوگا۔ اسے ہی کافی سمجھا جائے گا۔ ششما کو ٹیلی ویژن پر آنا ہی نہیں چاہیے تھا اس کے بعد چہ میگوئیاں چل پڑی ہیں۔ کشمیر پر بات نہیں ہو رہی ہے۔

پاکستان کے سیکریٹری اطلاعات سید انور محمود اور آئی ایس پی آر کے ڈائریکٹر جنرل راشد قریشی ہوٹل میں نظر آئے ہیں تو انھیں بھارتی صحافیوں نے گھیر لیا ہے۔ وہ انتہائی محتاط انداز میں بات کر رہے ہیں۔ لیکن صحافی ان سے کچھ کہلوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھوں نے کچھ کہا ہے کچھ نہیں بھی کہا ہے پاکستان کے وفد پر پاکستان کے عوام کی طرف سے دباؤ بڑھ گیا ہے۔ بھارت چینلوں سے پاکستانی ناظرین نے جب یہ دیکھا اور سنا کہ کشمیر پر بات نہیں ہو رہی ہے تو انھوں نے احتجاج کیا ہے کہ پاکستان کے سربراہ اور پاکستانی وفد آگرے کیا کرنے گئے ہیں۔ رات گئے پاکستان نے بیان جاری کیا ہے کہ کشمیر ہی بھارت پاکستان کی گفتگو کا مرکزی نکتہ ہے۔

اندازہ ہو رہا ہے کہ پاکستان بھارت مذاکرات آگے نہیں بڑھ رہے ہیں۔ امیدیں جو بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ وہ مدھم ہو رہی ہیں۔ رات کو ہوٹل میں بھارتی حکومت کی طرف سے پر تکلف عشائیہ ہے۔ کھانا بھی ہے۔ پینا بھی۔ گانا بھی ہے۔ ناچنا بھی۔ یہ ایک مقام اور ایک کیفیت ہے جہاں بھارتی اور پاکستانی ایک ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر اور دانشور ثقافت، شعر و شاعری انھیں اپنے مختلف ہونے کا یقین غالب ہونے لگتا ہے۔

میں نے آج اپنی یہ خصوصی رپورٹ بھجوائی ہے۔

''پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف نے سیاست اور سفارت میں انتہائی کم مدت کا تجربہ ہونے کے باوجود بھارت میں صرف 36 گھنٹے کے قیام کے دوران بھارت کی نصف صدی سے زیادہ عرصے کی راج نیتی۔ جوڑ توڑ، اور سفارت کاری کا تجربہ رکھنے والی قیادتوں پر اتنی سبقت حاصل کر لی ہے کہ ایک بھارتی ٹی وی چینل کے ماہر نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر صدر پاکستان اور وزیراعظم بھارت کی مشترکہ پریس کانفرنس ہوئی تو یہ بھارت کے لیے پبلک ریلشنز (تاثر قائم کرنے) Disaster (تباہی) ہوگی۔ کیونکہ ان کے بقول واجپائی جی بہت سست۔ کم بولنے والے اور زیادہ مؤثر نہ کرنے والے ہیں جبکہ پرویز مشرف بہت مستعد۔ تیز رفتار۔ اور چالاک ہیں۔ عالمی رائے عامہ کے سامنے پاکستان زیادہ حمایت حاصل کرے گا۔ صدر پرویز مشرف نے دہلی ایئرپورٹ پر آمد سے گارڈز آف آنر مہاتما گاندھی کی سمادھی۔ ظہرانے، استقبالیے۔ اور ضیافت سے تاج محل کی سیر تک بغیر کچھ کہے اپنے لباس کی تبدیلی۔ چال مسکراہٹوں اور بے تکلفانہ ملنے جلنے سے بھارت کے میڈیا کو حیرت میں اور بھارت کے عوام کو قربت میں ڈال لیا ہے۔ ہفتے کی صبح تک جتنا تناؤ پیدا ہو چکا تھا۔ صدر پرویز مشرف کی پر اعتماد بے تکلفی نے اسے بکھیر کر ایک نرمی میں تبدیل کر دیا ہے۔ بھارتی سرکاری حلقے سیاسی جماعتیں اور میڈیا سخت تعجب میں ہے کہ پاکستان کو آگرہ مذاکرات میں کیا مل گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وزیراعظم واجپائی اور صدر پاکستان کی تنہا ملاقات میں پاکستان کو کشمیر کے مسئلے پر کچھ اشارہ ملا ہے۔ جس کی وجہ سے صدر پاکستان سے لے کر پاکستان کے وفد کے ارکان اور پاکستانی صحافیوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہفتے کی صبح سے پاکستان اور بھارت کی قیادتوں نے ایک دوسرے کے تحمل، بصیرت، تدبر اور گہرائی کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ باور کیا جاتا ہے کہ اس پہلی تنہا ملاقات میں دونوں ملکوں کے درمیان مسائل کے انبار میں سے کچھ نکات چنے گئے۔ مسئلہ کشمیر سرفہرست ہے۔ جو پاکستان کے لیے طمانیت کا باعث ہے۔ انتہائی کشیدگی اور تلخیوں کے بعد ہونے والی اس سربراہی ملاقات کے لئے پہلے سے باقاعدہ کوئی ایجنڈا یا مذاکرات کے لیے نکات کی فہرست مرتب نہیں کی گئی تھی۔

اس لیے دونوں سربراہوں کو گزشتہ کئی سال سے دونوں ملکوں کے افق پر منڈلاتے ہوئے مسائل پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے انھیں ایک ترتیب میں لانا پڑا۔ اس ترتیب کو لے کر انھوں نے اپنے اپنے وفود کے ارکان کے ساتھ ملاقات کی دونوں وفود کے ارکان نے اپنے سربراہوں کے درمیان غیر رسمی طور پر ترتیب پانے والے نکات کو سمجھا اور بعد میں الگ الگ بیٹھ کر ان نکات کا تجزیہ کیا۔ اور پھر ترتیب دی سرکاری اور وزارتی سطح پر ترتیب پانے والے نکات شام کی سربراہی تنہا ملاقات میں سنجیدگی سے زیر غور آئے۔ صبح کو ہونے والی ملاقات کی نسبت شام کی ملاقاتوں میں رسمی انداز اور ضابطے غالب رہے۔ دونوں سربراہوں نے ایک دوسرے کے بارے میں بن ملے جو تاثرات قائم رکھے تھے۔ وہ ملنے سے دور ہو گئے ہیں۔ دونوں نے یہ جان لیا ہے کہ ایک دوسرے سے مسائل پر مفاہمت کیسے کی جا سکتی ہے۔ پاکستان کو یہ برتری حاصل ہے کہ حکومتی سطح پر سربراہی ملاقات کے سلسلے میں اختلافات نہیں ہیں بھارت کے لیے یہ مشکل ہے کہ اس کی کابینہ میں بھی ملاقات کے مخالفین ہیں۔ اور بیورو کریسی میں بھی۔ پھر بھارت کا میڈیا بالخصوص ٹی وی چینلز فوری اور قبل از وقت تبصرے کر کے کنفیوژن پیدا کر رہے ہیں۔ اور پرویز مشرف کے دو دن کی ملاقاتوں اور سرگرمیوں کے بعد آگرے کی فضا میں مذاکرات کے لیے مثبت اندازِ فکر غالب ہے۔ اگرچہ سب کو حیرت ہے کہ انتہائی متصادم اور متضاد موقف رکھتے ہوئے کون سا مشترکہ نکتہ ہے۔ جو پرویز مشرف اور واجپائی نے دریافت کر لیا ہے۔ جو مذاکرات کو آگے بڑھانے کا محرک بن رہا ہے۔ ساحر لدھیانوی نے تو کہا تھا کہ میرے محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر۔ ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق۔ تاریخ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ تاج محل کی قربت میں ہونے والی اس ملاقات میں جنوبی ایشیاء کے کروڑوں غریبوں نے امیدیں باندھ رکھی ہیں۔''

اصل مسئلہ یہی ہے کہ دونوں کے موقف متضاد اور متصادم ہیں۔ وہ مشترکہ نکتہ کون سا ہے۔ اتفاق کا مرکز یا نقطۂ آغاز بن سکتا ہے۔

16 جولائی 2001ء

صبح سویرے صدر پرویز مشرف کی ناشتے پر بھارت کے چند منتخب مدیروں کے ساتھ ملاقات ہے۔ جس کی ریکارڈنگ پی ٹی وی کی ہے۔ ہم موقع غنیمت جان کر تاج محل دیکھنے نکلے ہیں۔ ایک بار پہلے بھی تاج محل آنا ہوا تھا۔ تاج محل میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ اور نہ بھارت پاکستان کے تعلقات میں۔ محبت کی یہ امر یادگار۔ جنوبی ایشیاء میں محبتیں نہیں پیدا کر سکی ہے۔

ہوٹل واپس پہنچتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ 9 نکات پر کوئی سمجھوتہ ہو رہا ہے۔ ساڑھے چار بجے سہ پہر دستخط ہوں گے۔ سب کچھ طے ہو گیا۔

کچھ طے نہیں ہوا۔ مذاکرات ٹوٹ گئے ہیں۔ ششما سوراج آ رہی ہیں۔ وہ وضاحت کر رہی ہیں کہ انھوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔ خواہ مخواہ طوفان برپا ہو گیا ہے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ جب ایک باقاعدہ ترجمان مقرر ہے۔ آپ کو ٹی وی سے انٹرویو دینے کی ضرورت کیا تھی۔

لابیوں میں سرگوشی ہو رہی ہے کہ ششما سوراج نے جان بوجھ کر بلکہ اپل کے ایڈوانی کے کہنے پر ٹی وی میں یہ بیان دیا کہ کشمیر پر بات نہیں ہو رہی ہے۔ داؤد ابراہیم پر بات ہو رہی ہے۔ اب صدر پرویز مشرف کی ایڈیٹروں سے ناشتے پر گفتگو بھی بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ کیوں کہ اسٹار ٹی وی نے اس کی پوری فلم چلا دی ہے بھارت کے صحافی کہہ رہے ہیں۔ صدر پرویز مشرف کو یہ گفتگو نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ گفتگو ریکارڈ نہیں ہونی چاہیے تھی۔ ٹی وی چینلوں کی لڑائی نے انتہائی سنگین مذاکرات کو اپنی رقابت میں سبوتاژ کر دیا ہے۔ رات کے 10 بج گئے ہیں۔ گومگو کی کیفیت ہے۔ 11 بجے رات آخری لمحے شور مچا ہے۔ صدر پاکستان پریس کانفرنس کرنے والے ہیں۔ ہوٹل سے تمام صحافی کی قیام گاہ امرولاز کی طرف دوڑ رہے ہیں بس سے گاڑیوں سے۔

پھر آنے والے بتا رہے ہیں کہ پریس کانفرنس نہیں ہوسکی۔ اخبارنویسوں کو اندر ہی جانے نہیں دیا گیا۔ پھر ٹی وی چینل دکھا رہے ہیں۔ آخری لمحات آگئے ہیں۔ عقاب جیت گئے ہیں۔ امن کی تلاش ناکام ہوگئی ہے۔

صدر پرویز مشرف، وزیراعظم واجپائی سے الوداعی ملاقات کرکے رخصت ہورہے ہیں۔ ان کے چہرے پر اداسی ہے۔ صدر مشرف کا چہرہ سخت کھنچا ہوا ہے۔ حال واجپائی کا بھی یہی ہے۔

بھارتی ترجمان نے چند سطروں کی بریفنگ دی ہے۔ اس کے بعد کوئی سوالات طلب نہیں کیے ہیں۔ پاکستان کے صحافیوں کا اصرار ہے کہ وہ بتائیں مذاکرات کیوں ٹوٹے ہیں۔ صدر پاکستان کو پریس کانفرنس کیوں نہیں کرنے دی گئی۔ کیا انھیں نظر بند کرلیا گیا ہے۔

نروپماراؤ کو ہوٹل کی لابی تک اسی طرح گھیرے میں پہنچا دیا گیا ہے۔

بھارت سرکاری اہلکار بھی سخت غصے میں ہیں، چند بھارتی صحافی بھی۔ کہ یہ تو اخبارنویسوں کے انداز نہیں ہوتے۔ اس طرح تو دباؤ نہیں ڈالنا چاہیے۔

مغل شیریٹن کی لابیوں میں فضا بہت کشیدہ ہے۔ کچھ عقاب صحافی خوش ہیں۔ دونوں طرف ایسے اخبار نویس دانشور ہیں۔ جن کا یہ کہنا ہے کہ بہت اچھا ہوا ہے کہ کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے۔ پاکستان کے بعض صحافیوں کا کہنا ہے۔ اب صدر پرویز ہیرو بن گئے ہیں۔ تاریخ پاکستان کے ہیرو، جنھوں نے اصولوں پر سودے بازی نہیں کی۔ کشمیر کا مسئلہ پوری شدت اور اعتماد سے عین دشمنوں کے درمیان بیٹھ کر پیش کیا ہے۔ پاکستان کا سر فخر سے اونچا کیا ہے۔

بعض صحافیوں کا کہنا ہے کہ اتنا تو ہوتا ہے کہ آئندہ مذاکرات کے لیے کوئی تاریخ مقرر کرلی جاتی۔ 1972ء میں معاہدہ نہ ہوتے ہوئے کیا ہوگیا تھا۔ اب ہوتے ہوتے نہیں ہوا ہے۔

میں رات گئے اپنا یہ ڈسپیچ بھیج رہا ہوں۔

پیر کی شام بھارت کے غیر اخلاقی اور سفارتی آداب کے قطعی منافی رویے کے باعث جنوبی ایشیا میں امن کے قیام کا ایک سنہرا موقع وقتی طور پر ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ جاتے وقت صدر پاکستان کو بھارتی حکام نے پریس کانفرنس سے خطاب کی سہولت بھی سیکیورٹی کی وجوہ کا بہانہ بنا کر نہیں فراہم کی۔ باخبر پاکستانی ذرائع کے مطابق ڈیڑھ بجے دوپہر پاکستان کی طرف سے تیار کردہ ایک مسودے میں بھارت کی تجویز کردہ دو ترامیم پر رضامندی ظاہر کردی گئی تھی۔ صدر پاکستان نے بھی ان ترامیم سے اتفاق کرلیا تھا۔ یہ دونوں ترامیم کا مسئلہ کشمیر کے حل سے متعلق تھیں۔ صدر پاکستان نے لچکدار رویہ اختیار کرتے ہوئے دونوں ملکوں کے عوام کے سنگین مسائل کے حل کی خواہش میں اِن ترامیم کو قبول کرلیا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر نکات پر بھی پاکستان اور بھارت دونوں رضامند ہوگئے تھے۔ بھارت کے دفتر خارجہ کے اہلکار اس مسودے کو دوبارہ ٹائپ کرنے کے لیے لے گئے۔ اور یہ کہہ کر گئے کہ ہم اسے تیار کروا کے دستخط کرنے کے لیے لے کر آتے ہیں۔ یہ بھی طے ہوگیا تھا کہ میڈیا کے سامنے اس مسودے پر دستخط کیے جائیں گے۔ ذرائع کے مطابق جب پاکستان نے مسودے کے لیے دریافت کیا تو کہا گیا کہ وزیراعظم واجپائی کھانے میں مصروف ہیں۔ صدر پاکستان بھی دوسری طرف کھانا کھا رہے ہیں۔ یہ دونوں کھانے سے فارغ ہوجائیں۔ تو مسودہ لے آتے ہیں۔ کھانا کھانے کے قریباً ایک گھنٹے بعد صدر پاکستان نے پوچھا مسودہ کہاں ہے۔ تو بھارت کے وزیر خارجہ اور سیکریٹری خارجہ پاکستان کے وزیر خارجہ اور سیکریٹری خارجہ سے ملے۔ اور کہا کہ بھارت اس مسودے میں مزید ترامیم چاہتا ہے۔ اور تین شقوں پر اختلافات پیدا ہوگئے ہیں۔ پاکستان کی طرف سے کہا گیا کہ یہ معاملہ تو درست نہیں ہے۔ جب رضامندی ہوگئی تو ٹائپ شدہ مسودہ آنا چاہیے تھا۔ بھارتی وزیر خارجہ سے کہا گیا کہ آپ جو بھی نئی ترامیم ہیں۔ وہ لے آئیں۔ تاکہ ہم ان کا جائزہ لیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم لے کر آتے ہیں۔ اس کے بعد رات تک وہ آئے

ہی نہیں۔ صدر پاکستان نے طویل انتظار کے بعد 9 بجے کہا کہ میں واپس اپنے وطن جا رہا ہوں۔ لیکن میں واپس جانے سے پہلے پریس کانفرنس سے خطاب کرنا چاہوں گا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد یہ جواب ملا کہ سیکیورٹی وجوہ کی بنا پر پریس کانفرنس منعقد نہیں ہوسکتی۔ حالانکہ امرولاز جہاں صدر اور ان کا سرکاری وفد ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں سینکڑوں صحافی پہلے سے باہر کھڑے تھے۔ لیکن پریس کانفرنس نہیں کرنے دی گئی۔ اس تمام غیر اخلاقی اور غیر سفارتی رویے کے باوجود صدر پاکستان نے بھارتی حکام سے کہا کہ وہ روانگی سے پہلے وزیراعظم واجپائی سے الوداعی ملاقات کریں گے۔ اس الوداعی ملاقات کے لیے وہ امرولاز سے جے پی پیلس گئے۔ جہاں ان کی وزیراعظم واجپائی سے ایک گھنٹے تک ملاقات رہی۔ اس ملاقات کی تفصیلات کا علم نہیں ہوسکا ہے۔ کیونکہ بھارت کی ترجمان نروپما راؤ نے اس کے بعد اپنی بریفنگ میں صرف یہ کہا کہ وہ مایوسی سے یہ اطلاع دے رہی ہیں کہ قیام پاکستان کے لیے جس سفر کا آغاز کیا گیا تھا۔ وہ مشترکہ بیان کی منزل تک نہیں پہنچ سکا۔

انھوں نے سوالات کے جوابات دینے سے انکار کردیا اور کہا کہ منگل کی صبح دس بجے پریس کانفرنس میں تمام مسائل پر بات کی جائے گی۔ اور تمام سوالات کے جوابات دیے جائیں گے۔"

17 جولائی 2001ء

ہم اپنی بسوں سے دہلی روانہ ہورہے ہیں۔ ادھر میڈیا سینٹر میں بھارتی وزیر خارجہ جسونت سنگھ پریس کانفرنس کرنے والے ہیں۔

اب ہمیں فائیو اسٹار ہوٹل موریہ شیریٹن چھوڑ کر جنپت ہوٹل میں منتقل ہونا ہے۔ کچھ روز غیر سرکاری طور پر ٹھہرنا ہے۔ ترن وجے جی کے ساتھ ہوٹل کلیرج میں رات کا کھانا ہے۔ جہاں 'پنج جانیہ' کے ڈائریکٹرز بھی ہیں۔ بھارت کی سیاست پر بات ہورہی ہے۔ مذاکرات ٹوٹنے پر زیادہ مایوسی نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بھارتی وزیر خارجہ نے آگرے کی پریس کانفرنس میں اور پاکستانی وزیر خارجہ نے اسلام آباد میں امید کا اظہار کیا ہے۔ بات یقیناً آگے بڑھے گی۔

18 جولائی 2001ء

پران سبروال کے صاحبزادے گوتم سبروال آگئے ہیں۔ ان کے ہمراہ اپالو ہسپتال روانگی ہے۔ جہاں بھارت کے سینئر صحافی پران سبروال زیرِ علاج ہیں۔ پران سے 1972ء سے ملاقات رہی ہے۔ وہ پاکستان میں صدر بھٹو سے انٹرویو کرنے آئے تھے۔ بہت بے باک، دبنگ اخبارنویس۔ کتنی ہی حکومتوں سے ٹکراتے رہے ہیں۔ اپالو ہسپتال میں ایک دنیا بسی ہوئی ہے۔ یہ پورا ایک شہر ہے۔ سیکورٹی کا سخت انتظام بہت بڑا ہال کئی ائیرپورٹوں پر اتنے بڑے لاونج نہیں ہوں گے۔ یہیں کیفے ٹیریا ہے۔ انٹرنیٹ ہیں، پبلک کال آفس ہیں، بیرون ملک رہنے والے کسی بھارتی ڈاکٹر نے یہ ہسپتال بنایا ہے۔ جدید ترین آلات ماہر معالجین، طویل برآمدے، وسیع کشادہ لفٹیں، ایک ہجوم، ایک نظم وضبط۔

میں اور پران گزشتہ 29 سال کی یادیں تازہ کررہے ہیں۔ انتہائی شدید علالت کے باوجود ان کا ذہن حاضر ہے۔ قوت حافظہ عروج پر ہے۔ وہ پاکستان کے وزیر خارجہ کی صلاحیتوں اور استعداد کے بہت قائل ہیں۔

ان کی بیگم اور صاحبزادے کہہ رہے ہیں۔ آج بہت عرصے بعد انھوں نے کسی سے اتنی طویل گفتگو کی ہے۔ ورنہ یہ پانچ دس منٹ بات کرکے منہ پھیر لیتے تھے۔ آج یہ واپس اپنی فارم میں آگئے ہیں۔

اب ہم پاکستان کے ہائی کمشنر جناب اشرف جی قاضی کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ ایک منجھے ہوئے ڈپلومیٹ۔ حالات وواقعات پر گہری نظر رکھنے والے اور مملکت پاکستان کی پالیسیوں کے مکمل علمبردار وہ خاصے پرامید ہیں۔ ان سے ملاقات کے بعد یہ ڈسپیچ بھیج رہا ہوں۔ جس سے صورتِ حال سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔

بھارت میں پاکستان کے ہائی کمشنر اشرف قاضی نے کہا ہے کہ آگرہ مذاکرات کے نتیجے میں اگرچہ کوئی

دستاویز دستخطوں کے ساتھ جاری نہیں ہوئی ۔ لیکن صدر پاکستان اور بھارتی وزیراعظم کے درمیان 8 معاملات پر بھرپور مفاہمت ہوئی ہے۔ دستاویز جاری ہوتی تو یہ معاملات اس میں شامل ہوجاتے۔ اب ان پر مزید گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔ ان پر عملدرآمد کی ابتدا ہوجائے گی۔ انھوں نے کہا کہ دونوں لیڈروں کے درمیان مسئلہ کشمیر پر بہت طویل اور باربار گفتگو ہوئی ہے ۔ اس کے بعد دونوں وزرائے خارجہ بھی جموں کشمیر کے مسئلے سے متعلق نکتے پر رضامند ہوگئے تھے اور اسے اعلان آگرہ میں سرفہرست شامل کیا جارہا تھا۔ لیکن بھارتی مرکزی کابینہ نے اسے دوبارمسترد کردیا جوافسوس ناک ہے۔

یہ پاکستان کی کام یابی ہے کہ وزیراعظم بھارت اور وزیرخارجہ کشمیر کے متعلق نکتے پر اتفاق کرگئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ جن نکات پر مفاہمت ہورہی تھی۔ ان میں سارک کانفرنس کا انعقاد۔ آئندہ میٹنگوں کے لیے ایجنڈے کی تربیت۔ ستمبر میں دوبارہ سربراہی ملاقات ہرسال سربراہی ملاقات۔ وزرائے خارجہ کی سال میں دوبارہ ملاقاتیں بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ صدر پاکستان کی طرف سے بھارتی وزیراعظم کو پاکستان کے دورے کی دعوت بھی طے شدہ نکات میں شامل تھی۔ انھوں نے کہا کہ آگرہ مذاکرات کسی صورت میں ناکام نہیں رہے ہیں۔ دونوں لیڈروں نے بہت سے تنازعات اور معاملات پر جو مفاہمت حاصل کی ہے۔ اس سے جنوبی ایشیاء کے حالات میں بہتری لانے کے لیے راہ ہموار ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان کو اس موقع سے بہت سیاسی اور سفارتی فوائد حاصل ہوئے ہیں جن میں کل جماعتی کانفرنس کے رہنماؤں سے ملاقات سرفہرست ہے۔ صدر پاکستان کی بھارت کے سابق وزرائے اعظم، دانشوروں، اورصف اوّل کے ایڈیٹروں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ جن کے ذریعے پاکستان کا نقطہ نظر بھارت کے اکثر حلقوں تک پہنچے گا۔ انھوں نے کہا کہ صدر پاکستان کے نہر والی حویلی اور تاج محل کے دورے سے بھارت کے عام شہریوں تک یہ تاثر پہنچا ہے کہ صدر پاکستان کشمیر کے مسئلے پر سخت موقف رکھتے ہیں۔ وہ اصول پر ڈٹتے ہیں۔ لیکن وہ عام زندگی میں وہی محسوسات اور جذبات رکھتے ہیں جو دوسرے انسانوں کے ہوتے ہیں• انھوں نے کہا کہ ہم الزام تراشی سے ماحول خراب نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ ان مذاکرات نے مفاہمت کے ایک اچھے سلسلے کا آغاز کیا ہے۔ پاکستان نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ 9 نکات پر دونوں سربراہوں، وزرائے خارجہ کے درمیان مفاہمت ہوچکی تھی۔ لیکن بھارتی کابینہ کی طرف سے مسئلہ کشمیر سے متعلق نکتے پر رضامندی نہ ہونے کے باعث یہ دستاویز جاری نہیں ہوسکی۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اس سربراہی ملاقات کے لیے ایجنڈا اس لیے نہیں رکھا گیا تھا کہ یہ ایک Retreat خلوت کی میٹنگ تھی۔ ایسی میٹنگوں کے لیے ایجنڈے تیار نہیں کیے جاتے۔ نہ پہلے سے جوائنٹ سیکریٹری یا سیکریٹری کی سطح پر میٹنگیں کرکے کاغذات تیار کیے جاتے ہیں۔ ایسی سربراہ ملاقاتوں میں میڈیا کو بھی اتنی رسائی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ خلوت اور گوشہ نشینی کا مطلب تو دونوں سربراہوں کو زیادہ سے زیادہ الگ اور سکون سے بات کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ لیکن آگرے میں میڈیا کا دباؤ اتنا بڑھا دیا گیا کہ اس سے حالات خراب ہوتے رہے۔ اس میں بھارتی وزیراطلاعات کی گفتگو نے غلط تاثر دیا۔

یہ تو میراڈ سپیچ ہے۔

پاکستان ایک سفارتی حملہ کررہا ہے۔

صدر مملکت دو روز بعد پریس کانفرنس کررہے ہیں جس میں وہ تمام معاملات کو دنیا کے سامنے رکھنے والے ہیں۔ اس کے لیے بھارتی صحافیوں کو دعوت دی جارہی ہے کہ جو بھی جانا چاہے اس کو فوری طور پر ویزا دیا جائے گا۔

منسٹر انفارمیشن کامران علی خان کے پاس بھارتی صحافیوں کے فون آرہے ہیں۔ کافی بڑی تعداد اسلام آباد جانا چاہتی ہے۔ یہ ایک اچھی سفارتی کوشش ہے۔

اب ہماری منزل وزارتِ اطلاعات ونشریات کے دفاتر ہیں۔ جہاں ہمیں وزیر اطلاعات ونشریات ششما سوراج سے کچھ رسمی کچھ غیررسمی گفتگو کرنی ہے۔

ششما جی۔ اردو بھی روانی سے بولتی ہیں۔ پنجابی بھی، اور انگریزی بھی، ان کے ہاں وزارت اطلاعات کا دائرہ کا زیادہ وسیع ہے۔ ہمارے ہاں تو اب وزیر ہی نہیں ہے۔

رات گئے۔ شاعروں، ادیبوں سے ملنے کا ارادہ ہے۔ نعمان شوق سے خط وکتابت ایک عرصے سے تھی۔ آج ان سے پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ مشرف عالم ذوقی ناول لکھتے ہیں۔ ٹی وی پر سیریل لکھتے ہیں۔ سب کو فکر ہے۔ پاکستان بھارت تعلقات میں ابتری کی۔

19 جولائی 2001ء

صبح ساڑھے چھ بجے ہیں۔ میں بستی نظام الدین اولیا کی طرف روانہ ہوں۔ دلی آئیں اور یہاں حاضری نہ دیں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ عقیدتیں بکھری ہوئی ہیں۔ چادریں، پھول، اور مسلمانوں کی پسماندگی کے آثار۔ میں اخبارات خریدنے رک گیا ہوں۔ انگریزی، اردو، ہندی کے بارہ تیرہ اخبارات خریدے ہیں۔ اور سب کی قیمت صرف 17 روپے ادا کی ہے۔ ہمارے اور یہاں کے اخبارات کی قیمتوں میں کتنا فرق ہے۔

موسم بھیگ رہا ہے۔ ہم بازاروں میں کتابیں اور سوغاتیں تلاش کررہے ہیں ۔ پھر ٹائمز آف انڈیا میں خبروں اور تصویروں کے تبادلے کے سلسلے میں دلیپ گوانکر...... انجلی سے ملاقاتیں۔ دل ڈھل رہا ہے ۔ پر ان سبروال کی دانشمند، مدبّر صاحبزادیاں آئی ہوئی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ دوستی اگلی نسل تک بھی جاری رہنی چاہیے۔ گوری سبروال، جن کی ایل کے ایڈوانی کے صاحبزادے سے شادی ہوئی تھی۔ لیکن اب یہ بندھن ٹوٹ رہا ہے۔ اخبارات میں بھی اس کی گونج ہے۔ پران سبروال کا گھرانہ ایک لبرل سیکولر گھرانہ ہے۔ ایڈوانی جی کے ہاں سخت ہندوازم، تعصب' یہ رشتہ جاری نہ رہ سکا۔ ان سے بڑی گوپا سبروال نے میلنیم پر تحقیق کی ہے۔ ایک ضخیم کتاب شائع کی ہے۔ وہ اپنی یہ کتاب انکل کو پیش کررہی ہیں۔ پران جی نے اس کے لیے خاص طور پر کہا ہے۔

دوردرشن سے آل انڈیا ریڈیو سے پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا شروع ہوگیا ہے۔ ہم پھر آگرے سے پہلے والے دور میں پہنچ چکے ہیں۔

20 جولائی 2001ء

آج بھارت میں آخری دن ہے۔ گوتم سبروال کچھ رسالے لے کر پہنچ گئے۔ چنچ جانیہ کے ترن وجے سے مقابلے کے خوش نصیبوں کے پاکستان اور بھارت کے دوروں کا فیصلہ بھی کرنا ہے ایک غیررسمی ملاقات وزیرداخلہ ایل کے ایڈوانی سے۔

ان کا دفتر بہت شکوہ ہے۔ یہ انگریز کے دور میں برصغیر پر حکومت کرنے والی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر قانون کا دفتر ہوتا تھا۔ چھت پر۔ دیواروں پر اس حوالے سے پینٹنگز بنی ہوئی ہیں۔ ایڈوانی جی کو افسوس ہے کہ پاکستان میں انھیں ولن کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مذاکرات کو سبوتاژ کرنے والا قرار دیا جاتا ہے۔ ان سے بات چیت آف دی ریکارڈ ہے۔ وہ کسی وقت طویل انٹرویو دیں گے۔ ان کی خواہش ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات معمول پر آجائیں۔

ترن وجے اس ملاقات کے بعد رخصت ہورہے ہیں۔

ائیرپورٹ تک ہمیں چنچ جانیہ کے الوک گوسوامی نے پہنچادیا ہے۔ راستے میں فوٹوگرافر سے تمام تصویریں لینے کا انتظام بھی تھا۔ چنچ جانیہ نے اس دورے کے قیام کے دوران بھرپور پروٹوکول دیا ہے۔

ادھر والی ائیرپورٹ پر۔ جہاں سے ہم دوبارے آبرو ہوکر نکلے ہیں۔ کئی خدشات اب بھی ہیں۔ لیکن پی آئی اے کی گیتو نے اپنی مسکراہٹوں اور نفاستوں کے ساتھ ان مراحل کو آسان کردیا ہے۔

پی آئی اے ہمیں کراچی لے آئی ہے۔ پاکستان بھارت تعلقات ایک بار پھر اس سطح پر ہیں جہاں وہ اکثر رہتے ہیں۔

☆☆☆

''آپ نئی دہلی جارہے ہیں؟''

''پان امریکن کے کاؤنٹر انچارج نے میرا ٹکٹ دیکھا اور پھر حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اسی حیرت میں ڈوبے ہوئے اس نے کہا۔

''اپنا پاسپورٹ دکھایئے۔''

پاسپورٹ پر سوئٹزرلینڈ کے سفارت خانے کی طرف سے ہندوستان کے لیے ویزے کی مہر دیکھ کر اسے اطمینان ہوگیا، اور اس نے مجھے بورڈنگ کارڈ دے دیا۔

اس زمانے میں واقعی یہ حیرت کی بات ہے کہ ایک پاکستانی بھارت جارہا ہے، جبکہ بھارت اور پاکستان کے درمیان سفارتی تعلقات نہیں ہیں، سرحدیں بند ہیں۔ خود جانے والا بھی کافی تذبذب کے عالم میں رہتا ہے۔ پرواز میں کچھ وقت باقی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ایک دشمن ملک میں وقت کیسے گزرے گا۔ پرواز کے لیے اعلان ہوتا ہے تو میں اپنا بیگ اُٹھا کر سامنے کھڑی بس میں جانا چاہتا ہوں، میں پہلا مسافر ہوں۔ بس کی کھڑکی میں سے میں دیکھتا ہوں کہ تمام مسافر حفاظتی بکس میں سے گزر کر آرہے ہیں۔ جائزہ لیا جارہا ہے کہ کوئی جہاز ہائی جیک نہ کرلے۔ میں اس بکس میں سے گزرے بغیر ہی چلا آیا ہوں، کسی نے روکا نہ ٹوکا۔ اتنے حفاظتی اقدامات پھر بھی بھول چوک ہوجاتی ہے، یہی بھول چوک بعض اوقات بڑے واقعات کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ میں اپنا نفسیاتی تجزیہ کرتا ہوں۔ میرا جہاز ہائی جیک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور میرے پاس اصلی تو کیا نقلی پستول بھی نہیں ہے۔

جمبو جیٹ کی وسعتیں میری منتظر ہیں۔ بیٹھنے کی ہی نہیں لیٹنے کو بھی وافر جگہ ہے۔ کافی وسعت اور اس کے ساتھ ساتھ ویرانی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اس وقت پی آئی اے کی یاد ستا رہی ہے۔ اپنا وطن پھر بھی اپنا وطن ہے۔ جہاز پرواز کا آغاز کرتا ہے تو اناؤنسر کی آواز بلند ہوتی ہے۔

''صبح بخیر۔ ہم ایک گھنٹہ 20 منٹ کی پرواز کے بعد دہلی میں جا پہنچیں گے۔''

صرف ایک گھنٹہ 20 منٹ کا فاصلہ...... کراچی اور دہلی کے درمیان...... پاکستان اور ہندوستان کے درمیان۔ کیونکہ میرے پاس خصوصی ویزا ہے۔ خصوصی اجازت ہے۔ ورنہ دہلی اور کراچی کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے۔ کتنے خاندان بٹے ہوئے ہیں۔ مہینوں خیریت کی اطلاع نہیں ملتی ہے۔ میرے ساتھ کتنے ہی ایسے خاندانوں کے خطوط ہیں جو مجھے دہلی جا کر ڈاک کے حوالے کرنا ہیں، جن سے یکطرفہ خیریت کی اطلاع مل جائے گی، جانے کتنے دلوں کو سکون نصیب ہوجائے گا۔ یہ خاندان ایک عرصے سے منتظر ہیں کہ راستے کھلیں اور وہ اپنے خاندانوں کی خیریت جان سکیں، یا توفیق ہو تو خود بھی جاسکیں کتنے فاصلے ہیں۔ یوں صرف ایک گھنٹہ بیس منٹ کا فاصلہ...... جو پلک جھپکتے گزر جائے گا۔ ہندوستان کتنا قریب ہے مگر کتنا دور ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ فاصلے بڑھتے جارہے ہیں کچھ سیاسی مصلحتیں، کچھ سیاسی غلطیاں، کچھ بین الاقوامی طاقتوں کے مفادات کچھ بھارت کے حکمرانوں کی توسیع پسندی کا جنون۔ کچھ پاکستان میں جمہوریت کا فقدان۔ سب عوامل نے مل کر ان ہمسایوں کو نزدیک نہیں آنے دیا۔ معاہدہ شملہ کے بعد ایک نیا باب شروع کرنے کی خواہش کی گئی ہے، لیکن ماضی کی تلخیاں راہ میں بار بار دیوار بن رہی ہیں۔ ہندوستان کی خواہش ہے کہ اب کے پاکستان کو شکست ہوئی ہے، اب کے تمام اگلے پچھلے جھگڑے چکا لیے جائیں، اسی لیے پاکستان کے 90 ہزار جنگی قیدیوں کو رہا کرنے سے پہلے ہندوستان کی طرف سے مختلف شرائط عائد کی جارہی ہیں۔ اسے بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے فیصلے سے منسلک کیا جارہا ہے۔ پاکستان بہرحال بنگلہ دیش کو ضرور تسلیم کرے گا، لیکن پاکستان کی طرف سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے اور دوسرے ملکوں کی طرف سے تسلیم کرنے میں بہت فرق ہے، اسی لیے اس میں تاخیر ناگزیر ہے۔ عجلت میں اور دباؤ کے تحت

بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے برصغیر میں امن قائم نہیں ہوگا، کیونکہ مجبوری کے تحت کیے گئے فیصلے ہمیشہ عارضی اور وقتی ہوتے ہیں۔

میں انہی سوچوں میں گم ہوں، پین ایم کی ایئر ہوسٹس چائے وغیرہ کے لیے پوچھتی ہے، میں شکریہ کے ساتھ انکار کردیتا ہوں، رات کے چار بجے بھی کوئی چائے پیتا ہے۔ امریکیوں کو کیا ہوگیا ہے۔ لیکن وہ بے چاری بھی تو اپنے اس مسافر کی خدمت اسی عرصے میں کرسکتی ہے۔ دہلی ایئرپورٹ آگئی ہے جمبو جیٹ کے گیئر اچھی خاصی آواز پیدا کرتے ہیں، کپتان نے پہلے ہی خبردار کردیا تھا کہ گیئر کی آواز ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے، اس لیے دہشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، میں شیشے میں سے دہلی ایئرپورٹ کو دیکھ رہا ہوں۔ آخر شب میں پالم ہوائی اڈے پر ہوں۔ آج 13 فروری ہے۔ مقامی وقت پانچ بج کر تیس منٹ ہے۔ کچھ مسافر ٹرانزٹ میں چلے گئے ہیں، اور ہمیں امیگریشن اور کسٹم وغیرہ کے مراحل سے گزرنا ہے۔ اتنے سارے مسافروں میں سے صرف ایک میں پاکستانی ہوں۔ مسافروں کے خیر مقدم کے لیے ان کے عزیز رشتے دار آئے ہوئے ہیں، اگر بھارت کے فارن آفس (وزارت خارجہ) والوں کو اطلاع مل گئی ہوگی، تو شاید کوئی آیا ہو۔ مگر یہاں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ میں نے آمد کا کارڈ پر کیا۔ خدشے اور وسوسے تو بہت ہیں صحت کے سرٹیفکیٹ دیکھنے والا امیگریشن افسر پہلا بھارتی ہے جس سے میرا سابقہ پڑا ہے۔ بہت شائستگی سے پیش آتا ہے میرے پوچھنے پر بتاتا ہے کہ فارن آفس کی طرف سے کوئی اطلاع تو نہیں ہے، لیکن آپ فکر نہ کریں، یہاں انتظار کرلیجے گا، امیگریشن کے مرحلے میں بہت تاخیر ہوتی ہے۔

مجھے کارڈ میں نیشنلٹی کے خانے میں پاکستان لکھتے ہوئے دہلی کے ایئرپورٹ پر جتنا فخر محسوس ہوتا ہے۔ شاید ہی زندگی میں کبھی ہوا ہو...... پاکستانیوں کے لیے امیگریشن کے فارم مختلف ہیں آج کل ان کی کبھی کبھار ضرورت پڑتی ہے، اس لیے افسر انہیں ساتھ رکھ کر نہیں بیٹھے ہیں۔ مجھے امیگریشن افسر نے بیٹھنے کے لیے کہا ہے۔ اس پرواز کے علاوہ ایک اور پرواز کو نبٹانے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہیں انہوں نے اپنی ساری فائلیں دیکھ لی ہیں، میرے بارے میں انہیں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ کئی جگہ فون کیے، وقت گزر رہا ہے۔ دو گھنٹے ہوگئے ہیں۔ میں کچھ فون کرنا چاہتا ہوں، ڈائریکٹری میں ایکسٹرنل پبلسٹی کے ڈائریکٹر جے این بھٹ کا فون تلاش کرتا ہوں۔ ڈائریکٹری 1971ء کی چھپی ہوئی ہے، اس میں اُن کا نمبر نہیں ہے۔ اپنے ایک اور دوست کے نمبر ڈھونڈتا ہوں، وہ دہلی سے باہر گئے ہوئے ہیں پھر اپنے ایک اور دوست ہندوستان ٹائمز کے بیورو چیف پران سبروال کا نمبر مل جاتا ہے، انہیں فون کرتا ہوں۔ بے انتہا خوش ہوتے ہیں میں صورتِ حال بتاتا ہوں، پوچھتے ہیں کہاں ہو۔

کسٹم کے مرحلے میں۔

''وہیں رُکو۔ میں پہنچ رہا ہوں۔''

اس وقت پران سبروال میرے لیے فرشتۂ رحمت ثابت ہوتے ہیں۔ پران خالص پنجابی ہیں۔ میں کسٹم سے فارغ ہوکر باہر نکل آیا ہوں۔ ایئرپورٹ کا کرایہ بھی دینا پڑتا ہے۔ اس کے لیے مجھے ڈالر انڈین کرنسی میں تبدیل کروانا پڑتا ہے ایک ڈالر کے سات روپے اسی پیسے ملتے ہیں۔ ایک ڈالر تقریباً 11 پاکستانی روپوں کا ملا تھا۔ کتنا فرق پڑ گیا ہے۔ ایئرپورٹ سے باہر نکلتا ہوں، ٹیکسی ڈرائیور آلیتے ہیں، صاحب چلیے۔ آپ کو ڈالر کے اچھے پیسے دلوا دیں گے۔'' اس کے بعد ایک اور ٹیکسی ڈرائیور آتا ہے، وہ بھی یہی پیشکش دہراتا ہے۔ پران کے آنے تک کافی ٹیکسی ڈرائیور یہ پیش کش کرچکے ہیں، ایئرپورٹ کا یہ حصہ کافی بے رونق ہے۔ ہندوستان کی بنی ہوئی ایمبیسیڈر گاڑیاں اور وہیں تیار شدہ فلیٹ کاریں، نظر آتی ہیں، پرائیویٹ بھی اور ٹیکسیاں بھی...... پران مجھے اشوکا ہوٹل لے گئے ہیں، یہاں کمرہ لینے کے بعد پران فارن آفس کو اطلاع دیتے ہیں۔ انہیں علم نہیں ہے، خیر بارہ بجے کے قریب فارن آفس سے ایک صاحب

مسٹر سی ڈی شرما آتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ساڑھے چار بجے مجھے بھارتی وزارتِ خارجہ کے شعبۂ پاکستان کے انچارج مسٹر اشوک چب سے ملنا ہے۔ میں آپ کو یہیں سے لے جاؤں گا۔ اسی عرصے میں پریس ایشیا انٹرنیشنل کے دیوان بریندر ناتھ اور ان کی بیگم منور ما دیوان بھی تشریف لے آتے ہیں۔ ان سے ملاقات رہتی ہے۔ پھر پران سبروال اور ان کے ایک دوست 'سیکولر ڈیموکریسی' کے ایڈیٹر مسٹر گوئل بھی آ گئے ہیں۔ سیکولر ڈیموکریسی ایک پرچہ ہی نہیں ایک تحریک ہے۔ کانگریس کے رکن پارلیمنٹ شری متی جوشی اس کی قائد ہیں۔ جن سنگھ ان کی سخت مخالف ہے۔ ان کے خلاف اخبر بیانات جاری کرتی رہتی ہے۔ گوئل صاحب سے ملاقات کے بعد پران مجھے فارن آفس لے چلے ہیں۔ دہلی کا سیکریٹریٹ انگریز کے زمانے کا بنا ہوا ہے۔ اس میں ایک شکوہ ہے۔ برصغیر کے فنِ تعمیر کا مظہر، جدید دور کے سیکریٹریٹ اس طرزِ تعمیر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بھارتی حکومت نے دفاتر کے لیے نئی عمارات بنائی ہیں، وہ ان کے مقابلے میں ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ فارن آفس کے ملاقاتی کمرے میں بیٹھے کنول تجشی سے ملاقات ہوتی ہے، وہ کراچی کے بھارتی ہائی کمیشن میں ہوتے تھے۔ بعد میں اشوک چب صاحب سے تفصیلی ملاقات ہوتی ہے۔ وزارتِ خارجہ کے جوائنٹ سیکریٹری اور شعبہ پاکستان کے انچارج سے میں پاکستان اور بھارت کے درمیان موجود مسائل پر بات کر رہا ہوں۔ گفتگو سے انتہائی خلوص جھلک رہا ہے اور باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ واقعتاً پاکستان سے اچھے تعلقات کے خواہشمند ہیں اون کا زور اس بات پر ہے کہ آپس میں غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے رسل و رسائل اور ذرائع مواصلات کی بحالی ضروری ہے۔ کم از کم اخبارات اور رسائل کا تبادلہ ضروری ہے۔ تاکہ مسائل سے براہ راست آگاہی ہو سکے۔ میں اپنی معلومات کے مطابق ان کی بہت ہی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں، بنگلہ دیش کے مسئلے پر بات ہوتی ہے میں نے کہا کہ میں ذاتی طور پر بھی اور پاکستان کے لوگ بھی جنگی قیدیوں کی واپسی اور بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے میں کوئی ربط نہیں سمجھتے، دونوں اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں اور انتہائی بھی۔ بنگلہ دیش کے تسلیم کیے جانے کی بات چل رہی تھی تو اس کے ساتھ ساتھ شیخ مجیب الرحمٰن سے جولائی میں صدر بھٹو کی ملاقات کی بات بھی ہوئی تھی، جس سے شیخ صاحب نے انکار کر دیا اور اس طرح سارا مسئلہ اُلجھ گیا، اسی لیے یہ مسئلہ پاکستان نے قومی اسمبلی میں پیش نہیں کیا۔ پاکستان کے عوام صدر بھٹو کے اس مؤقف کو حق بجانب خیال کرتے ہیں کہ شیخ صاحب سے صدر بھٹو کی ملاقات پہلے ہونی چاہیے کیونکہ بہت سے مسائل پر پہلے کچھ بات اور مفاہمت ہو جائے۔ جو بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے بعد بھی تلخیوں کا سبب بنے رہیں گے اور اس دباؤ اور تلخیوں کے درمیان اگر پاکستان اسلام آباد سے ہی Recognitin کا اعلان کر دے، اس سے تلخی اور نفرت میں کمی نہ ہوگی، اس لیے ہندوستان کو پاکستان پر یہ دباؤ نہیں ڈالنا چاہیے بات چیت اچھے دوستانہ ماحول میں ہو رہی ہے۔ انگریزی، پنجابی اور اردو، تینوں زبانیں استعمال کی تھیں۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ آپ کی طرف سے ایک بھی تو خیر سگالی کا اظہار نہیں ہوا۔ آپ شہری قیدیوں کو ہی رہا کر دیتے' بچے ہیں، شیر خوار بچے، نوزائیدہ بچے، عورتیں اُن کا کیا قصور ہے۔ ہمارے صحافی ہیں۔ ٹیلی ویژن کے کیمرہ مین ہیں پروڈیوسر ہیں۔ یہ تو اپنے ملک میں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے، صحافیوں کے ساتھ ہمیشہ اخلاقی طور پر کچھ ترجیحی سلوک ہوتا ہے۔ میں نے کہا اردو کے مشہور شاعر حفیظ ہوشیار پوری کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے، ان کی بیٹی عصمت، اپنے خاوند کے ساتھ جنگی قیدیوں کے کیمپ میں ہیں، مرتے دم ان کے منہ پر اس بچی کا نام تھا۔ آخر ان لوگوں نے کیا قصور کیا؛ اور ان کو یرغمال رکھ کر آپ کو کیا ملے گا۔ آپ کی طرف سے کچھ تو خیر سگالی کا مظاہرہ ہو۔

میں نے اپنی بات کہہ ڈالی ہے انہوں نے اپنی بات کہی وہ تو بہر حال سرکاری افسر ہیں، اس لیے سرکار کی ترجمانی ان کا فرض ہے۔ میں نے ایک پاکستان اخبار نویس کی حیثیت سے بات کی ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ آپ ہندوستان میں گھومیے، پھریے لوگوں سے ملیے، دیکھیں آپ کیا تاثرات لے کر جاتے ہیں۔

میں اشوکا میں واپس چلا آیا ہوں۔ اب میں سرکاری مہمانداری میں ہوں۔ ہندوستان جانے والے صحافیوں میں بعض کو بھارتی حکومت نے براہِ راست دعوت دی ہے۔ اس میں روزنامہ 'ڈان' کے دو حضرات جو پہلے ہو آئے ہیں اور مزید دو صحافی ہیں، وہ بھی ڈان کے ہی ہیں۔ کچھ صحافیوں کے لیے انہوں نے حکومتِ پاکستان سے کہا کہ وہ کچھ لوگوں کو بھجوائیں۔ ان میں سے دو جا چکے ہیں۔ میں پہلا صحافی ہوں۔ جسے نہ بھارت سرکار نے بلایا ہے اور نہ حکومتِ پاکستان نے بھجوایا ہے۔ اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔ یہ بھارتی وزارتِ خارجہ کی صوابدید کہ انہوں نے میرے پہنچ جانے کے بعد فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ میرے لیے بھی سرکاری مہمانداری کا انتظام کریں اور یوں مجھے بھارت سرکار کو کافی مالی گزند پہنچانے کا موقع مل گیا ہے۔ اشوکا پانچ ستاروں والا ہوٹل ہے۔ بھارت کی سیاحتی کارپوریشن کے زیر انتظام ہے۔ بہت بڑا ہوٹل ہے۔ ساڑھے چار سو سے زیادہ کمرے ہیں اور بے پناہ سہولتیں ہیں۔

دہلی میں یہ میری پہلی رات ہے، آج کوئی پروگرام نہیں ہے، اس لیے ہوٹل میں ہی رہتا ہوں، ہوٹل کی کھڑکی سے دہلی کی روشنیاں دیکھتا ہوں، جو خاصی مایوس کن ہیں۔ دہلی 'اپنے کو' کچھ جچ نہیں رہا ہے۔ یا یہ شہر کا سب سے ویران حصہ ہے۔

یہ نئی دہلی کی ویران روشنیاں ہیں۔

آج مجھے پرانی دلی میں جانے کا اتفاق بھی ہوا ہے، اپنے ایک دوست کے عزیزوں کے ہاں کچھ خطوط اور سامان پہنچانا تھا۔ میں ایک ٹیکسی سے کوچہ بلی ماراں پہنچا ہوں۔ اس کے بعد پیدل چلنا ہے۔ یہ پرانی دلی ہے غالب و میر کی۔ یہی وہ کوچے ہیں جو اوراقِ مصور تھے، مسلمانوں کی تاریخ یہاں انگڑائیاں لے رہی ہے، اب یہاں کچھ مکانوں اور دکانوں میں ہندو بھی آ بسے ہیں۔ دلی کے ان کوچوں میں صدیاں سانس لیتی محسوس کی جا سکتی ہیں۔ میں اپنی تاریخ کے اوراق میں گم ہو گیا ہوں، ان کوچوں سے گلیوں سے، حویلیوں سے صدیاں سال، ماہ، دن لمحے کس طرح گزرتے رہے ہیں۔ ان تنگ تنگ کوچوں میں جو اپنائیت ہے، دیواریں جس طرح بغل گیر ہونے کو ہوں، دروازے جیسے نیم والب، کھلی اور بڑی سڑکوں جدید بنگلوں میں یہ لگاؤ کہاں ہے، یہاں ٹریفک رینگتا ہے۔ کاریں، ٹیکسیاں تو اِدھر آ ہی نہیں پاتیں، سائیکل رکشے، سائیکل، اسکوٹر ٹھیلے، ریڑھے اور انسان، سب رینگتے ہیں اور کبھی کبھی ایک ٹھہراؤ آتا ہے۔ سب رُک جاتے ہیں، چیخیں شور اور پھر روانی۔

مجھے وہ مکان مل گیا ہے۔ مکین نہیں ملا، امانت ہمسائے کے سپرد کر کے میں تاریخ کے ان اوراق کو تیزی سے الٹتا پھر بیسویں صدی میں لوٹ آیا ہوں، جہاں سے بھاگ رہے ہیں، ٹیکسیاں، گاڑیاں، بسیں۔

دہلی کی صبح

نئی دلی اور پرانی دلی میں صدیوں کا فاصلہ ہے۔

دلی کی صبح...... نئی دلی میں کوئی خاص نہیں لگتی۔

آج دس محرم ہے۔ مجھے ایک سیکولر لیکن ہندو اکثریت کے دیش میں شعیہ بھائیوں کو دیکھنا ہے کہ یہاں عزاداری حسین کا کیا عالم ہے۔ میرے ساتھ ترکی کی ایک بزرگ خاتون صحافی بھی تعزیے اور ماتم دیکھنے جا رہی ہیں۔ مسز ادیبہ دلو کردار۔ پاکستان بھی آ چکے ہیں، ہمارے دفتر میں بھی آئی تھیں، دشمن ملک میں اپنے ایک دوست ملک کی خاتون صحافی سے ملنا کافی دلچسپ ہے اس ترک خاتون کے لیے تو یہ ایک خبر ہے کہ ہندوستان میں ایک پاکستانی صحافی۔ جبکہ دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات نہیں ہیں۔ وہ مجھے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہیں، ہم جامع مسجد میں جا پہنچے ہیں۔ لال قلعہ، عظمت رفتہ کی یادگار۔ اب جس پر ہندوستان کا ترنگا لہرا رہا ہے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں کا تصور میرے ذہن میں بچپن سے تھا۔ میں یہاں آیا تھا۔ اب سیڑھیاں، جھونپڑیوں میں چھپ گئی ہیں۔ سامنے

کی طرف جھونپڑیاں ہی جھونپڑیاں ہیں، یہ کون لوگ ہیں، مسلمان ہیں، جامع مسجد کے میناروں کے سائے میں پناہ لے رکھی ہے۔ جامع کی خوبصورتی بھی اس سے متاثر ہو رہی ہے اور اتنے بڑے شہر کے عین قلب میں جھونپڑیوں میں لوگ کیوں رہتے ہیں۔ میں نے بعد میں ایک مسلمان سے ہی پوچھا ہے کہ یہ کیا مسئلہ ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ حکومت انہیں متبادل جگہ تو دینے کو تیار ہے۔ لیکن یہ کہتے ہیں کہ اس طرح مسلمان بکھر جائیں گے۔ ایک سیکولر ملک میں بھی اقلیت کو بکھر جانے کا خوف کیوں ہے۔ یہ مسلمانوں کی سیاسی عقلمندی ہے یا حماقت۔

اِدھر مسلم مملکت میں مسلمان اکٹھے رہتے ہوئے بھی کس طرح بکھرے ہوئے ہیں۔

میں اور ترک خاتون جامع مسجد کی سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں۔ سیڑھیاں، ہماری تاریخ کے باب، دروازے پر اس ترک خاتون کو ایک جمپر پہنا دیا جاتا ہے تاکہ گھٹنے ننگے نہ رہیں، یہ انتظام وقف بورڈ کے ذمے ہے۔ کیمرہ اندر لے جانے کے پچاس پیسے دینے پڑتے ہیں۔ مسجد میں مرمت ہو رہی ہے۔ یہ مسجد جس سے کتنی صدیوں کی تاریخ وابستہ ہے اس مسجد کے میناروں نے جانے کتنے دور، کتنے بحران، کتنے حادثے، کتنے سانحے گزرتے دیکھے ہیں، کبھی یہ صحن سجدہ گزاروں سے معمور رہتا ہوگا، آج یہاں غیر ملکی سیاح، ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے ہندو، سکھ، مسلمان سب گھوم رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے۔ سب گھوم پھر رہے ہیں، جیسے پکنک کی جگہ ہو۔ وسیع صحن میں حوض کے پاس نمازیوں کے لیے صرف ایک صف بچھی ہے۔ باقی پوری مسجد۔ تفریح گاہ بنی ہوئی ہے۔ مینار پر اور اِدھر گیلری میں ہپی ٹورسٹ گھوم رہے ہیں۔ مسجد کا احترام کیا ہوا۔ یہ کس کا قصور ہے۔ ہندوؤں کا، مسلمانوں کا لیکن مسجد کا انتظام تو دہلی وقف بورڈ کے ذمے ہے، دونوں دروازوں پر اسی بورڈ کے نگران ہیں، جو داخلے کا ٹکٹ دیتے ہیں، مینار پر چڑھنے کا ٹکٹ الگ ہے۔ دوسری یادگار عمارتوں کی اتنی اچھی حالت ہے اور جامع مسجد کی اتنی دل آزار کیوں اس کا جواب تو دہلی وقف بورڈ ہی دے سکتا ہے؟

ہم ٹکٹ لے کر مینار پر چڑھ رہے ہیں ترک خاتون ہانپ رہی ہیں۔ مینار سے نئی اور پرانی دلّی کتنا فرق ہے دونوں میں۔ دلّی، عظیم دلّی، قدیم دلّی، ہندو، جین، مسلمان' تغلق، غلاماں، خلجی، لودھی، عظیم مغل شہنشاہ، برطانوی سامراج اس فضا نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔

ہم مینار سے نیچے اُتر کر گیلری سے عزاداران حسین کو ماتم کناں دیکھ رہے ہیں، تعزیے برآمد ہو رہے ہیں۔ یہ مسلمانوں کا اور اردو کا علاقہ ہے۔ اردو بازار حمید ریسٹورنٹ، ٹیٹین ریسٹورنٹ، اِدھر سے ہو کر ہم جور باغ کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں تعزیہ برداروں کے جلوس پہنچیں گے۔ ایک خلقت جمع ہے۔ پولیس بھی بھاری تعداد میں ہے۔ یہاں تعزیوں کو دفن کیا جاتا ہے۔ یہ مقام کربلا کہلاتا ہے۔ اب ہم اندرونِ دہلی، تنگ تنگ گلیوں سے ہوتے حسینی یتیم خانے پہنچے ہیں، جہاں مجلس برپا ہے۔ عزاداران حسین ماتم کر رہے ہیں۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے دستانِ حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل

ہندو اکثریت کے سیکولر ملک میں مجلس، جلوس، تعزیے اور ماتم حسین۔ کچھ اور ہی کیفیت رکھتے ہیں۔ چند نوجوان لہولہان ہاتھوں میں زنجیریں لیے کھڑے ہیں۔ کچھ نوجوان زار و قطار رو رہے ہیں۔ ایک صاحب بیمار کربلا حضرت زین العابدین کے چہلم کے سلسلے میں اشتہار بانٹ رہے ہیں۔ ایک طرف نیاز کی دیگیں چڑھی ہوئی ہیں۔ ہم یہاں سے فارغ ہو کر اپنے ہوٹل کا رخ کرتے ہیں۔ ایک طرف نیاز کی دیگیں چڑھی ہوئی ہیں۔ ہم یہاں سے فارغ ہو کر اپنے ہوٹل کا رخ کرتے ہیں۔ راستے میں بھارت کے مہاتما گاندھی، پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو، دوسرے وزیر اعظم لال بہادر شاستری کی سمادھیاں پڑتی ہیں، سمادھی ہندوؤں کے لیے اتنی ہی قابلِ احترام جگہ ہے، جیسے ہمارے لیے مزار، سمادھی بھی

مزاروں کی طرح کافی جگہ گھیرتی ہے، لیکن یہاں جسم کی بجائے صرف راکھ دفن ہوتی ہے۔ بھارتی قوم نے اپنے رہنماؤں کی راکھ کو نہایت عقیدت اور احترام سے دفن کیا ہے اور اس کے اِردگرد، باغیچے، گھاس کے لاس اور بہت کچھ بنایا ہے۔ اسکولوں کے بچے بچیاں یہاں عقیدت کے اظہار کے لیے بھی آتے ہیں اور پکنک منانے بھی۔

اپنے ہوٹل سے تازہ دم ہو کر ہمیں لال قلعے میں صوت و نور (Light And Sound) کا پروگرام دیکھنے جانا ہے۔ صبح سے محکمہ خارجہ کے مسٹر اشفاق محمد خاں میرے ساتھ ہیں، لال قلعے میں ان کے ساتھیوں مسٹر سپرا، اور مسٹر پوری سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ بیلجیم کے دو صحافیوں کے ہمراہ آئے ہوئے ہیں۔ صوت و نور کا پروگرام ہمارے ہاں بھی لاہور کے قلعے میں ہوتا ہے۔ لال قلعہ مغلیہ دور کی تاریخ کا مرکزی مقام رہا ہے، اس لیے اس پروگرام میں زیادہ جامعیت ہے۔ یہ پروگرام ہندی اور انگریزی میں ہوتا ہے۔ میں چونکہ غیر ملکی ہوں، اس لیے مجھے انگریزی والا پروگرام دکھایا جاتا ہے۔ کافی محنت سے یہ پروگرام ترتیب دیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک اکبر سب سے اچھا شہنشاہ تھا۔ اورنگ زیب سب سے تنگ نظر۔ صورت و نور میں بھی ان کا اندازِ بیاں یہی ہے۔ شاہجہان کے ذکر اور قلعہ معلیٰ کی تعمیر میں شاہجہاں کے کارناموں، دیوان خاص، دیوان عام، مینا بازار ہر شے کا ذکر کرنے کے بعد جب اورنگ زیب کا ذکر آتا ہے تو انتہائی افسوس اور مذمت بھرے لہجے سے بتایا جاتا ہے کہ اورنگ زیب تنگ نظر مسلمان تھا۔ موسیقی کا اس کے عہد میں گلا گھونٹ دیا گیا، سختیاں کی گئیں اور یہ کہ مغلیہ دور کے زوال کی بنیاد اورنگ زیب نے ڈال دی۔ پھر محمد شاہ رنگیلا کا زمانہ بھی خوب دلچسپی سے بیان کیا جاتا ہے۔

یاری بار موسیقی کی دھنوں کے ساتھ مغنیہ کی آواز ابھرتی ہے۔

رس بھرے نین تورے۔

نادر شاہ کی فوجیں دہلی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

ہنوز دہلی دور است۔

اور گاؤ۔ جاؤ لاؤ۔

پھر قلعے کے چاروں طرف گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیتی ہیں۔

دلّی میں قتل عام۔

محمد شاہ رنگیلا کی اس رنگیلی داستان کے دوران مجھے دہلی کے لال قلعے میں بیٹھے ہوئے سابق صدر یحییٰ خاں کی جانے کیوں یاد آتی رہی۔ لال قلعے کی صوت و نور کی یہ داستان انگریزوں کے ظلم و تشدد کے واقعات بیان کرتی ہوئی تحریک آزادی کے تین انقلابی کارکنوں پر اس قلعے میں ڈھائے جانے والے مظالم بھی بیان کرتی ہے۔ ان تینوں کارکنوں میں ایک ہندو' ایک سکھ' ایک مسلمان بتایا جاتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی المناک داستان' پھر انگریزوں کا دور۔ پھر دلّی لٹنے اور اجڑنے کی کہانیاں اور بالآخر لال قلعے کے باہر بھارت کے پہلے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کی پہلی تقریر۔ یہ ہے لال قلعے کا صوت و نور کا پروگرام جو بھارت کی سیاحتی کارپوریشن کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ مجھے بعد میں ایک صاحب نے بتایا کہ 1971ء کے بعد اس میں 'بنگلہ دیش' کا کچھ ڈرامہ بھی شامل کر دیا گیا تھا۔ لیکن معاہدہ شملہ کے فوراً بعد اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ صوت و نور کے ایسے مظاہرے دہلی کے علاوہ احمد آباد اور سری نگر میں بھی دکھائے جاتے ہیں۔

پروگرام ختم ہونے کے بعد محکمہ خارجہ کے یہ صاحبان مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ پروگرام آپ کو کیسے لگا۔ میں انہیں کیا بتاتا کہ یہ تو میری اپنی تاریخ ہے۔ کچھ آپ نے مسخ کر دی ہے، کچھ ٹھیک بیان کر دی ہے۔ یہ عمارتیں، یہ عظیم یادگاریں، ہمارے آباؤ اجداد نے ہی تو تعمیر کی تھیں، یہ ہماری نشانیاں ہی تو ہیں۔ کیا ہوا آج ہم ان سے دور چلے گئے ہیں، مگر ہم اپنی تاریخ کے اوراق کو کیسے بھلا سکتے ہیں۔

اس دلچسپ سفرنامے کی سنسنی خیز روداد اگلے ماہ انہی صفحات پر ملاحظہ فرمائیے۔



سب کچھ تیرا ہے

ارم خان

اُس رات اگر وہ بھٹی میں پہنچ جاتی تو شاید جنات اسے بھسم ہی کر ڈالتے

وہ رات، وہ کالی سیاہ رات بھلا میں کیسے بھلا سکتی ہوں۔ ان بیس سالوں میں تو کیا پوری زندگی وہ رات نہیں بھلائی جاسکتی ۔ وہ رات مجھے آج بھی اس طرح یاد ہے جیسے گئے دن کی گزری رات یاد ہے۔ سوچوں تو سر چکرا سا جاتا ہے کہ آخر وہ کیسی رات تھی۔ کیا اس میں، میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ سب حقیقت تھی یا میری نظر کا ایک دھوکہ تھا یا پھر میرا ایک خواب۔

نہیں، نہیں میں اسے خواب نہیں کہہ سکتی کیونکہ خواب بند آنکھوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ جب کہ میں نے تو کھلی آنکھوں سے وہ سب دیکھا تھا۔

☆☆☆

میرا نام نازیہ ہے۔ میں اپنے ماں باپ کی پہلی اولاد ہوں میرے بعد ایک بہن اور تین بھائی ہیں۔ آج سے بیس سال قبل میرا باپ ایک غریب کسان تھا۔ جو دوسروں کے کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ ابا کے سارے دن کی محنت سے ہمارے گھر کا دو وقت کا چولہا جلتا تھا۔ ہمارا گھر ایک بہت ہی چھوٹے سے کمرے اور کچی چار دیواری پر مشتمل تھا۔ مگر اس چھوٹے سے گھر کو بھی اماں بڑی مشکل سے سنبھالتی کیونکہ غربت اس گھر کی اینٹ اینٹ میں بسی تھی۔ میں بھی بچپن سے جوانی تک کے سفر میں غربت کیا ہے سمجھ چکی تھی۔ مجھے اپنے گھر کی حالت پر بہت دکھ ہوتا تھا۔ لیکن بھلا میں کیا کرسکتی تھی۔

ایک تو اس گھر میں غربت تھی، جسے میں بچپن سے دیکھتی آرہی تھی، اور ایک اور بات جو میں نے اماں کے منہ سے کئی بار سنی تھی وہ یہ کہ اِس گھر میں جنات کا سایا ہے۔ اماں اکثر ہمارے گھر آئی گاؤں کی عورتوں کے سامنے ذکر کرتی تو میں اکثر اچانک پہنچ جانے پر سن لیتی ورنہ اماں نے کبھی مجھے خود نہیں بتایا تھا۔ ان کا خیال تھا شاید میں ڈر جاؤں گی۔

وقت اسی طرح گزر رہا تھا۔ اماں کے سوا وہاں اور کسی کو کبھی محسوس نہیں ہوا کہ ہمارے گھر میں جنات ہیں۔ اس لیے وہاں کبھی کسی نے خوف محسوس نہیں کیا تھا۔ لیکن پھر ایک بار میری زندگی میں ایسی رات آئی جس نے آج تک خود کو مجھے بھولنے نہیں دیا۔

☆☆☆

رات کا اندھیرا ہر طرف پھیل چکا تھا۔ میں اپنے سارے کام مکمل کر کے اپنی چارپائی پر



آ گئی تھی۔ اپنے قریب کی چارپائیوں پر نظر ڈالی تو اماں ابا اور بہن بھائی سب سو گئے تھے۔ ساتھ والے گھروں میں بھی خاموشی چھا گئی تھی۔ یقیناً وہاں بھی سب نیند میں مگن تھے۔ ہر طرف کالی رات کا راج تھا۔ باقی راتوں سے یہ رات کچھ زیادہ ہی کالی تھی۔ چاند بھی آسمان پر کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ میں تاروں کو تکتے تکتے نیند کی وادی میں اتر گئی اور جانے کتنی دیر نیند میں رہی کہ اچانک ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔

آنکھ کھلتے ہی میں نے اپنے اردگرد دیکھا مگر وہاں مجھے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ایک پل کو دل میں خوف اٹھا۔ مگر پھر اگلے ہی پل میں پھر سے آنکھیں موند لیں۔

مجھے آنکھیں بند کیے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی میرے سر کے پیچھے کھڑا ہے۔ میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور اس طرف دیکھا جہاں مجھے کسی کی موجودگی محسوس ہوئی تھی۔ تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میرے سرہانے بہت ہی پیارا ایک لال گلاب رکھا تھا، اتنا پیارا گلاب میں نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور بڑا اتنا کہ اگر دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا لیا جائے اور اس میں وہ پھول رکھ لیا جائے۔ وہ پھول اس پیالے میں سماتا، اتنا پیارا پھول دیکھ کر تو میں اپنا سارا خوف ہی بھول گئی۔ میں بھول گئی کہ اتنی رات کو اچانک کس نے اسے یہاں رکھا ہے اور جہاں اتنے اندھیرے میں اور کچھ نظر نہیں آرہا وہاں یہ پھول کیسے......

میں نے جلدی سے پھول اٹھانے کے لیے اپنے ہاتھ کو حرکت دی تو یوں لگا جیسے میرا ہاتھ کسی بہت بڑے پتھر کے نیچے آگیا ہو۔ وزن ہاتھ پہ اتنا آگیا کہ میں بے بس ہوگئی۔

میں نے مدد کے لیے اماں کی چارپائی کی طرف

دیکھا تو وہ نیند میں نظر آئیں۔ سو بے بسی سے ایک بار پھر گلاب کے پھول کی طرف دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی، پھول وہاں سے غائب تھا اور میرے ہاتھ کا وزن بھی غائب تھا۔ میں نے ہاتھ کو کئی بار ہلا کر دیکھ لیا مگر اب ہاتھ بالکل ٹھیک تھا۔ میں ابھی اس کشمکش میں تھی کہ آنکھوں کے سامنے ایک اور منظر زندہ ہوگیا۔ میں جس کروٹ لیٹی تھی اسی طرف ہمارا کمرہ تھا اور کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس کھڑکی سے عجیب سی روشنی پھوٹتی نظر آ رہی تھی۔ وہ روشنی دیکھ کر میں اُٹھ بیٹھی اور پھر بے اختیار چارپائی سے اتر کر کمرے کی طرف بڑھ آئی۔ جانے میرا خوف اس وقت کہاں چلا گیا تھا جو میں اس طرح بنا سوچے سمجھے چلی جا رہی تھی۔

میں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اس روشنی والی جگہ کو دیکھتی رہ گئی۔ سونا، چاندی اور شاید ہیرے تھے جو چمک رہے تھے۔ اور وہ بھی اتنے کہ کمرے کا ایک کونا بھرا پڑا تھا۔ میں بت بنی کھڑی سب کچھ دیکھتی رہی۔

''لے لو نازیہ! یہ سب تمہارے لیے ہے۔'' ایک آواز جو میرے لیے بالکل اجنبی تھی۔ میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''لے لو یہ سب تمہارا ہے۔'' ایک بار پھر وہی آواز آئی تھی۔ لیکن میں نے ان چیزوں کی پروا نہیں کی اور اس آواز دینے والے کو تلاش کرنے لگی۔ مجھ پر کوئی عجیب سی بے خوفی سوار ہو چکی تھی۔ میں اس آواز دینے والے کو تلاش کرتے کرتے گھر سے باہر آ چکی تھی۔

میرے گھر سے باہر آ جانے پر وہ آواز تو ختم ہوگئی تھی لیکن اب میرا رخ کسی اور جانب تھا اور جگہ تھی بہت سے کھیتوں کو پار کر کے ایک پرانی بھٹی۔ جہاں مشہور تھا کہ وہاں جنات بستے ہیں۔

کوئی طاقت تھی جو مجھے اپنے ساتھ لیے چلی جا رہی تھی اور میں خاموشی سے چلتی چلی جا رہی تھی۔ بغیر کسی چپل، جوتے کے میں کھیتوں سے مسلسل گزرتی جا رہی تھی اور چلتے چلتے میں تقریباً آدھا سفر کر آئی تھی کہ اچانک مجھے کسی چیز سے ایک شدید ٹھوکر لگی جس نے مجھے ہوش کی دنیا میں واپس لا کھڑا کیا۔

ہوش آتے ہی میں نے اردگرد دیکھا اور پھر مکمل خوف مجھ پر حاوی ہوگیا۔ میں نے اسی وقت گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ پیچھے نہیں دیکھا اور پھر گرتے پڑتے گھر آ کر سانس لی۔

''نازی کیا کر رہی ہو وہاں۔'' میں باہر کا دروازہ بند کر رہی تھی کہ اماں کی آوز سنائی دی، جس سے میری جان میں جان آئی۔

''اماں کچھ نہیں وہ بس ایسے ہی دروازہ کھلا تھا۔ ابھی میری آنکھ کھلی، میں نے دیکھا تو بند کرنے چلی آئی۔'' میں نے اماں سے بات چھپا لی کہ اصل بات کیا ہے۔

''ٹھیک ہے آ کر سو جاؤ۔'' اماں شاید آدھی نیند میں تھیں سو مجھے کہہ کر سو گئیں۔

پھر صبح میں نے اماں کو سارا رات کا قصہ سنایا تو اماں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں وہاں سے سلامت واپس آ گئی جہاں گئی تھی۔ ورنہ رات پتا نہیں میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

اس رات کے دو سال بعد میری شادی ہوگئی لیکن ان دو سالوں میں پھر ایسا میرے ساتھ کچھ نہ ہوا جیسا اس رات ہوا تھا۔ نہ ہی اماں کو پھر کبھی کچھ محسوس ہوا۔

میں آج بھی سوچتی ہوں کہ اس رات کا آخر قصہ کیا تھا۔ کیا وہ رات میرے لیے ایک خواب تھی۔ جسے میں نے حقیقت سمجھ لیا تھا۔ اگر خواب تھا وہ سب تو میرا کھیتوں میں جانا اور پھر ٹھوکر کھا کر واپس آ جانا کیا تھا۔ مجھے آج بھی یہی سوال ستاتا ہے کہ مجھے وہاں تک لے جانے والے نے واپس کیسے آنے دیا۔ اور وہ سونا چاندی ہیرے موتی اور خاص طور پر میرے قریب رکھا وہ لال گلاب...... ان سب میں کتنی حقیقت تھی۔

☆☆☆



وہ بُڑھیا کون تھی؟



سیدہ حجاب فاطمہ

تیز خوشبوؤں کی شوقین، ایک دوشیزہ کی خوف بیتی

کہتے ہیں کہ ہمارے اردگرد بھی ایک اسرار بھری دنیا آباد ہے۔ اس دنیا کے باسی نہ ہمیں دکھائی دیتے ہیں نہ ہی محسوس ہوتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی ایسا ضرور ہوتا ہے کہ ان چیزوں کو ہم اپنی کم فہمی سے یا کبھی جان بوجھ کر اتنا مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں اپنی موجودگی کا احساس ضرور دلاتی ہیں۔ اب یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ وہ ہمیں کوئی آزار نہ پہنچا سکیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے بھلا میں اس اسرار بھری دنیا کے باسیوں کی حمایت کیوں کر رہی ہوں؟ تو پھر لیجیے آپ ہی فیصلہ کیجیے۔



میں اُن دنوں چھٹی جماعت کی طالبہ تھی۔ جب ہم نیو کراچی سیکٹر 3 میں شفٹ ہو کر آئے۔ اس عمر میں لڑکیوں کو فطرتاً پھول، خوشبو اور دل کو لبھاتے موسم ویسے ہی بہت اچھے لگتے ہیں اور مجھے تو بچپن سے ہی رنگ اور خوشبو بہت بھاتے تھے۔ امی لاکھ سمجھاتیں مگر اُن کی نصیحت کو میں ہنس کر ایک جملے سے ہوا کی غذا بنا ڈالتی تھی۔

''امی جان! خوشبو لگانا تو سنت نبویؐ ہے۔'' اور اتنی گرمی ہے بس میں طرح طرح کے لوگوں کی بُو سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ پلیز امی!''

''بیٹا خوشبو لگانا بے شک سنت ہے مگر تمہاری عمر کی چھوٹی لڑکی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اتنی خوشبو لگا کر اسکول جاؤ جبکہ تمہارا اسکول بھی دوپہر کا ہے اور زوال کے وقت ویسے ہی اوپری ہواؤں کا زور ہوا میں ہوتا ہے۔''

مگر میں نے تو نہ ماننا تھا نہ مانی۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ میں کوئی نافرمان بچی تھی۔ میری امی کہتیں تو شاید کبھی دوسرا سانس بھی نہ لیتی۔ میری ماں تھیں ہی ایسی۔ سراپا محبت بہرحال! بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔

ہاں! تو میں بتا رہی تھی کہ خوشبو میری ایسی کمزوری تھی جسے میں چاہ کر بھی چھوڑ نہیں سکتی تھی اور اس وجہ سے میں ایک ہفتے میں پرفیوم کی پوری بوتل خالی کر دیا کرتی تھی۔ مگر اس دن ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کے بعد میری یہ عادت خود بخود چھوٹ گئی۔

''بیٹا! یہ لالوکھیت کون سی بس جائے گی۔

آج پورے پندرہ دن ہو گئے تھے کہ اتنی عوام کے ہوتے ہوئے بھی وہ خاتون مجھے ہی مخاطب کرتی تھیں۔ میں بے زاری سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''آنٹی آپ روز مجھ سے ایک ہی سوال پوچھتی ہیں اور میں روز ایک ہی جواب دیتی ہوں پھر بھی آپ کو پتا نہیں چل سکا کہ لالوکھیت یہاں سے بس ایک ہی بس جاتی ہے۔ F-16۔'' ابھی وہ کچھ بولتی کہ میری مطلوبہ بس نے آ کر گفتگو میں مداخلت کی اور میں انھیں نظر انداز کر کے بس میں چڑھ گئی۔

آج ویسے ہی مجھے دیر ہو گئی تھی اور میرا سائنس کا ٹیسٹ بھی تھا۔ پھر سارا دن کی مصروفیت میں یاد ہی نہ رہا کہ آخر وہ آنٹی کون ہیں۔ اور مجھ سے کیوں روز ایک ہی سوال کرتی ہیں۔''

اس دن کے بعد پورے دو ہفتے سکون سے گزرے، نہ وہ آنٹی مجھے نظر آئیں اور میں بھی اس قصے کو بھول بھال گئی اور پھر ایگزامز کی تیاریوں میں لگ گئی۔

یہاں میں یہ بات واضح کرتی چلوں کہ میرا وہ مطلوبہ اسٹاپ کچھ پراسرار سا تھا۔ آنے جانے والی دونوں سڑکوں کے بیچ ایک گندا اور پرسرار نالہ تھا۔ جس سے آئے دن نامعلوم اشخاص کی لاشیں برآمد ہوتی رہتی تھیں۔

اس طرف جہاں میرا گھر تھا۔ نالے سے کچھ دور کچے پکے مکانات تھے۔ جن میں سے بیشتر خالی تھے اور جو رہائشی تھے ان میں بھی زیادہ تر کرائے داروں کا بسیرا تھا۔ پھر اس سڑک کے لیے یہ بھی مشہور تھا کہ وہ سڑک ہر چھ ماہ میں بھینٹ لیتی ہے۔ مجھے روڈ کراس کر کے اسکول کی طرف مطلوبہ بس لینی ہوتی تھی اور جس طرف میرا اسٹاپ تھا۔ وہاں ایک بہت بڑا میدان تھا جس میں خودرو جھاڑیوں کا ایک گھنا جنگل آباد تھا۔ میرے اسکول جانے کے وقت اکثر ہی وہاں سناٹے کا راج ہوتا تھا۔ کبھی کبھار ہی وہاں رش ہوا کرتا تھا۔ مگر میں اس وقت کیونکہ بچی تھی اس لیے کبھی ان باتوں کو محسوس نہیں کیا۔ بہرحال یہ پچیس نومبر 1992ء کی بات ہے کہ میں خلافِ توقع یا معمول آج اسکول جلدی جانے کے خیال سے گیارہ بج کر پندرہ منٹ پر ہی حسب عادت کپڑوں پر خوب پرفیوم لگا کر اپنے رومال کو بھی گیمبٹ کی تیز خوشبو سے تر کر کے امی کو خدا حافظ کہتی، بیگ سنبھالتی لمبے لمبے ڈگ بھرتی اسٹاپ پر پہنچی ہی تھی کہ مجھے پھر وہ عجیب وغریب آنٹی اپنی طرف آتی دکھائی دیں۔

میں دعا کر رہی تھی کہ میری مطلوبہ بس B-2 جو کہ نیو کراچی سے میرے اسکول کے اسٹاپ تخی حسن تک پہنچاتی تھی۔ آ جائے کہ اسی اثناء میں وہ آنٹی مجھ تک پہنچ گئیں۔

''کیسی ہو کرن!'' ان کے منہ سے آج اپنا نام سن کر میں بُری طرح چونکی تھی۔

''جی...... جی...... میں ...... جی ٹھیک مگر...... آ...... آ...... آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟''

میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا تو ایک بڑی عجیب سی ہنسی ان کے منہ سے برآمد ہوئی جیسے کسی ریل کی پٹڑی پر بڑی رفتار سے کوئی ٹرین گزر گئی ہو یا کوئی لاؤڈ اسپیکر پھٹ گیا ہو اور دماغ کو سن کر دینے والی آواز کان کے پردے پھاڑ رہی ہو۔ میں اسٹاپ پر اکیلی تھی اور بس نہ جانے آنے میں کیوں اتنی دیر لگا رہی تھی۔ گھبرا کر میں نے اس عورت کی طرف دیکھا وہ اب بھی مسلسل ہنس رہی تھی۔ چہرے پر ہمیشہ کی طرح نقاب تھا۔ جس سے اس کی لہو رنگ آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ جو ایک پل میں لگتا تھا کہ اُبل پڑیں گی۔ خوف کے مارے میرے پیر زمین پر جم چکے تھے۔ سانسیں تھم کر رگوں میں خون کو منجمد کرنے لگی تھیں۔ میں چیخنا چاہتی تھی مگر حلق سے تو کوئی آواز ہی نہیں نکل پا رہی تھی۔ اسی اثناء میں اس عورت نما آسیب یا آسیب نما عورت نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا۔

وہ مجھے گھسیٹ رہی تھی اور مجھے جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ اب میں مکمل اس کی گرفت میں تھی۔ سخت سردی میں بھی میرا پورا بدن پسینے میں شرابور تھا اور دل لگتا تھا کہ ابھی سینے میں قید توڑ کر رہا ہو جائے گا۔ دفعتاً میرے پورے جسم میں خراشیں پڑنے لگیں۔ سکتہ ٹوٹا اور میں نے دیکھا کہ میں اس میدان کی خودرو جھاڑیوں کی رو میں اس مخلوق کے ساتھ ساتھ گھسٹتی جا رہی تھی۔ اچانک جیسے میرے دماغ کو کسی نے سگنل دیا کہ تم تو قرآن پاک پڑھی ہوئی ہو۔ پھر کیوں اپنے اللہ سے رجوع نہیں کرتیں۔ اسی کی مدد چاہیے۔ تمھیں...... بس پھر مجھے جتنی آیاتِ قرآنی یاد آتی گئیں میں نے ورد شروع کر دیا۔ ساتھ ہی میری کوشش تھی کہ کسی طرح اس عورت سے اپنا ہاتھ چھڑا لوں کہ اچانک ہی جھاڑیوں میں کچھ سرسراہٹ ہوئی اور ایک نہایت ضعیف بزرگ باہر آئے جن کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ جیسے ہی انھوں نے اپنی لاٹھی اس عورت کی طرف ماری۔ وہ خوف ناک عورت ایک دلدوز چیخ مار کر میرا ہاتھ چھوڑتی تیزی سے بھاگی اور ان ہی جھاڑیوں میں کہیں گم ہو گئی۔ میں بھی ایک چیخ کے ساتھ بے ہوش ہو گئی، اور پورے تین دن بعد ہوش میں آئی تھی۔

اس کے بعد کے حالات مجھے امی کی زبانی معلوم ہوئے کہ تم کو ایک باریش بزرگ نے بچایا ہے۔ بیٹا وہ پتا نہیں کس کس سے گھر کا پتا معلوم کر کے تمھیں گھر لائے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اگر وہ وقت پر تمہارا ہاتھ نہیں پکڑتے تو تم بس کی تیز رفتاری کی نظر ہو جاتیں۔ روڈ کراس کرتے ہوئے احتیاط کیا کرو بچی۔ اگر وہ بزرگ تمھیں نہ بچاتے تو تم...... خدا جانے کیا ہوتا تمہارا۔'' امی کی باتوں سے ممتا کی مہک آ رہی تھی۔

شاید ان بزرگ نے امی کو حقیقت سے مطلع نہیں کیا تھا۔ ورنہ امی اتنی بڑی بات برداشت نہیں کر پاتیں۔ اس میں بھی میرے اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی۔ لیکن میرے لیے یہ بات بہت سکون کا باعث تھی کہ میری امی پریشانی سے بچ گئیں۔ مگر اس بات پر تشویش کا اظہار ضرور کرتی ہیں کہ بیٹا کرن مجھے سمجھ نہیں آتی کہ جب تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا تو تمھیں ان بزرگ نے بچا بھی لیا تھا، پھر تمہارے یونیفارم پر گھسیٹنے کے نشان اور بدن پر خراشیں کیوں تھیں؟''

''اور میں بس اتنا ہی کہہ پاتی ہوں کہ امی جان...... میں تو بے ہوش ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کیا ہوا ہوگا۔''

اور میں خود آج بھی یہی سوچتی ہوں کہ وہ کون تھی اور مجھے کہاں لے جانا چاہتی تھی؟؟ کہیں امی کی کہی ہوئی بات کانوں سے ٹکرا جاتی ہے۔

''بیٹا کرن! تم اتنی تیز خوشبو لگا کر اسکول مت جایا کرو، زوال کا وقت ہوتا ہے۔'' اور اب میرے پاس کوئی جواز نہیں کہ میں اس بات کو رد کر دوں۔ کیا آپ لوگ جانتے ہیں کہ میرے ساتھ اس دن کیا ہوا؟؟؟ وہ سب کیا تھا؟؟؟ کوئی غیبی مدد یا غیبی نصیحت؟؟؟

☆☆☆



نجات

الماس فاطمہ ارمان

کراچی سے اُس چائے فروش کا قصہ عجب؛ جس نے چالیس سال سے بھٹکتی روح کو.....

وہ ایک ٹھنڈی سرد رات تھی۔ لوگ عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے اپنے گھر لحاف میں جا کر دبک کر چائے کوفی کے مزے لے رہے تھے مگر غریب کی کیا سردی کیا گرمی۔ وہ تو بس روزی کمانے کی فکر میں کسی بات کی پروا نہیں کرتا۔ وہ صرف اپنے کاروبار اور گھر والوں کا پیٹ پالنے کی فکر میں مبتلا رہتا ہے۔ ان ہی میں ایک بندہ نواز تھا جو کہ ملتان کا رہنے والا تھا جو کراچی روزی کمانے آیا تھا۔ گرمیوں میں وہ مٹکے والی قلفی بیچتا اور سردیوں میں چائے اور ساتھ ہی مرغی کی یخنی بھی۔ تین ہٹی پر اُس کی چھوٹی سی دکان تھی۔ اس چھوٹی سی روزی میں اللہ نے اُسے بہت برکت عطا کی تھی زیادہ رش کی وجہ سے اُس نے دو لڑکے بھی اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ آج غضب کی سردی تھی۔ سردی کے ساتھ کوئٹہ کی ہوا بھی چل رہی تھی۔ جس کی وجہ سے سردی میں اور اضافہ ہو رہا تھا۔ اکا دکا لوگ آتے اور سوپ کی جگہ آج چائے کا زور زیادہ چلا۔ رات کا ایک بجنے والا تھا شاید آج لڑکوں کو بھی سردی بہت لگ رہی تھیں۔

''استاد دکان بند کر کے گھر چلنا چاہیے بہت ٹھنڈ لگ رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے ایک ایک چائے کا گرم کپ پی لو۔ تمہارا پیدل کا راستہ ہے۔''

''ٹھیک ہے استاد۔''

''تمام کام ختم کر کے بچے اپنے گھر کی طرف چل دیے۔ نواز بھی کچھ چیزوں کو سمیٹ کر چائے کے لیے مڑا ہی تھا کہ اُسے چوڑیوں کی کھنک سنائی دی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ جس نے اورنج کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اُس کے لباس اور جسم سے عجیب سی مہک اُٹھ رہی تھی جو نواز محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

محترمہ آپ اتنی رات میں کیا کرنے آئی ہیں۔''

''ارے یہ کیسا سوال پوچھ رہے ہو۔ سردی ہے تمہارے ہوٹل سے چائے پینے آئی ہوں۔''

''مگر بی بی میں تو اپنا کیبن بند کر چکا ہوں، تمام سامان بھی، آپ گھر جائیں اور اپنے کچن میں اچھی سی چائے بنائیں۔ خود بھی پئیں اور گھر والوں کو بھی اگر وہ جاگ رہے ہوں تو۔''

''جناب باتیں اچھی کرتے ہیں آپ۔ میں بہت ضدی ہوں۔ چائے تو آپ کے ہاتھ ہی کی پیوں گی۔''

''جائیں اپنے گھر۔'' یہ سن کر وہ لڑکی زور زور سے ہنسنے لگی۔ اُس کی ہنسی میں ایک عجیب سی جلترنگ تھی۔ جسے وہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ فضا میں ہنسی گونج رہی تھی۔ نواز نے اُس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ بڑی بڑی براؤن آنکھیں، گلابی گلاب کی طرح چہرہ جو میک اپ سے بے نیاز تھا۔ وہ اُس کے حسن میں کھو سا گیا۔ اُس نے جلدی سے چولہا جلایا۔ فریج سے دودھ نکال کر دودھ پتی کی چائے اسے بنا کر اُسے پیش کی۔

''یہ لیں جلدی سے پی کر آپ اپنے گھر کی راہ پکڑیں۔''

''ارے آپ کو بڑی جلدی ہے۔''

''محترمہ......''

''میرا نام محترمہ نہیں رجا ہے۔''

''ٹھیک ہے رجا صاحبہ! اگر پولیس کی موبائل یہاں تک پہنچ گئی تو آپ کے ساتھ میری بھی شامت آ جائے گی۔ میں شریف آدمی ہوں آپ جلدی سے چائے ختم کیجیے۔''

''ارے آپ کتنے ڈرپوک ہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ جب تک میں آپ کے ساتھ ہوں پرندہ بھی پر نہیں مارے گا۔ انسان کو تو چھوڑیے۔''

نواز کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ رہی تھی آخر یہ کیا بلا ہے۔ بلا کا نام ذہن میں آتے ہی نواز کی ہوا گم ہوگئی۔ یہ کوئی چڑیل یا آسیبی سایا ہے کیونکہ اس کے کیبن کے ساتھ ہی بڑے بڑے برگد کے درخت تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا یہاں پر سایا ہے۔

''ارے تم جو سوچ رہے ہو بالکل ویسا ہی ہے۔ میں ایک چڑیل ہوں مگر تم سے پیار کر بیٹھی ہوں۔ میں سامنے والے درخت پر بیٹھی تم کو دیکھتی رہتی تھی، مگر موقع نہیں ملا تم سے اکیلے میں بات کرنے کا۔ آج موقع مل گیا جس کی میں تلاش میں تھی۔ میں رجا کی روح ہوں۔ میں سب بتاتی ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے کپ ایک طرف رکھا اور دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولنے لگی۔

''میرا نام رجا ہے۔ میں نے خودکشی کی تھی۔ ذات کی بھنگن یعنی جمعدار قوم سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں تمہیں دوسری ملاقات میں سب کچھ بتاؤں گی۔ میری وجہ سے تم پریشان مت ہونا۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی، بس تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ جاؤ۔ اب تم گھر جاؤ تمہاری بیوی اور ماں فکرمند ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ غائب ہوگئی۔ نواز تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اُس نے اپنی بائیک اسٹارٹ کی اور گھر کا رخ کیا۔ راستے میں بھی اُسے رجا کا خیال آ رہا تھا۔

جیسے ہی وہ گھر پہنچا۔ اُس نے اپنی بیوی سے کہا کہ مجھے دو لحاف اوڑھا دو، مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔''

رات بیت رہی تھی مگر نواز کی آنکھوں سے نیند اوجھل تھی۔ صبح فجر کی نماز پڑھ کر وہ پھر لحاف میں دبک گیا۔ پتا نہیں کس وقت نیند کا غلبہ طاری ہو گیا۔ ظہر کی نماز کے لیے اُس کی بیوی نے اٹھایا۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھا۔ اُس کا پورا جسم درد کر رہا تھا۔ اُس نے تھوڑا بہت ناشتا کیا۔ درد کی دوائی کھائی اور مسجد نماز پڑھنے چلا گیا۔

☆......☆......☆



جب سب نمازی جا چکے تو اُس نے مولانا صاحب جو کہ عامل بھی تھے۔ انہیں متوجہ کر کے رات والی ساری داستان سنائی۔ وہ حیرانی سے سب کچھ سن رہے تھے۔ انہوں نے نواز سے کہا۔

''تم کل میرے ساتھ میرے استاد کے پاس چلو وہ ضرور تمہیں اس سے نجات کا تعویذ بنا کر دیں گے۔'' نواز کو کچھ آس نظر آئی۔

وہ شام کو کیبن پر چلا گیا۔ اُس نے اپنے اردگرد آیت الکرسی اور چاروں قل کا حصار کھینچا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ وہ کوشش میں تھا کہ بارہ بجے دکان بند کر کے چلا جائے وقت کا پتا بھی نہ چلا۔ آج بھی سردی عروج پر تھی۔ مگر آج کل کے مقابلے میں رش زیادہ تھا۔ رش کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس طرح پھر وہی ٹائم ہو گیا۔ لڑکے چلے گئے۔ نواز ڈر رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی سب سمیٹ کر گھر کا رخ کر رہا تھا۔ وہ دکان سے نکل کر چورنگی کی طرف آ گیا۔ اُس نے دیکھا ایک بوڑھی عورت ہاتھ میں چھڑی لیے سڑک کے بیچ میں کھڑی کانپ رہی ہے۔ ہاتھ کے اشارے سے گاڑی روک دی تھی۔ نواز نے اپنی بائیک روکی اور قریب جا کر پوچھا۔

''اماں آپ اتنی رات میں کیا کر رہی ہو۔''

''بیٹا میں راستہ بھول چکی ہوں۔''

''کہاں جانا ہے۔''

''مجھے لالوکھیت جانا ہے۔''

''اماں اسکوٹر پر بیٹھو میں تمہیں لالوکھیت چھوڑ دیتا ہوں۔'' وہ جلدی سے اسکوٹر پر بیٹھ گئیں۔

ابھی وہ اپنے خیالوں میں چل رہا تھا کہ اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے پیچھے جو بڑھیا بیٹھی ہے۔ اُس کے پاس سے وہی معطر خوشبو اور چوڑیوں کی کھنک آ رہی ہے، اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ رجا یعنی وہی بدروح تھی۔

''ارے سامنے دیکھو ٹرک آ رہا ہے۔'' واقعی اُس کی بائیک کے سامنے ٹرک تھا۔ اُس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور بائیک بے ساختہ رُک گئی۔ ''آپ......''

''ہاں میں۔ تم کیا سمجھتے ہو میں تمہارا آسانی سے پیچھا چھوڑ دوں گی نہیں...... جب میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی تو تم مولویوں کے چکر میں پڑ رہے ہو۔ تمہارے مولوی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

''مجھے گھر جانا ہے گھر والے میرا انتظار کرتے ہوں گے۔''

''میں بھی تو کب سے تمہارے انتظار میں سڑک پر کھڑی تھی۔ چلو میرے ساتھ۔'' نواز درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

''آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟''

''دیکھو میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے چند گھڑی بات کر لیا کرو۔ میں تم سے ایک کام لینا چاہتی ہوں۔''

''بولیے کیا کام ہے؟''

''میں بتاتی ہوں۔ آج سے تقریباً چالیس سال پہلے جہاں برگد کا درخت اور خالی گراؤنڈ ہے، یہاں چند کچے پکے مکانات تھے۔ میری فیملی بھی ان ہی میں رہتی تھی۔ ہم لوگ کرسچن تھے۔ مجھے سامنے جھونپڑی میں رہنے والے ایک لڑکے شوکت سے محبت ہوگئی جو کہ مسلمان تھا۔ ہم ساتھ ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ کچی عمر میں پیار ہو گیا۔ وہ بھی مجھ سے دو ہاتھ آگے نکلا۔ ہم لوگ اسکول کے بہانے سے اِدھر اُدھر ملتے رہتے۔ ایک دن میرے ابا نے دیکھ لیا۔ مجھے بہت مارا اور شوکت کے ابا سے بھی شکایت کی۔ وہ بہت ہی نیک آدمی تھے۔ انہوں نے شوکت کو ڈانٹا۔ میرا اسکول جانا بند ہو گیا بہت ہی پابندیوں کے باوجود میں شوکت سے ملتی رہتی۔ اس راز میں میری چھوٹی بہن شامل تھی۔ پھر میرے ابا نے فیصلہ کیا کہ مجھے نانی کے پاس پنجاب بھیج دیا جائے۔ وہیں پر کوئی اپنی ذات کا لڑکا دیکھ کر میرا بیاہ کر دیا جائے۔ جس دن مجھے پنجاب جانا تھا۔ اُس سے ایک دن پہلے میں نے اور شوکت نے گھر سے بھاگنے کا پروگرام بنایا۔ میری چھوٹی بہن کو پتا چل گیا، عین وقت پر اُس نے ابا کو بتا دیا۔ ابا نے مجھے بہت مارا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اپنی جان دے دوں گی مگر شوکت کے علاوہ کسی کی نہیں بنوں گی۔ میں نے رات کو سونے سے پہلے فنائل پی لیا جو میرا ابا اسپتالوں میں باتھ روم دھونے کے لیے لاتا تھا۔ میں ختم ہو چکی تھی۔ میرے ابا نے جب یہ دیکھا کہ میں مر چکی ہوں تو اُس نے مجھے صبح ہونے سے پہلے اس برگد کے درخت کے نیچے گڑھا کھود کر دفن کر دیا اور خود اماں اور بہن کو لے کر پنجاب بھاگ گیا۔

چند دن بعد شوکت اور اُس کے ابو بھی نہ جانے کہاں چلے گئے مگر اُس دن سے میری روح بھٹک رہی ہے۔ اس

درخت کے نیچے آج بھی میری تازہ لاش موجود ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ مجھے یہاں سے نکال کر مسیحی قبرستان میں دفن کر دیا جائے۔ یہ کام تم کر سکتے ہو۔ تمہاری شکل شوکت سے بہت ملتی ہے۔ تم کل رات دو بجے کے بعد میری ڈیڈ باڈی درخت کے نیچے سے نکال کر مسیحی قبرستان میں ڈال آؤ کیونکہ یہاں تمام مسلمانوں کی درسگاہ ہے۔ یہاں سے مجھے آزادی ملے۔ جب بھی میں یہاں سے آزادی کی کوشش کرتی ہوں کوئی نہ کوئی چیز آڑے آ جاتی ہے۔ تم صرف میری ڈیڈ باڈی مسیحی قبرستان کی پیچھے والی جھاڑیوں میں پھینک کر آ جانا باقی سب میرا کام ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔''

نواز نے فوری بائیک اسٹارٹ کی اور گھر کی طرف چل دیا۔ اُس کو سخت سردی میں بھی پسینے آ رہے تھے۔ گھر آتے آتے اُس پر سخت کپکپی طاری ہو گئی تھی۔ بیوی نے دو کمبل دو لحاف اوڑھا دیے، دودھ میں ہلدی ڈال کر پلایا مگر نواز کو سخت بخار اور سردی کی کیفیت طاری تھی۔

☆......☆......☆

صبح اُس نے مسجد سے مولانا صاحب کو بلایا اور تمام حقیقت بیان کی۔ مولانا صاحب پریشان ہو گئے انہوں نے اُسے فوری استاد کے پاس چلنے کو کہا۔ بڑی مشکل سے وہ بستر سے اٹھا اور وہاں تک پہنچا۔

وہ اپنے آستانے میں ہی تھے۔ انہوں نے نواز سے شروع سے آخر تک داستان سنی۔ یہ حقیقت سن کر وہ خود حیران تھے۔

''مولانا صاحب آپ بتائیں کیا میں یہ کام کر سکتا ہوں۔ میں کیسے اُس کی لاش کو نکال کر وہاں تک لے کر جاؤں اور وہاں جھاڑیوں میں پھینکوں۔''

''تمہیں ہمت کر کے یہ کام کرنا ہوگا، ورنہ وہ کبھی بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ میں تمہیں پانی دم کر کے دیتا ہوں اور نقش بنا کر دیتا ہوں۔ تم اُسے فوری گلے میں ڈال لو۔ جب تم یہ کام کرو تو یہ پانی کی بوتل ساتھ رکھنا۔ اس کے پانی کو تم اس جگہ کے اردگرد چھڑکنا اور وقفہ وقفہ سے پانی کو پینا۔ اس کے اثر سے وہ تم پر نہ تو حملہ کر سکے گی اور نہ ہی اُس وقت تک بیدار ہوگی جب تک تم اُسے جھاڑیوں میں نہیں پھینک دیتے۔ میں دور کھڑا ہو کر تمہاری مدد کروں گا۔ میں پڑھائی کرتا رہوں گا۔ تم اس کام کے لیے کسی سے گاڑی لے لو۔''

''ہاں میرے ماموں کے بیٹے کے پاس ٹیکسی ہے۔ میں اُس سے لے لوں گا۔''

بہرحال نواز دوسرے دن تمام کاموں سے فارغ ہو کر اُس درخت کی طرف چل دیا۔ مولانا صاحب آ گئے تھے۔ اُس نے تمام چیزوں کا پہلے سے ہی انتظام کر لیا تھا۔

اُسے اُس جگہ کو کھودنے میں زیادہ ٹائم نہیں لگا۔ تھوڑی دیر بعد اُس جگہ سے معطر سی خوشبو آنا شروع ہو گئی۔ نواز نے پانی پیا اور چاروں طرف چھڑکا اور کام تیزی سے کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اُسے ایک لڑکی کی لاش مل گئی۔ وہ لڑکی بالکل رجا کی طرح خوبصورت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سو رہی ہے۔ ایک عرصے بعد بھی اس کی لاش بالکل تازہ تھی۔ اُس نے وہی اورنج لباس پہن رکھا تھا۔ اُس کے گلے میں مسیحی لاکٹ پڑا ہوا تھا۔ اُس نے جلدی سے لاش کو چادر میں باندھا، ٹیکسی کی ڈگی میں رکھا۔ مولانا صاحب بھی جلدی سے گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہ اپنی پڑھائی جاری رکھے ہوئے تھے۔ اچانک لاش میں سے ایک گندی بدبو آنے لگی۔ گاڑی میں سانس لینا مشکل ہو گیا۔ مولانا صاحب بولے۔

''نواز جلدی کرو اگر یہ بیدار ہو گئی تو تمہارے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔'' بڑی مشکل سے وہ لوگ قبرستان تک پہنچے نواز نے رجا کی باڈی کو جلدی سے جھاڑیوں میں پھینکا۔ اُسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کو مولانا صاحب نے سختی سے منع کیا تھا۔

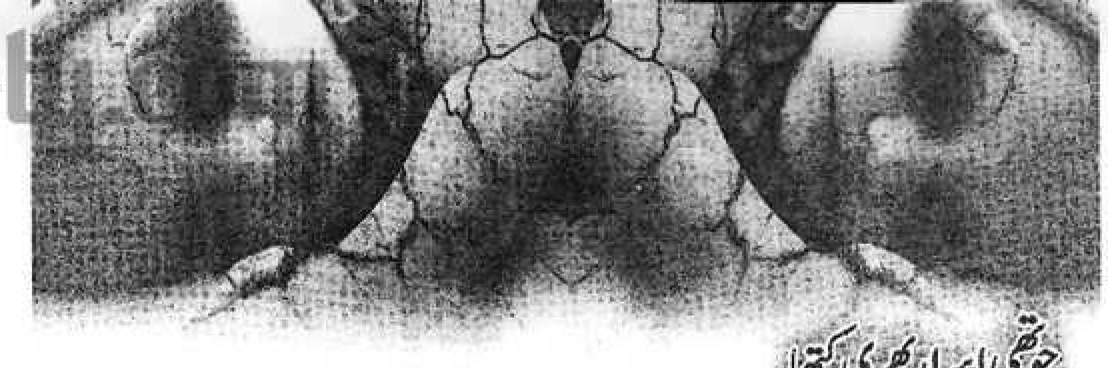
چاروں طرف سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ فضا میں عجیب سی سرسراہٹ طاری تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بچی سسک سسک کر رو رہی ہے۔ مولانا صاحب آنکھیں بند کر کے قرآنی آیتوں کا ورد کرتے رہے۔

نواز نے گاڑی جلد ہی گھر کو جانے والے راستے پر موڑ دی۔

گھر پہنچ کر انہوں نے شکر ادا کیا۔ مولانا صاحب نے کہا کہ تم بالکل پریشان مت ہونا۔ وہ اپنی جگہ پر پہنچ گئی ہے۔

یہ داستان نواز نے اپنے مرنے سے پہلے اپنے دوست کو سنائی تھی۔ جس کی بدولت آج میں لکھ رہی ہوں۔ اللہ جانتا ہے کیا جھوٹ ہے کیا سچ۔

☆☆......☆☆



چوتھی اسرار بھری کتھا

بیٹا دے یا ...... مایا

سیما عروج صدیقی

اُس ماں کی کہانی جس سے 'مایا' بیٹے کی بھینٹ مانگ رہی تھی

آج پھر کجو کی بیوی نے وہی خواب دیکھا تھا۔ جو وہ گزشتہ کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ پہلے کی طرح ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ اُس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس کے بڑبڑا کر اٹھنے سے کجو کی نیند خراب ہوگئی تھی اور وہ بھی اٹھ بیٹھا تھا۔

"ارے بھئی کیا بات ہے۔ کیوں پریشان ہو رہی ہو۔"

"آج پھر مجھے وہی خواب دکھائی دیا ہے۔ ارشد کے ابو تم کسی سے میرے خواب کی تعبیر پتا کرو۔ کوئی غیبی آواز میرے بچے کو مانگ رہی ہے۔ جب سے یہ خواب دکھائی دیا ہے ارشد بھی بیمار رہنے لگا ہے۔ اور دو مرتبہ اس کا ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا ہے۔ تم کل جا کر مفتی صاحب سے میرے خواب کی تعبیر پتا کرو۔" کجو خوابوں پر یقین رکھنے والا بندہ نہ تھا۔ وہ اول فول بکتا ہوا کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کے نزدیک گلشن کے خوابوں کی وجہ تبخیرِ معدہ کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔

گلشن رات بھر سو نہ سکی۔ صبح وہ بوجھل اور تھکی تھکی تھی۔ اُس نے تمام کام ختم کیے دوپہر کو ارشد دکان سے کھانا کھانے آیا۔ ہاتھ دھو کر زمین پر بیٹھ گیا۔

"امی جلدی سے مجھے کھانا دے دو واپس دکان جانا ہے۔"

"ہاں ابھی لائی۔" گلشن نے ارشد کے آگے کھانا لا کر رکھ دیا۔ جو پہلے سے تیار تھا۔ کھانے کھاتے ہوئے اُسے احساس ہوا کہ جس جگہ وہ بیٹھا ہے وہاں زمین کچھ گرم ہے۔

"امی دیکھنا ذرا یہ زمین گرم ہے یا مجھے محسوس ہو رہی ہے۔"

"ہائیں یہ کیا بک رہا ہے تو۔"

"ہاں اماں ذرا زمین کو چھو کر دیکھو تو۔"

گلشن نے جیسے ہی زمین کو ہاتھ لگایا ارشد کے ارد گرد کی زمین اُسے گرم محسوس ہوئی۔ ارشد وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ مگر گلشن تشویش میں مبتلا ہوگئی۔ مگر پھر اس نے اپنا وہم سمجھ کر اس بات کو نظر انداز کر دیا۔ ارشد کھانا کھا کر دکان چلا گیا۔ اور گلشن پڑوس میں قرآن خوانی میں شرکت کرنے چلی گئی۔

شام کو جب سب لوگ گھر لوٹے تو ارشد گلشن کے علاوہ کجو بھی چونک بنا نہ رہا کہ زمین کا ایک خاص حصہ جہاں ارشد سوتا تھا وہ نہایت گرم ہو رہا تھا۔ اتنا گرم کے ہاتھ رکھنے پر جلنے لگتا۔ وہاں سونا تو دور بیٹھنا تک ممکن نہ تھا۔ یہ ایک انوکھی اور عجیب سی بات تھی۔ ایسا بھی نہ تھا کہ کجو کسی پہاڑی علاقے کا باسی تھا۔ جہاں آتش فشاں کے باعث زمین گرم ہو رہی ہو۔ خیال آیا کہ ساتھ کے گھر والے حلیم بریانی کا کاروبار کرتے تھے۔ ممکن ہے انہوں نے رات بھر حلیم پکایا ہو جس کے اثر سے زمین گرم ہوگئی ہو۔ گلشن فوراً دیوار کے پیچھے رہنے والے محمود بھائی کے گھر دوڑی مگر انہوں نے تو کئی مہینوں سے حلیم بریانی کا کام چھوڑ دیا تھا۔ اور انہوں نے حلیم وغیرہ کچھ بھی نہیں پکایا تھا۔ گلشن اب پریشان ہوگئی۔ وہ دوڑی دوڑی گھبراہٹ کے عالم میں میرے پاس آگئی۔ اس وقت میں مغرب کی نماز ادا کر کے فارغ ہوئی تھی۔ جب بھی اُسے کوئی دینی مذہبی بات معلوم کرنی ہوتی، کسی مسئلے کا حل نہ ملتا تو ہمیشہ میرے پاس آجاتی اور میں حتیٰ الامکان اُس کی تسلی کر دیا کرتی۔ آج بھی وہ پریشان ہو کر میرے گھر آگئی تھی۔ اور آتے ہی بولتی ہی چلی گئی۔ جیسے اس کی چھٹی حس اُسے کسی خطرے کی خبر دے رہی ہو۔

"باجی میں اس وقت آپ کے پاس بڑی مشکل میں آئی ہوں۔" اس نے ایک ہی سانس میں ساری کہانی میرے گوش گزار کر دی تھی۔ میں نے اُسے پانی پلا کر تسلی دی۔ اُس کی بات سن کر میں اس عجیب و غریب واقعے پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ پھر میں نے اُس سے پوچھا۔

"تمہیں کوئی خواب تو نظر نہیں آیا۔"

اُس نے اپنے وہ خواب مجھے بتائے جس میں کوئی غیبی طاقت اُس کو پکار کر کہتی تھی۔ "بیٹا دے دے مایا لے لے۔"

اتنا سنتے ہی میں بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔ میں نے اُس کو ایک لمحہ کی دیر کیے بنا کہا کہ میں تمہارا مسئلہ سمجھ گئی ہوں۔ مگر اس حالت میں تمہیں کیا کرنا چاہیے۔"

میں یہ نہیں جانتی مطلب اُس کے گھر میں مایا تھی جو بھینٹ مانگ رہی تھی۔ اُس کے اکلوتے بیٹے کی جان واقعی خطرے میں تھی۔ اگر وہ گرم زمین پھٹ جاتی تو اُس کے بیٹے کی جان پر بن آتی۔ اور جہاں اُس کا بیٹا سوتا تھا وہیں پر زمین گرم ہو رہی تھی۔ میں نے اُس سے کہا۔ "تم فوراً میرے ساتھ چلو۔" میں ایک لمحہ کی دیر کیے بنا اُسے قریبی مسجد کے امام صاحب کے پاس لے گئی۔ کیونکہ امام صاحب مخصوص دنوں اور مخصوص وقت تک مسائل کا حل لوگوں کو دیتے تھے۔ اگر وہ اٹھ جاتے تو دیر ہو جاتی۔ گلشن میرے ساتھ دوڑ پڑی۔ امام صاحب نے مسئلے کو غور سے سنا اور مسئلے کا حل عنایت کرتے ہوئے کہا۔

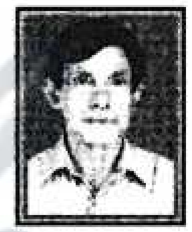
"آپ فوراً گھر جائیں ابھی اسی وقت گھر کے مردوں سے گھر کے چاروں کونوں میں اذان دلوائیں۔ یہ دم کیا ہوا پانی اُس جگہ چھڑک دیں۔ اور تین دن تک اذانیں چاروں کونوں میں دلوائیں۔ اور اس واقعے کا ذکر نہ کریں۔" گلشن نے ایسا ہی کیا رفتہ رفتہ زمین ٹھنڈی ہوتی گئی۔ اور وہ زمین جس پر پانی چھڑکنے پر چیخ کی آواز سے دھواں اٹھتا تھا۔ رفتہ رفتہ دو دن کے اندر ٹھنڈی ہوتی چلی گئی۔ اس کے بعد گلشن کو بھی وہ خواب نظر نہیں آیا۔ اُس نے وہ گھر فروخت کر دیا ہے۔ آج بھی وہ گھر موجود اُس گھر کے نئے مکین آرام سے رہ رہے ہیں۔ میں اس واقعہ کی چشم دید گواہ ہوں۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔ نجانے وہ مایا آج بھی اُس گھر میں دفن ہے یا زمین نیچے سے قرآن و اذان کی برکت سے کہیں اور بھینٹ مانگنے سرک گئی ہو۔ کون جانے۔

☆☆☆





پچھل پیری



بشیر احمد بھٹی

بہاول پور سے ایک خوف بیتی

اس خوفناک کہانی کا راوی علیم الدین کا بھائی نعیم الدین ہے۔ یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت نعیم الدین کی فوجی بستی چوک میں آڈیو وڈیو کی شاپ تھی۔ تاج دین کا بیٹا اکبر شاہ نعیم بھائی کی دکان پر کام کرتا تھا۔

گرمی کی ایک رات کا ذکر ہے۔ نعیم الدین کو چند وڈیوز لینے کی خاطر بازار جانا پڑا۔ وہ بازار گیا اور اپنے ایک دوست کی دکان سے اس نے چند وڈیو کیسٹ لیں اور واپسی کا سفر اختیار کیا۔ سینٹرل لائبریری روڈ اس وقت ویران رہتا تھا۔ اس روڈ پر لائٹ وغیرہ کا بندوبست نہیں تھا۔ رات کو اس روڈ پر اُلو بولتے تھے۔ بہت کم لوگ اس روڈ کو استعمال کرتے تھے۔ نعیم بھائی نے یہ افواہ بھی سن رکھی تھی کہ رات کو اس روڈ پر ایک پراسرار عورت نظر آتی ہے جو چلتے چلتے اچانک نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ کئی لوگ تو اس نظارے کو اپنی نظروں کا دھوکہ سمجھتے تھے۔ دل کا وہم سمجھ کے کئی لوگوں نے اس بات کی پروا نہیں کی۔

وہ مافوق الفطرت پراسرار عورت کون تھی؟ یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ سینٹرل لائبریری اور اب موجودہ آڈیٹوریم کی جو عمارت ہے۔ ان دونوں عمارتوں کے درمیان ایک گلی نما روش، جس میں اینٹوں کا فرش لگا ہوا ہے۔ عدالت کی طرف جاتی ہے۔ پہلے یہ راستہ عدالت کی طرف جانے والے لوگ استعمال کرتے تھے۔ آج کل اس راستے کو بند کر دیا گیا ہے۔ یہ راستہ اب جھاڑ جھنکار سے پُر، ویران پڑا ہے۔ اس راستے کے دونوں طرف لوہے کا جنگلہ لگا ہوا ہے۔ ایک جانب لائبریری کا پلاٹ ہے۔ دوسری جانب آڈیٹوریم کا پلاٹ اور عمارت موجود ہے۔ آڈیٹوریم میں ریلوے کا ایک قدیم کالا انجن بھی جنگلے کے قریب مصنوعی لائن پر کھڑا ہے۔ آڈیٹوریم میں موجود پاکستانی ثقافت کو دیکھنے کا ٹکٹ 10 روپے ہے۔ اندر بہت کچھ موجود ہے۔ جب پاکستان وجود میں آ رہا تھا۔ اس وقت کی ادب وثقافت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ قائد اعظم، لیاقت علی خان، محترمہ فاطمہ جناح کی ماضی کی شاندار تصاویر کا اس آڈیٹوریم میں نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ادارہ اتوار کو بھی کھلا رہتا ہے۔ سرکاری ملازمین اتوار کو ڈیوٹی کرتے ہیں اور اتوار کی جگہ سوموار کو تعطیل یعنی چھٹی کرتے ہیں۔

وڈیو فلمیں لے کر رات کو دس بجے جب لائبریری روڈ پر پہنچا۔ اس وقت روڈ ویران پڑا تھا۔ اس پُر اسرار عورت کے بارے میں اس نے بھی سن رکھا تھا۔ مگر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس وقت یہ روڈ سنگل تھا۔ اب خیر سے اس روڈ کو ڈبل (دو رویہ) کر دیا گیا ہے۔ لائٹ کا بھی بندوبست ہے۔ دونوں سڑکوں کے درمیان درخت بھی لگا دیے گئے ہیں۔ جو کافی بڑے ہو چکے ہیں۔ سڑکوں کے دونوں جانب لوہے کے جنگلے بھی موجود ہیں۔ یعنی سینٹرل لائبریری والی سمت میں اور وکٹوریہ اسپتال کی سمت میں۔



نعیم الدین جوں ہی سینٹرل لائبریری کے سامنے پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک عورت چلتی چلی جا رہی ہے۔ وہ عورت چونکہ کافی آگے تھی۔ اس لیے جب نعیم الدین اس کے قریب سے گزرا تو اس نے سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی۔ مرد حضرات کی یہ عادت ہوتی ہے۔ دن ہو یا رات۔ عورتوں کے قریب سے گزرتے ہوئے اُن پر ایک طائرانہ سی نگاہ ضرور ڈالتے ہیں۔ جب نعیم الدین نے اس پر نگاہ ڈالی۔ وہ اس گلی کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ جو سینٹرل لائبریری اور آڈیٹوریم کے درمیان سے عدالت کی طرف جانے کا راستہ تھا۔ عورت کا لباس چمکیلا تھا۔ سر پر چنریا تھی۔ گھٹنوں سے اوپر تک قمیض کی لمبائی تھی۔ شلوار کی جگہ اس نے گھاگھرا پہن رکھا تھا۔ یہ مکمل ہندوانہ لباس تھا۔ عورت عدالت کی طرف جانے والے گلی نما راستے کے نکڑ پر رکی ہوئی تھی۔

یکایک نعیم الدین کی آنکھوں میں ایک روشنی سی لہرائی۔ اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ یہ روشنی جھلمل کرتے انداز میں اس کے چہرے کی طرف آ رہی تھی۔ وہ عورت ہاتھ کی دو انگلیوں کو اوپر نیچے کر کے اسے اپنی جانب بلا رہی تھی۔ اس کی انگلیوں کے ناخن بڑے تھے۔ اُن ناخنوں کی سطح چمکیلی تھی۔ ناخنوں سے قوسِ قزح جیسے نیلے پیلے رنگ پھوٹ رہے تھے۔ چمک اتنی تیز تھی کہ نعیم الدین کے لیے اپنی آنکھیں کھلی رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ آنکھوں کے سامنے کر لیا اور پھر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ آنکھوں کے سامنے ہاتھ کر کے اس نے عورت کے پیروں کی طرف دیکھا۔ پیر پیچھے کی جانب مُڑے ہوئے تھے۔ اس کا گھاگھرا ٹخنوں سے ذرا اوپر تھا۔ نعیم الدین نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ یہ عورت پچھل پیری ہے۔

اب اس کا وہاں ٹھہرنا جان جوکھوں میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ اس نے فوراً آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے موٹر سائیکل کی رفتار بڑھا دی۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اپنی دکان پر جا کے دم لیا۔ وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ یہ پچھل پیری ہندو ہے۔ اس نے اکبر شاہ سے کہا۔ ”تم دکان بند کر دینا۔ میں ذرا گھر جا رہا ہوں۔ طبیعت خراب ہے۔ سر درد ہو رہا ہے۔“

یہ کہہ کر نعیم الدین گھر گیا اور اُس نے دو گولیاں اسپرین کی کھائیں اور چائے پی کر لیٹ گیا۔ ساری رات نیند اس کی آنکھوں سے دور رہی۔ وہ کروٹ بدلتا رہا۔ یہ نظارہ اسے پریشان کر گیا تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح وہ دکان پر دن کے بارہ بجے آیا۔ اس نے مجھے اور اکبر شاہ کو رات کا یہ واقعہ سنایا۔ نعیم الدین نے ہمیں تلقین کی کہ رات کو لائبریری روڈ پر نہ جایا کرو۔ اب مجھے سمجھ آئی ہے کہ وہ روڈ رات کو ویران کیوں ہو جاتا ہے۔ لوگ اس روڈ سے کیوں دور رہتے ہیں؟ اگر تم رات کو بازار جاؤ تو ڈی سی آفس چوک سے ہو کر جاؤ اور اُسی راستے سے واپس آؤ۔ ہاں لائبریری اور آڈیٹوریم کے درمیان جو گلی ہے۔ اس میں سے تو ہرگز نہ جانا۔ وہ اس پُر اسرار عورت کا مسکن ہے۔“

یہ کہانی سنا کر نعیم الدین نے اکبر شاہ سے کہا کہ اس رات میں آیت الکرسی کی برکت سے بچ کر آیا ہوں۔ ہر مسلمان عورت مرد اور بالغ بچوں پر لازم ہے کہ وہ آیت الکرسی زبانی یاد کر لیں۔ اس سے جنات گھبراتے ہیں۔ اور نقصان نہیں پہنچاتے۔“

☆☆☆



حلوہ کھاؤں گی!



محمد اسامہ

اُس جوڑے کو خدا نے اولاد تو دی، لیکن......!

کبھی کبھی ہماری زندگی میں ایسے پُراسرار واقعات بھی رونما ہو جاتے ہیں جنہیں جب ہم کسی اور کو بتاتے ہیں تو لوگ یقین نہیں کرتے یا پھر ہنس دیتے ہیں۔ ایک ایسا ہی پُراسرار واقعہ ہمارے ساتھ بھی پیش آیا۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب ہم لوگ سیالکوٹ میں رہا کرتے تھے۔ ہمارا گھر دو منزلہ تھا اوپر ہم رہتے تھے جبکہ نیچے والا پورشن ہم نے عنایت صاحب کو کرائے پر دیا ہوا تھا جو اپنی ماں اور چھوٹی بہن کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جلد ہی عنایت کی چھوٹی بہن عظمٰی سے میری گہری دوستی ہو گئی۔ انہی دنوں میں عنایت بھائی کے لیے ایک غریب گھرانے کی لڑکی سے رشتے کی بات شروع ہوئی۔ لڑکی چونکہ خوبصورت اور معصوم تھی اس لیے عنایت کی ماں نے فوراً حامی بھر لی۔ ایک سال کے اندر ثمینہ دلہن بن کر عنایت کے گھر آ گئی۔ شادی کے بعد تقریباً چھ سال تک عنایت اولاد جیسی نعمت سے محروم رہا لیکن ساتواں سال عنایت کے لیے خوشی کا سورج لے کر طلوع ہوا۔

مجھے وہ رات اچھی طرح یاد جب عظمٰی رات کو دس بجے مجھے اوپر بلانے آئی اور بڑی خوشی کے ساتھ کہا ''انیسہ جلدی میرے ساتھ چلو بھابی کی لڑکی ہوئی ہے۔ دونوں ساتھ چل کر اپنی بھتیجی کو دیکھتے ہیں۔''

جب ہم دونوں نیچے پہنچے تو بچی کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہ بچی عام بچیوں سے بالکل مختلف تھی۔ اس کے چہرے کا آدھا حصہ خاصا گورا تھا جبکہ باقی آدھا حصہ سانولے رنگ کا تھا۔ عظمٰی کی امی نے بتایا کہ یہ بچی اب تک ایک منٹ کو بھی نہیں روئی۔ میں نے جلد ہی یہ محسوس کیا کہ یہ بچی اس گھر کی در و دیوار کو اس طرح تک رہی تھی جیسے برسوں پہلے یہاں رہ چکی ہو۔ وہ بچی جسمانی طور پر دو گھنٹے پہلے پیدا ہوئی بچی معلوم ہو رہی تھی لیکن اس کی حرکات کسی بے حد ذہین اور چالاک انسان کی سی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ثمینہ نے بچی کو گود میں لیا اور ہر ماں کی طرح پیار سے اس سے پوچھنے لگی کہ میری بیٹی کو بھوک لگی ہے، میری بیٹی کیا کھائے گی؟

مگر اس وقت ہم سب کے قدموں تلے زمین نکل گئی جب اس بچی کے منہ سے تقریباً بیس بائیس سالہ عورت جیسی آواز نکلی اور وہ بولی ''میں حلوہ کھاؤں گی'' یہ آواز اتنی صاف تھی اسے وہم کا نام نہ دے سکے۔

ثمینہ تو ایک دم سکتے کی حالت میں آ گئی، اس نے بے یار اس پُراسرار بچی کو پلنگ پر چھوڑ دیا۔ کیا بتاؤں اس وقت ہم سب کی کیا حالت تھی۔ وہ بچی ہم سب کو باری باری اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے بس ابھی ہم کو کسی بھوکی شیرنی کی طرح کھا جائے گی۔

ہم سب ڈر کی وجہ سے اس بچی کو چھوڑ کر بھاگ آئے۔ عظمٰی کی امی نے جلد ہی مولوی صاحب کو بلوایا۔ کچھ ہی دیر میں مولوی صاحب آ گئے۔ مولوی صاحب نے سب سے پہلے اس بچی کو غور سے دیکھا۔ اور اپنی پوری قوت کے ساتھ انہوں نے بچی



کے پیروں کو پکڑا اور پوچھنے لگے ''بتا کون ہے تُو'' اس بار اس بچی کے منہ سے ایک الفاظ بھی نہیں نکلا، بس صرف اس کی آنکھیں لال ہو گئیں، جن میں خون سا تیرنے لگا۔ مولوی صاحب نے دوبارہ یہی عمل دہرایا اور پوچھا ''بتا کون ہے تو'' اس بار اس بچی کے منہ سے چیخ نکلی اور اس نے خوفناک آواز میں کہا۔

''مجھے کچھ مت کرو۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی، مجھے چادر میں لپیٹ کر صحن میں چھوڑ دو۔ لیکن یاد رکھنا میرے جانے کے بعد تیز آندھی آئے گی اور بارش ہو گی۔''

مولوی صاحب نے یہ سننے کے بعد عنایت سے چادر مانگی، بچی کو اس میں لپیٹا اور اس پُراسرار بچی کو فرش پر لٹا دیا۔

آپ یقین کریں اس وقت میں وہاں موجود تھی۔ پلک جھپکتے ہی وہ لڑکی فرش سے غائب ہو گئی اور جیسے ہی وہ فرش سے غائب ہوئی، موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

عنایت صاحب نے ہمت کر کے مولوی صاحب سے پوچھا کہ مولوی صاحب یہ سب کیا تھا۔''

مولوی صاحب نے کہا'' بیٹے یہ سب خدا کے فیصلے ہیں۔ وہی بہتر جانتا ہے ہم بندے کیا کہہ سکتے ہیں۔''

دو ماہ کے بعد عنایت صاحب سیالکوٹ چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں آباد ہو گئے اور ہم نے بھی اپنا دو منزلہ گھر فروخت کر دیا۔ آج بھی جب وہ پُراسرار بچی آنکھوں کے سامنے تصویر بن کر آتی ہے تو مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ اور میں اس بچی کی شکل کو اب تک نہیں بھولی ہوں حالانکہ اس واقعے کو برسوں گزر گئے ہیں۔

☆☆☆

بادبان

نعمان اسحاق

خواہشوں کے سمندر میں سفر کرتا، ایک حاصل مطالعہ ناول،

جس میں زندگی کا بادبان ایک نئے جذیرے کا سفر کرائے گا۔

(دوسرا حصہ)

تمام قزاق اپنی کشتی میں سوار ہو چلے تو کشتی میں چپو چلانے پر معمور قزاق جو پہلے ہی چپو تھامے جیسے تیار کھڑے تھے۔ نے تیزی سے چپو چلانے شروع کردیے۔ جسم کی طاقت بازوؤں سے چپوؤں کو منتقل ہوئی۔ چپو نیلے پانی کو مخالف سمت دھکیلتے اور کشتی آگے کی طرف سرکتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کشتی بحری بیڑے سے دور ہوتی گئی۔ قزاقوں کے سردار نے اپنی داہنی جیب میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں ایک لاکٹ تھا۔ لاکٹ میں ایک سفید رنگ کا نگینہ جڑا تھا۔ نگینے سے روشنی اس طرح منعکس ہوتی کہ آنکھوں کو خیرہ کرتی۔ یہ نگینہ سردار نے بیڑے کی ایک امیر خاتون کے گلے سے اتروایا تھا۔ قہقہہ لگا کر سردار نے نگینے کی ٹھنڈک کو ہاتھوں کی پوروں سے محسوس کیا اور اپنے ساتھیوں کو متوجہ کیا۔

''یہ ایک نایاب نگینہ ہے، اس کی قیمت لگانا جوہریوں کے بس میں نہ ہوگا۔''

مکروہ چہرے والے قزاق کی آنکھوں کی چمک بھی دہشت میں مبتلا کرنے والی تھی۔ سبھی قزاق سردار کے ہاتھ میں دبے نگینے کو شوق سے دیکھنے لگے۔ سوائے کنارے پر کھڑے سنہری بالوں والے عربی النسل قزاق کے۔

''کیا یہ ہیرا ہے؟''

''ہاں۔'' سردار نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

سردار ہیرے کی وضع، تراش اور ساخت کے بارے میں بتانے لگا۔ سبھی منہمک ہو کر سنتے ہوئے جوڑ توڑ کرنے لگے کہ ہیرا کس قیمت میں فروخت ہوگا۔ تبھی سنہری بالوں والا قزاق بولا۔

''سردار میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' سردار نے عربی النسل نوجوان کو بغور دیکھا۔ جیسے نظروں میں تولا۔ یہ اس کے گروہ کا سب سے رحم دل قزاق تھا۔ جسے ہمیشہ لوٹے جانے والے لوگوں کی فکر رہتی تھی۔ یوں تو اس کی رحمدلی سردار کو زیادہ پسند نہ تھی مگر وہ جانتا تھا کہ یہ رحم دلی اسے نسلاً منتقل ہوئی ہے۔ وراثت میں منتقل ہوئی۔ چیز پر اب سردار کیا اعتراض کرتا۔

''بولو۔'' سردار کی آواز گرجدار تھی۔

سنہری بالوں والے قزاق نے ایک نظر لمحہ بہ لمحہ دور ہوتے بیڑے پر ڈالی۔ جس کا پھٹا ہوا بادبان ہوا کے دوش پر لہلہاتا عجب منظر پیش کرتا تھا۔

''سردار اس بیڑے کا بادبان پھٹ گیا ہے۔ بیڑہ بے سمت ہو کر سمندر میں بھٹک جائے گا۔ سمندر میں بھٹکنے والے بھلا کہاں منزل کو پہنچ پاتے ہیں۔'' سردار نے توجہ سے سنا۔ چند لمحے خاموش نظروں سے اپنے عرب النسل

ساتھی کو دیکھتا رہا اور پھر جب گویا ہوا تو آواز حسب معمول گرجدار تھی۔

''جیسے ہر کمرے کا ایک دروازہ ہوتا ہے۔ ویسے ہی ہر مشکل کا ایک حل ہوتا ہے۔ جب فطرت انسان کو کسی آزمائش میں ڈالتی ہے تو انسان سوچے بغیر اپنے لیے کچھ اور آزمائشیں کھڑی کر لیتا ہے۔ اس صورتِ حال میں انسان کو تمام آزمائشوں سے اکیلے نبرد آزما ہو کر ہی کامیاب ہونا ہوتا ہے۔ اے میرے عربی النسل ساتھی۔ بادبان ملاح نے پھاڑا ہے۔ اب اسے خود ہی اس مسئلے سے نمٹنے دو۔ ہم تو یہاں سے بس تماشا دیکھیں گے۔''

سردار کا لہجہ اٹل تھا اور سنہری بالوں والے قزاق کے سوا سبھی سردار کی باتوں سے متفق تھے اور سنہری بالوں والے کے پاس بھی جیسے متفق ہوئے بغیر چارہ نہ تھا۔

☆......☆......☆

ہفتے کی رات کو فٹ پاتھ پر ٹہلتے چنبیلی سوچ رہی تھی کیا آج صاحب آئے گا۔ اس دن مال میں اس نے جو احمقانہ حرکت کی تھی اس کے بعد بھی اگر وہ صاحب آتا ہے تو یقیناً وہ چنبیلی سے کچھ خاص لگاؤ رکھتا ہے۔

''ویسے شکر ہے صاحب کے ساتھ لڑکی کو شک نہ ہوا اور صاحب نے بات سنبھال لی۔'' مشرق سے مغرب فٹ پاتھ ماپنے کے بعد چنبیلی نے رخ موڑا اور اب مغرب سے مشرق قدم قدم چلنے لگی۔

سرخ گاڑی فٹ پاتھ کے قریب جھٹکے سے رکی۔ قبل اس کہ چنبیلی متوجہ ہوتی۔ بدر دروازہ کھولتا اترا۔ اور قدموں سے دھمک پیدا کرتا چنبیلی کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ بدر کے چہرے کا تناؤ اس کے غصے کی وضاحت کر رہا تھا۔ چنبیلی ناسمجھی سے بدر کو دیکھنے لگی۔ اس سے پہلے وہ کچھ بولتی۔ بدر نے دایاں ہاتھ گھمایا اور ایک تھپڑ چنبیلی کے بائیں گال پر پڑا تھا۔

''فاحشہ'' تجھے پیسے اس لیے نہیں دیتا تھا کہ تُو شہر میں



ڈھنڈورا پیٹے۔'' مغلظات کا طوفان تھا جو بدر بک رہا تھا اور چنبیلی کے کانوں میں زہر کی مانند منتقل ہو رہا تھا۔ ''اگر سارہ کو شک بھی ہو جاتا تو۔۔۔۔'' بدر نے چنبیلی کو گردن سے دبوچا تھا اور شہادت کی انگلی سے تنبیہ کر رہا تھا۔

''معمولی سی فاحشہ! نہ آگے نہ پیچھے۔ آج زندہ گاڑ دوں تو کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا۔ کہاں مر کھپ گئی۔ گندے نالے کے پاس اگی کھمبیوں سے زیادہ تیری اوقات نہیں۔''

یہ افتاد اس قدر غیر موقع اور اچانک تھی کہ چنبیلی سنبھل ہی نہ پائی۔ بدر نے گردن چھوڑی۔ چنبیلی کھانسی، گردن سہلائی جب تک سنبھلی بدر بکتا جھکتا گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی یہ جا وہ جا۔

''سالا، کمینہ، کتا۔۔۔۔'' چنبیلی نے ایسی واہیات مردانہ گالیاں دیں کہ بس انتہا۔ سرخ گاڑی دور مشرق کی سمت جا رہی تھی۔ چنبیلی نے فٹ پاتھ پر پڑا پتھر اٹھایا اور گاڑی کی سمت پھینکا۔ پتھر گاڑی کی گرد کو بھی نہ چھو سکا۔

گردن سہلاتی، سرخ چہرہ لیے چنبیلی بکتی جھکتی فٹ پاتھ پر کھڑی رہ گئی۔

☆......☆......☆

''میرا ڈر بلاوجہ نہیں۔ میں پہلے نہ کہتی تھی کہ کوئی چاہے ہمیں مار کر پھینک جائے کون ہے ہمارا پوچھنے والا۔'' چندہ نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

''چندہ اگر پاس کوئی شے پڑی ہوئی تو میں ضرور تجھے دے مارتی۔'' چنبیلی کا لہجہ معمول سے تیز تھا۔

''ہونہہ۔ چنبیلی تو کبھی میری بات کو اہمیت نہیں دے گی۔'' چندہ نے منہ پھلا کر کہا تھا۔ ''چلو چھوڑو اب ان باتوں کو کیا فائدہ۔'' رانی نے اس موضوع کو رفع دفع کرنا چاہا۔

خلافِ معمول آج بھی لڑکیاں اکٹھی ہو بیٹھی تھی۔ وہ لڑکیاں جو ایک دوسرے کی کچھ نہ لگتی تھیں پر برس ہا برس سے اکٹھے رہ رہی تھیں۔

''سونی تو کیوں اداس لگ رہی ہے۔'' رانی نے موضوع بدلنے کے لیے سب کی توجہ سونی کی طرف مبذول کی۔

اداس چہرہ سونی چہرے پر ایک سوگوار مسکراہٹ لے آئی۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں'' سونی نے بات ٹالی۔

سیاہ آنکھوں، بھورے گھنگھریالے بالوں والی سونی اس گھر کی سب سے سادہ لڑکی تھی۔ رات کو سنگھار کیے بغیر ہی سب کے ساتھ جاتی۔ پیادہ، دو پہیوں والی سواری والا یا شاندار گاڑی والا جو شخص سونی کی طرف سب سے پہلے متوجہ ہوتا سونی اس کے ساتھ چلی جاتی۔

''سونی تم ہی بتاؤ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔ اب یہ چنبیلی کا سرخ گاڑی والا صاحب، کتنی تعریفیں کرتی تھی چنبیلی، آج اپنی اصلیت دکھا گیا۔ وہ شریف آدمی یہ کر سکتا ہے تو خود سوچو اگر کوئی خبیث مل گیا تو وہ تو ہماری بوٹیاں۔۔۔۔''

''چندہ'' چنبیلی نے اکتا کر چندہ کو ٹوکا۔

''یہ جو تو خود چیل کوؤں کو اپنی بوٹیاں کھلانے پر بضد ہے۔ یہ سوچ سوچ کر تو ایک دن پاگل ہی ہو جائے گی۔ چاہے تو میری بات لکھ کر رکھ لے۔'' چنبیلی نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ نا چاہتے ہوئے بھی باقیوں کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

اسی وقت سیفی ہاتھ میں کیک لیے کمرے میں داخل ہوا۔

''لڑکیو، لڑکیو، میں آج تم سب کے لیے کیک لایا ہوں۔ آج میں بہت خوش ہوں۔'' سیفی نے کیک ایک طرف رکھا۔ دور پڑی میز لا کر درمیان میں رکھی اور پھر کیک اس میز پر رکھ دیا۔

''ایسی بھی کیا خاص بات تھی کہ سیفی آج ہمارے لیے کیک لے آیا۔'' رانی خوش دلی سے بولی۔

خوش رنگ چاکلیٹ کیک سبھی کی نظروں کا محور ہے۔

''پہلے تم سب منہ میٹھا کر لو۔ پھر بتاتا ہوں۔'' سیفی نے اٹھلا کر ایک ادا سے کہا تھا۔ ''رانی تم سب سے بڑی ہو۔ تم ہی اس کیک کے ٹکڑے کرو۔'' سیفی نے چھری رانی کی طرف بڑھائی تھی۔ رانی نے چھری پکڑ لی اور آگے بڑھ کر کیک کے ٹکڑے کرنے لگی۔

''اب بتا بھی دے سیفی کہ ایسی کون سی خوشخبری ہے۔'' چنبیلی نے کیک کا ٹکڑا منہ میں ڈالا تھا۔

خوش و خرم کھڑا سیفی اپنے پیلے دوپٹے کا پلو پکڑ کر منہ میں دبا کر شرمانے لگا۔ سیفی کی اس ادا میں غضب کا مصنوعی پن تھا۔ لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ سیفی مزید شرمانے لگا۔ منہ سے دوپٹہ نکال کر انگلی پر بل دینے لگا اور گویا ہوا۔

''میں شادی کر رہا ہوں۔''

''اوہو۔۔۔۔'' کئی آوازیں بیک وقت ابھری تھیں۔

''مبارک ہو۔ بہت بہت''

''کون ہے وہ کیا کرتا ہے۔''

''کہاں ہے؟

''مرد ہے یا عورت؟'' مبارکباد دیتے ہوئے لڑکیاں طرح طرح کے سوال پوچھنے لگیں۔

''مرد، عورت کی تقسیم ہمارے حصے میں کہاں۔ میری برداری کا ہے اور کرتا کیا ہے۔ میری طرح دلال ہی سمجھو۔ پر ہے بہت خوبصورت اور مجھ سے محبت بھی خوب کرتا ہے۔'' سیفی کی باتوں میں اچانک اتراہٹ آ گئی۔ کمرے میں لمحے بھر کو خاموشی چھائی۔ لیکن لڑکیاں ایک بار پھر سیفی کو مبارک بادیں دینے لگیں۔

''مبارک ہو، بہت بہت''

☆......☆......☆

اور پھر وہ دن آ ہی گیا۔ جس کا پچھلے اڑھائی مہینوں سے انتظار تھا۔ رزلٹ کا دن۔

ساری رات یونہی سوتے جاگتے گزری تھی۔ یہ کوئی رات کے دو بجے کا وقت تھا جب اسفر کی آنکھ کھلی تو دوبارہ نہ لگی۔ کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا۔ مگر نیند نے نہ آنا تھا، نہ آئی۔

تنگ آ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ ساتھ والی چارپائی پر زوار سوئے ہوئے تھے۔ جب کہ افقی سمت میں بچھی چارپائیوں پر فاخرہ اور سدرہ تھیں۔ اسفر یک ٹک سدرہ کو دیکھے گیا۔ بے فکر نیند تھی۔ حالانکہ اس کا بھی رزلٹ تھا۔

سدرہ تھوڑا سا کسمسائی اور نیند میں ہی کروٹ بدلی۔ رشک و حسد کے ملے جلے جذبات سے اسفر سدرہ



کو دیکھے گیا۔ کئی لمحے ایسے ہی گزر گئے۔ پھر وہ اٹھا بنا آہٹ پیدا کیے باہر آیا۔

باہر آنگن چاندنی میں نہائے اندھیرے میں خاموش تھا۔ صحن کے بیچوں وبیچ کھڑے ہو کر اسفر نے آسمان پر موجود چاند کو دیکھا۔ گول ٹکیہ سا ٹھنڈک بھری روشنی والا چاند آسودہ حال تھا۔ اسفر نے سر جھکا لیا۔ دل کی دھڑکن معمول سے ہٹ کر تھی۔

قدم قدم چلتا وہ صحن کے ایک کونے میں لگے واش بیسن تک آیا۔

نل کھولا، پہلے ہاتھ دھوئے، پھر کلی کی، ناک میں پانی ڈالا، منہ دھویا اور جب وضو پورا ہو گیا تو ساتھ لٹکے تولیے سے اس نے چہرہ اور بازو پونچھے۔ برآمدے کے ستون کے ساتھ جائے نماز بچھائی، نیت باندھی اور تکبیر کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

یہ زندگی کی پہلی تہجد تھی جو اسفر نے پڑھی تھی۔ خدا سے آدھی رات کو وہ اس وقت ہی محو کلام ہوا تھا جب اسے خود اچھے نمبروں کی خواہش تھی۔ سدرہ سے بھی زیادہ نمبروں کی۔

لیکن زمینی حقائق اس طرح تھوڑی بدلتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے یہ حقائق بنائے ہی انسان کی آزمائش کے لیے ہیں۔

صبح دس بجے وہ اور جواد بورڈ کے دفتر کے سامنے سنگی بنچ پر بیٹھے تھے۔ طلباء کا جم غفیر تھا۔ جو گزٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ یوں تو چند گھنٹوں کی تاخیر کے ساتھ نیٹ پر بھی رزلٹ آجاتا۔ لیکن طلباء سے یہ چند گھنٹوں کا انتظار کہاں ہوتا تھا۔

بس گزٹ آنے ہی والا تھا۔ اضطراب اسفر کے ہر عضو سے جھلکتا تھا پر دل کے ایک گوشے میں سکون بھی تھا۔ بورڈ نے تین دن پہلے ضلع میں ٹاپ کرنے والے بچوں کے ناموں کا اعلان کر دیا تھا اور خوشی کی بات یہ تھی کہ سدرہ کا نام ان پانچ ٹاپرز میں نہ تھا۔ گزٹ کی کاپیاں باہر برآمد ہوئیں۔ ایسی افراتفری مچی کہ الامان۔

جواد نے پہلے اپنا رزلٹ دیکھا۔ خوشی سے چہرہ تمتما اٹھا۔ اس کی امید سے کچھ نمبر زیادہ ہی تھے۔ سدرہ اور اسفر کے رزلٹ چند رول نمبروں کے فرق کے ساتھ ایک ہی لائن میں تھے۔ پہلے انگلی سدرہ کے رزلٹ پر رکی اور پھر انگلی نے نیچے حرکت کی اور ایک بار پھر ساکت ہو گئی۔

اسفر کو لگا کہ جلدی میں وہ کسی اور کے نمبر دیکھ رہا ہے۔ لائن ملا کر اس نے دوبارہ نے دیکھا۔ وہ اسی کے نمبر ہی تھے۔ سدرہ اور اس کے نمبروں میں تین سو نمبروں کا فرق تھا۔

دل کا بوجھ اتنا بڑھا کہ اسفر کو سانس لینا دشوار محسوس ہوا۔

ہجوم کو چیرتا ہوا وہ باہر آیا۔ لڑکے ابھی بھی اپنا نتیجہ دیکھنے کے لیے گتھم گتھا تھے قدم من من بھر کے محسوس ہوتے تھے۔

''اسفر، اسفر، بات سنو۔'' جواد نے ہجوم سے ہی اسفر کو پکارا تھا۔ لیکن اسفر کو سنائی ہی نہ دیا۔ جواد بھی ہجوم سے نکل کر اسفر کا ہم قدم ہوا۔

''مبارک ہو اسفر بہت اچھے نمبر ہیں تمہارے۔'' جواد کے الفاظ پھیکے تھے۔

چلنا دشوار ہوا تو وہ ایک سنگی بنچ پر بیٹھ گیا۔

''یار اداس مت ہو، تھوڑے زیادہ نمبروں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہارے بھی اچھے نمبر ہیں۔'' تھوڑے زیادہ نمبروں سے جو فرق پڑتا تھا جواد ان سے خوب واقف تھا، پر دوست سے یہ کہنا تو تھا۔

تبھی جیب میں موجود فون بجنے لگا۔ رزلٹ معلوم کرنے کے لیے آتے ہوئے اسفر باپ کا فون ساتھ لیتا آیا تھا تاکہ سدرہ فون پر نمبر جان سکے۔

اسفر نے موبائل جیب سے نکال کر ہاتھوں میں لیا۔ گھر سے کال آ رہی تھی۔ یقیناً سدرہ نمبر جاننے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ چند لمحے موبائل کی سکرین دیکھنے کے بعد اسفر نے کال کاٹ دی۔

دوسری طرف سدرہ نے یہی سوچا ابھی نمبر نہیں پتا چلے ہوں گے اس لیے اسفر نے کال کاٹ دی۔

''اچھا اسفر اب یوں اداس مت ہو، آج خوشی کا دن ہے۔ Lets Celebrate دوست کو دلاسے دینے والا جواد کچھ ہی دیر میں اسفر کی خاموشی سے تنگ ہونے لگا تھا۔ اسے لگنے لگا تھا کہ اسفر اس کی خوشی میں بھی بھنگ ڈال رہا ہے۔

اسفر آنکھیں پٹپٹا کر آنسو اندر دھکیلنے لگا۔ مگر آنسو پینا کہاں آسان تھا۔ اگلے لمحے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

☆......☆......☆

اور یہ رزلٹ کی شام کا واقعہ تھا۔

صوفے پر پاؤں پسارے بیٹھی سدرہ ناخنوں کو فائل کر رہی تھی۔ منہ میں دبا چیونگم چباتے ہوئے اس کا دھیان ٹی وی سکرین پر تھا۔

سدرہ کو دو چند افسوس تو ہوا کہ چند نمبر اور آجاتے تو وہ بھی بورڈ ٹاپر ہوتی لیکن خیر۔۔۔۔۔ دل کے نہاں خانوں میں کمینی خوشی بھی ہوئی۔ اسفر کے نمبر بے تحاشا کم تھے ورنہ اسفر نے جس قدر محنت کی تھی کئی بار تو سدرہ کو لگنے لگا تھا کہ وہ سبقت ہی لے جائے گا۔ یہ آخری ناخن تھا جو وہ فائل کر رہی تھی۔ فائل ہو گیا تو اس نے پھونک مار کر نادیدہ ذرات اڑائے اور ناخنوں کی بناوٹ پر دھیان دینے لگی۔

دوسرے کمرے میں اسفر آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود سی تھی بس دل و دماغ پر ایک بوجھ سا چھایا تھا۔ تبھی ساتھ والے کمرے نے کچھ چیخوں کی آواز سنائی دی۔ ان نسوانی چیخوں میں خوشی اور کامیابی کی کھنک تھی اور چند لمحے بعد سدرہ کی قیادت میں دعا اس کمرے میں آئی۔ جہاں اسفر لیٹا تھا۔

''اسفر اس طرح کیوں لیٹے ہو۔ آج تو خوشی کا دن ہے۔'' دعا اور سدرہ ساتھ والی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ اسفر یونہی آنکھوں پر بازو لپیٹے غصہ سا لیٹا رہا۔

''دعا تم ہی اب سمجھاؤ۔ کچھ باتیں تو تقدیر کا حصہ ہیں۔ ان پر ہرگز افسوس نہیں کرنا چاہیے اور ویسے اسفر کے نمبر اتنے برے بھی نہیں جتنا کہ وہ غم منا رہا ہے۔'' سدرہ کا لہجہ بے تاثر تھا جیسے روزمرہ کی گفتگو۔

''اسفر اٹھ کر تو بیٹھو، سدرہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تم ان کا طلباء کا سوچو جو پاس بھی نہیں ہو پائے۔ تمہارے تو اچھے خاصے نمبر ہیں۔ یوں افسوس نہ کرو۔ چلو شاباش۔'' دعا لب کچلتی کہہ رہی تھی۔

اسفر غصہ لیٹا رہا۔

''اچھا اسفر یہ دیکھو تمہارے لیے تحفہ بھی لائی ہوں۔'' دعا نے نیلے چمکیلے کاغذ میں بند ڈبا اپنے پہلو سے اٹھا کر سامنے میز پر رکھا۔

اسفر نے کوئی ردِ عمل نہ دکھایا۔

''اندازہ لگاؤ میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں تم کبھی صحیح اندازہ نہ لگا پاؤ گے۔'' دعا اب مسکرانے لگی تھی۔

''اور ہاں اسفر تمہارے اور سدرہ کے تحائف میں نے اپنی سیونگز سے خریدے ہیں ابو سے پیسے نہیں لیے۔'' دعا تھوڑی پرجوش ہوئی۔ سدرہ بے تاثر بیٹھی اسفر کو دیکھتی رہی۔

''اور ہاں بلیک فاریسٹ کیک بھی لائی ہوں۔ ٹریٹ بیکری سے میں نے کیک پر ہم تینوں کا نام لکھوایا ہے۔ تم اٹھو تو مل کر کاٹیں۔'' کیک اور سدرہ کا گفٹ دعا ساتھ والے کمرے میں ہی چھوڑ آئی تھی۔

''اسفر۔۔۔۔'' دعا ابھی مزید کچھ کہنے ہی والی تھی کہ دفعتاً اسفر اٹھا۔ میز پر پڑا گفٹ اٹھایا اور دیوار پر دے مارا۔

چمکیلے کاغذ میں پیک کرسٹل کا پیس جس پر دعا نے اپنی سیونگز کا بڑا حصہ خرچ کر کے The Asfar! Luckiest Boy Of the World لکھوایا تھا۔ لمحے بھر میں ٹوٹ گیا۔

''دفع ہو جاؤ۔ میرا تماشا دیکھنے آئی ہو۔ مجھے تمہاری تسلیوں کی قطعاً ضرورت نہیں'' اسفر دھاڑا تھا۔ دعا سہم سی گئی۔ سدرہ سکون سے بیٹھی اسفر کو دیکھتی رہی۔

☆......☆......☆

رات کا وقت تھا۔ پانچویں منزل پر موجود فلیٹ کا کمرہ روشن تھا۔ یہ کمرہ عموماً ساری رات روشن رہتا۔ دعا کو روشن کمرے میں سونے کی عادت تھی۔ سونے کے لیے دعا کو کبھی بھی اندھیرے کی ضرورت نہ پڑتی۔ بلکہ جلتی لائٹ میں بھی اسے پرسکون نیند آتی۔ اس عمر میں یوں بھی سکون کی نیند آتی ہے۔

لاہور کے اس علاقے میں موجود فلیٹس میں آسودہ حال لوگ ہی آباد تھے۔ جن کے پاس روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ دعا تو یوں بھی اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ دو بھائیوں کے بعد پیدا ہونے والی گھر بھر کی آنکھ کا تارا تھی۔

کمرہ گلابی رنگ میں نہایا تھا۔ کمرے کی سجاوٹ میں نوعمری نمایاں تھی۔ شوخ رنگوں کی چیزیں کمرے میں جابجا تھیں۔ اپنی رائٹنگ ٹیبل پر کہنی ٹکائے بیٹھی دعا ہاتھوں میں کرسٹل پیس لیے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

وہ کرسٹل پیس جس پر اس نے آرڈر پر Dua Luckiest girl of the world لکھوایا تھا۔ ویسا ہی کرسٹل پیس جیسا اس نے اسفر کے لیے تیار کروایا تھا۔ آج اسفر کے برے رویے کا اس نے بالکل برا نہیں منایا تھا۔ اسفر کی کسی بات کا وہ بھلا کہاں برا منا سکتی تھی۔ بلکہ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اسفر کے دکھ کو بانٹ نہ پائی۔

''اسفر'' یونہی بلا ارادہ دعا کے لبوں سے نام ادا ہوا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تبھی صاعقہ ناب گھما کر اندر آئی۔

''آج تو خوشی کا دن ہے۔ کیا میری بیٹی کا خوشی اکیلے سیلبریٹ کرنے کا ارادہ ہے؟'' صاعقہ اندر آ گئی۔ شکل و صورت میں صاعقہ اپنی چھوٹی بہن فاخرہ سے بے پناہ مشابہت رکھتی تھیں۔

''نہیں امی'' دعا نے مسکرا کر کہا تھا۔

''تو چلو جلدی سے فریش ہو کر آ جاؤ تمھارے ابو آ گئے ہیں اور میں نے تمھارے پسندیدہ ریسٹورنٹ سے آرڈر کر دیا ہے۔ فرقان اور حنان بھی سرپرائز گفٹ لیے تمھارے منتظر ہیں۔'' صاعقہ کاؤچ پر بیٹھ گئیں۔ وہ خوشیوں کو ہمیشہ گھر پر سیلبریٹ کرنا پسند کرتی تھیں۔ اسی لیے کہیں باہر جانے کی بجائے آج بھی انھوں نے ڈنر ڈیلیور کروایا تھا۔

''تھینک یو امی'' دعا کے چہرے پر ایک دلکش سی مسکراہٹ آ گئی۔

''ہاں فاخرہ کا فون آیا تھا۔ اسفر کے مس بی ہیو پر معذرت کر رہی تھی۔ تم برا مت منانا تم دونوں سے نمبر کم ہیں۔ شاید اسی لیے اپ سیٹ ہو گیا۔'' بہن سے مالی تفاوت ہونے کے باوجود صاعقہ نے کبھی فرق نہ رکھا تھا۔ بہن کے بچے بھی اسے کم عزیز نہ تھے۔

''امی میں نے بالکل برا نہیں منایا۔ میں اُس کی جگہ ہوتی تو شاید میں بھی ایسا کرتی'' یہ بات خود دعا بھی جانتی تھی اور صاعقہ بھی جانتی تھی کہ وہ کبھی ایسا نہ کرتی۔ صاعقہ نے اسے ہر حال میں خوش رہنا سکھایا تھا تو وہ بھلا کیسے بدتمیزی کرتی۔ لیکن اگر خالہ زاد کا دفاع کر رہی تھی تو صاعقہ نے بالکل بھی برا نہیں منایا تھا۔

''اچھا اب جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ کھانا پانچ منٹ تک ڈیلیور ہو جائے گا۔ لیکن تم چاہو تو تیاری میں پندرہ منٹ لگا سکتی ہو۔ Princess Of the day کو یوں بھی سب سے آخر میں آنا چاہیے۔'' صاعقہ مسکراتے ہوئے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''ہاں لیکن پندرہ منٹ سے زیادہ مت لگانا۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا اور ٹھنڈے کھانے سے سب سے زیادہ ہماری پرنسز کو ہی چڑ ہوتی ہے اور اسے اوون میں گرم کیا ہوا کھانا بھی تو پسند نہیں۔'' صاعقہ نے نرمی سے بیٹی کے گال کو چھوا اور دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

ہاتھ میں پکڑے ہوئے کرسٹل پیس کو دعا نے الٹ پلٹ کر دیکھا تھا اور اسے نیچے گراتے ہوئے ایک مسکراہٹ اس کے سپرد کی۔

صاعقہ ابھی دروازے کی ناب گھما رہی تھی کہ چھناکے کی آواز سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا تو دعا کا وہ کرسٹل پیس چکنا چور ہوا پڑا تھا۔ جو اس نے بڑی چاؤ سے خود سیونگز سے بنوایا تھا۔

''اوہ تمھارا کرسٹل پیس ٹوٹ گیا۔ کوئی بات نہیں ٹوٹنے والی چیز تھی ٹوٹ گئی۔ میں کل ہی اس سے زیادہ خوبصورت پیس بیٹی کو پریزنٹ کروں گی۔''

''نہیں امی اس کی ضرورت نہیں۔ یہ کوئی اتنا اہم بھی نہیں تھا کہ دوبارہ سے بنوایا جائے۔'' مدہم سی مسکراہٹ دعا کا احاطہ کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

انڈے تو وہ پہلے ہی فرائی کر چکی تھیں اب تو سینک رہی تھیں۔ یوں بھی ورکنگ وومن کے پاس کہاں اتنا وقت ہوتا ہے کہ ناشتے میں پراٹھے بنا سکے۔ فاخرہ بھی پراٹھے نہیں بناتی تھی اور اب تو یہ عالم تھا کہ ان سے پراٹھے بنتے بھی نہیں تھے۔ صحیح طرح سے بل ہی نہ آتے۔ گول بھی نہ ہو پاتے۔ سو ناشتہ توس انڈوں کا ہی ہوتا کبھی زیادہ دل چاہا تو بازار سے نان چنے، حلوہ پوری، پھورے منگوا لیے۔

انڈوں کے ساتھ توس رکھنے کے بعد انھوں نے سدرہ کو آواز لگائی۔

''سدرہ آ کر ناشتا لے جاؤ'' ہر پلیٹ میں فرائی انڈے کے ساتھ توس کے تین ٹکڑے تھے۔ سدرہ اپنی اور اسفر کی پلیٹ ہال کمرے کی طرف لے گئی۔ زوار کے لیے فاخرہ نے کپ میں چائے انڈیلی۔ انڈے توس کی پلیٹ کے ساتھ چائے کا کپ ہاتھ میں لیے وہ دوسرے کمرے میں آئیں۔

زوار حسب معمول قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ صبح نماز پڑھنے بعد وہ قرآن مجید پڑھنا شروع کرتے تو گھر کے باقی افراد کے گھر سے نکلنے تک وہ کلام پاک کی تلاوت کر رہے ہوتے۔

پلیٹ زوار کے سامنے رکھی، کپ کو پائنتی پر رکھا کہ چھلک ہی نہ جائے۔ قرآن مجید پڑھتے ہوئے زوار گفتگو کو پسند نہیں کرتے تھے۔ سو آج بھی دونوں میاں بیوی میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ دوبارہ کچن سے اپنے لیے انڈے توس کی پلیٹ لینے کے بعد وہ ہال کمرے میں آ گئیں۔ جہاں اسفر اور سدرہ نصف سے زائد ناشتہ کر چکے تھے۔ ایک ناقدانہ نظر سے کالج کی یونیفارم میں ملبوس بچوں کو دیکھا اور ناشتا کرنے لگیں۔ توس کا ایک نوالہ لینے کے بعد انھوں نے چائے کا گھونٹ بھرا اور اسفر سے مخاطب ہوئیں۔

''اسفر میں جانتی ہوں کہ میٹرک میں تم نے خوب محنت کی۔ رات دن کی پروا کیے بغیر پڑھا لیکن پھر بھی اچھا سکور نہ کر سکے۔'' انھوں نے چائے کا ایک اور گھونٹ حلق سے اتارا تھا۔ اسفر سر ناشتے کی پلیٹ پر جھکائے توس کا ٹکڑا توڑتا رہا۔ ''تو اسفر دھیان دو کہاں کمی رہ گئی۔ کوئی ویک پوائنٹ ہوگا۔ جس کی بنا پر اچھے نمبر نہ آئے۔ اب اس ویک پوائنٹ کی نہ صرف تم کو نشاندہی کرنی ہے بلکہ اسے دور بھی کرنا ہے۔'' فاخرہ نے چائے کا کپ ایک بار پھر لبوں سے لگایا تھا۔

''تم میرے بیٹے ہو۔ مستقبل میں تمھیں اعلیٰ مقام پر دیکھنا چاہتی ہوں۔ سدرہ کی طرف سے تو مجھے کوئی پریشانی نہیں۔ اس کا تو میڈیکل کالج میں داخلہ ہو جائے گا۔ خوشی تو مجھے تب ہوگی جب تم مجھے ایڈمیشن لے کر دکھاؤ گے۔'' چائے کا کپ ختم ہو گیا تو انھوں نے پلیٹ میں پڑا ہوا توس کا آخری ٹکڑا بھی منہ میں ڈالا اور کھڑی ہو کر سامنے لگے چوکور آئینے میں اپنا عکس دیکھنے لگیں۔ چہرے پر آئی لٹوں کو انھوں نے جوڑے کا حصہ بنایا۔

''پڑھتے ہوئے ارتکاز کی کمی کا سامنا تو نہیں کرنا پڑتا۔'' بال بناتے ہوئے فاخرہ پوچھ رہی تھیں۔

اسفر خالی پلیٹ کے سامنے سر جھکائے چپ بیٹھا رہا۔ ارتکاز کی کمی کا مسئلہ نہ تھا۔ جانے کیا مسئلہ تھا۔ ''اس مہینے سے باقاعدگی سے بادام لے آؤں گی تمھارے لیے۔'' مدت بعد فاخرہ بیٹے سے اس مخاطب تھیں اور موضوع سخن اسفر کی ذات تھی۔ اسفر کو تھوڑا عجیب لگا۔

''چلو بچو، اب چلیں تمھارے کالج کی ڈرائیو کا اندازہ نہیں، جانے کتنا ٹائم لگے۔'' فاخرہ اپنا بیگ سنبھالتیں آئینے میں آخری بار اپنا عکس دیکھتیں باہر کی طرف روانہ ہوئیں۔ تو اسفر اور سدرہ نے بھی ماں کی پیروی کی۔

فاخرہ نے گاڑی گیراج سے نکال لی تو اسفر نے دروازہ دھکیلا۔ آٹو لاک سے دروازہ خود بند ہو گیا۔ آج سے ڈیڑھ سال پہلے اندر سے کنڈی لگانی پڑتی تھی۔ لیکن گاڑی لینے کے بعد فاخرہ نے آٹو لاک لگوا لیا۔ یوں گھر سے روانہ ہوتے ہوئے زوار کو نہ کہنا پڑتا کہ کنڈی لگا لیں۔

☆☆☆

سدرہ اور اسفر کا آج کالج میں پہلا دن تھا۔ کالج زندگی کا ایک نیا دروازہ۔۔۔۔۔

یوں تو شہر کے اس ٹاپ کے کالج میں کم نمبر والے طلباء کو داخلہ نہیں دیا جاتا تھا لیکن فاخرہ نے اپنے سکول کی ہیڈ مسٹریس سے سفارش کی درخواست کی تھی۔ کالج کا پرنسپل ہیڈ مسٹریس کا بہنوئی تھا۔ ہیڈ مسٹریس کے کہنے پر انھوں نے اس پرائیویٹ کالج میں اسفر کو داخلہ دے دیا۔ اس شرط پر کہ وہ کالج فیس جتنی ڈونیشن دیں گے۔ زوار کی ایزی لوڈ اور موبائل اسیریز کی دکان سے کہاں اتنی سیونگز تھیں۔ فاخرہ نے ہی اپنی جمع شدہ سے کالج کے اخراجات سہے تھے۔ سدرہ کو انتہائی اچھے نمبر لینے پر فیس میں رعایت ملی تھی اور اسفر کم نمبر پر ڈونیشن دینی پڑتی تھی۔ عجیب صورتحال تھی۔

''Best Of Luck My kids'' کالج گیٹ پر

اسفر اور سدرہ کو اتارتے ہوئے فاخرہ نے نیک تمنائیں بچوں کے سپرد کی تھیں۔ دھڑکتے دلوں کے ساتھ بہن بھائی نے اپنا پہلا قدم کالج کے گیٹ سے اندر رکھا تھا۔ اس سے اسفر کی شخصیت میں سدرہ کی نسبت کہیں کم اعتماد تھا۔

☆......☆......☆

یوں تو شہر میں ٹاپ کے دوسرے کالجز بھی تھے لیکن دعا اور جواد نے بھی اسی کالج میں داخلہ لیا تھا۔ حالانکہ یہ کالج ان کے گھروں سے کافی دوری پر تھا۔ جواد کو تو ایک گھنٹہ ڈرائیو کر کے آنا پڑتا تھا۔

جواد کے داخلہ لینے کی وجہ سدرہ تھی اور وہ سدرہ تک رسائی کی کوششیں بھی کر رہا تھا اور دعا کے اس کالج میں آنے کی وجہ اسفر تھا۔ لیکن وجہ اسفر کیوں تھا تا حال اس بات سے ناواقف تھی۔

''کالج کی پڑھائی تھوڑی مختلف ہوتی ہے۔ یوں بھی ہماری ساری زندگی کا دارومدار ان دو سالوں پر ہوتا ہے اس لیے ان دو سالوں کو جس قدر ہو سکے کارآمد بنایا جائے اور اچھے سکورز کے لیے دن رات ایک کیے جائیں۔'' کالج کے ابتدائی دنوں میں ایک دن جواد بریک ٹائم میں اسفر سے کہہ رہا تھا۔

اسفر نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ یہ اس کے لیے نئی باتیں تو تھیں نہیں، شب و روز تو وہ ان ہی باتوں کو سوچتے ہوئے گزارتا تھا۔

''اور ہاں یہ سال صرف محنت کے سال نہیں۔ اکیلی محنت انسان کو کامیاب نہیں بنا سکتی۔ اچھی سٹریٹجی بھی اتنی ضروری ہے جتنی محنت، سٹریٹجی کے بغیر محنت لاحاصل ہی ثابت ہوگی۔''

''سٹریٹجی'' اسفر نے لفظ زیرلب دوہرایا تھا۔

''تو کیا سٹریٹجی اپنائیں جس سے ہم میڈیکل کالج تک پہنچ جائیں۔'' اسفر کا سارا دھیان جواد کی طرف تھا۔

جواد نے دھڑکتے دل کے ساتھ حتی المقدور کوشش کی کہ اس کے لہجے میں کوئی غیر معمولی پن نہ آئے۔

''ہمیں کئی ایک کام کرنے چاہیے۔ سب سے پہلے تو کمبائنڈ سٹڈی کے لیے گروپ بنانا چاہیے۔ ایسا گروپ جو زیادہ باتونی بھی نہ ہو تاکہ ٹائم ویسٹ کرنے کی بجائے ہم لوگ پڑھائی پر ہی توجہ دیں۔'' جواد کی بات پر اسفر تھوڑی دیر سوچوں میں غرق ہوا۔

''کمبائنڈ سٹڈی اور گروپ'' بات دل کو لگتی تھی۔

''یار تمھاری تو خیر ہے۔ اتنے ٹیلنٹڈ ہو جس کے ساتھ گروپ بنانا چاہو گے۔ ویلکم ہی کہا جائے گا میں تو کسی کھاتے میں ہوں ہی نہیں۔'' اسفر کے لہجے میں خود ترسی عود آئی۔

''اب ایسا بھی نہیں سب سے پہلے اپنے آپ کو دوسروں سے کم سمجھنا تو چھوڑو۔'' جواد نے کہا تو اسفر نے یکدم سر جھکا لیا۔ احساس کمتری یونہی سر جھکانے پر مجبور کرتی ہے۔

''اچھے بھلے ہو یار۔ ویسے میں نے گروپ کے لیے سوچا ہوا ہے۔ ایک میں اور تم ہو گئے دوسرا تمھاری بہن اور کزن۔ دعا اور سدرہ دونوں ہی پڑھاکو ہیں۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کی ہیلپ سے کہیں آگے جا سکتے ہیں۔''

''سدرہ اور دعا'' اسفر شش و پنج میں مبتلا ہوا۔ دونوں ہی وہ کردار تھے جن سے وہ آگے نکلنا چاہتے تھے۔ اسفر کو کشمکش میں مبتلا دیکھ کر جواد نے اسے مزید قائل کرنا چاہا۔ ''دیکھو یار تم اور میں دوست ہیں۔ اب باقی کسی اور سے گروپنگ کریں تو پتا نہیں وہ بندہ کیسا ہو۔ سدرہ تمھاری بہن ہے اور دعا کزن وہ تو مخلص ہی ہوں گی۔ ہاں البتہ تمھیں یہ اعتراض ہے کہ میں لڑکا ہوں اور وہ۔۔۔۔۔۔''

''نہیں یار ایسی بات نہیں'' اپنی سوچوں میں الجھے ہوئے اسفر نے جواد کی بات کاٹی تھی۔

کچھ دیر یونہی اسفر خاموش رہا اور جواد جانچتی نظروں سے اسفر کا چہرہ کھوجتا رہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسفر گویا ہوا۔

''ٹھیک ہے۔ میں دعا اور سدرہ سے بات کروں گا۔'' اور جواد کے ہونٹوں پر ایک جاندار مسکراہٹ آن ٹھہری۔

☆......☆......☆

اسفر کو موسمی بخار نے آن گھیرا تو سدرہ اکیلی کالج آئی تھی۔ یوں بھی سدرہ کے لیے اسفر کا آنا نہ آنا اتنا اہم تھا بھی نہیں۔ وہ تو اپنے حلقہ احباب میں ہی مگن رہتی۔ ایسا حلقہ جس میں اس کی ذہانت کو سراہنے والے کم نہ ہوتے۔

لیکچرز کے درمیانی وقفے میں فزکس کے نوٹس کے لیے وہ بک شاپ تک جا رہی تھی۔ اپنی سوچوں میں غلطاں پیچاں وہ گھاس کا قطعہ پار کر رہی تھی کہ یونہی بے ارادہ اس نے مڑ کر دیکھا۔

اس کے پیچھے ٹرانس میں چلتا جواد لمحے بھر میں گڑبڑایا اور جلدی سے سمت تبدیل کر لی۔ سدرہ کے لب مسکرا اٹھے۔

اس کا شک یقین میں بدل چکا تھا کہ جواد اسے پسند کرتا ہے۔ اب سدرہ کو انتظار تھا کہ وہ کب پہل کرتا ہے۔ شاید وہ پہل ہی تھی جو اسفر کی زبانی اس تک پہنچی تھی۔

''جواد'' سدرہ نے آواز لگائی۔ جواد لمحے بھر کو رکا۔ رخ پھیرا اور سدرہ کی طرف آیا۔

''میں فزکس کے نوٹس لینے بک شاپ تک جا رہی ہوں۔ اگر فری ہو تو ساتھ چلو۔''

اسکول میں ان لوگوں میں ایسی بے تکلفی نہ تھی۔ لیکن اب تو کالج تھا۔ مسرور دل کے ساتھ جواد سدرہ کا ہم قدم ہو چلا۔

''اسفر نے کہا تھا کہ اگر ہم لوگ گروپ بنا لیں تو کمبائن اسٹڈی سے اپنی پڑھائی کی مشکلات کم کر سکتے ہیں۔ یہ صرف اسفر کی سوچ تھی یا آپ کی بھی یہی رائے ہے۔'' یوں تو سدرہ اسفر سے پوچھ چکی تھی اور اسفر بتا چکا تھا کہ یہ مشورہ جواد کا تھا لیکن اب جواد سے بھی تو کوئی بات کرنی ہی تھی۔

''میرے خیال میں تو گروپ بنانے سے فائدہ ہوگا۔ کالج کی پڑھائی تھوڑی مختلف ہوتی ہے۔ آپ کو اعتراض تو نہیں۔'' جواد نے سدرہ کو دیکھا تھا۔ پونی ٹیل والی خوبصورت لڑکی اس کو دل کے کس قدر قریب محسوس ہوتی تھی۔

''فرض کریں مجھے اعتراض ہے تو'' سدرہ کی آنکھوں میں شرارت چمکی۔

''فرض کیوں کریں۔ جو حقیقت ہے اس کا سامنا کریں۔'' جواد کے ہونٹوں کے ساتھ آنکھیں بھی مسکرائی تھیں۔

''بھائی فرسٹ ایئر فزکس کے چیپٹر فائیو کے نوٹس کی ایک کاپی دینا۔'' بک شاپ آ گئی تھی۔ سدرہ نے بک شاپ والے لڑکے سے کہا تھا۔

''ایک نہیں دو'' جواد نے لڑکے کو تصحیح کی۔

''ہاں تو کیا بات کر رہے تھے؟'' جواد نے سلسلہ تکلم وہیں سے جوڑنا چاہا۔

''ہم تو کوئی بات نہیں کر رہے تھے''۔ سدرہ نے بے نیازی سے پونی ٹیل جھلائی تھی۔

لڑکا دو کاپیاں لے آیا۔ سدرہ پرس سے پیسے نکالنے لگی۔

''رکو میں پیسے ادا کرتا ہوں'' سدرہ کے پیسے نکالنے سے پہلے ہی جواد نے والٹ نکال کر پیسے ادا کر دیے۔ سدرہ نے ایک بار بھی نہ کہا آپ نے کیوں ادا کیے اور نہ ہی خود پیسے جواد کو لینے کا اصرار کیا۔ جواد نے پیسے ادا کیے تو سدرہ کا انداز ایسا تھا کہ یہ تو جیسے روز کی بات ہو۔

دونوں اپنی اپنی کاپی لے کر کلاس روم کی طرف چلنے لگے۔

''آپ کا مستقبل کا کیا ارادہ ہے؟'' سوال کرنے والا جواد تھا۔

''آپ سے لفظ تم زیادہ اچھا ہوتا ہے اور میرے ارادے بھی وہی ہیں جو ایف ایس سی پری میڈیکل رکھنے والے ہر طالبعلم کے ہوتے ہیں۔'' تکلف کی دیواریں یونہی گرتی چلی گئیں۔

کلاس روم پہنچنے تک دونوں میں چھوٹی موٹی گفتگو ہوتی رہی۔

کلاس روم کے دروازے پر جواد لمحے بھر کو رکا۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے۔

''میں تم سے ایک خاص بات جلد کروں گا'' جواد نے دھڑکتے دل کے ساتھ خود اعتمادی سے کہا تھا۔

''میں بھی اس خاص بات کا انتظار کر رہی ہوں''۔ سدرہ نے تیقن سے کہا اور کلاس روم میں داخل ہو کر لڑکیوں کی رو میں بیٹھ گئی اور جواد کو اپنے گرد خوشیوں کے بے تحاشا پھول کھلتے دکھائی دینے لگے۔

☆......☆......☆

گروپ تشکیل پا گیا تو کمبائن سٹڈی ہونے لگی۔ آپس میں ڈسکشنز ہونے لگیں۔ چھوٹے سے چھوٹے ٹاپک پر اتنی باریک بینی سے ڈسکشن کی جاتی کہ وہ فنگر ٹپس پہ آ جاتا۔ ان

ہی ڈسکشنز کا ہی نتیجہ تھا کہ اسفر کو احساس ہونے لگا وہ دماغی طور پر اتنا کم بھی نہیں اور اسی گروپ ڈسکشنز کا یہ فائدہ بھی ہوا کہ ان دونوں بہن بھائی میں موجود تکلف اور بیگانگی کی دیوار میں دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔ آج ان لوگوں نے بائیولوجی کا چیپٹر تھری ڈسکس کرنا تھا۔ ہفتے کا دن تھا اور کالج آف ہوئے لگ بھگ آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ لائبریری میں بیٹھ کر مطالعہ تو کرلیا جاتا لیکن لائبریری میں بولنے کی اجازت نہ تھی اسی لیے ڈسکشنز کے لیے آج انھوں نے آڈیٹوریم کی سیڑھیوں کو چنا تھا۔

آڈیٹوریم کی اوپر کی طرف سے چوتھی سیڑھی پر جواد اور اسفر بیٹھے تھے اور ایک سیڑھی نیچے سدرہ اور دعا بیٹھی تھی۔ پونی ٹیل عادتاً جھلاتے ہوئے سدرہ نے کہا۔

''اس جیسا آسان اور مختصر چیپٹر کوئی ہے ہی نہیں۔ بھلا انزائمز بھی ڈسکس کرنے والا ٹاپک ہے۔'' اسفر ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔ جس چیپٹر کو اس کی بہن آسان ترین کہہ رہی تھی اس پر پچھلے دو دنوں سے کئی کئی گھنٹے مغز ماری کرنے کے بعد بھی مکمل دسترس نہ حاصل کر سکا تھا۔

''میری بھی یہی رائے ہے۔ کوانزائمز، کوفیکٹر، اپوانزئمز، ان ساری چیزوں کا تو ہمیں میٹرک سے پتا ہے۔ میں نے خود یہ چیپٹر بیس منٹ میں پڑھ کر کتاب ایک طرف رکھ دی تھی۔'' جواد نے ایک طرح سے سدرہ کی ہاں میں ہاں ملائی تھی اور اسفر بس آنکھیں پٹپٹا کر جواد کو دیکھ کر رہ گیا۔

''تو پھر کیوں نا آج ہم پڑھائی سے ہٹ کر باتیں کرتے ہیں۔ یوں بھی تو ویک اینڈ ہے۔'' جواد نے کہا تو سدرہ نے تائید میں سر ہلایا اور دعا جو اس مکالمے کے درمیان چپ بیٹھی اسفر کے تاثرات دیکھ رہی تھی، گویا ہوئی۔

''نا بھئی نا، مجھے تو بالکل سمجھ نہیں آیا اور میں نے تو اسے ڈسکس کرنا ہے، کئی سوال ہیں میرے ذہن میں۔''

''پیر والے دن ڈسکس کریں گے دعا۔'' سدرہ نے پونی ٹیل کا ربن کسا تھا۔ آج اس کا پڑھنے کا دل نہیں کر رہا تھا۔

''بھئی اگر تمھارا اور جواد کا پڑھنے کے بجائے گپیں ہانکنے کا موڈ کا ہے تو تم لوگ باتیں کرو۔ میں اور اسفر تو پڑھیں گے۔ کیوں اسفر؟'' اسفر بھی پڑھنا چاہتا تھا اسی لیے اس نے بھی اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''تم دونوں باتیں کرو ہم آخری والی سیڑھیوں پر بیٹھ کر پڑھ لیتے ہیں۔ آؤ اسفر'' دعا اٹھی تو اسفر نے اپنی کتابیں سمیٹتے ہوئے دعا کی پیروی کی تھی۔

''پہلے تم بتاؤ اسفر اس چیپٹر میں کون سی چیز تمھیں سمجھ نہ آئی'' آخری سیڑھی پر بیٹھتے ہوئے دعا نے پوچھا تھا۔ اسفر نے بتایا تو دعا اسے سمجھانے لگی اور وہ کافی دیر پڑھتے رہے۔ اس دوران دعا نے شعوری کوشش کی کہ اسفر کو یہ احساس نہ ہو کہ اسے اس چیپٹر پر عبور ہے۔ ویسے سدرہ اور جواد کی طرح یہ چیپٹر اسے بھی بے حد آسان لگا تھا اور اسے پوری طرح سمجھ بھی آ گیا تھا اور وہ ڈسکشن کی ضرورت بھی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ لیکن محض اسفر کے لیے اس نے یہ قدم اٹھایا تھا۔

اوپر والی سیڑھیوں پر بیٹھے جواد نے سدرہ کی بائیو کی کتاب پکڑی تھی اور پینٹ کی جیب سے گلاب کی ایک کلی نکال کر درمیان والے صفحے پر رکھ دی تھی۔ نفاست سے ٹرانسپرنٹ کاغذ میں لپٹی کلی کس قدر خوبصورت تھی۔

''یہ سرخ گلاب کس لیے''

''تمھارے لیے''

''مگر کیوں؟؟''

''کیوں کا ہونا ضروری ہے؟''

''تم سوال کے جواب میں سوال کیوں کرتے ہو؟''

''تم خود اتنے سوال کیوں کرتی ہو؟''

''میری مرضی''

''میری بھی مرضی'' جواد اور سدرہ میں یونہی مہمل سے فقروں کا تبادلہ ہونے لگا۔ وہ مہمل فقرے جن میں بہت سارے پوشیدہ معانی تھے۔

☆......☆......☆

جو کچھ اسفر نے سنا ایک لمحے کو تو اس کو اپنے گردونواح کی تمام چیزیں گھومتی محسوس ہوئیں۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

یہ کینٹین کا بوائز سیکشن تھا۔ اس حصے میں دیوار کو سہارا دینے والے بڑے بڑے گول ستون تھے۔ ان ستونوں نے ہی بوائز سیکشن کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا اور اس ستون کے دونوں اطراف میز اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔

اسفر جواد کو ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ لیکن وہ مل ہی نہ پا رہا تھا۔ یوں تو اسفر نے بھی کالج لائف شروع ہوتے ہی موبائل فون لے لیا تھا لیکن زیادہ گھر ہی بھول آتا۔ آج بھی گھر بھول آیا تھا اسی لیے میسج کر کے بھی جواد سے نہ پوچھ سکتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔

''کینٹین میں ہی ہوگا'' سوچتے ہوئے اسفر نے قدم کینٹین کی طرف بڑھائے تھے۔ کینٹین کے داخلی دروازے پر کھڑے ہو کر اسفر نے نظر دوڑائی۔ جواد ایک ستون کی آڑ میں ایک کلاس فیلو کے ساتھ بیٹھا تھا۔ چونکہ اس کی دروازے کی طرف پشت تھی اس لیے وہ اسفر کو نہ دیکھ پایا۔ اسفر نے قدم اس میز کی طرف بڑھائے تھے۔ جواد اور دوسرا کلاس فیلو دونوں ایک ہی رخ بیٹھے تھے چنانچہ دونوں ہی اسفر کو نہ دیکھ پائے تھے۔

''یار داد دینی پڑے گی تمھاری حکمت عملی کی۔'' کلاس فیلو نے تھوڑی اور کیچپ بوتل سے سامنے پڑی پلیٹ میں انڈیلی تھی۔

''بس یار جواد جو بھی کام کرتا ہے۔ خوب سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔'' جواد نے فرائز کا ایک ٹکڑا دانتوں سے کترا تھا۔ اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

''ابتدائی دنوں میں تو مجھے بھی سمجھ نہ آیا کہ تم اسفر کے ساتھ کیوں ہو۔ بھلا تمھارا اور اس کا کیا جوڑ۔ اپنا نام سن کر اسفر لمحے بھر کو رک گیا۔ کینٹین میں بلاشبہ شور تھا لیکن وہ پھر بھی ان لڑکوں کی گفتگو سن سکتا تھا۔

''ہاں یار! اسفر تو میرے ساتھ چلتے ہوئے لڑکھڑاتا ہے۔ تم سے اس قدر لو سیلف کانفیڈنس میں نے نہیں دیکھی۔'' جواد چٹخارے لے کر فرائز کھا رہا تھا۔

''بس خالد۔ نہ وہ لڑکا پڑھائی میں اچھا ہے اور جیب بھی خالی ہے۔ ہم لوگ جب بھی آؤٹنگ پر گئے میں نے ہی خرچا کیا۔''

اسفر کو اپنا تنفس بھی گراں گزرنے لگا۔

''اس طرح تو یہ طریقہ مہنگا پڑا۔ تم سدرہ سے ڈائریکٹ بات کر لیتے تو بھی تو ٹھیک تھا۔''

خالد اب کولڈ ڈرنک کی سپ لے رہا تھا۔

''کیا مہنگا کیا سستا۔ تم دیکھو کامیاب تو ہو گیا نا۔ اسفر سے میں نے پینگیں بڑھائی اس لیے تھیں کہ سدرہ تک پہنچ پاؤں۔ اب دیکھو سدرہ میری دوست ہے اور جلد ہی فیانسی بن جائے گی۔ اس حوالے سے اسفر بھی میرا سالا ہوا نا اور اگر میں نے اپنے سالے پر پیسے خرچ کر لیے تو کیا ہو گیا۔ میرے ڈیڈ کا کون سا بینک بیلنس ختم ہو گیا۔'' جواد قہقہہ لگا کر ہنس رہا تھا۔ میز، کرسیاں، کینٹین کی عمارت کی چھت، زمین، سب چیزوں نے گھومنا شروع کر دیا تھا۔

''او مائی گاڈ۔۔۔ بات یہاں تک پہنچ گئی۔ سدرہ نے گرین سگنل دے دیا۔''

خالد نے چونک کر کہا تھا۔

''ام م۔۔۔۔'' جواد سوچنے لگا۔

''بس سمجھ لو دے ہی دیا۔ ڈائریکٹ بات تو نہیں ہوئی لیکن پھر بھی بات ہو گئی۔''

''اوہ ہو لکی بوائے۔۔۔۔؟'' خالد نے جواد کی پشت تھپتھپائی تھی۔

''ویسے یار سچ میں سدرہ اور اسفر ٹوئنز ہیں۔ کہاں سدرہ آسمان کا تارا اور کہاں اسفر زمین کا آوارہ۔۔۔۔''

اس سے قبل کہ اسفر اس بے یقینی کے لمحوں میں لڑکھڑا کر گرتا کینٹین کے چھوٹے نے اسفر کو مخاطب کیا۔

صاحب کھڑے کیوں ہو بیٹھو'' چھوٹا سامنے والی میز کو کندھے پر رکھے کپڑے سے صاف کرنے لگا۔'' جواد نے مڑ کر دیکھا۔ لمحے بھر کو بوکھلایا لیکن جلد ہی اپنی ٹون میں آ گیا۔

''آؤ اسفر کہاں تھے تم؟ موبائل یقیناً آج بھی گھر بھول آئے ہو گے میں نے ٹیکسٹ کیا تھا تم نے ریپلائی نہ کیا تو سمجھ گیا کہ آج پھر۔۔۔ کھڑے کیوں ہو آؤ ہمیں جوائن کرو۔''

ساتھ بیٹھے خالد کو بھی اندازہ نہ ہو پا رہا تھا کہ گویا اسفر نے باتیں سنی ہیں کہ نہیں۔ چند قدم کا فاصلہ اسفر نے طے نہیں کیا۔ بس بے یقین نگاہوں سے جواد کو دیکھتا رہا۔

''اسفر آؤ نا'' جواد اپنی تشویش چھپانے لگا۔

اسفر بس خالی نظروں سے جواد کو دیکھتا رہا۔

''آج دوستی سے ہی اعتبار اٹھ گیا۔'' یہ کہہ کر اسفر کا نہیں۔ ساتھ پڑی کرسی دھکیلتا کینٹین کے خارجی دروازے سے باہر چلا گیا۔

''اسفر'' جواد نے پکارا تو سہی لیکن پیچھے نہ گیا اور

جب اسفر کینٹین سے باہر چلا گیا تو ایک بار پھر فرائز کھانے لگا۔

"یہ تو برا ہوا جواد" خالد کو حیرانگی ہوئی اتنی بڑی بات ہوگئی اور جواد پھر سے فرائز کھانے بیٹھ گیا ہے۔

"اچھا ہی ہوا۔ اس ڈرامے کا تو دی اینڈ ہوا جو مجھے بے انتہا بور کرتا تھا۔"

"اور جب یہ سب سدرہ کو پتا چلا تو۔۔۔۔"

"کچھ بھی نہ ہوگا۔ مجھے سو فیصد یقین ہے۔" جواد اطمینان سے کیچپ انڈیلنے لگا۔ ویسے اس کا یقین کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔

☆......☆......☆

ہفتے کی شام تھی۔ ویک اینڈ کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسی لیے ہر چیز پر فرصت کا رنگ نمایاں تھا۔ جا بجا روغن اتری دیواروں والے ہال کمرے میں اسفر بیٹھا تھا۔ چہرے پر تناؤ لیے۔

عام سے حلیے میں بے ترتیب بالوں کے ساتھ فاخرہ کچھ سوچتے ہوئے کریم کی تہہ سے بچی کوفی گھونٹ گھونٹ پی رہی تھی۔

سدرہ نے کن اکھیوں سے ماں کے تاثرات جانچے تھے۔ اس کے دل کی رفتار معمول سے تیز تھی۔ فاخرہ نے اسفر کی بات پوری توجہ سے سنی، پہلوؤں پر غور بھی کیا اور پھر گویا ہوئیں۔

"تمھارا غصہ بے جا نہیں اسفر۔ یوں استعمال ہونا برا ہی لگتا ہے لیکن۔۔۔۔۔۔" فاخرہ خاموش ہوئیں۔ اور گھونٹ گھونٹ کافی اپنے اندر اتاری تھی۔ اسفر نے پہلو بدلا تھا۔ یہ "لیکن" آگے کی باتوں کی صحیح طرح وضاحت نہ کر رہا تھا۔

"سدرہ، اسفر نے بتایا کہ پچھلے دو مہینوں سے تم دونوں اس لڑکے کے ساتھ گروپ اسٹڈی بھی کرتے تھے۔ کیسا ہے وہ لڑکا ؟؟" فاخرہ نے سدرہ کو مخاطب کیا تھا۔ سدرہ نے تھوک نگلتے ہوئے دھڑکتے دل کو سنبھالا تھا۔

"اچھا ہے" بلاشبہ سدرہ چاہے جتنی بھی بااعتماد سہی لیکن تھی تو لڑکی ہی۔

فاخرہ نے ایک بار پھر گھونٹ گھونٹ کوفی حلق سے اتاری تھی۔ اسفر نے ایک بار پھر پہلو بدلا تھا۔ عموماً فاخرہ یوں ٹھہر ٹھہر کر گفتگو نہیں کرتی تھی۔ لیکن آج کی بات کچھ خاص تھی۔

"اسفر اس کا طریقہ بے حد غلط سہی لیکن اگر وہ سدرہ کے لیے سنجیدہ ہے تو یہ زیادہ بری بات نہیں۔" ماں کی بات اسے چابک کی طرح ہی لگی۔

"امی آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ اس کمینے نے مجھ سے اس لیے دوستی بڑھائی اور اس نیت سے کھلاتا پلاتا رہا کہ میں سدرہ کا بھائی ہوں۔ مجھے الو بناتا رہا اور اپنا الو سیدھا کرتا رہا۔ میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔" اسفر کا لہجہ اکھڑا ہوا تھا۔

جواباً فاخرہ نے بس اتنا کہا۔

"کسی کے لیے برے القاب نہیں استعمال کرتے۔"

سدرہ نے سر جھکا لیا۔ اس کے دل کی رفتار مزید تیز ہو رہی تھی۔

فاخرہ نے کپ ایک بار پھر ہونٹوں سے لگایا۔ کوفی ختم ہوگئی تھی۔ مگ اس نے ساتھ پڑی میز پر رکھا اور سوچتے ہوئے بولی تھیں۔

"اسفر یوں کرو اس لڑکے سے کہو کہ اگر وہ سنجیدہ ہے تو اپنے ماں باپ کو بھیجے۔"

اسفر کے چہرے کا تناؤ پورے جسم پر پھیل گیا۔

"امی آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" اسفر کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل رہی تھیں۔

"جو کہہ رہی ہوں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ تم کل کے بچے ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ ویسے سدرہ اس لڑکے کو تم نے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چائے پلائی تھی۔ وضع قطع تو مجھے تھوڑی تھوڑی یاد ہے سلجھا ہوا تھا۔" فاخرہ اب بالوں کی چٹیا کھول کر بال بنانے لگی تھیں۔

غصے میں دکھ گھلنے لگا۔ یہ غم و غصہ مل کر اسفر کو پامال کرنے لگے۔

"امی اس لڑکے نے مجھے Exploit کیا۔ میرے دل چاہ رہا ہے اسے مار ڈالوں اور آپ کہہ رہی ہیں اسے کہوں سدرہ کے رشتے کے لیے ماں باپ کو بھیجے۔ کس قدر اذیت ناک ہے یہ، آپ کو میری عزت کی تو پروا نہیں۔" یہ کہتا اسفر اٹھا اور کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ کسی نے اسے نہ پکارا۔

سدرہ یونہی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کا دل تو جیسے کانوں میں دھڑک رہا تھا۔

فاخرہ نے معمول کے لہجے میں کہا۔

"تم پریشان نہ ہو۔ اس طرح کے معاملات میں لڑکے ایسے ہی جذباتی ہو جاتے ہیں۔" فاخرہ بالوں کو ترتیب دیتی رہیں۔ بال بنانا شاید زیادہ اہم تھے۔

☆......☆......☆

ہال کمرے سے نکل کر اسفر نے کچن کا رخ کیا تھا۔ ایک گلاس غٹا غٹ پانی پینے کے بعد بھی اس کے اپنے اوپر چھائے تناؤ میں کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ کچن کے شیلف پر دونوں ہاتھ جمائے کتنی دیر وہ لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ پھر بھی دماغ ویسے ہی بھٹی کی طرح جلتا رہا۔

کچن سے نکلا اور گھر کے خارجی راستے کو ناپا۔ سڑکوں پر بے تحاشا ٹریفک تھی۔ لوگوں کا سیلاب تھا۔ جو ہر طرف رواں دواں تھا۔ اسفر کو اپنا اندر باہر جلتا محسوس ہوا۔ کتنی دیر وہ یونہی سڑکوں پر بے مقصد چلتا رہا۔

ذہن میں جواد کے ساتھ گزارا ہوا وقت اور اس کی طرف سے کی گئی مہربانیاں آنے لگیں۔

"دوستی ایک خالص جذبہ ہے، تم مجھے اچھے لگتے ہو، دوستی کے لیے یہ ایک بات ہی اہم ہے اور دوستی کی ٹھوس وجہ بھی۔ معاشرتی فرق کی بنا پر دوستی نہ کرنا بے وقوفی ہے۔ ہاں البتہ میں تمھیں ناپسند ہوں یا پھر میری کوئی بات تمھیں ناپسند ہو جس کی بنا پر تم دوستی نہ کرنا چاہتے ہو تو بتاؤ۔" یہ کہنے والا جواد ہی تھا۔ جب وہ اسفر کو گیمز سٹوڈیو لے گیا تھا۔

اسفر کو اپنا آپ حد سے زیادہ بے وقوف لگ رہا تھا۔ کیسے جواد نے کھیل کھیلا تھا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ جواد اکثر و بیشتر سدرہ کا ذکر چھیڑ دیتا تھا۔ حالانکہ اگر اسفر احتراز کرتا تب بھی۔ اور گروپ کی تشکیل بھی شاید جواد نے اسی لیے کی تھی کہ سدرہ تک رسائی ہو۔ وہ خود تو بس شاید ایک شطرنج کا مہرہ ہی تھا۔

اسفر چلتا رہا، رکتا رہا، رک رک کر چلتا رہا۔ یونہی بے لگام سوچوں کے ساتھ سڑکیں ناپتا رہا۔ ذیلی سڑک پر دائیں طرف ایک موبائل شاپ تھی۔

بسم اللہ موبائل شاپ۔۔۔۔۔ پروپرائیٹر محمد زوار۔

"یہاں پر تمام کمپنیوں کے ایزی لوڈ کی سہولت میسر ہے۔" دکان کی سامنے والی دیوار پر چارٹ پر خوشخط لکھا ہوا تھا۔ دکان کی دیوار کے ساتھ لگے اسٹینڈز پر سستے موبائل ماڈلز کی کیسنگ، ہینڈ فری، بیٹریاں اور دوسری موبائل اسسریز لٹکی تھیں۔ ان موبائل اسسریز کو تو شاذ و نادر ہی کوئی خریدتا یہ موبائل شاپ تو ایک طرح سے بس ایزی لوڈ شاپ تھی۔ اہلِ محلہ اور راہ گیروں کو ایزی لوڈ کی سہولت مہیا کرتی۔

زوار ناک پر چشمہ ٹکائے حدیثوں کی تشریح پر مشتمل کتاب پڑھ رہے تھے۔ جب کاؤنٹر پر کھٹکا ہوا اور انھوں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو سامنے اسفر کو کھڑے پایا۔

"آؤ اسفر" اسفر دکان پر شاذ و نادر ہی آتا تھا۔ زوار کی بھی شعوری کوشش ہوتی کہ بیٹا دکان پر نہ آئے۔ وہ بیٹے کو مستقبل میں اعلیٰ مقام پر دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ موبائل شاپ ان کے بیٹے کے شایانِ شان نہ تھی۔

"آؤ اسفر کیسے آنا ہوا؟" زوار نے کتاب کا صفحہ موڑا تھا۔ تشریح شدہ حدیثوں کی کتاب ان کی ذاتی تھی۔ قرآن مجید کے بعد ان کے مطالعے میں سب سے زیادہ رہنے والی دوسری کتاب یہی تھی۔

"بچے تو باغ کے پھول ہیں۔" یہ حدیث انھیں کس قدر اچھی لگتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی حدیث کی تشریح پڑھ رہے تھے۔

"آؤ اسفر اندر آؤ۔" کتاب بند کرتے ہوئے انھوں نے جب دیکھا کہ اسفر کاؤنٹر کے پار ہی رک گیا ہے تو انھوں نے کہا تھا۔

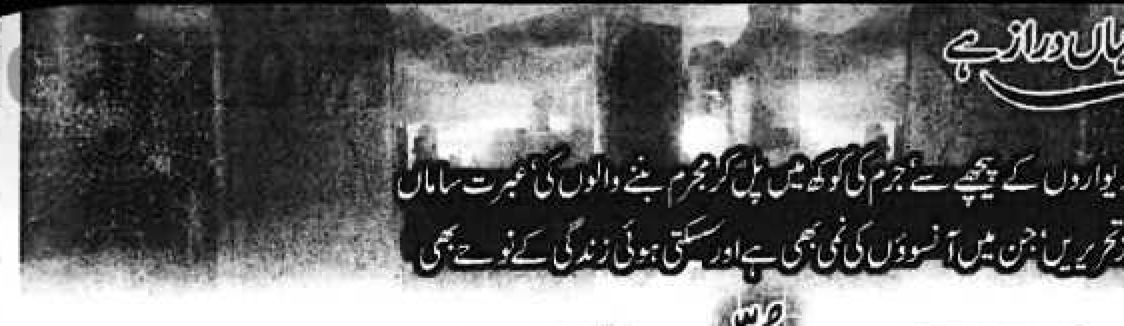
اسفر نظر انداز کیے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا رہا۔ نظر باپ کے سامنے پڑی کتاب کے سرورق پر پڑی تو نا چاہتے ہوئے بھی منہ میں کڑواہٹ گھلنے لگی۔

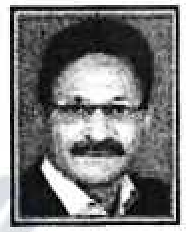
"اسفر خیریت تو ہے نا۔" انھیں غیر معمولی پن کا احساس ہو رہا تھا۔

"خیریت" اسفر کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ آن ٹھہری۔ "آپ کو بھی ضرورت پڑی اپنے بچوں کی خیریت جاننے کی۔ آج کس لیے پوچھ رہے ہیں۔"

کڑوے الفاظ منہ سے نکلنے لگے تھے۔ زوار لمحے بھر کو تو سکتے میں آگئے۔

(جاری ہے)





منّی باجی

جاوید راہی

اُس عورت کا قصہ عبرت، جس نے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے

شیطانی طاقتوں کو قابو کر لیا تھا، جاوید راہی کے قلم سے ایک اور پراسرار سچ کا پردہ فاش

بابا صدو دیوار کے ساتھ بنائے گئے کچے چبوترے پر میلے چکیلے بستر پر پڑا زندگی کے آخری پہر کی ڈھلتی دوپہر کے ساتھ ساتھ پاؤں گھسیٹتے آگے بڑھ رہا تھا۔

عمر قید کی سزا کاٹ کر گھر واپس آیا تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ ماں باپ اللہ کو پیارے ہو گئے تھے، بیوی اس کے جیل جانے کے بعد دونوں بچے لیکر ایک رات چپکے سے گھر چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی، منّی باجی کو قتل کرنے پر مقدمہ کی پیروی کے سلسلہ میں جو پائی پیسہ خرچ ہوا وہ افضل نامی آدمی جو اس کے ساتھ ہی کام کرتا تھا لگانے کی مد میں اس کی بہن کلثوم سے نکاح کروا کر لے گیا۔ بوڑھے والدین کچھ سال ہی زندہ رہ پائے تھے۔ گھر سے فرار ہونے والی بیوی کے بھائی نے گھر پر قبضہ کر لیا۔ جب واپس آ کر صدو نے واویلا کیا تو محلّہ کے چند لوگوں نے اکٹھے ہو کر اس کے سالے سے مکان کا تھوڑا سا حصہ اسے دلوا دیا جو اس کی بیوی نے اپنے بھائی کو اونے پونے فروخت کر کے اسٹامپ پیپر پر اس کے نام لکھ دیا تھا۔

کچی پکی اینٹوں سے چھوٹا سا کمرہ تو بنا لیا تھا صدو نے مگر زیادہ وقت اسی چبوترے پر ہی گزار دیتا جہاں بچوں کے کھانے پینے کا کچھ سامان بازار سے لے آتا اور اسی سے دال روٹی کما کر گزر اوقات کرتا۔ دو چار بار افضل اور کلثوم ملنے آئے اور اسے اپنے ساتھ لے کر جانے کی کوشش کی مگر صدو نے انکار کر دیا کہ بہن کے گھر بھائی رہتا اچھا نہیں لگتا لوگ باتیں کریں گے۔

صدو کے بارے میں جناب ایم اے راحت صاحب نے بتایا۔ جب میں اُن سے ملنے مہران بلاک اقبال ٹاؤن گیا تو وہ آدھا سامان اعوان ٹاؤن والے گھر میں شفٹ کر چکے تھے۔ انہوں نے ہی بتایا تھا کہ کوئی صدو بابا ہے قصور میں جس کے ساتھ کچھ پراسرار واقعات رونما ہوئے ہیں اور اس سے ایک قتل بھی ہو گیا۔ عمر قید کی سزا بھگت کر واپس آیا ہے۔ تم اس کو مل آؤ ہو سکتا ہے کہ اس کی روداد تمہارے کام آ سکے، میں تو مصروف ہوں ورنہ میں خود جاتا۔ مجھے بھی ایک دوست سے کچھ حالات معلوم ہوئے تھے جو خاصے دلچسپ لگے۔ انہوں نے ہی مجھے بابے صدو کا اُتا پتا دیا تھا۔

پہلے تو بابا صدو کسی لائن پر نہ آیا جب میں نے اسے اپنا تعارف کروایا تو کچھ سوچ کر ٹانگیں سمیٹتا اُٹھا اور دیوار کا سہارا لیتے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

بابے صدو نے کھانس کر اپنا گلا صاف کیا اور مجھے مخاطب کر کے بولا۔

''باؤ جی! میں تیرہ سال پہلے چمڑا منڈی میں ایک آڑھت پر کھالوں اور چمڑے کی صفائی اور نمک لگائی کا کام کرتا تھا۔ میرے ساتھ چار اور لوگ بھی کام کرتے تھے۔ افضل اور میں گودام میں جبکہ دوسرے تینوں مرے ڈنگروں کی کھالیں اُتارنے اور ان کے گوشت اور چربی کو پگھلا کر لوہے کے خالی ڈرموں میں اکٹھا کرنے کے بعد وہ پنجر اُٹھا کر ہڈیوں کے ڈھیر پر پھینک دیتے۔ کُتے اور گدھ نوچ نوچ کر پنجروں پر سے بچا کھچا ماس اُتارنے میں لگ جاتے۔ گودام اور ہڈی احاطہ کی بدبو ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی ہم اس کے عادی ہو چکے تھے۔ آڑھت مالکان بھی ہمارے جیسے ہی تھے وہ بھی ہمارے درمیان بیٹھتے اُٹھتے اور کھاتے پیتے۔

افضل دوپہر کو اپنے گھر کھانا کھانے چلا جاتا جبکہ میں گھر سے لایا کھانا اُدھر گودام میں ہی بیٹھ کر کھا لیتا۔ مالکان کی رہائش بھی گودام کے آخری حصہ میں تھی وہ بھی دوپہر کو گھر چلے جاتے۔ مُردار جانوروں کی کھالیں اُتارنے والے تینوں نو مسلم روغن چربی نکالنے والے بڑے سے کڑاہے کے قریب ہی آرام کرنے کیلئے زمین پر پڑی چٹائی پر جا بیٹھتے، یہ ہم سب کا معمول تھا۔ جب خشک ہڈیوں کو ٹرک پر لوڈ کرنے کا وقت ہوتا تو ہم تمام ملازمین یہ کام سرانجام دیتے۔

اسی طرح ایک دن ہم ٹرک لوڈ کر رہے تھے کہ ہڈیاں اُٹھانے کی غرض سے میں ایک کونے کی طرف گیا تو میں نے وہاں دیوار کے آخری حصہ میں کچھ اینٹوں کو زمین پر ترتیب سے پڑے دیکھا اور ایک طرف سفید موم بتیوں کے تین پیکٹ، اگر بتی کا بڑا پیکٹ، سیاہ ثابت ماش اور چھوٹے چھوٹے سیاہ کنکروں کی مٹھی بھر ڈھیری اور بوری کو چار حصوں میں اکٹھا کر کے بیٹھنے کیلئے اس ٹھڑے پر رکھا ہوا تھا اور ایک مٹی کا دیا جس میں شائد تیل یا کچھ اور تھا آدھ جلی روئی کی بتی جو شائد روشنی کیلئے جلایا گیا ہوگا۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں کوئی بیٹھ کر جادو ٹونہ کرتا ہے۔ پہلے تو میں اس کا



تذکرہ ان سب سے کرنے لگا پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ مجھے کیا پڑی ہے۔ جو بھی کوئی کر رہا ہے کرے اور ہڈیوں کی ٹوکری سر پر رکھتے ٹرک کی طرف ہو گیا۔

ٹرک لوڈ کروا کر ہم وہاں سے دوبارہ گودام میں آ گئے۔ وہ تینوں مری ہوئی بھینس کی کھال اُتارنے کیلئے اپنی اپنی چھریاں اُٹھائے اس طرف ہو گئے۔ گدھ جو دیوار پر بیٹھے للچائی نظروں سے اس طرف دیکھ رہے تھے چیخ و پکار کرنے لگے آوارہ کتے بھاگ کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔

گودام میں آ کر میں نے افضل سے اس سارے معاملات کا تذکرہ کیا تو وہ بھی پریشان ہو گیا اور اپنا خیال ظاہر کرتے کہا کہ ”اس مُردار کھاتہ میں آ کر تو کوئی کالے جادو والا ہی کچھ کرتا ہوگا۔ ویسے بھی میں نے سنا ہے کہ ایسی جگہوں پر باہر کی چیزیں قابض ہوتی ہیں۔ چلو دفع کرو جو بھی کوئی ہے ہمیں اس سے کیا؟“

بات آئی گئی ہو گئی۔ میں اپنے کاموں میں اُلجھ گیا۔ بڑے حاجی صاحب نے کڑاہے کے نیچے جلانے والی لکڑیوں کی ریڑھی اُتارنے کیلئے مجھے مُردار کھاتہ جانے کا کہا۔ میں چھری رکھتے اُدھر چل پڑا۔ ابھی میں کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ میں نے مُنی باجی کو مُردار کھاتہ کے اس حصہ میں سے نکل کر دوسری طرف جاتے دیکھا۔ جب تک میں وہاں پہنچا مُنی باجی رہائشی حصہ کی طرف مُڑ گئی تھی۔

مُنی باجی بڑے حاجی صاحب کی رشتہ میں سالی تھی اور دوبار طلاق ہونے پر پکی پکی حاجی صاحب کے پاس آ گئی تھی۔ ریڑھی سے لکڑیاں اُتارتے میں اس بات پر سوچ رہا تھا کہ مُنی باجی کا اس تپتی دوپہر میں مُردار کھاتہ میں کیا کام؟ کہیں وہ جادو ٹونہ مُنی باجی ہی تو نہیں کرتی؟ پھر یہ سوچ کر اس خیال کو ذہن سے نکال دیا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی کام کی غرض سے ادھر آئی ہو۔ اسی ادھیڑ بُن میں ریڑھی خالی ہو گئی۔ ایک بار تو دِل میں خیال آیا کہ جا کر اس جگہ کو ایک بار پھر دیکھ لوں شائد وہ سب کچھ وہاں نہ ہو جو کچھ روز پہلے میں نے اُدھر کونے میں دیکھا تھا مگر میں واپس گودام کی جانب چل پڑا۔

رات گئے تک کام کرنا پڑتا تھا اس لئے صبح والی بات ذہن سے نکل گئی مگر جب گھر آ کر تمام کاموں سے فارغ ہو کر بستر پر گرا تو صبح والا واقعہ ایک بار پھر ذہن میں جاگ اُٹھا کہ مُنی باجی اِدھر مُردار کھاتہ میں کیا لینے گئی تھی؟ اگر وہی کوئی علم سیکھ رہی ہے تو وہ کیا ہوگا؟ کوئی جواب نہ ملا تو میرا تجسس اور بڑھ گیا اور میں نے دِل میں تہیہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے میں اس راز کو جان کر ہی رہوں گا۔

☆☆☆

صبح چمڑا منڈی پہنچ کر میں سیدھا مُردار کھاتہ کی طرف گیا۔ جمع شدہ مرے ڈنگروں کے سوکھے گیلے پنجروں کا ڈھیر کافی اونچا ہو چکا تھا جس پر کئی گدھ ماس بوٹیاں نوچنے میں مصروف تھے۔ ایک طرف آوارہ کتوں کا جھنڈ بھی ہڈیاں گوشت نوچ کھسوٹ رہے تھے۔ گدھ اور کتے ہمیں دیکھ کر مجال ہے کہ اپنی جگہ سے ٹس سے مَس ہوں یہ ہمارے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ ان کو ہم سے شائد ڈر ہی نہیں لگتا تھا۔ میں اس ڈھیر کے اوپر سے گھوم کر جب اس جگہ پہنچا تو میری آنکھوں کے سامنے ایک سیاہ رنگ کا بڑا سا مرغا جس کو پروں سمیت کاٹ کر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اپنے خون میں لتھڑا ہوا اینٹوں کے چبوترے پر پڑا تھا جس کے چاروں جانب سفید موم بتیاں دائرے میں جل جل کر موم میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ تین بڑے سے لیموں جن کے آر پار اسی مرغے کے بڑے پَر دھنسے ہوئے تھے وہ پاس ہی موجود تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ رات جو کوئی بھی تھا اس نے چبوترے پر بیٹھ کر ضرور کوئی عمل کیا ہوگا۔

اب میرا معمول بن چکا تھا کہ جب میں صبح گودام پر کام کیلئے آتا تو پہلے اس طرف ضرور جاتا تھا۔

تین دن بعد اس مرغ کے گوشت کے اندر بے شمار کلبلاتے سفید رنگ کے کیڑے رینگ رہے تھے۔ چاروں جانب اُٹھنے والی ناگوار بدبو جس کے ہم یہاں کام کرنے والے عادی ہو چکے تھے مگر یہ اس بدبو سے الگ بدبو تھی سیاہ مرغے کے گلے سڑے گوشت کی۔ ضبط کے باوجود مجھے ابکائی آتے آتے رہ گئی اور میں تیزی سے مُردار کھاتہ سے نکل کر گودام کی طرف آ گیا سامنے افضل کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا کیونکہ گودام کے تالے کی چابی میرے پاس تھی۔

”کدھر سے آ رہے ہو تم؟“ افضل نے مجھے مُردار کھاتہ کی طرف سے آتے دیکھ کر سوال کیا۔ جس کو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اپنی چھوٹی انگلی دکھا کر مطمئن کر دیا اور تالا کھول کر ہم دونوں اپنے کام میں لگ گئے۔

دوپہر کو کھانے کیلئے اُٹھا اور پانی لینے ہینڈ پمپ کی طرف آیا تو سامنے رہائشی حصہ کی طرف سے مُنی باجی کو آتے دیکھا جو شائد بازار جانے کیلئے گھر سے نکلی تھی۔ لمحہ بھر کو وہ میرے قریب رُکی اور مجھے مخاطب کرتے کہا۔

”صدو میرے پیچھے اسٹیشن آؤ میں وہاں پہنچ کر تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“ اور جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

میں نے پانی والا جگ گودام میں رکھا اور تالا لگا کر بڑے بڑے ڈگ بھرتا مُنی باجی کے پیچھے چل پڑا۔ اسٹیشن تھوڑے ہی فاصلے پر تھا میں اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کے پچھواڑے سے ہوتا ہوا پلیٹ فارم کے دوسری طرف گھوم گیا جہاں مسافر گاڑی کے انتظار میں اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے تھے۔ آخری بینچ پر بیٹھی مُنی باجی پر میری نظر پڑی اور میں چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

”جی مُنی باجی“ میں نے انہیں مخاطب کیا۔

”صدو بیٹھ جاؤ“ مُنی باجی نے مجھے بیٹھنے کیلئے کہا۔ میں ان کے سامنے ہٹ کر دوسرے کونے میں بیٹھ گیا۔

”صدو! میں کئی دِن سے تمہیں نوٹ کر رہی ہوں تم بار بار مُردار کھاتہ کے اس کونے کی طرف جاتے ہو“ مُنی باجی کی آنکھوں کی پُراسرار چمک کا سامنا نہ کرتے میں نے فوراً اپنی نظریں جھکاتے کہا۔

”مُنی باجی دراصل بات یہ ہے کہ رات کو کوئی وہاں بیٹھ کر جادو ٹونہ کرتا ہے۔ میں اس کو پکڑنا چاہتا ہوں کہ کہیں وہ آپ کے کاروبار کی بندش کیلئے تو کوئی عمل نہیں کر رہا۔“ میں نے بدستور جھکی نگاہوں سے اپنے دل کی بات اس پر عیاں کی۔

”دیکھو صدو تم میرے بھائیوں جیسے ہو۔ یہ بات تمہیں بتا رہی ہوں کہ وہ کوئی اور نہیں میں ہوں جو رات کو سب سے چھپ کر ایک چلّہ کاٹ رہی ہوں۔“

مجھے مُنی باجی کے منہ سے یہ الفاظ سن کر بُری طرح جھٹکا لگا۔ چند پل خاموشی رہی پھر وہ بولی۔

”صدو بھائی! میرے نصیب شروع دن سے ہی ایسے چلے آ رہے ہیں۔ ہوش سے پہلے ہی ماں باپ گزر گئے، ایک بھائی اور ہم دو بہنیں تھیں۔ بھائی بڑی بہن کی شادی کر کے سسرال شفٹ ہو گیا۔ حاجی صاحب مجھے سالی کی بجائے بیٹی کا درجہ دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بھانجے سے شادی کروا دی وہ پرلے درجے کا نکھٹو اور نشہ باز نکلا۔ میرے اصرار پر کہ کوئی کام دھندہ کرو اُلٹا اس نے مجھے طلاق دے دی۔ کچھ عرصہ بعد میرے مراسم شہر کے ایک دوکاندار سے بن گئے جس کی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ اس نے میری داستان سُنی اور مجھ سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کر دی جس کا تذکرہ میں نے بڑی آپا سے کیا تو انہوں نے حاجی صاحب سے مشورہ کر کے میرا نکاح شفیق سے پڑھوا دیا۔ کچھ ماہ تو سب ٹھیک چلا پھر گھر میں جھگڑا اور طعنہ زنی، الزام تراشیاں شروع ہو گئیں۔ ایک دِن اس نے بھی طلاق کا اسٹامپ میرے ہاتھ میں دیتے گھر سے نکال دیا کہ تمہارے تعلقات حاجی صاحب سے ہیں۔ میں نے بہت صفائیاں پیش کیں کہ وہ مجھے اپنی بیٹی ہی سمجھتے ہیں مگر اس ظالم نے میری کوئی بات نہ سُنی“

یہ سب بتاتے ہوئے وہ رو پڑی اور روتے روتے بتایا کہ ”مجھے یہ چلّہ گھر میں کام کرنے والی نے اپنے سُسر سے جو کالے علم کا ماہر ہے لیکر دیا ہے۔ اس کے مکمل ہونے پر میں کچھ بھی کر سکوں گی۔ میں نے کامیاب ہو کر دونوں سابقہ شوہروں سے انتقام لینا ہے چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

”تو کب تک یہ سلسلہ مکمل ہوگا؟“ میں نے نظریں اوپر اُٹھاتے مُنی باجی سے پوچھا۔

”ابھی تو بہت دِن پڑے ہیں۔“ وہ بتا کر بولی۔ بھائی میں نے تمہیں ایک کام کیلئے یہاں بُلایا ہے“

”ہاں بولیں۔“

”ایک بوتل شراب اور کالے بکرے کا دل جو کاٹا نہ گیا ہو، جس کے اندر خون موجود ہو مجھے چاہئے۔ یہ لو ہزار روپے۔“ مُنی باجی نے ہزار کا نوٹ میری طرف بڑھاتے کہا۔

”شراب تو مل جائے گی مگر بکرے کا ثابت دِل پوچھ کر جواب دوں گا۔“ کہتے میں نے نوٹ پکڑ کر جیب میں ڈال لیا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اب میں چلتا ہوں“ میں نے اجازت مانگی۔

”ٹھیک ہے۔“ مُنی باجی بھی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور جانے کیلئے سیڑھیوں کی طرف اور میں واپس گودام کی

جانب چل پڑا۔

ابھی میں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ پیچھے سے مُنّی باجی کی آواز آئی، میں رُک گیا وہ قریب آ کر بولی۔

"یہ سامان مل جائے تو ادھر ہی رکھ دینا کونے میں جہاں کچرا پڑا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" کہتے میں آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

شراب کی بوتل تو مجھے کرسچن کالونی سے مل گئی جبکہ بکرے کے دِل کیلئے کوئی قصاب ثابت دینے کی حامی نہیں بھر رہا تھا آخر کار ایک ملازم جو مٹن شاپ پر بکرے چھترے ذبح کر کے تیار کرتا تھا اس نے پانچ سو روپے کے عوض بند دل دینے کا وعدہ کر لیا جس کو میں نے پانچ سو روپے ادا کر دیے۔ اس نے دوسرے دن لانے کا کہا کہ میں تمہارے گودام آ کر دے جاؤں گا۔ دونوں کام مکمل ہو گئے، اب میں نے دونوں چیزیں وہاں رکھنی تھیں۔

دوسرے دِن حسب وعدہ وہ کالے بکرے کا دِل مجھے کھالوں والے گودام میں آ کر دے گیا۔ افضل نے پوچھا کیا ہے؟ تو میں نے بہانہ بنا دیا کہ بکرے کا گوشت منگوایا تھا پاؤ بھر والدہ کو یخنی بنا کر دینی ہے۔" وہ سر ہلاتا ہوا دوبارہ کام میں لگ گیا۔

دوپہر کو وہ کھانا کھانے چلا گیا تو میں نے شراب کی بوتل اور بکرے کا دل جو شاپر میں بند تھا اُٹھایا اور مُردار کھاتہ کی طرف چل پڑا۔ مُنّی باجی کی بتائی جگہ پر دونوں چیزیں چھپا کر واپس گودام میں آ گیا۔

وہ دِن گزر گیا' دوسرے دن آ کر میں نے سب سے پہلے وہ جگہ دیکھی جہاں بوتل اور کالے بکرے کا دِل چھپایا تھا۔ وہاں دونوں چیزیں موجود نہیں تھیں۔ مجھے تسلی ہوئی کہ مُنّی باجی نے وہ اُٹھا لیں ہوں گی اور واپس گودام میں آ کر کام میں اُلجھ گیا۔

جس دن سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ مُنّی باجی وہاں کوئی چِلّہ کاٹ رہی تھی دل کو تسلی ہو گئی۔ اب میرا دھیان اُدھر کم ہی ہوتا تھا۔ ایک دوبار آمنا سامنا ہوا مُنّی باجی سے لیکن نہ انہوں نے مجھے مخاطب کیا اور نہ ہی میں نے۔

☆☆☆

ایک دِن پھر انہوں نے مجھے اشارہ سے بُلا کر اسٹیشن آنے کا کہا اور آگے بڑھ گئیں۔ میں اسی طرح ان کے پیچھے چلتا ہوا اسٹیشن پہنچ گیا۔ وہ مجھے ایک طرف کھڑی مل گئیں۔ میرے سلام کا جواب دیتے انہوں نے بڑے پیار سے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

"جی مُنّی باجی!"

"صدو بھائی ایک گذارش کرنا تھی آپ سے"

"جی باجی فرمائیں۔" میں نے انکساری سے جواب دیا۔

"کل منگل ہے اور آپ نے میرے پاس بیٹھنا ہے۔"

تو میں سن کر پریشان ہو گیا پھر دل بڑا کر کے بولا۔ "مُنّی باجی کوئی خطرہ تو نہیں۔ میرا مطلب آپ تو چِلّہ کر رہی ہیں اور میں؟" میرے لہجہ کا خوف محسوس کرتے وہ جواباً بولی

"صدو بھائی کوئی خطرہ نہیں بس میری مدد کرنی ہے آپ نے۔ وہ جو چیزیں آپ لائے تھے ان کی باری ہے کل۔ میں جب پڑھ رہی ہوں گی تو آپ نے دل کے پانچ ٹکڑے کر کے شراب نیچے گرانی ہے اور پھر شراب کو آگ لگا کر ایک ایک دِل کا ٹکڑا اس آگ پر پھینکنا ہے اور بس۔ میں آپ کو اس کام کے دو ہزار روپے دوں گی' یہ رکھو۔" انہوں نے اپنے پرس سے دو ہزار روپے نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیے۔ واپس آ کر میں کام کرنے کے دوران یہ بھی سوچتا رہا کہ وہ عورت ذات ہو کر رات کی تاریکی میں مُردار کھاتہ میں بیٹھ کر چِلّہ کشی کرتی ہے تو تم مَرد ہو کر ڈر رہے ہو۔

رات بھر میں سوچ سوچ کر ہلکان ہوتا رہا پھر منگل کی رات مُنّی باجی کے پاس بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

شام کو فارغ ہو کر میں گھر آیا اور آتے وقت بڑی سی ایک چھری بھی گودام سے ساتھ لیتا آیا تھا کسی بُرے لمحہ کیلئے۔ جب گھر والے سونے کیلئے اپنی اپنی چارپائی پہنچ گئے تو میں چپکے سے اُٹھا چھری کو زیر جامہ کرتے اپنی چارپائی چھوڑ کر بیٹھک سے باہر نکل آیا۔

جس جگہ کا میں نے سوچا تھا وہ کھیتوں کی جانب والا حصہ تھا۔ گندا نالہ کراس کرنے میں بچتا ہوا دیوار تک پہنچ گیا۔ ایک جگہ دیوار کی اونچائی قدرے کم تھی میں اس پر ہاتھ جماتے دوسری طرف اُتر گیا۔ دیوار کے سائے کے ساتھ رینگتا ہوا میں اس کونے میں پہنچ گیا جہاں مُنّی باجی نے اینٹیں جوڑ کر بیٹھنے کی جگہ بنائی ہوئی تھی مگر ابھی تک مُنّی باجی وہاں نہیں پہنچی تھی۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا اندھیرے میں مجھے مُنّی باجی بڑے محتاط انداز میں مُردار کھاتہ کی طرف آتے دکھائی دی۔ میں نے ان کو اور انہوں نے مجھے دیکھ لیا۔

"آ گئے صدو بھائی؟"

"جی مُنّی باجی۔" میں نے قریب آتے ہوئے جواب دیا۔

ان کے ہاتھ میں ایک بڑا سا شاپر بیگ تھا جو انہوں نے اس چھوٹے سے چبوترے پر رکھا اور اس میں سے ایک سرخ رنگ کا بڑا سا چوکور کپڑے کا ٹکڑا نکالا جس کی تہہ کھولتے ہی کافور کی تیز بو میرے ناک میں گھسی۔ وہ کپڑا اس جگہ ڈال کر مُنّی باجی اس پر بیٹھ گئی اور مجھے بھی قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بھی چند فٹ دور زمین پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے شاپر سے میری لائی شراب کی بوتل اور اسی شاپر میں لپٹا بکرے کا دِل بھی نکال کر میرے سامنے رکھ دیا اور مخاطب ہوئیں۔

"صدو بھائی آپ کو یاد ہے نا جو آپ نے کرنا ہے؟"

"جی مُنّی باجی۔" میں نے ان کی بتائی ہوئی ترکیب دہرائی۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ میرے وجود سے خوف نامی احساس سرے سے ہی ختم ہو چکا تھا۔ مُنّی باجی نے چھوٹی سی چھری نکال کر میرے اور اپنے گرد ایک دائرہ کھینچ دیا اور سفید موم بتیاں ترتیب سے رکھتے ہوئے ان کو جلا دیا۔ اب موم بتیوں کے تھرکتے شعلوں کے درمیان مُنّی باجی جو خود بھی سیاہ کپڑوں میں ملبوس کوئی عجیب مخلوق دکھائی دے رہی تھی، منہ میں کوئی منتر پڑھنے لگی۔ میں نے ہاتھ لگا کر اپنے ساتھ لائی چھری کو محسوس کیا اور مُنّی باجی کے اشارے کا منتظر ہو گیا۔ منہ میں پڑھتے پڑھتے ایک دم وہ بڑبڑانے لگی جیسے کسی کو بلا رہی ہو۔ یکدم موم بتیوں کی مدھم روشنی کے دائرہ میں ایک خوفناک شکل کا سایا سا اُبھرا اور مُنّی باجی سے مخاطب ہوا۔

"کیوں پریشان کیا ہے ہمیں؟ کیا چاہتی ہو؟" مارے خوف کے میں تھر تھر کانپ رہا تھا مگر وہ دونوں مجھ سے بے نیاز ایک دوسرے سے سوال جواب کر رہے تھے۔ مُنّی باجی نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنا کام کرنے کا کاشن دیا۔ میں نے فوراً وہ بدبو مارتا بکرے کا دِل نکال کر چھری سے پانچ ٹکڑے کیا پھر بوتل سے شراب زمین پر انڈیل کر ماچس کی تیلی جلاتے اس پر پھینکی۔ شراب تیز اور اچھی تھی فوراً ہی بھڑک اُٹھی اور میں نے ایک ایک کر کے دِل کے ٹکڑوں کو آگ میں ڈالنا شروع کر دیا۔

گندی بدبو جو جلتے دِل کے گوشت سے اُٹھ رہی تھی اور گہرا سیاہ دھواں بھی۔ وہ ہیولا جو موم بتیوں کی لو میں تھرک رہا تھا ایک دم اس دھوئیں میں آ گیا۔ اب وہ سائے سے بدل کر مکروہ شکل میں سامنے تھا۔ مجھے وہ یا تو دیکھ نہیں رہا تھا یا نظر انداز کر رہا تھا۔ مُنّی باجی سے ہی مخاطب تھا۔

"کیا چاہتی ہو مجھ سے؟" وہ غرا کر بولا۔

"تمہاری حاضری اور اپنے کام۔"

"ایک نوزائیدہ بچے کا دِل نکال کر یہی عمل کرنا ہو گا تمہیں مگر اکیلے میں...... کوئی تمہارے ساتھ نہیں ہو گا۔ یہ کل ہر حال میں ورنہ ا......" اتنا کہتے ہی وہ دھوائیں میں غائب ہو گیا۔

"اب تم جاؤ مجھے تھوڑی دیر اور بیٹھنا ہے یہاں"

مُنّی باجی نے چھری کی مدد سے کچھ پڑھا اور میرے گرد کھینچا دائرہ ختم کر دیا۔ میں کوئی جواب سوال کیے بغیر گولی کی طرح وہاں سے اُٹھا اور گرتا پڑتا دیوار پھلانگ کر کھیتوں اور گندے نالے کو پیچھے چھوڑتا مُردار کھاتہ کی حدود سے نکل کر گھر کی طرف ہو دیا۔

گھر پہنچ کر جب میں اپنے بستر پر گرا تو ایک ہی بات ذہن میں محو گردش تھی کہ چھوٹے سے بچے کا دِل جو اسی طرح جیسے کالے بکرے کا دِل شراب کی آگ میں بھنا تھا، اب بچے کا دِل بھی نکال کر وہ ایسا ہی کرے گی مگر بچہ لائے گی کہاں سے؟ جب تک مجھے نیند نہ آئی میرے دِل اور ذہن میں خوف اور آنے والے حالات گردش کرتے رہے۔

☆☆☆

صبح جب میں گودام آیا تو چھڑا منڈی کی پرانی جھگیوں میں جہاں "باگے گے" جو حرام حلال، کتے بلے، گیدڑ مُردار سب کھا جاتے تھے شور مچا ہوا تھا کہ رات کوئی

نامعلوم بلا تین چار ماہ کا بچہ ماں کے ساتھ لیٹا اُٹھالی کر گئی تھی اور اسے تلاش کیا جا رہا تھا۔ سنتے ہی میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی مجھے منی باجی کی کرتوت کا پتا چل گیا کہ رات کو وہ مُردار کھاتہ میں کیوں رُک گئی تھی۔ جھگیوں پر صرف گھاس پھوس کی چھتیں یا پرانے کپڑے ڈال کر صرف سایا ہی کیا جاتا تھا ورنہ چاروں جانب سے اوپن۔ بس بدنصیب ماں کے ساتھ لیٹے بچے کو منی باجی اُچک کر لے گئی پتا نہیں وہ زندہ تھا یا اسے سفاک عورت نے مار ڈالا تھا۔

میں ڈرتا ہوا اس بات کا تذکرہ بھی نہیں کر رہا تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ رات بھر جادو ٹونے میں شریک رہا۔ بس اب صرف ایک ہی فیصلہ تھا میرے پاس کہ رات کو میں منی باجی کو وہ چلہ نہ کرنے دوں جیسا کہ وہ تقریباً سب کچھ حاصل کر چکی تھی۔ سارا دن میرا پریشانی میں گزرا کہ دن ڈھلے اور رات ہو اور میں مُردار کھاتہ میں پہنچ جاؤں۔

☆☆☆

میں نے جو فیصلہ کیا وہ انتہائی تھا۔ ایسی سفاک اور بدبخت عورت کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں جو ایسی شیطانی قوت کو اپنے قابو میں کر کے چاہے کچھ بھی کر ڈالے۔ اس کے دونوں سابق شوہروں کی موت تو یقینی تھی نا۔

میں نے بڑی چھری کو خوب تیز کر رکھا تھا اور رات کی تاریکی میں گھر سے نکل کر چمڑا منڈی کی طرف چل پڑا۔ دیوار پھلانگتے میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ منی باجی کے پاس شیطانی طاقت میں دیکھ چکا تھا اور جس مقصد کو لے کر میں مُردار کھاتہ آیا تھا اگر اسے ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو میری موت یقینی تھی مگر میں بڑی احتیاط سے چلتا ہوا ڈنگروں کی ہڈیوں کے ڈھیر کے پیچھے دبک گیا۔

میری نظریں اس راستے پر تھیں جدھر سے منی باجی اس روز مُردار کھاتہ کی طرف سے اس جگہ آئی تھی، جہاں بیٹھ کر وہ شیطانی چلہ کشی کرتی تھی۔

وہ رات کا پچھلا پہر ہو گا بدبو اور مچھروں نے میرا بُرا حال کر رکھا تھا۔ رہائشی حصہ کی طرف سے سیاہ چادر میں لپٹا انسانی وجود مُردار کھاتہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چاند کی روشنی گو کہ بڑی کم تھی مگر منی باجی کو میں پہچان گیا۔ وہ سیدھی اس چبوترے کی طرف بڑھ رہی تھی اس کا اور میرا فاصلہ برائے نام ہی تھا۔ میں نے اپنا سانس روک لیا اُس نے چادر کے اندر چھپایا بچہ نکالا جو حرکت کر رہا تھا مگر اس کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ سب کچھ اپنی نظروں کے سامنے دیکھ کر میرا خون کھول اُٹھا اور میرے ہاتھ اپنے ساتھ لائی چھری پر مضبوط ہو گئے۔

اس نے موم بتیاں روشن کیں اور کپڑے میں لپٹا بچہ نکال کر اس دائرہ کے اندر رکھا۔ بچہ شائد بھوکا پیاسا تھا جو صرف برائے نام ہی حرکت کر رہا تھا۔ پھر وہ کچھ پڑھنے لگی اور چھری جو اس کے ہاتھ میں تھی اس نے بلند کی اور بچے کے جسم میں اُتارنے ہی والی تھی کہ میں برق رفتاری سے ہڈیوں کے ڈھیر کی اوٹ سے نکلا اور منی باجی کی طرف جھپٹا اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی میرا چھری والا ہاتھ اس کے جسم میں پیوست ہو گیا۔ دوسرا وار اس کے دل والے حصہ پر کیا اور وہ تڑپ تڑپ کر میرے سامنے ٹھنڈی ہو گئی۔

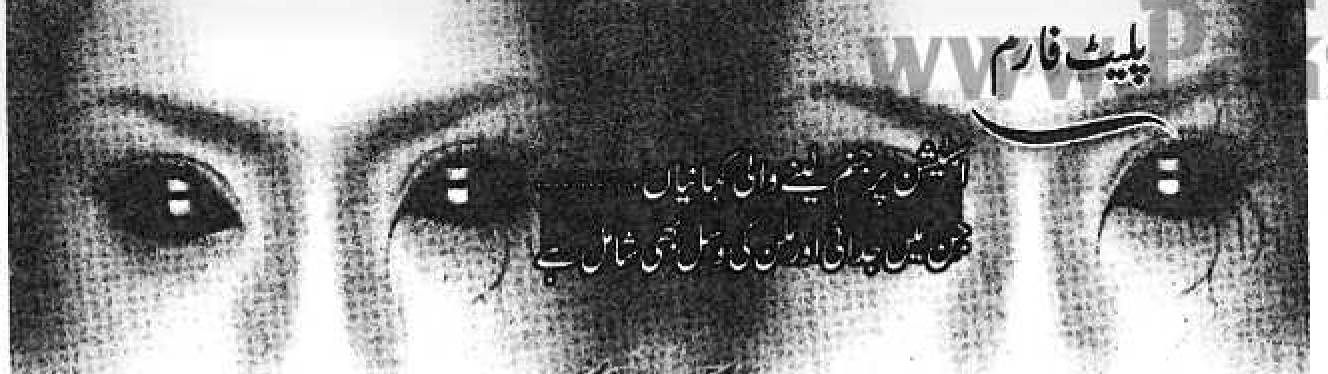
میں بچے کی طرف متوجہ ہوا جس کے منہ پر سختی سے ٹیپ چسپاں تھیں جس کو میں نے ہٹایا تو اس کے منہ سے نحیف سی کراہ اُبھری میں نے اسے جلدی سے اُٹھایا اور تقریباً بھاگتا ہوا رہائشی حصہ کی طرف آ گیا اور زور زور سے گیٹ پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد گیٹ پر حاجی صاحب اور دوسرے لوگ آ گئے۔ میں نے منی باجی کو قتل کرنے اور بچے کو بچانے کے بارے میں بتایا۔ حاجی صاحب نے بچہ میرے ہاتھ سے لے کر اندر کسی خاتون کے سپرد کیا اور ایمرجنسی لائٹیں لیے وہ لوگ منی باجی کی لاش کی طرف بڑھ گئے۔"

☆☆......☆☆

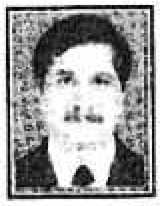
بس یہ سب کہنے کے بعد صدو بابا پُرسکون ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے کا سکون اُس کے مطمئن ضمیر کا پتا دے رہا تھا۔ میں نے زیادہ کریہ مناسب نہ سمجھی اور خاموشی سے وہاں سے چلا آیا۔

اس قدر جان لیوا اور سفاک سچائی نے میرے اندر بھی خوف کی ایک لہر سی جگا دی تھی۔ میں اپنے خوف پر قابو پاتا واپسی کا سفر پر گامزن تھا۔ نئی کہانی، نئی سچائی کو بے باک کرنے کے لیے میں نی اپنے قدم تیز کر دیے تھے۔

☆☆......☆☆



حسد کی آگ

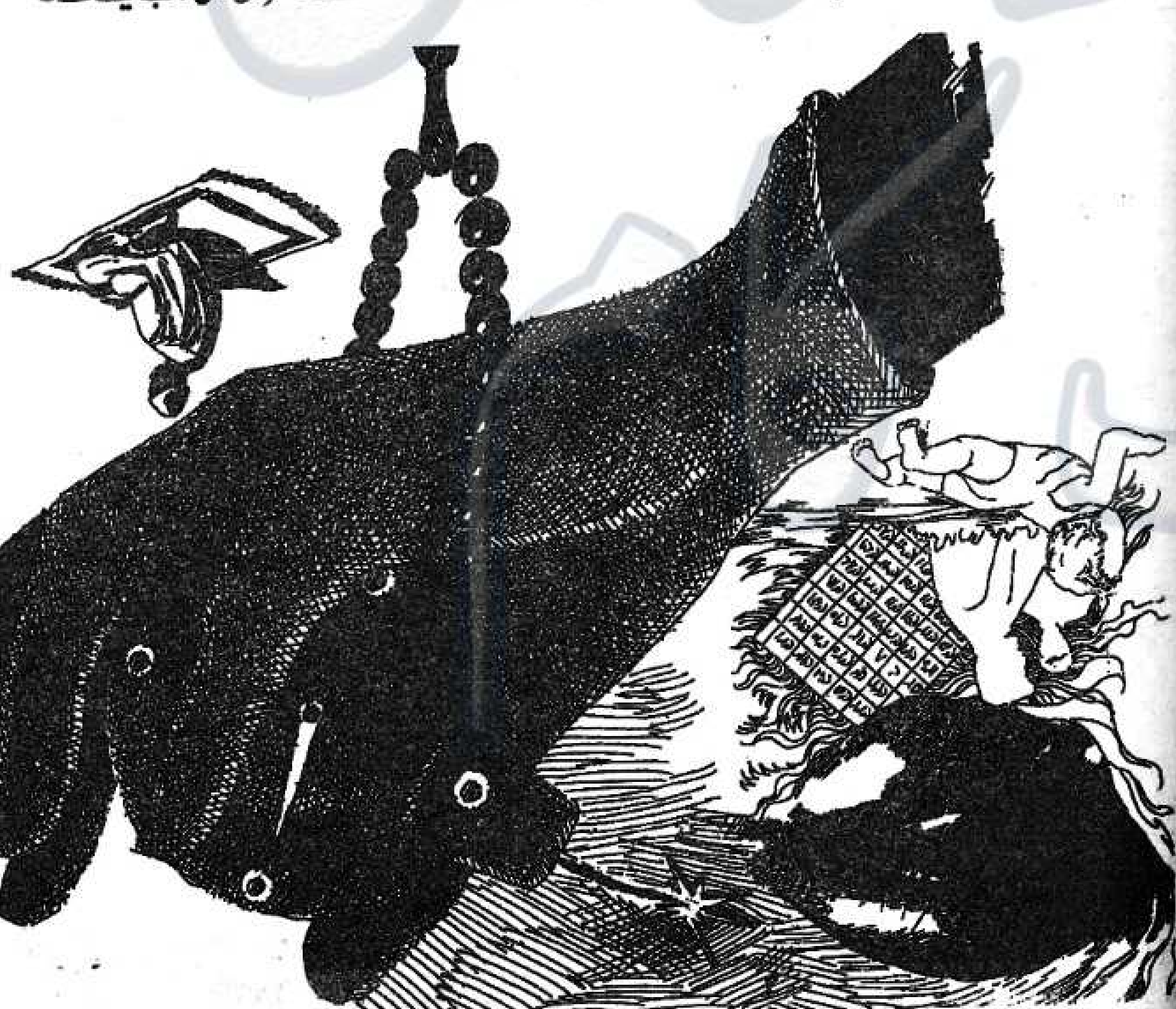


ممتاز احمد

ٹرین سے ٹانگیں کٹ جانے والا وہ شخص آج بھی لوگوں کو پلیٹ فارم پر بیٹھا دکھائی دیتا ہے

ایک بہت منفرد پراسرار داستانِ عبرت

آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی۔ ہُو کا عالم، سردی کا موسم تھا لوگ اپنے اپنے گھروں میں گرم لحافوں میں خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور چاند ان بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ ٹھیک دو بجے بجلی بند ہو گئی اور ہر طرف مکمل اندھیرے کا راج ہو گیا۔ ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم سنسان پڑا تھا۔ کیونکہ صبح تک کوئی ٹرین نہیں آئی تھی۔ ریلوے کے عملے کے لوگ کمروں میں دبکے بیٹھے تھے۔



رات کی اِس تاریکی میں ایک سایا جس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے بغیر آواز پیدا کیے دائیں بائیں دیکھتا اور جنوب کی طرف چلتا جارہا تھا۔ اب وہ پلیٹ فارم سے نیچے اُتر آیا اور ریلوے لائن کے درمیان چل رہا تھا۔ اُس کا رخ قریبی قبرستان کی طرف تھا۔ چند قدموں کی مسافت کے بعد قبرستان آگیا تو وہ خاموشی سے قبرستان کی چھوٹی سی چار دیواری پھلانگ کر اندر داخل ہوا اور چند لمحے کھڑے رہنے کے بعد سمت کا تعین کرکے لمبے لمبے ڈگ برتا۔ قبریں پھلانگتا ہوا ایک جگہ پر رُک گیا۔ اُس کی آنکھوں میں چمک آ گئی، اُس نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا اور نیچے بیٹھ گیا۔

☆☆☆

عظیم اور کلیم دونوں سگے بھائی تھے۔ عظیم عمر میں بڑا تھا اور کلیم اُس سے تین سال چھوٹا تھا۔ عظیم اور کلیم کے والد سلیم ایک آڑھتی کے پاس منشی کا کام کرتے تھے وہ صبح سے رات گئی تک اپنے کام میں مشغول رہتے۔ جس مکان میں اُن کی رہائش تھی وہ اُسی آڑھتی کا تین مرلے کا پُرانا مکان تھا۔ جس کے پاس وہ منشی تھے۔

مکان میں دو کمرے جن کے آگے برآمدہ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ اور تھوڑا آگے غسل خانہ تھا۔ جس کے سامنے صحن تھا۔ آڑھتی پانچ سو روپے مکان کا کرایہ سلیم صاحب کی تنخواہ میں سے کاٹ لیتا تھا۔ گھر میں کل چار افراد تھے، سستا زمانہ تھا تو اِن لوگوں کی گذر بسر آسانی سے ہورہی تھی۔ عظیم کو پڑھائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بار بار فیل ہونے کی وجہ سے ابھی تک مڈل میں تھا۔ کلیم تین سال چھوٹا ہونے کے باوجود آٹھویں کلاس میں پہنچ گیا۔ عظیم جب مڈل کا امتحان پاس نہ کرسکا تو اُس نے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا اور گاڑیوں کا کام سیکھنے کے لیے ایک ورکشاپ میں میکینک کی شاگردی اختیار کرلی۔ جبکہ کلیم کو پڑھنے کا بہت شوق تھا تو وہ محنت اور لگن سے تمام تعلیمی مراحل کامیابی سے طے کرتا ہوا یونیورسٹی پہنچ گیا۔

عظیم بنیادی طور پر ذہین تھا مگر اُس کی توجہ ہرگز پڑھائی کی طرف نہ تھی۔ ورکشاپ میں اُس کو استاد بہت اچھا ملا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ چھ سال کے عرصہ میں سارا کام سیکھ گیا اور گاڑیوں کا بہترین میکینک اور کاریگر بن گیا۔

عظیم نے جب پڑھائی اور اسکول چھوڑا تو اُس کے والد سلیم صاحب پہلے پہل بہت برہم ہوئے مگر اُس کے بار بار فیل ہونے کا نتیجہ اور تعلیم سے عدم دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اس لیے خاموش ہوگئے کہ ایک تو عظیم نے بُری صحبت اختیار کرنے کی بجائے ورکشاپ میں کام سیکھنا شروع کردیا تھا۔ دوسرا یہ کہ عظیم کا استاد اُسے روزانہ دس روپے دیتا جو وہ لا کر اپنی ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتا تو اِس لیے انھوں نے زیادہ اعتراض اور باز پرس نہ کی۔ عظیم جوں جوں کاریگر بنتا گیا اُس کے معاوضے میں اضافہ ہوگیا گیا اور اُسے ماہوار چھ سو روپے تنخواہ ملنے لگی۔ کلیم رات گئے تک پڑھتا رہتا اور محنت کے بل بوتے پر ہر امتحان میں پہلی پوزیشن لیتا، دونوں بھائیوں میں پیار تھا تو زندگی سکون سے گزر رہی تھی۔

ایم اے کرنے کے بعد کلیم نے ملازمت کے حصول کے لیے مختلف محکموں میں اپلائی کرنا شروع کردیا اور جلد ہی شاندار تعلیمی ریکارڈ کے بل بوتے پر اُسے اپنی ہی شہر میں بہت اچھی پوسٹ پر سرکاری ملازمت مل گئی۔ کلیم نے اپنے ربّ کا شکر ادا کیا۔

پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کلیم نے ڈیوٹی جوائن کرلی اور جب اُس نے اپنی پہلی تنخواہ پندرہ سو روپے لاکر اپنی ماں کے ہاتھ میں رکھی تو اُنھوں نے پیار سے اُس کا ماتھا چوم لیا۔ ڈھیر ساری دعائیں دیں اور پورے محلے میں مٹھائی تقسیم کی۔

اب دونوں بیٹے کماؤ پوت ہوگئے تھے۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو دونوں اپنی اپنی تنخواہ لاکر ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتے، ماں بہت خوش ہوتی کہ دونوں بیٹے بہت فرماں بردار ہیں۔ اب ماں کی یہ خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد اپنے دونوں بیٹوں کی شادیاں کردے۔ چنانچہ اُس نے اپنے شوہر سلیم سے صلاح مشورہ کیا اور بہوئیں ڈھونڈنے لگ گئی۔

جلد ہی اُس کی مراد بر آئی اور بہوؤں کا انتخاب کرلیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ گھر بہت چھوٹا تھا، صرف دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے، ظاہر ہے دونوں بہوئیں جہیز بھی لے کر آئیں۔ مگر جگہ بہت تنگ تھی چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ گھر تبدیل کرلیا جائے۔

تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد ایک مناسب گھر جو چار کمروں پر مشتمل تھا وہ مل گیا۔ مکان کا کرایہ بارہ سو روپے تھا۔ اور جلد ہی وہ نئے گھر میں شفٹ ہوگئے۔ شادیوں کی تاریخیں مقرر کردی گئیں۔

اور پھر وہ دن آگیا۔ آج عظیم اور کلیم کی ماں کا اپنے بیٹوں کے سر پر سہرا سجانے کا ارمان پورا ہورہا تھا۔ پہلے دن عظیم کی بارات گئی۔ دوسرے دن کلیم کی اور تیسرے دن دونوں کا مشترکہ ولیمہ کیا گیا۔

نسرین عظیم کی دلہن تھی اور صبیحہ کلیم کی دلہن تھی۔ نسرین اور صبیحہ کے مزاجوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ نسرین بہت تیز طرار اور انتہائی چالاک اور ہوشیار تھی۔ وہ جھوٹ اس خوبصورتی سے بولتی کہ سننے والے کو سچ لگتا۔ نسرین صرف آٹھ جماعتیں پاس تھی جبکہ صبیحہ نے بی اے کیا ہوا تھا۔ وہ ایک سلجھی ہوئی طبیعت کی سادہ اور اچھے مزاج کی لڑکی تھی۔ چوں کہ کلیم ایم اے پاس سرکاری افسر تھا تو اُسے بیوی بھی پڑھی لکھی ملی جبکہ عظیم آٹھویں فیل تھا تو اُسے بیوی بھی آٹھ جماعتیں پاس ملی۔

شادی کے پہلے دو مہینے تو کچھ آرام اور سکون سے گزرنے پر دیورانی، جیٹھانی کی روایتی چپقلش آہستہ آہستہ شروع ہوگئی۔ چپقلش کی بنیادی وجہ تو کوئی خاص نہیں تھی۔ اصل میں نسرین کینہ، بغض اور حسد کی ماری ہوئی تھی۔ کلیم سرکاری افسر تھا تو اُسے محکمہ کی طرف سے بلاسود قرضہ ملا جس سے اُس نے نئی زیرو میٹر موٹر سائیکل خرید لی۔ وہ صبح آٹھ بجے آفس کے لیے نکل جاتا اور اُسے تین بجے چھٹی ہوجاتی تو وہ ساڑھے تین بجے تک گھر پہنچ جاتا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کرتا اور پھر دونوں میاں بیوی موٹر سائیکل پر کہیں گھومنے پھرنے کے لیے نکل جاتے مگر نسرین کے دل پر یہ بات بہت گراں گزرتی کیونکہ عظیم صبح سویرے کام پر نکلتا اور رات گئے ورکشاپ سے واپس لوٹتا۔ اُس کے کپڑوں پر گریس، موبائل آئل اور کالک لگی ہوتی۔ وہ آکر منہ ہاتھ دھوکر کپڑے بدلتا اور کام کی وجہ سے تھکا ہوتا تھا تو جلد سو جاتا۔ وہ بہت کم نسرین کو کہیں لے کر جاتا تھا۔

نسرین کو اُس کے میلے کپڑے جن سے گریس، تیل کی بدبو آتی تھی دھونے ناگوار گزرتے۔

چونکہ صبیحہ بہت نرم مزاج تھی اور گھر میں آئے ہوئے مہمانوں کو بہت عزت دیتی تھی تو اب ہر آنے والا مہمان صبیحہ کے کمرے میں بیٹھتا۔ اب یہ بات بھی نسرین کو گوارا نہیں تھی۔ جس محکمے میں کلیم نوکری کررہا تھا وہ براہِ راست پبلک ڈیلنگ والا محکمہ تھا۔ کلیم بہت ایماندار اور دیانتدار تھا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ خوش اخلاقی سے بولتا خندق پیشانی سے پیش آتا۔ بغیر رشوت لیے ہر ایک کا کام فوراً کردیتا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ اُس کے گرویدہ ہوگئے اور دن بدن اُس کا حلقہ احباب بڑھنے لگا۔ لوگ ملنے کے لیے گھر آتے تو کوئی پھل، کوئی مٹھائی کوئی کیک وغیرہ لے کر آتا تو ظاہری بات ہے کہ مہمان نوازی بھی کی جاتی۔ اس طرح کئی بار دودھ وغیرہ ختم ہوجاتا۔ عظیم کو ملنے کوئی بھی نہیں آتا تھا جو بھی آتا وہ کلیم سے ملنے آتا اب اِس بات سے نسرین جل بھن جاتی۔ عظیم کو روزانہ رات ایک گلاس دودھ پی کر سونے کی عادت تھی۔ اب نسرین جان بوجھ کر دودھ کو نالی میں بہادیتی اور عظیم کے آتے ہی شکایتوں کے دفتر کھول کر بیٹھ جاتی اور عظیم سے شکوہ کرتی کہ سارا دن کلیم کے مہمان آتے رہتے ہیں اور نسرین ان کی خاطر داری کرتی رہتی ہے۔ صبیحہ کچھ نہیں کرتی اور مہمانوں کو آؤ بھگت میں دودھ ختم ہوجاتا ہے بلکہ چینی پتی تک مہمانوں کی نظر ہوجاتی ہے۔ تو اس طرح کی باتوں سے نسرین نے نفرت کے بیج بونا شروع کردیے۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ مہمانوں کے لیے چائے پانی اور دیگر لوازمات صبیحہ تیار کرتی۔ عظیم کے لیے دودھ پہلے ہی الگ برتن میں ڈال کر فریج میں رکھ دیتی مگر نسرین وہ دودھ جان بوجھ کر ضائع کردیتی۔ تو اس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنیاد بنا کر لڑائی جھگڑے شروع ہوگئے۔

شادی کے دس ماہ بعد صبیحہ نے ایک خوب صورت بیٹے کو جنم دیا جبکہ نسرین کے ماں بننے کے دور دور تک کوئی آثار نہ تھے۔ اب جلن اور حسد کی وجہ سے نسرین کو صبیحہ کا بیٹا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

اب تو لڑائی جھگڑے روز کا معمول بن گئے تھے۔ عظیم اور کلیم کی والدہ بے چاری پس کے رہ گئی تھی۔ وہ بے چاری بہوؤں کی روز صلح کرواتی مگر اگلے روز پھر نئی لڑائی۔

☆☆☆

ایک دن عظیم اور کلیم کے والد اپنے کام سے واپس گھر آرہے تھے کہ ایک گاڑی کی ٹکر لگنے سے شدید زخمی ہوگئے اور ایک گھنٹے کے بعد زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جاں بحق ہوگئے۔

سلیم صاحب کی تنخواہ دو ہزار روپے تھی، ایک ہزار روپے عظیم کی اور کلیم کی تنخواہ پندرہ سو روپے بھی تھی اس وجہ سے گزر بسر اچھے طریقے سے ہورہی تھی مگر اُن کی موت کے بعد آمدنی گھٹ گئی تھی۔ اب صرف عظیم اور کلیم کی تنخواہیں تھیں۔ بارہ سو روپے مکان کا کرایہ نکل جاتا پھر بجلی، گیس، دودھ والے کا بل اور دیگر اخراجات تو گھر میں مالی تنگی آگئی جس کی وجہ سے بک بک، چخ چخ میں اضافہ ہوگیا۔

اگلے سال صبیحہ نے ایک اور بیٹے کو جنم دیا تو نسرین کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔

اب اس نے خاندان بھر میں مشہور کردیا کہ صبیحہ نے اس پر جادو کروایا ہوا ہے کہ نسرین کے ہاں اولاد نہ ہو، عظیم جیسے ہی تھکا ہارا کام سے آتا تو نسرین رونا شروع کردیتی اور صبیحہ کی جھوٹی شکایتیں لگاتی کہ اُس نے یہ کیا وہ کیا پہلے پہل تو عظیم نے نسرین کی باتوں پر کوئی خاص توجہ نہ دی مگر آہستہ آہستہ وہ سننے لگا مگر ماں سے یا کلیم سے کچھ نہ بولتا۔

ایک دن نسرین کی امی آئی اور نسرین کو اپنے ساتھ لے گئی۔ شادی کو تین سال ہوچکے تھے۔ مگر نسرین کی کوکھ ابھی تک ہری نہیں ہوئی تھی۔ نسرین کی ماں اُسے ایک عامل کے پاس لے گئی اور اُسے بتایا کہ اس کے ہاں اولاد بھی نہیں ہورہی۔ دوسرا اس کا خاوند بھی اس پر توجہ نہیں دیتا۔ چنانچہ اُس عامل نے چینی پر کوئی عمل کرکے دیا اور کہا کہ یہ چینی سات دن لگاتار چائے یا دودھ میں ڈال کر عظیم کو پلانی ہے۔ پھر ایک نقش ونگار والا کاغذ دیا کہ اسے اپنے سر میں کسی ہیئر پن کے ساتھ لگائے رکھنا ہے۔ اس سے تمہارا خاوند تمہارا طابع اور فرماں بردار ہوجائے گا۔ باقی اولاد کے لیے لمبا علاج ہے تو دس بارہ دن کے بعد آنا۔"

نسرین کچھ دن میکے میں رہ کر واپس سسرال آگئی اور اُس نے آتے ہی عامل کی ہدایت کے مطابق عمل کی ہوئی چینی عظیم کو پلانی شروع کردی اور وہ کاغذ سر کی پن کے ساتھ لگالیا۔ اب حیرت انگیز طور پر عظیم میں تبدیلی آنی شروع ہوگئی۔ وہ مکمل طور پر جورو کا غلام بن گیا اور نسرین کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کردیا۔ نسرین اپنی ساس اور صبیحہ کی جھوٹی شکایتیں لگاتی جسے سن کر عظیم طیش میں آجاتا، پھر خوب گالم گلوچ کرتا اور ماں کی بے عزتی بھی کردیتا۔ صبیحہ کو ماں بہن کی گالیاں دیتا اور کلیم کا گریبان بھی پکڑلیتا۔ اگر ماں بیچ بچاؤ کرانے درمیان میں آجاتی تو وہ ماں کو بھی دھکا ماردیتا اور اُن کو بھی گالیاں دینے لگ جاتا۔

اب تو عظیم کو نسرین کے سوا کچھ نظر نہ آتا وہ اُس کی ہر بات کو سچ سمجھتا۔ اپنی ماں، بھائی اور بھابی کو ظالم اور نسرین کو مظلوم سمجھتا۔ دو ہفتے کے بعد نسرین اپنے میکے گئی اور ماں کے ساتھ اُسی عامل کے پاس گئی۔ نسرین کا پہلا کام تو ہوچکا تھا۔ اس کا اعتقاد عامل پر ہوگیا۔ عامل نے نسرین کو بتایا کہ صبیحہ نے اُس پر جادو کروایا ہے جس کی وجہ سے اُس کے وہاں اولاد نہیں ہورہی ہے۔ تو سب سے پہلے اُس جادو کا توڑ کرنا ہوگا۔ پھر ایک لمبا عمل ہے۔ جس کے لیے نسرین کو ہر تیسرے دن اکیلے اُس کے پاس آنا ہوگا۔ تو بہت جلد وہ بھی ماں بن جائے گی۔ جادو کا توڑ کرنے کے لیے اُس نے کافی رقم نسرین سے بٹورلی جو کہ وہ عظیم کی جیب سے چوری نکال لیا کرتی تھی۔ کچھ پیسے وہ اپنی ساس کے بٹوے سے بھی اُڑالیتی۔ عامل نے نسرین سے کہا کہ وہ ایسا عمل بھی کرے گا جس کے نتیجے میں صبیحہ کے دونوں بیٹے بھی مرجائیں گے اور وہ بھی شدید بیماری میں مبتلا ہوجائے گی۔" اور یہ سب کچھ بھی نسرین دل سے چاہتی تھی مگر یہ بات زبان پر نہیں لاسکتی تھی۔ جو کہ عامل نے خود ہی کہہ دی۔ نسرین نے خوش ہوکر عامل کے گندے پاؤں پر سر رکھ کر چوما اور شکریہ ادا کرکے چلی آئی۔

☆☆☆

چند دن گزرے تو صبیحہ کے دونوں بیٹے بیمار ہوگئے۔ صبیحہ بھی بیمار ہوگئی۔ تو نسرین خوشی سے نہال ہوگئی اور روزانہ چشم تصور میں صبیحہ کے بیٹوں کو مرتا دیکھتی۔ اب

تو نسرین کا اندھا اعتقاد ہوگیا۔ عامل پر وہ اُسے بہت پہنچا ہوا سمجھنے لگی جب کہ حقیقت یہ تھی کہ وہ عامل غیر مسلم تھا اور جادوگر تھا۔ کلیم اور صبیحہ پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے ادا کرتے تھے۔ صبیحہ قرآن پاک کی تلاوت بھی کرتی اور یہ نماز، تلاوت اور اللہ کے ذکر کی برکت تھی کہ اُس جادوگر عامل کے جادو کا اثر اُن پر اتنی شدت سے نہیں ہورہا تھا۔ جتنا سخت عمل اور جادو اُس نے کیا تھا۔ صبیحہ چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھ کر اپنے، اپنے بچوں اور کلیم پر دم کرتی رہتی تھی۔ ایک دن نسرین اکیلی اُسی عامل کے پاس گئی۔ نسرین بہت خوب صورت تھی اور آج عامل کی ہدایت کے مطابق تنہا آئی تھی۔ عامل نے فوراً اُسے اپنے کمرہ خاص میں بُلایا۔ آج عامل کسی اور نیت اور نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا اُس کی آنکھوں اور مَن میں شیطانیت تھی۔ اُس نے نسرین کو بہت سبز باغ دکھائے کہ وہ ایسا عمل کرے گا جس کے نتیجے میں وہ ماں بن جائے گی۔ اُس کی دیورانی اور اس کے دونوں بچے بھی مرجائیں گے اور ایک سال کے اندر اندر نسرین بہت امیر ہوجائے گی دولت میں کھیلے گی۔ کار ہوگی، کوٹھی ہوگی۔ یہ سب کچھ نسرین کا خواب تھا اور عامل اسے بہت جلد یہ سب کچھ دینے کی خوش خبری سنا رہا تھا۔ نسرین اُس کے پیروں میں بچھ بچھ جارہی تھی۔ نسرین نے پوچھا کہ یہ سب کچھ پانے کے لیے اُسے کیا کرنا ہوگا؟"

تو عامل نے عیاری اور مکاری سے کہا کہ تمہیں کچھ نہیں کرنا ہوگا جو کچھ بھی کرنا ہے وہ خود کرے گا۔ بس وہ تھوڑی سی رقم کا بندوبست کرے اور...... اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا تو نسرین نے پوچھا کہ اور کیا کرنا ہوگا تو عامل نے اُسے اپنے قریب کرکے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا کہ ایک دن چھوڑ اُسے اکیلا اسی ٹائم آنا ہوگا۔ نسرین کی آنکھوں پر حسد، بغض اور لالچ طمع کی پٹی تو بند چکی تھی اور وہ اندھی ہوچکی تھی تو وہ کٹھ پتلی کی طرح عامل کے اشاروں پر ناچنے لگی۔ آج اُس نے اپنی سب سے قیمتی متاع اپنی عزت جو کہ اُس کے شوہر کی امانت تھی وہ لٹادی اور وہ بھی ایک غیر مسلم چمار کے ہاتھ۔

نسرین اپنی دیورانی کے حسد اور بغض میں ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں گرگئی۔ پورا ایک مہینہ وہ عامل کے ہاں مختلف حیلوں بہانوں سے جاتی رہی اور وہ بھیڑیا اُس کو نوچتا رہا۔ عیار عامل نسرین سے اُس کے جسم کے ساتھ ساتھ آدھا زیور بھی ہڑپ کرچکا تھا۔

☆☆☆

جب عظیم کو علم ہوا کہ نسرین کہیں جاتی ہے تو اُس کا پوچھنے پر نسرین نے اُسے بتایا کہ بہت پہنچے ہوئے عامل بابا کے پاس جاتی ہوں۔ جس کے علاج سے وہ باپ بھی بن جائے گا اور دولت مند بھی۔ کار، کوٹھی کا مالک ہوگا اُس کے سب دکھ درد دور ہوجائیں گے۔ اگلی صبح نسرین کو متلی قے شروع ہوگئی تو شام تک لیڈی ڈاکٹر نے نسرین کو ماں بننے کی خوش خبری سنادی۔

اب تو نسرین کے ساتھ ساتھ عظیم بھی عامل بابا کا قائل ہوگیا۔ اُس عقل کے اندھے پر پہلے ہی عمل کا اثر ہوچکا تھا۔ اب دولت مند بننے کے چکر اور لالچ میں اُس کی آنکھوں پر پٹی بندھ گئی۔ عظیم اب نسرین کا بہت خیال رکھتا۔ صبیحہ اور اس کی ساس بھی نسرین کا خیال رکھتے۔ اُسے کوئی کام نہ کرنے دیا جاتا۔ گھر کا سارا کام اپنی بوڑھی ساس کے ساتھ مل کر کرتی۔ صبیحہ اور اُس کے دونوں بیٹے بیمار رہنے لگے۔ صبیحہ کو جوانی میں جوڑوں کا درد، سر چکرانا اور پیٹ میں شدید مروڑ اُٹھنا جیسے امراض لگ گئے۔ کئی بار تو صبیحہ کا سانس ایک دم رک جاتا اُسے بہت گھٹن اور گھبراہٹ ہوتی اور وہ تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش ہوکر گرجاتی۔ اسی طرح اُس کے دونوں بیٹے بھی دن بدن کمزور اور لاغر ہوتے گئے۔

کلیم ماہر ڈاکٹروں سے اپنے بیوی بچوں کا علاج کروا رہا تھا۔ کئی کئی ٹیسٹ ہوتے اور تمام رپورٹس کلیئر ہوتیں۔ مہنگا علاج ہورہا تھا۔ صبیحہ خود بھی باقاعدگی سے مہنگی دوا خود بھی کھاتی اور اپنے بیٹوں کو بھی کھلاتی۔ مگر مرض بڑھتا گیا۔ جوں جوں دوا کی...... بالکل آرام نہیں آرہا تھا۔ کلیم کی تنخواہ ساری کی ساری علاج پر خرچ ہورہی تھی۔ اب تو الٹا کافی سارا قرض بھی چڑھ گیا تھا۔ کلیم بہت پریشان رہنے لگا تو ایک دن اُس کولیگ نے اُس کی پریشانی کی وجہ پوچھی تو کلیم نے سارا ماجرا بیان کردیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد کلیم کے کولیگ نے صلاح دی کہ جسمانی دوا کے علاج کے ساتھ ساتھ روحانی علاج بھی

کراؤ تو اُس نے بتایا کہ میرے ایک جاننے والے شاہ صاحب ہیں جو کہ بہت نیک، متقی اور پرہیزگار ہیں۔ اُن کے پاس چلتے ہیں اُن سے دعا کرواتے ہیں۔ چنانچہ اُسی شام کلیم اپنے کولیگ کے ہمراہ اُن شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔

شاہ صاحب امام مسجد تھے۔ اُن کا بیشتر وقت عبادتِ الٰہی میں گزرتا۔ مسجد سے ملحقہ حجرے میں اُن کی رہائش تھی بہت سارے لوگ اُن کے پاس اپنے مسائل لے کر آتے اور اُن سے دعا کرواتے۔ شاہ صاحب رات گئے تک خدمت خلق میں مصروف رہتے۔ ہر ایک کی بات توجہ سے سنتے اور فی سبیل اللہ سب کی مدد کرتے۔ کبھی پوری زندگی کسی سے ایک روپیہ تک نہیں لیا۔ کلیم کے کولیگ نے کلیم کا تعارف اُن سے کرایا۔ سلام دعا اور تعارف کے بعد کلیم نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور ساری بات بتائی تو شاہ صاحب نے کچھ دیر مراقبہ کیا اور کہنے لگے۔

"اللہ مہربانی فرمائے گا۔ آپ کے بیوی بچوں کو کوئی جسمانی بیماری نہیں ہے۔ کافی بُرے اثرات ہیں مگر انشاء اللہ جلد ہی شفایابی ہوگی۔"

انھوں نے کلیم اور اُس کی بیوی بچوں کے لیے دعا کی اور تین تعویذ لکھ کر دیے اور ساتھ ہی پانی دم کرکے دیا کہ ایک ایک تعویذ چمڑے میں پیک کروا کر تینوں کے گلے میں ڈال دو اور یہ پانی بیوی بچوں کو پلاؤ، نماز پنجگانہ کی پابندی رکھیں اور حسبِ استطاعت صدقہ خیرات بھی کریں۔ چنانچہ اس عمل سے چند ہی دنوں میں صبیحہ اور اُس کے دونوں بیٹے صحت یاب ہوگئے تو کلیم نے سُکھ کا سانس لیا۔

☆☆☆

نسرین کو جب پتا چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو خوشی سے اُس کو پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ وہ پورے دو مہینے اپنی خوشی میں مگن رہی جب اُس نے صبیحہ اور اُس کے دونوں بیٹوں کو دیکھا کہ یہ تینوں بھلے چنگے ہوگئے ہیں تو اس کا ماتھا ٹھنکا اور وہ اگلے ہی روز بہانہ بنا کر اُسی جادوگر عامل کے پاس پہنچی اور اُسے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے مگر صبیحہ اور اس کے دونوں بیٹے تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوگئے ہیں۔ آپ تو کہتے تھے کہ وہ جلد ہی مرجائیں گے مگر اُن کو تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔"

جس پر عامل نے ایک کاغذ پر آڑی ترچھی لائنیں لگا کر حساب لگایا اور نسرین کو بتایا کہ اُس کے عمل کا توڑ کروایا گیا ہے۔ مگر اب وہ بہت سخت عمل کرے گا جس کے نتیجے میں وہ تینوں خون تھوکتے جلد ہی مرجائیں گے۔

عمل کے لیے پہلے اُس نے نسرین کے جسم کی رشوت وصول کی پھر نسرین سے کہا کہ صبیحہ اور اُس کے دونوں بیٹوں کے استعمال شدہ کپڑے اور صبیحہ کے کچھ بال لے کر آؤ، ساتھ ہی ایک ہزار روپے بھی لے کر آنا۔" نسرین نے کچھ دن بعد آنے کا وعدہ کیا اور گھر چلی آئی۔

اب وہ موقع کی تاک میں رہنے لگی کہ کس طرح ان تینوں کے استعمال شدہ کپڑے لے۔ صبیحہ جس ہیئر برش سے بالوں میں کنگھی کرتی تھی تو اُس میں کچھ بال رہ جاتے تھے۔ تو نسرین نے کچھ دنوں میں وہ تھوڑے تھوڑے بال ہیئر برش سے نکال کر اپنے پاس محفوظ کرلیے اور کسی نہ کسی طریقے سے تینوں کے استعمال شدہ کپڑے بھی حاصل کرلیے۔ اب مسئلہ تھا ایک ہزار روپے کا جو کہ فی الوقت اُس کے پاس نہیں تھے۔

اُس نے ایک دن آنکھ بچا کر صبیحہ کی ایک انگوٹھی جو کہ وہ اپنے ڈریسنگ ٹیبل پر اُتار کر بھول گئی تھی۔ وہ چوری کرلی اور اگلے ہی دن اُسے بیچ کر ایک ہزار روپے بھی حاصل کرلیے۔ اور اُسی دن مطلوبہ اشیاء کے ساتھ جادوگر عامل کے پاس پہنچ گئی۔ عامل نے اُلو کے خون سے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کچھ لکھا پھر بالوں اور کپڑوں پر گندا عمل کیا اور اُس کاغذ کے ٹکڑے میں صبیحہ کے سر کے بال لپیٹ دیے اور ہدایت کی کہ اسے مٹی میں دبا دو اور یہ کپڑے واپس لے جاؤ۔ جیسے ہی وہ یہ کپڑے پہنیں گے تو بہت جلد تینوں خون تھوکتے ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر مرجائیں گے۔ عامل نے ایک ہزار روپے بمعہ نسرین کے جسم کے ساتھ وصول کیے اور نسرین نے فوراً عامل کی ہدایات پر عمل کردیا۔

☆☆☆

اگلی رات صبیحہ سوتے میں ایک دم چیخیں مارتے ہوئے بیدار ہوگئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ کلیم اور اس کے گھر والے گھبرا کر اُٹھ گئے۔ صبیحہ بہت سخت ڈر گئی تھی

اور کہنے لگی کہ کمرے میں ابھی کوئی تھا جو کہ اُس کا گلا دبا رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں لال سرخ تھیں۔" اُسے سانس لینے میں بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

کلیم اور اُس کی ماں نے تسلی دی کہ کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ یقیناً اُس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ جیسے تیسے رات گزری تو اگلے دن صبیحہ کے کمرے میں خون کے چھینٹے گرنے لگے۔ کبھی کبھی گندے انڈے بھی گرتے۔ جس سے اُس کے کمرے میں سخت بدبو اور تعفن اٹھتا۔ اُس کے دونوں بچے بھی خوف زدہ ہوکر رونے لگے۔ صبیحہ کو ہر وقت اپنے اردگرد سائے نظر آتے۔ عجیب وغریب مخلوق نظر آتی۔ اچانک کسی نہ کسی چیز کو آگ لگ جاتی۔ پانی پینے کے لیے شیشے کا گلاس جیسے ہی اپنے ہونٹوں سے لگاتی ایک دم خود بخود گلاس ٹوٹ جاتا اور پانی اُس کے کپڑوں پر گر جاتا۔ اُس پر شدید کھانسی کا دورہ پڑتا اور کھانسی کے ساتھ خون نکلنے لگتا۔ کلیم اس تمام صورت حال سے بہت پریشان ہوا۔ فوراً شاہ صاحب سے ملنے گیا تو پتا چلا کہ وہ عمرے کی ادائیگی کے لیے حجاز مقدس گئے ہیں اور ایک ہفتے کے بعد آئیں گے۔ اُس کی پریشانی بڑھ گئی۔ پھر اُس نے کسی طرح شاہ صاحب سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا اور اپنی بپتا سنائی تو انھوں نے ہدایت کی کہ فوراً صبیحہ اور بچوں کو اُس کے میکے میں چھوڑ دو۔ سختی سے ہدایت کی کہ اگر وہ تعویذ اتار دیے ہیں تو فوراً تینوں کو پہنا دو اور ایک وظیفہ پڑھنے کو بتایا۔ تسلی دی کہ وہ ایک ہفتے کے بعد آکر اس مصیبت سے چھٹکارا دلا دیں گے۔ حوصلہ رکھیں کچھ نہیں ہوگا۔"

تو کلیم کی جان میں جان آئی۔ چنانچہ اُس نے اُسی روز صبیحہ اور بچوں کو اپنے سسرال میں چھوڑا۔ ان تینوں کے گلے میں تعویذ ڈال دیے اور شاہ صاحب کے بتائے ہوئے وظیفے کا ورد شروع کردیا۔ جس کی برکت سے کچھ بہتری آئی۔ شاہ صاحب کا کہنا تھا کہ ان کے واپس آنے تک صبیحہ اپنے بچوں کے ساتھ اپنے میکے میں ہی رہے۔ اور صبح شام اپنے اور بچوں کے گرد آیت الکرسی کا حصار کھینچ لیا کرے......

☆☆☆

عظیم اُس ڈھونگی عامل کا قائل تو ہوچکا تھا۔ اب اُس کی دلی خواہش روز بروز شدت اختیار کرتی جارہی تھی کہ وہ جلد از جلد دولت مند بن جائے۔ کار ہو کوٹھی ہو دنیا کی ہر آسائش ہو۔ اُس کی اِس خواہش کے پیچھے نسرین کا ہاتھ تھا۔ نسرین نے امیر بننے کی خواہش کی تکمیل کے سلسلہ میں عظیم کو راضی کیا کہ وہ اولین فرصت میں عامل سے ملاقات کرے۔ چنانچہ اگلے روز عظیم اور نسرین دونوں عامل کے ٹھکانے پر پہنچے۔ عامل نے بغور سر سے پاؤں تک عظیم کا جائزہ لیا اور دونوں کو اپنے سامنے بٹھا کر گفتگو کا آغاز کیا چونکہ عامل نے خود ہی امیر کبیر بننے کی خواہش نسرین کے دل میں جگائی تھی۔ مگر اب وہ خود اُن کے منہ سے سننا چاہتا تھا تو اُس نے انجان بنتے ہوئے آنے کا مقصد پوچھا تو عظیم اور نسرین نے بڑی عاجزی اور انکساری سے عامل کی تعریف کی۔ اُس کی شان میں قلابے ملائے اور کہا کہ آپ کے عمل کے نتیجے میں نسرین کی گود ہری ہونے جارہی ہے تو اب آپ کچھ ایسا کریں کہ میں اپنی ذاتی ورکشاپ کا مالک بن جاؤں۔ خوب آمدنی ہو اپنی کار اور کوٹھی ہو تو عامل نے کہا کہ یہ کام بہت مشکل ہے۔"

جس پر وہ اُس کے آگے گڑگڑانے لگے کہ آپ ہمارے لیے کچھ کریں آپ جیسا بولو گے ہم کرنے کو تیار ہیں۔" عامل مسلسل انکار کر رہا تھا۔ مگر عظیم اور نسرین اتنا ہی اصرار کر رہے تھے۔ تو عامل ایک دم غصے میں آگیا اور کہنے لگا کہ تیرے بھائی کا رابطہ اُس شاہ سے ہے اور ہر بار وہ شاہ میرا راستہ کھوٹا کر دیتا ہے۔ جب تک شاہ راستے سے ہٹ نہیں جاتا تو کچھ نہیں ہوسکتا۔

"اس پر عظیم اور نسرین نے عامل کے گندے اور بدبودار پاؤں پکڑ کر کہا کہ آپ سب کچھ جانتے ہیں تو اُس شاہ کا کانٹا نکال دیں نا آپ کے لیے کیا مشکل ہے؟"

تو عامل نے کہا کہ شاہ کا پتا صاف کرنے کے لیے اور تمہارے امیر بننے کے لیے مجھے ایک بہت سخت اور کٹھن عمل اور چلّہ کرنا پڑے گا۔ کیونکہ جب تک شاہ زندہ ہے میں کچھ نہیں کرسکتا۔"

اس پر عظیم اور نسرین نے عامل کی منتیں کیں کہ آپ وہ عمل اور چلّہ کریں ہم ہر طرح سے حاضر ہیں تو عامل نے کہا کہ چلّے اور عمل کے لیے مجھے کچھ چیزیں درکار ہیں۔ تم جلد

از جلد اُن کا بندوبست کردو تو میں چلّہ کر لیتا ہوں۔ عظیم نے دریافت کیا کہ کیا کیا چیزیں چاہئیں۔ تو عامل نے رازداری سے کہا کہ دس ہزار روپے نقد، کالے بکرے کی کھال اور کسی نوزائیدہ مردہ بچے کا دماغ چاہیے۔ جسے وہ تل کر کھائے گا اور بکرے کی کھال پر بیٹھ کر رات بھر چلّہ کاٹے گا۔ اس کے علاوہ جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ خود بندوبست کر لے گا۔ بس تم کسی مردہ بچے کا دماغ لا دو۔ اور ساتھ ہی دونوں کو یقین دلایا کہ اگر تم یہ کام کر دو تو پھر تم راتوں رات امیر بھی ہو جاؤ گے اور شاہ بھی میرے راستے سے ہٹ جائے گا۔

عظیم گہری سوچ میں ڈوب گیا تو عامل نے کہا آپ لوگ اب جاؤ۔ یاد رکھنا ہر معاملے میں رازداری شرط ہے اب تم دوبارہ میرے پاس اُس وقت آنا جب بچے کے دماغ کا بندوبست کر لو گے۔"

☆☆☆

عظیم سارا دن اور رات سوچ میں پڑا رہا اور بالآخر نسرین کے اصرار پر وہ اِس کام کے لیے راضی ہو گیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ مردہ بچے کا دماغ کیسے اور کہاں سے حاصل کیا جائے تو اگلے ہی دن اُس کا یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ ہوا یوں کہ جس ورکشاپ میں عظیم کام کرتا تھا تو وہاں اس کا ایک کاریگر ساتھی تھا جس کا پندرہ دن کا بچہ فوت ہو گیا تھا۔ اور مغرب کے بعد اُس کا جنازہ تھا۔ عظیم کو اپنے مقصد میں کام یابی نظر آ رہی تھی۔ چنانچہ وہ جنازے کے ساتھ گیا اور بچے کی تدفین تک قبرستان میں موجود رہا۔ اُس نے سارا راستہ اور بچے کی قبر کی اِردگرد کی نشانیوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا اور گھر واپس آ گیا اور گھر جاتے ہی نسرین کو خوش خبری سنائی۔

دس ہزار کا بندوبست یوں کیا کہ کچھ رقم ورکشاپ کے مالک سے بطور قرض لی اور کچھ رقم اپنے جاننے والوں سے اُدھار لی اور اس طرح دس ہزار روپے اکٹھے کر لیے۔ اُس نے ایک کھرپے، چھرے اور ہڈیاں کاٹنے والے ٹوکے کا بندوبست کیا اور ایک تھیلے میں ڈال کر رات گہری ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

عظیم اور نسرین جس گھر میں رہتے تھے وہ ریلوے اسٹیشن کی شمال والی جانب تھا۔ اور قبرستان ریلوے اسٹیشن کی جنوب والی جانب تھا۔ آخری ٹرین رات ایک بجے یہاں سے گزرتی تھی اور صبح تک اُس کے بعد کسی ٹرین نے نہیں گزرنا تھا۔ رات کے پونے دو بجے عظیم نے گرم کپڑے پہنے اور گرم چادر کی بُکل مار کر تھیلا اُٹھایا اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ اسٹیشن کی جانب چل پڑا۔

آج عظیم ایک ایسا گھناؤنا کام کرنے جا رہا تھا جس کے آگے انسانیت شرمندہ ہو رہی تھی۔ عظیم اور نسرین دونوں شیطان کے پیروکار بن چکے تھے۔ ٹرین جا چکی تھی۔ اب عظیم کا راستہ صاف تھا اور وہ احتیاط سے پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتا بالآخر اپنے مطلوبہ مقام یعنی اس بچے کی قبر تک پہنچ چکا تھا۔ جسے آج ہی مغرب کے بعد دفن کیا گیا تھا۔ عظیم نے جلدی جلدی کھرپے سے قبر کی مٹی ہٹائی اور سلیب اُٹھا کر ایک جانب رکھ دی۔ معصوم بچہ قبر میں ابدی نیند سو رہا تھا۔ عظیم نے کفن کھول کر ٹوکے کے ایک ہی وار سے مردہ بچے کا سر تن سے جدا کر دیا اور کاٹا ہوا سر ایک شاپر میں ڈالا اور سلیپ واپس رکھ کر دوبارہ مٹی ڈال کر قبر بنا دی۔ بچے کا سر، ٹوکہ اور کھرپا تھیلے میں ڈالا اور اُسی راستے سے چلتا ہوا رات کے تین بجے واپس گھر پہنچ گیا۔ عظیم کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ سارا مرحلہ انتہائی کام یابی سے سرانجام پا گیا ور کسی نے عظیم کو یہ گھناؤنا اور قبیح فعل کرتے نہیں دیکھا تھا۔

رات کے اندھیرے میں عظیم نے انسانیت پر ایک کاری ضرب لگا کر خدا کے قہر کو آواز دی تھی۔ گھر آ کر عظیم نے اپنی بیوی نسرین جو کہ جاگ رہی تھی اور اُس کا انتظار کر رہی تھی تو دونوں نے مل کر ٹوکے اور چھرے کی مدد سے بچے کے سر کو کاٹ کر دماغ نکالا اور اُسے ایک چھوٹے سے برتن میں محفوظ کر لیا۔ سر کی باقیات کا قیمہ بنا کر شاپر میں ڈال دیا کہ صبح کچرے میں پھینک دیں گے۔"

جیسے ہی صبح ہوئی تو عظیم اور نسرین اُس شیطان کے چیلے عامل کے ٹھکانے پر پہنچے اور بچے کا دماغ اور دس ہزار روپے اُس کو دے دیے۔ عامل نے کہا کہ وہ آج رات جنگل میں کھلے آسمان کے نیچے بیٹھ کر عمل اور چلہ کاٹے گا۔ تو تم لوگوں کے سب دلدر دور ہو جائیں گے۔ تمہاری مرادیں پوری ہو جائیں گی۔ چنانچہ وہ خوشی خوشی واپس گھر لوٹ آئے۔ اپنے اس گھناؤنے فعل پر بجائے شرمندگی محسوس کرنے کے وہ آنے والی خوشحالی کے تصور میں بیٹھے تھے۔

☆☆☆

شاہ صاحب عمرہ کی ادائیگی کا مقدس فریضہ سرانجام دینے کے بعد واپس تشریف لا چکے تھے۔ کلیم اُن کی خدمت میں حاضر تھا۔ بہت سارے لوگ شاہ صاحب کو ملنے کے لیے آ جا رہے تھے۔ شاہ صاحب آنے والے تمام مہمانوں کی تواضع مدینے شریف سے لائی گئی کھجوروں اور آبِ زم زم سے کر رہے تھے۔ آنے والوں کے لیے دعائیں کر رہے تھے۔

نمازِ عشاء کے بعد اُنھوں نے کلیم سے تفصیلاً ملاقات کی اور مراقبہ کیا تو شاہ صاحب بہت متفکر مضطرب اور پریشان ہو گئے تو کلیم نے پوچھا محترم خیریت تو ہے نا؟ تو شاہ صاحب نے کہا کہ خیریت نہیں ہے۔ کیونکہ آج کی رات بہت اہم اور بھاری ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

شاہ صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پھر ایک طویل مراقبہ کیا اور فرمایا کہ آج کی رات فیصلہ کن رات ہے۔ بہرحال آپ پریشان نہ ہوں۔ انشاء اللہ رب کریم کی مدد سے ہمیں کام یابی ملے گی۔"

دراصل شاہ صاحب کے پاس نوری علم تھا۔ وہ ایک متقی اور پرہیز گار انسان تھے۔ اللہ کے محبوب بندے تھے۔ انسانیت کی خدمت عبادت سمجھ کر کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ آج رات اپنے رب سے مدد مانگیں گے۔ انھیں مراقبے میں سب کچھ نظر آ گیا تھا۔ انھیں ادراک ہو گیا کہ شیطان عامل آج رات اپنے جادو سے چار جانوں کا قتل کرنے جا رہا ہے تو اُسے ہر حال میں روکنا تھا۔ لہٰذا شاہ صاحب نے میدانِ عمل میں آنے کا فیصلہ کیا۔ کلیم کو تو کچھ نہیں بتایا اُسے کچھ تعویذ لکھ کر اور پانی دم کر کے دیا کہ گھر جا کر بیوی بچوں کے گلے میں تعویذ ڈال دو اور دم کیا ہوا پانی جسے میں آبِ زم زم مکس کر کے دیا کہ اُن کو پلاؤ۔ عجوہ کھجوریں دیں کہ خود بھی کھاؤ اور بیوی کو بھی کھلاؤ اور تسلی دلاسہ دے کر کلیم کو گھر بھیج دیا۔ شاہ صاحب نے غسل فرمایا اور مسجد میں جا کر نوافل ادا کیے۔ پھر سوہنے سچے رب کی بارگاہ میں دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے اور مدد مانگی۔

آج کی رات خیر اور شر کے ٹکرانے کی رات تھی۔ نوری علم اور جادو کا مقابلہ تھا۔ ایک طرف شیطان جادوگر عامل چار جیتے جاگتے انسانوں کا قتل کرنے جا رہا تھا تو دوسری طرف اللہ کا ایک برگزیدہ بندہ اپنے رب کی مدد سے انسانیت کو بچانے جا رہا تھا۔ آج کی رات بہت اہم اور فیصلہ کن تھی۔ کیونکہ جیت کس کی ہونی ہے یہ صرف رب کو معلوم تھا۔ عامل جو عمل آج کرنے جا رہا تھا وہ بہت سخت اور کاری عمل تھا۔ اُس کا توڑ بہت مشکل تھا کیونکہ جو بھی اُس کے جادوئی عمل کو توڑنے کی کوشش کرتا۔ ناکامی کی صورت میں اُس کی موت یقینی تھی اور اگر جادو کے عمل کو توڑنے والا کام یاب ہو جاتا تو جادوگر کی دردناک اور عبرت انگیز موت یقینی تھی۔

آج کی رات سر دھڑ کی بازی لگانے کی رات تھی۔ شیطان عامل کو اپنی جادوئی طاقت اور شیطانی علم کے ذریعے پتا چل گیا تھا کہ شاہ صاحب اس کے مقابلے پر آ چکے ہیں تو وہ کیل کانٹے سے لیس ہو کر مقابلے کی تیاری کے لیے میدان میں اُتر آیا۔

اُس نے مردہ بچے کے دماغ میں کچھ اور حرام اور پلید اشیاء شامل کر کے اُسے سؤر کی چربی میں بھون کر کھایا۔ پھر آبادی سے دور کھلے آسمان کے نیچے ایک آگ کا بہت بڑا الاؤ جلایا اور آگ کے قریب کالے بکرے کی کھال بچھا کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اور اشلوک پڑھنے شروع کر دیے۔ خشک لکڑیوں کا ڈھیر اُس کے قریب رکھا تھا۔ جسے وہ ساتھ ساتھ آگ میں ڈال رہا تھا۔ جس سے آگ خوب بھڑک رہی تھی۔ اُس کی مدد کے لیے شر پھیلانے والے بھوت اور جن موجود تھے۔ جنھیں وہ ہدایات دے رہا تھا۔ اور اپنے مذموم مقصد میں کام یابی کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ آگ کا الاؤ روشن تھا۔ عامل وقفے وقفے سے مٹھی بھر کوئی چیز آگ پر پھینکتا جس سے آگ کے شعلے اور تیز ہو جاتے ساتھ ساتھ وہ تیز تیز اشلوک پڑھتا جا رہا تھا۔ ماحول پر ایک ہیبت طاری تھی۔

عامل نے عظیم کو بھی بلایا ہوا تھا۔ وہ اُس کے سامنے بیٹھا خاموشی سے عامل کا عمل اور چلّہ دیکھ رہا تھا۔ وہ دولت کے حصول کے شوق میں آنکھیں بند کیے عامل کی ہر بات مان رہا تھا اور شیطانی اور کفر کے راستے پر چل پڑا تھا۔ اب آگ کو بھڑکانے کے لیے اُس میں لکڑیاں ڈالنے کی ڈیوٹی عظیم کی لگا دی کہ آگ کے شعلے کم نہ ہوں

اس لیے وہ ساتھ ساتھ لکڑیاں ڈالتا جائے۔ ہڈیوں کا گودا جما دینے والی سخت سردی کی رات تھی۔ عامل اور عظیم دونوں کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر آگ کی حرارت اتنی تیز تھی کہ عظیم کو پسینہ آرہا تھا۔ عامل نے اب آنکھیں بند کرلیں اور اشلوک پڑھنے میں مگن ہوگیا۔

☆☆☆

شاہ صاحب نے نوافل کی ادائیگی کے بعد مسجد میں ہی اپنے گرد کلام پاک سے مضبوط حصار کھینچا اور بیٹھ گئے۔ اپنے سامنے قرآن پاک رکھا اور تلاوت فرمائی پھر قرآن پاک بند کر کے جادو کے توڑ کا وظیفہ پڑھنا شروع کردیا۔ عامل کی بھیجی ہوئی مخلوق شاہ صاحب کو ختم کرنے کے لیے اُن ہی کے قریب آنے کی کوشش کرتی مگر حصار کی وجہ سے نہیں پہنچ پارہی تھی۔ شاہ صاحب خشوع خضوع سے وظیفے کا وِرد جاری رکھے ہوئے تھے۔

جب شریر جن بھوت شاہ صاحب تک نہ پہنچ جائے تو عامل کو غصہ آگیا۔ اُس نے کوئی اور سخت اشلوک پڑھنے شروع کردیے اور شاہ صاحب کے حصار کو توڑنے کی سرتوڑ کوشش کرنے لگا۔ جن بھوت دوبارہ شاہ صاحب پر حملہ آور ہوئے۔ اب حصار کافی کمزور ہوچکا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ شیطانی مخلوق شاہ صاحب تک پہنچ پاتی شاہ صاحب نے فوراً ایک جلالی وظیفے اور عمل کا وِرد شروع کردیا اور اس وظیفے میں قرآن پاک پر ایک چھری رکھ دی جاتی ہے۔ یہ آخری عمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد خیر اور شر کی طاقتوں کے درمیان فوری اور فیصلہ کن مرحلہ ہوتا ہے۔ اس عمل اور وظیفے کے نتیجے میں دونوں میں سے ایک کی موت یقینی ہوجاتی ہے۔ چونکہ شیطان کا عامل اب بھاری پڑ رہا تھا تو شاہ صاحب نے مجبوراً قرآن پاک پر چھری رکھ کر جلالی وظیفہ شروع کیا تو تھوڑی دیر کے بعد شیطان عامل پر غالب آگئے اور عامل ڈھیلا پڑگیا۔ اُس کی زبان ایک دم گنگ ہوگئی۔ اشلوک پڑھنا بند ہوگیا تو جو جن بھوت اُس نے اپنی مدد کے لیے بلائے تھے وہ ایک دم غصے میں آگئے اور بپھر گئے اور پوری طاقت سے عامل پر حملہ آور ہوئے اور اُسے اُٹھا کر اُسی آگ کے الاؤ میں پھینک دیا۔ عامل کو آگ لگ گئی اس کی دردناک چیخوں سے جنگل گونج اُٹھا۔

یہ ماجرا دیکھ کر عظیم حواس باختہ ہوگیا اور گھبراہٹ میں ایک طرف اندھا دھند بھاگنا شروع کردیا اور بھاگتے بھاگتے ریلوے لائن پر آگیا۔ عظیم سخت گھبراہٹ میں ریلوے لائن کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ اُس نے پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا مگر خوفناک آوازیں اُس کا تعاقب کررہی تھیں۔ یکلخت اُسے ٹھوکر لگی اور وہ ریلوے لائن پر گر گیا ۔اب اتفاق ہوا کہ رات ایک بجے والی ٹرین آرہی تھی۔ انجن کے ڈرائیور لائٹ کی روشنی میں دیکھا کہ کوئی انسان لائن پر گرا ہوا ہے کیونکہ خوف، دہشت اور تیز بھاگنے کی وجہ سے عظیم گرا تھا۔ اور گرتے ہی بے ہوش ہوگیا تھا۔ وہ ریلوے لائن پر اس طرح گرا تھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں لائن کے اوپر تھیں اور دھڑ ایک طرف تھا۔ انجن کے ڈرائیور نے فوراً ایمرجنسی بریک لگائی مگر گاڑی رکتے رکتے عظیم کے اوپر سے گزر گئی اور اُس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئیں۔ اور وہ درد اور تکلیف کی شدت سے تڑپنے لگا۔ ٹرین رک چکی تھی۔ ٹرین کا عملہ فوراً نیچے اُترا۔ عظیم کی سانسیں چل رہی تھیں۔ عملے نے فوراً عظیم کو اسپتال بھجوانے کا بندوبست کیا۔ ٹرین اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔ اسپتال کے عمل نے اُسے طبی امداد دینا شروع کردی۔ عظیم کا بہت سارا خون بہہ چکا تھا۔ فوری طور پر اُسے خون کی بوتلیں لگادی گئیں اور کٹی ہوئی ٹانگوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں۔ عظیم پر بے ہوشی طاری تھی۔

☆☆☆

شاہ صاحب نے وظیفہ مکمل کیا۔ اب ہر طرف سکون تھا۔ اُن کو اشارے مل چکے تھے کہ ڈھونگی شیطان عامل واصلِ جہنم ہوچکا ہے۔ شاہ صاحب نے فوراً شکرانے کے نوافل ادا کیے۔ گڑگڑا کے رونے لگے اللہ سے معافی اور توبہ استغفار کے بعد اُس پاک ذات کا شکر ادا کیا۔ کیونکہ آج دھرتی ایک خبیث، شیطان جادوگر عامل کے وجود سے پاک ہوگئی تھی۔ اس جادوگر عامل کے شر سے خدا کی مخلوق بچ گئی تھی اُس نے بہت شر پھیلایا ہوا تھا۔ اُس کے جادو سے بہت سے لوگ پریشان تھے۔ کئی گھرانے تباہ و برباد ہوئے تھے تو آج وہ عامل اپنے بدترین انجام سے دوچار ہوکر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ واصلِ جہنم ہوچکا تھا۔ شاہ صاحب نے نماز تہجد ادا کی پھر قرآن پاک کی تلاوت اور درود پاک کی کثرت سے تلاوت کی۔ نمازِ فجر کے لیے امامت کی اور نماز کے بعد پوری مخلوق کے لیے دعا خیر کی۔

☆☆☆

نسرین ساری رات جاگتی رہی اور پریشانی سے کمرے میں ٹہلتی رہی۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ عظیم کا دور دور تک کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ چونکہ عظیم کی جیب میں اُس کی شناخت کی کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی تھی اور وہ مسلسل بے ہوش تھا۔ اور یہ پولیس کیس تھا تو پولیس نے شہر کی تمام مساجد میں عظیم کا حلیہ بتا کر اعلانات کروائے تو نسرین دوڑتی ہوئی ہسپتال پہنچی اور عظیم کی حالت کٹی ہوئی ٹانگیں دیکھ کر اُسے غشی کا دورہ پڑگیا۔ جس جگہ ریلوے لائن پر عظیم کی ٹانگیں کٹی تھیں وہاں پر پولیس نے معائنہ کیا اور اِردگرد کے علاقے میں گشت کی تو بہت جلد انھیں قریب ہی جادوگر عامل کی جلی ہوئی مسخ شدہ لاش مل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹروں کی کوشش سے نسرین کو ہوش آگیا تھا تو پولیس نے اُس سے پوچھ گچھ کی تو اُس نے سارا ماجرا بیان کردیا تو اس طرح اُس کے بیان کی روشنی میں تفتیش کی اور سارے معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی۔

اگلے روز قومی اخبارات کے پہلے صفحے پر جادوگر عامل کے کالے کرتوتوں اور اُس کے اندوہناک انجام بد کی پوری تفصیل جلی حروف میں شائع ہوئی۔ معصوم بچے کی قبر کی بے حرمتی اور لاش کا سر کاٹ کر گھر لاکر دماغ نکالنے کے جرم میں عظیم اور نسرین کے خلاف پرچہ درج کرلیا گیا۔ نسرین کی نشاندہی پر بچے کے سر کی باقیات بھی برآمد ہوگئیں تو پولیس نے نسرین کو حراست میں لے لیا گیا۔

کلیم کو بھی عظیم کی ٹانگیں کٹنے کی خبر مل چکی تھی تو وہ بھی دوڑا دوڑا ہسپتال پہنچا اور جب اُسے ساری صورتِ حال کا علم ہوا تو وہ ششدر اور حیران رہ گیا۔ تین دن کے بعد عظیم کو ہوش تو آگیا مگر وہ اپنے حواس میں نہیں تھا۔ وہ پورا ایک ماہ ہسپتال میں رہا اُس کا علاج ہوتا رہا اور علاج کا سارا خرچہ کلیم نے ادا کیا۔ کیونکہ آخر وہ اس کا ماں جایا بھائی تھا۔ عظیم اور کلیم کی والدہ بھی پورا ایک مہینہ ہسپتال میں رہیں اور عظیم کی تیمارداری کرتی رہیں۔ انھیں تمام واقعات جان کر بہت دکھ ہوا۔ وہ ہر وقت روتی رہتیں ایک تو بیٹے کی ٹانگیں کٹ گئیں۔ دوسرا اُس کے اور نسرین کے کرتوت جان کر وہ لرز گئیں۔ جیسے ہی عظیم کے زخم ٹھیک ہوئے پولیس نے اُسے گرفتار کرلیا اور مقدمہ عدالت میں پیش کردیا۔ عظیم اور نسرین کو گھناؤنے جرم کی پاداش میں پانچ پانچ سال کی جیل ہوگئی۔ صبیحہ اور اُس کے دونوں بچے مکمل طور پر صحت یاب ہوچکے تھے۔ کلیم کو اُس کے محکمے کی سرکاری کالونی میں بہترین مکان الاٹ ہوگیا اور وہ اپنی ماں اور بیوی بچوں کے ساتھ وہاں شفٹ ہوگیا۔

نسرین نے جیل میں ایک انتہائی بدصورت اور کریہہ بچے کو جنم دیا۔ بچے کی شکل اتنی خوفناک تھی کہ اُسے دیکھ کر خوف آتا۔ نسرین کو وہ بچہ خود بھی بوجھ محسوس ہوتا اور وہ اُسے شدید نفرت سے دیکھتی۔ کوئی دو ماہ کے قریب وہ بچہ زندہ رہا پھر ایک دن مرگیا۔

سزا کی مدت پوری ہونے کے بعد عظیم اور نسرین کو رہا کردیا گیا۔ نسرین تو اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی اور عظیم سے طلاق کا مطالبہ کردیا۔ عظیم اور نسرین کے جیل جانے کے بعد کلیم نے نسرین کے جہیز کا سارا سامان اُس کے میکے بھیج دیا تھا۔ عظیم کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہا تھا۔ گوکہ رہائی کے بعد کلیم اُسے اپنے گھر لے آیا مگر وہ اب کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہا۔ کبھی کبھی وہ بالکل ٹھیک ہوجاتا ہے تو بہت روتا ہے اپنی ماں سے کلیم سے اور صبیحہ سے بہت معافیاں مانگتا ہے۔ کبھی کبھی اُس کا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے اور پاگلوں جیسی حرکتیں کرتا ہے۔ وہ حسرت و یاس کی ایک چلتی پھرتی تصویر ہے۔ وہ اکثر اپنی کٹی ہوئی ٹانگیں گھسیٹتا ہوا ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چلا جاتا ہے اور سارا دن آتی جاتی ٹرینوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ پھر شام کو کلیم اُسے اپنی سرکاری گاڑی میں بٹھا کر گھر لے آتا ہے۔ کلیم کی ترقی ہوگئی وہ اب بڑا افسر بن گیا ہے اور اُسے سرکاری گاڑی بھی مل گئی ہے۔ نسرین کے اندر جلنے والی حسد کی آگ نے اُسے اور عظیم کو تباہ و برباد کردیا ہے۔

نسرین آج بھی اپنے میکے میں بیٹھی ہے۔ وہ اپنے بھائیوں اور بھابیوں کی نوکرانیوں کی طرح خدمت کرتی ہے۔ صبح سے رات تک گھر کے کام کرتی ہے۔ اُس کی دوبارہ شادی نہیں ہوسکی۔ آج بھی وہ اپنی حسد کی آگ میں جل رہی ہے۔

☆☆☆



ناول

کاشی چوہان

زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

قسط نمبر:13

کون ہے کی آواز نگراں کے حلق سے نکلی۔ وہ نیند میں تھا مگر اسے پھر بھی ڈر محسوس ہوا۔ اسے لگا جیسے کمرے میں کوئی موجود ہے۔ مگر اسے دکھائی کچھ نہیں دے رہا تھا۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے اٹھ کر کمرے کی لائٹ جلا دی۔ اور اسے کمرے میں موجود چیزیں صاف دکھائی دینے لگیں لیکن اس کے بعد بھی کوئی انسان یا کوئی اور مخلوق اسے نظر نہیں آئی۔ اس نے سوچا ہوسکتا ہے کوئی بلی وغیرہ اندر گھس آئی ہو۔ اس خیال کو بھی اس کے ذہن نے فوراً ہی رد کر دیا کیونکہ اس کے کمرے میں کسی بھی ایسی چیز کا داخل ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ کھڑکیاں اور دروازے بہت اچھی طرح بند کر کے ہی سویا کرتا تھا۔ ہوسکتا ہے کوئی کھڑکی کسی بھول کی وجہ سے کھلی رہ گئی ہو۔ اس نے سوچا اور آہستہ روی سے چلتا ہوا وہ ایک ایک کر کے کمرے کی سب ہی کھڑکیوں کے پاس گیا اور انہیں ہاتھ سے دھکیل کر یہ دیکھنے لگا کہ کہیں کوئی کھڑکی کھلی ہوئی تو نہیں ہے۔ اسے کوئی بھی کھڑکی کھلی ہوئی نہیں ملی۔ اس نے اچھی طرح سب کھڑکیوں کی کنڈی وغیرہ چیک کی اور ایسا کرنے کے بعد اسے ایک اطمینان تو ضرور ہوا کہ کوئی کھڑکی کھلی ہوئی نہیں تھی۔ پھر وہ دروازے کی طرف گیا اور اسے بھی اچھی طرح چیک کرنے لگا دروازہ بھی اسی طرح بند تھا جیسے ہمیشہ ہوتا ہے۔ پھر یہ کھٹکا کس چیز کا تھا۔ اندر تو کوئی بھی نہیں ہے۔ ہوا سے ہونے والی کسی آواز کو تو باہر سے آنا چاہیے تھا اور اس نے آواز کمرے کے اندر سے سنی تھی۔ اس بات کا اسے یقین تھا لیکن حالات و واقعات نے اس کے یقین کو متزلزل کر دیا اور اسے یہ ماننا ہی پڑا کہ یہ سب اس کا وہم تھا یا پھر اس نے کوئی ایسا خواب دیکھا تھا جو اب اسے ذرا سا بھی یاد نہیں تھا۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ خواب یاد نہیں رہتے۔ سب طرح کے اطمینان کے بعد وہ پھر سے اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گیا اور دوبارہ سے لیٹنے کا سوچنے لگا۔ ابھی وہ لیٹنے کے لیے پاؤں پھیلانے والا ہی تھا کہ اس کے ذہن میں ایک کھٹکا ہوا۔ اس نے کمرے کے اندر ایک اور چھوٹے سے کمرے کے بارے میں سوچا جس میں مدرسے کے ریکارڈ اور حساب کتاب کی ضروری چیزیں حفاظت سے رکھی جاتی تھیں۔ اس کمرے کے بارے میں زیادہ تر لوگوں کو کچھ بھی معلوم نہ تھا اگر کوئی یہ جانتا بھی تھا کہ اس کے کمرے میں ایک اور ریکارڈ روم کے طور پر استعمال ہونے والا خفیہ کمرا ہے تو یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس ریکارڈ روم میں کیا کچھ رکھا ہوا تھا اور کون سی چیز کہاں رکھی ہوئی تھی۔ یہ

صرف نگراں ہی جانتا تھا اور وہ ہی اس کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ البتہ اس کمرے کی ایک چابی بورڈ کے چیف ایگزیکٹیو کے پاس بھی تھی‘ اور یہ اس احتیاط کے طور پر کیا جاتا تھا کہ اچانک نگراں کا انتقال ہو جائے اور نگراں کے پاس موجود چابی بورڈ کو نہ ملے تو اس اسپیئر چابی سے ریکارڈ روم کو کھولا جاسکتا ہوتا کہ مدرسے کا نظام ٹھیک طرح سے چلتا رہے اور اس میں کوئی تاخیر نہ ہوسکے۔ بصورت دیگر نگراں کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی تھی کہ اس کمرے میں کسی کو جانے کی ضرورت پڑتی ہو۔ جس بھی فائل کی ضرورت پڑتی تو نگراں خود لا کر دے دیا کرتا تھا یوں بھی بورڈ کی میٹنگ مدرسے میں شاذ ہی ہوتی تھی۔ یہ میٹنگ شہر کے کسی بڑے اور مشہور ہوٹل میں ہوا کرتی تھی جہاں نگراں اپنے ساتھ ایجنڈے کے مطابق ضروری فائلیں لے کر جایا کرتا تھا۔ موجودہ نگراں کوئی پچھلے بارہ سال سے موجود تھا اور اس کی کارکردگی سے بورڈ کوئی شکایت بھی نہیں تھی ان کی متفقہ رائے میں وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا وہ ہی ٹھیک تھا۔ اس لیے بڑھتے بڑھتے نگراں کی خود اعتمادی ایک قسم کے تکبر میں داخل ہوگئی۔ اس کا نام اکرام اللہ تھا۔ پہلے پہل وہ ایسا نہیں تھا قدرے معقول انسان تھا اور طالب علموں کے معاملے میں بھی اس کا رویہ مشفقانہ نہیں تو اتنا سخت گیر بھی نہیں تھا لیکن جیسے جیسے اس کے اعتماد میں اضافہ ہوتا گیا ویسے ویسے اس پر ایک قسم کی انانیت بھی طاری ہوتی چلی گئی۔ کہتے ہیں کوئی بھی چیز چاہے وہ کتنی بھی اچھی کیوں نہ ہو اس کا کوئی نہ کوئی منفی پہلو بھی ضرور ہوتا ہے حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا معاملہ بھی یہی ہے اگر اس کا جائزہ نہ لو تو پتا ہی نہیں چلتا کہ یہ کب تکبر اور غرور کی سرحدوں میں داخل ہوگئی۔ خود اعتماد انسان کی اگر کبھی کسی معاملے میں سبکی ہو جائے تو اسے انتقامی غصہ نہیں آتا وہ اپنے کیے ہوئے فعل کا جائزہ لیتا ہے کہ اس سے کہاں غلطی ہوئی ہے جس کی وجہ سے اسے سبکی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ زیادہ حساس ہو تو اپنے سامنے جیتنے والے کو مبارک باد دے کر اپنی سبکی کو برتری میں بدلنے اور زیادہ اچھا انسان بننے کی جستجو کرتا ہے لیکن اگر خود اعتمادی کا جائزہ بروقت نہ لیا جائے تو وہ ایک قسم کے انتقامی جذبے میں تبدیل ہوتی رہتی ہے ایسا آدمی اپنی ہار کو کبھی تسلیم نہیں کرتا اور انتقامی انداز میں سوچنا شروع کر دیتا ہے اور اس قسم کے انسان کو جب بھی موقع ملتا ہے وہ وار ضرور کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا انسان اپنی شان اور خود کے اختیارات کو ثابت کرنے کے لیے چھوٹی موٹی زیادتی بھی محض دکھاوے اور اپنی طاقت کی نمائش کی خاطر کرتا ہے تاکہ لوگ بھول نہ جائیں کہ وہ کس قدر بااختیار ہے۔ داخلی طور پر ایسے انسان کی اپنی انا کو بھی ایسا کر کے سکون ملتا ہے۔ اس وقت اکرام اللہ کی حالت بھی یہی ہوئی تھی اسے سلمان کے معاملے میں جو شکست ہوئی تھی۔ سلمان کے جس طرح اس کا بچھایا ہوا جال جس میں اس سے مشکل اور ایسے سوالات کیے تھے جن کا جواب اس درجے کا کوئی بھی طالب علم دے ہی نہیں سکتا تھا مگر سلمان نے وہ سارے جواب بڑی سہولت سے دے دیے تھے۔ نگراں کو پورا یقین تھا کہ اس امتحان کے بعد سلمان کو مدرسے سے بے دخل کرنا بالکل بھی مشکل نہیں ہوگا اور سلمان کے سب سے بڑے حمایتی ابو ریحان بھی خاموش ہو جائیں گے۔ لیکن ہوا اس کے برعکس سلمان کے جوابات نے نگراں کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا اور اسے لگا کہ اتنے سارے اہم لوگوں کے سامنے اس معمولی لڑکے نے اسے نیچا دکھا دیا ہے۔ اب وہ اپنے ہی اس امتحان میں پھنس گیا سلمان کو مدرسے سے نکالنے کا جواز ختم ہوگیا۔ تو اس نے سلمان کے خلاف نئی سازش کا جال بنا اور اس بار سلمان کو اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا نہ ہی اسے کسی ٹیسٹ یا کسی امتحان سے گزارا گیا کیونکہ اس بار نگراں کسی بھی طرح شکست کھانا نہیں چاہتا تھا وہ یک جنبش قلم سلمان کو مدرسے سے نکالنا چاہتا تھا چاہے اس کے لیے اسے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑتا۔ ابو ریحان چونکہ سلمان کے سب سے قریب سمجھے جاتے تھے اور وہ وقت بے وقت سلمان کی طرف داری کیا کرتے تھے تو انھیں یقین تھا کہ اس طرح اگر سلمان چلا گیا تو انھیں بھی اس مدرسے میں چین سے جینے نہیں دیا جائے گا کیونکہ نگراں اکرام اللہ کی کینہ پروری سے وہ اچھی طرح واقف تھے اس لیے انھوں نے خود ہی مدرسے سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

نگراں دوسرے خفیہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کے سامنے جو منظر تھا اسے دیکھ کر خیال میں نہیں حقیقت میں اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی اس کی خفیہ ریکارڈ والی تجوری کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس میں سے سارے ضروری کاغذات غائب تھے۔ وہ ایک دم سے جیسے سٹپٹا گیا اس نے جلدی جلدی سارے کمرے کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا لیکن وہ سارے کاغذات جو ٹھیکداروں سے اس کے کمیشن کھانے کا ثبوت فراہم کرتے تھے وہ سب کے سب غائب تھے اس کا سیدھا مطلب تھا کہ اب اس کی مدرسے سے صرف ملازمت ہی ختم نہیں ہوگی بلکہ اسے ذلیل کر کے اس طرح نکالا جائے گا کہ دوسروں کو بھی اس کی سزا سے عبرت ہو اور بھاری جرمانہ بھی کیا جائے گا جو وہ کسی بھی طرح ادا نہیں کر سکے گا اور اس کے بعد اسے شہر کسی اور مدرسے میں بھی ملازمت نہیں ملے گی سمجھو تو اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔ اس کی پریشانی چھت کو لگ رہی تھی اور وہ بار بار اپنی داڑھی اور سر کے بال نوچ رہا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ سب کیسے ہوگیا اور اب اس کا انجام کیا ہوگا۔ اس نے سارے گھر میں اور دونوں کمروں میں بار بار گھوم پھر کر دیکھ لیا مگر کسی بھی جگہ سے چور کے داخل ہونے کے کوئی نشانات نہیں مل رہے تھے۔ تمام داخلی دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں تو پھر چور آیا کس راستے سے تھا۔ وہ بار بار سوچتا اور ہر بار اسے اپنی سوچ کسی ویران گنبد میں گھوم کر واپس آتی ہوئی سنائی دیتی۔ عجب نہیں تھا کہ وہ زور زور سے سر پٹک کر بین کرنا شروع کر دے مگر اس سے حاصل تو کچھ نہیں ہونے والا تھا اگر وہ ایسا کرتا بھی اور مدرسے کی جملہ انتظامیہ کو یہ یقین بھی دلاتا کہ اس کے حجرے میں چوری ہوگئی اور اس کا سارا ریکارڈ چوری ہوگیا ہے تب بھی سزا سے تو اسی صورت میں بچ سکتا تھا جب اسے یہ یقین بھی ہوتا کہ چور ان کاغذات کو بورڈ کے ممبران کے سامنے پیش نہیں کرے گا روپیا پیسے کی چوری ہوتی تو وہ خود کو یقین دلا لیتا کہ چور جو کچھ لے گیا اس کے بعد اب کبھی یہاں واپس نہیں آئے گا لیکن یہ تو اس کے ضروری اور خفیہ کاغذات کی چوری تھی اور انھیں چرانے کا بس ایک ہی مطلب ہوسکتا ہے کہ اسے ذلیل کر کے مدرسے سے بے دخل کروانا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ سارا وقت یہ سوچنے میں گزار دیتا کہ چور اس کے حجرے میں داخل کیسے ہوا کیونکہ یہ بہت بڑا اچنبھا تھا کہ چور کے داخل ہونے کا کوئی نشان‘ کوئی ثبوت بھی نہیں تھا اور چوری بھی سب کچھ ہو چکا تھا ن حتیٰ کہ اس کی تجوری کا تالا تک توڑا نہیں گیا تھا بلکہ وہ کسی اسی تالے کی چابی سے کھولا تھا جس سے وہ کھلا کرتا تھا۔ لیکن اس کی بڑھتی ہوئی پریشانی کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ چابی اس کی جس جیب میں رکھی ہوتی وہیں رکھی ہوئی تھی۔ پھر یہ تالا کیسے کھلا اس کا مطلب ہے چور کے پاس اس تجوری کے تالے کی کوئی اور چابی بھی تھی جو ناممکن بات تھی لیکن اس وقت اس بات پر یقین کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

”یہ تو واقعی ناقابل یقین ہیں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نگراں اتنا بڑا بے ایمان، بدنیت اور بددیانت انسان ہے۔ اس نے سپلائرز سے کس قدر کمیشن کھایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مدرسے کی آمدنی کو بھی شدید نقصان پہنچایا ہے وہ اس بدعنوانی کا بھی مرتکب ہوا ہے کہ اس نے طالب علموں کے والدین سے عذر بہانوں سے روپیا اینٹھا ہے اس نے مدرسے کو ملنے والے چندے اور کھالوں میں بھی خرد برد کی ہے میں تو حیران ہوں۔ مجھے اس کے لیے مناسب الفاظ نہیں مل رہے کہ میں کیا کہوں کیسے اتنے عرصے سے اتنا گرا ہوا آدمی اس پاکیزہ جگہ کا نگراں بنا ہوا سب ہی کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا تھا اور اپنے کیے پر پشیمان ہونے کے بجائے چھاتی چوڑی کیے وہ اسے دندناتا اور غراتا پھرتا تھا جیسے نعوذ باللہ وہ ہی اللہ تعالیٰ کا سب سے نیک بندہ ہے۔ تف ہے اس کی انسانیت اور مسلمان ہونے پر۔ میرا بس چلے تو ایسے انسان کو میں سرِ عام کوڑے لگواؤں اور سولی پر ٹانگ کر اس کی لاش کو درس عبرت بنا دوں۔“ غصے سے پھنکارتے ہوئے ابو ریحان جانے کیا کیا کہتے رہے اور سلمان ان کی باتیں اطمینان سے سننے کے بعد بولا۔

”تو آپ کو کس نے روکا ہے کیجیے وہ سب جو آپ کرنا چاہتے ہیں“

”کیا مطلب..... میں کچھ سمجھا نہیں؟“ انھوں نے گہری آنکھوں سے حیران ہو کر سلمان کی طرف دیکھا۔

”یہ سب کچھ بورڈ کے ممبران کے سامنے آپ ہی پیش کریں گے۔ جب آپ یہ ثبوت فراہم کر دیں گے تو پھر

سزا بھی آپ ہی تجویز کیجیے گا۔'' سلمان نے اسی اطمینان سے کہا۔ ابوریحان چونکتے ہوئے بولے۔
''میں... میں کیسے کرسکتا ہوں۔ وہ پوچھیں گے کہ مجھے یہ ثبوت کہاں سے اور کیسے ملے تو میں کیا جواب دوں گا؟''
''جواب سارے میں آپ سمجھا دوں گا آپ فکر مت کیجیے۔''
سلمان کی بات سن کر انھیں جیسے کوئی اور بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی انھیں صاف محسوس ہوا کہ یہ لڑکا غیر معمولی طاقتوں کا حامل انسان ہے اور یہ وہ سب بھی جانتا ہے جو کوئی نہیں جانتا۔ دونوں دیر تک خاموش رہے۔ پھر اذان کا وقت ہوگیا اور دونوں خاموشی سے مسجد کی طرف چل دیے۔ دونوں وضو کر کے مسجد میں پہنچے تو اکا دکا طالب علموں کے علاوہ نگراں بھی وہاں پہلے سے موجود تھا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کے پیر زمین پر ٹھیک سے جم نہیں رہے تھے وہ کچھ نوافل کے لیے کھڑا ہوا تھا اور جب وہ کھڑا ہو کر رکوع اور سجود میں جاتا تو صاف پتا چلتا تھا کہ اس کے پیروں میں کپکپی طاری تھی وہ ضرور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں اور جرائم کی معافی مانگنے کو یہ نماز پڑھ رہا تھا۔ سلمان اور ابوریحان نے معنی خیزی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور جائے نماز پر کھڑے ہو کر نماز کی نیت باندھ لی۔
نماز ختم ہونے کے بعد بھی نگراں ہمیشہ کی طرح مسجد سے باہر نہیں آیا۔ بلکہ اسی جگہ بیٹھا آہ وزاری کرتا رہا۔ تب ابوریحان کے باہر کی طرف جاتے ہوئے قدم تھم گئے اور وہ واپس پلٹے۔ تحمل سے چلتے ہوئے نگراں ے پاس پہنچے اور بولے۔
''اب کوئی فائدہ نہیں ہے اکرام اللہ!'' اتنا سننا تھا کہ اکرام اللہ ایسے چونکا جیسے اسے کسی سانپ نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس نے خوف سے پھیلتی ہوئی آنکھوں سے ابوریحان کی طرف دیکھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ابوریحان کو اس لب ولہجے پر بات کرنے سے اچھی خاصی سخت سست سناتا لیکن اس وقت وہ کھلی آنکھوں سے بس دیکھتا رہا۔
''تمہارے گناہوں اور جرائم کا پردہ فاش ہو چکا ہے۔ اب مدرسے سے میں اور سلمان نہیں تمھیں جانا ہوگا۔''
نگراں کی آنکھیں مزید پھیل گئیں اور وہ اچھی طرح سمجھ گیا کہ ابوریحان کو اس کے کالے کرتوتوں کے بارے میں سب معلوم ہو چکا ہے۔
''کہا تھا نا اس لڑکے سلمان کو تنگ مت کرو۔ لیکن تم طاقت کے نشے میں چور تھے تم نے میری ایک نہیں سنی اب وقت آگیا ہے کہ تمہاری طاقت کا سومنات مسمار کر دیا جائے۔''
''کون کرے گا؟'' بڑی عجلت اور غیر ارادی طور پر نگراں کے منہ سے اتنی دیر میں بس یہی ایک جملہ نکلا۔
''وہی کرے گا جس نے تمہارے راز کو طشت از بام کیا ہے۔'' ابوریحان نے کہا۔
''تو کیا میرے حجرے سے چوری تم نے کروائی ہے؟'' ابھی جیسے گرتی ہوئی دیوار میں کچھ دھمک باقی تھی۔
''میں کیا جانوں کہ تم نے کیسے کیسے جرائم کا پہاڑ اپنے حجرے کے خفیہ خانوں میں چھپا رکھا ہے یہ تو وہی جانتا ہے جو تمہارے ایسے سوالوں کے جواب بھی دے سکتا ہے جن کا جواب اس کے درجے کے کسی طالب علم کو نہیں آتے۔''
''سلمان'' اس کے منہ سے ایسے نکلا جیسے یہ کسی بھوت کا نام ہو۔
''ہاں سلمان.... میں نے کہا تھا اس لڑکے کو پریشان مت کرو۔ وہ مدرسے کا سب سے ذہین طالب علم ہے وہ ایسا کچھ بھی جانتا ہے جو میں اور تم بھی نہیں جانتے۔ لیکن تم اپنی طاقت اور اختیارات کے نشے میں چور یہ سمجھتے تھے کہ تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا اب اس کے سامنے بار ماتھا ٹیک کر آہ وزاری کرتے ہو جو سب کا سب کچھ بگاڑ بھی سکتا ہے اور سنوار بھی سکتا ہے۔'' اتنا کہہ کر ابوریحان تیزی سے وہاں سے اٹھ آئے۔ اسی تیزی سے نگراں بھی ان کے پیچھے لپکا۔ اب منظر یہ تھا کہ ابوریحان آگے آگے جا رہے تھے اور نگراں ان کے پیچھے پیچھے جلدی جلدی ایسے چل رہا تھا جیسے اس کے دل ودماغ میں ابوریحان کے علاوہ کچھ باقی نہ رہا ہو۔ ظاہر ہے یہ منظر نگراں کی حیثیت سے اس کے لیے ایک قسم کی بے عزتی پر محمول کرتا تھا۔ اگر رات والا واقعہ نہ ہوتا تو نگراں ایسے ابوریحان کے پیچھے جانے کے

بجائے انھیں اپنے آفس میں بلواتا۔ ابوریحان کی بھی مجال نہیں تھی کہ وہ اس طرح نگراں کو اپنے پیچھے کسی سوالی کی طرح آتا دیکھ کر بھی اسے نظر انداز کرتے ہوئے چلتے چلے جاتے۔ مسجد سے نکلنے والے سب ہی لوگوں نے یہ عجوبہ منظر دیکھا اور ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ وہ فوری طور پر سمجھ نہیں پائے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ لیکن ابوریحان جانتے تھے کہ کل تک فرعون کی طرح اپنے احکامات منوانے والا نگراں اب کسی معمولی کیڑے مکوڑے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا کیوں کہ وہ اس کا کچھا چٹھا اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ ان کے ذہن میں سلمان کی غیر معمولی طاقتوں کے بارے میں بھی بہت سوالات تھے لیکن اس وقت وہ صرف نگراں کی کمزور ہوتی ہوئی طاقت کا مزا لے رہے تھے اور اس کے علاوہ کچھ اور سوچنا نہیں چاہتے تھے۔ رات کے اندھیرے دامن کو صبح کی پھیلتی ہوئی روشنی نے تار تار کرنا شروع کر دیا تھا۔ موسم قدرے خنک تھا۔ اسی لیے نگراں کو اپنا منہ ایک چادر میں چھپانے کا آسرا مل گیا تھا۔ ابوریحان طویل غلام گردشوں سے گزرتے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچے اور چاہتے تھے کہ اپنے پیچھے دروازہ بند کرلیں لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ نگراں ان سے کیا کہنا چاہتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں نگراں ان کے دروازے پر پہنچ گیا اور دروازے کو کھلا دیکھ کر بھی اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ بنا دستک کے اندر داخل ہو سکتا۔ دستک کی آواز سن کر ابوریحان نے اسے اندر آنے کی اجازت دی۔ نگراں پہلے تو ان کے سامنے خاموش کھڑا رہا پھر نہایت عاجزی سے بولا۔ ''میں جانتا ہوں آپ میرے بارے میں سب کچھ جان چکے ہیں اور اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ فرشتے میرے خلاف ہو چکے ہیں ورنہ جس طرح میرے حجرے میں چوری ہوئی ہے یہ کسی انسان کے بس کا کام نہیں تھا۔''
''جب جان ہی چکے ہو تو میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟'' ابوریحان نے کسی لگی لپٹی کے بغیر سپاٹ لہجے میں کہا۔
''کیا آپ میری مدد کرتے ہوئے مجھے اس مصیبت سے بچانے کی ہلکی سی کوشش بھی نہیں کریں گے؟'' وہ گھگھیایا۔
''نہیں'' ابوریحان نے کہا۔
''آپ تو بڑے نرم اور کشادہ دل ہیں ابوریحان۔ مجھے آپ سے ایسی گریز پائی کی امید نہیں ہے۔'' وہ سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔
''ابھی تم نے خود ہی کہا کہ یہ فرشتوں کا کام ہے۔ کسی انسان کے بس میں نہیں تھا کہ وہ تمہاری بدعنوانیوں کا پردہ چاک کرسکتا۔ جب اتنا جان چکے ہو تو پھر یہ بھی سمجھ لو کہ فرشتے اللہ کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے یہ اللہ کا حکم ہے اور میں اللہ کے حکم کے راستے میں آنے یا اسے تبدیل کرنے کی نہ ہی طاقت رکھتا ہوں اور نہ ارادہ'' ابوریحان نے جیسے دوٹوک اسے بتا دیا کہ اب جو کچھ بھی ہونے والا ہے اسے اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔
''ٹھیک کہتے ہیں آپ میں اللہ کے عتاب میں ہوں اور اللہ سے ہی مجھے معافی مانگنا چاہیے لیکن اللہ بھی تو رحم اپنے بندوں کے ذریعے ہی کرتا ہے۔ آپ اس کے نیک صفت بندے ہیں آپ چاہیں تو مجھے اس مشکل گھڑی میں ملنے والی بے عزتی سے بچا سکتے ہیں۔'' وہ خود کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔
''میں کچھ نہیں کرسکتا۔ اکرام اللہ تم نے جو کچھ کیا ہے وہ ایسا نہیں ہے جسے معاف کیا جاسکتا ہو۔ تمھیں سزا سے گزرنا ہی ہوگا۔ اور اب جب کہ میں یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ اللہ کی مرضی ہے کہ تمھیں تمہارے گناہوں کی سزا ملے تو پھر میں بیچ آنے والا کون ہوں۔ تم نے جو کچھ کیا ہے تمھیں اس کی سزا بھگتنا ہوگی۔'' ابوریحان کی بات سننے کے بعد جیسے اکرام اللہ کے پاس مزید کچھ کہنے کی گنجائش ختم ہو چکی تھی لیکن وہ پھر بھی کمرے میں رکا رہا تو ابوریحان کو اپنے مزاج کے برعکس اس سے یہ کہنا ہی پڑا کہ اب تم جا سکتے ہو۔ وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ ''میں نے کہا اب تم جا سکتے ہو۔'' ابوریحان نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔
''کیا میں سلمان سے مل سکتا ہوں؟'' کمرے میں دیر تک ایک کشمکش کا سا ماحول رہا۔ جسے اکرام اللہ کے اس

سوال نے درہم برہم کیا۔

''سلمان سے ملنے کے لیے تمھیں میری اجازت کی ضرورت نہیں ہے'' ابوریحان جانتے تھے سلمان سے اس سلسلے میں ملنا بے سود ہی ہوگا۔ کیونکہ وہ تو شاید کچھ نرمی اور رحم وغیرہ سے کام لے بھی لیتے لیکن سلمان نے انھیں سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ کسی قسم کی نرمی اور ہمدردی سے کام نہ لیں یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر شاید کبھی اس آدمی کو دوبارہ اس طرح پکڑا نہیں جاسکے گا۔ اس لیے صاف صاف اس سے کہہ دیجے کہ اسے اس کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔

''اچھا میں سلمان سے مل لیتا ہوں'' یہ کہہ کر وہ سر جھکائے آہستگی سے چلتا ہوا۔ جیسے ہر قدم اٹھاتے ہوئے یہ سوچ رہا ہو کہ شاید کوئی ایسا لمحہ ہو جب ابوریحان کے دل میں رحم کا جذبہ سر اٹھائے اور وہ اسے روک کر اس کی مدد کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ مگر اں وہاں سے تو ایسے نکلا جیسے اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہو لیکن ابوریحان کے کمرے کے دروازے سے نکلتے ہی اس کے پیروں میں پہیے لگ گئے اور وہ اپنی پوری تیزی کے ساتھ سلمان کے کمرے کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

شرجیل نے اپنے والد سرفراز ملک سے اپنے دل کی بات کہہ تو دی لیکن کیا اس کے لیے کورٹ میرج کرنا ممکن ہوگا۔ یہ سوچ اسے سارا وقت ستاتی رہی کیونکہ اس طبقے میں اس قسم کی رومانوی جسارت کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا یہاں سب کچھ پیسوں اور حیثیتوں کے ترازو میں تولا جاتا ہے اور غرض اور مطلب کے آئینے میں اسے دیکھا جاتا ہے۔ اس طرح کی شادی کا تصور بھی موجود نہیں تھا کیونکہ اس کا مطلب ہے باپ کی طرف سے ہر قسم کی جائداد اور پائی پیسے سے عاق کر دیا جانا اور اپنے بل بوتے پر زندگی شروع کرنا۔ اس بات کی اجازت خود صنوبر کے گھر والے بھی اسے کسی قیمت پر نہیں دیں گے اور گھر والوں کی مرضی کے بغیر ان کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھانا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں تھا۔ لیکن وہ اچھی طرح یہ بات جانتا تھا کہ اس کا باپ فارس رحمان کے باپ کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا وہ کسی بھی قیمت پر اپنی محبت کی یہ بازی جیت نہیں سکے گا۔ کچھ دیر تک وہ اپنے کمرے میں اسی ادھیڑ بن میں رہا پھر اسے اپنے دروازے پر دستک سنائی دی وہ سمجھا اس کا نوکر ہے اور کھانے کا پوچھنے آیا ہے لیکن یہ دیکھ کر اسے کافی حیرانی ہوئی کہ وہ اس کے والد سرفراز ملک تھے۔

''میں سمجھتا ہوں تم ایک بار اور ٹھنڈے دل سے سوچ لو۔ یہ بات کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ رحمان ہمیں برباد کر دے گا اگر ہم نے اس کے بیٹے کی خوشیوں کو اس سے چھین لینے کی کوشش کی تو۔'' سرفراز ملک خامشی سے کونے میں پڑی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ان کے لہجے سے لگتا تھا کہ بیٹے کے ارادے کے سامنے جم کے کھڑے رہنے کے بجائے بیٹے کو اس بات کا احساس دلانے آئے تھے کہ جو وہ کرنا چاہتا ہے اس کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں اور ان نتائج کے بدلے میں اس کے خاندان کو کیا قیمت چکانی پڑ سکتی ہے۔

''اسی لیے کہتا ہوں آپ مجھے کورٹ میرج کرنے دیجے۔ اس طرح آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا آپ کہہ دیجے گا کہ میں نافرمان ہو چکا ہوں اور آپ کی بات بھی نہیں مان رہا۔'' شرجیل کو بھی باپ کے رویے کی وجہ سے یہ ہمت ہوئی کہ وہ انھیں اس طرح کی بات کہہ سکے جو کسی قدر دوستانہ راستا نکالنے کی کوشش تھی۔

''تم رحمان کو اور اس کے بیٹے فارس کو نہیں جانتے۔ میں اگر تمھیں عاق کرنے کا ڈراما کروں اور درپردہ تمھاری مدد کرتا رہوں۔ تمھاری کورٹ میرج کے بعد تب بھی مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ تمھیں آسانی سے جینے کی اجازت دیں گے وہ تمھارا جینا حرام کر دیں گے۔ اور کاروبار کو تو تمام صورتوں میں نقصان پہنچ کر ہی رہے گا اس باپ بیٹے کو اس بات کا یقین کبھی نہیں آئے گا کہ میں نے تمھیں اپنے کاروبار اور زندگی سے الگ کر دیا ہے۔'' سرفراز ملک بیٹے سے اس کی مرضی کا حل معلوم کرنے نہیں بلکہ سے اپنی مرضی پر راضی کرنے آئے تھے۔

''تب تو اس مسئلے کا کوئی حل ہے ہی نہیں۔ لیکن جو بھی ہو میں صنوبر کو چھوڑ نہیں سکتا اگر میں نے ایسا کیا تو سمجھ

لیجے میں جی نہیں سکوں گا۔ کیا آپ کو یہ منظور ہوگا؟'' شرجیل کو خود نہیں پتا تھا کہ اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی جو وہ اپنے باپ کے سامنے زندگی میں پہلی بار اس طرح اپنے دل کی بات کھول کھول کر بیان کر رہا تھا۔

''ایسا کیا ہے اس لڑکی میں جو تم جینے مرنے کی بات کر رہے ہو ہماری کلاس میں اس قسم کی باتوں کو حماقت سمجھا جاتا ہے۔'' سرفراز ملک نے ایک بار اور بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''اب آپ اس قسم کی باتیں مت کہیے ڈیڈی جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔'' شرجیل کو فوری طور پر جیسے غصہ آنے لگا۔

''تو پھر تم ہی بتاؤ اس مسئلے کا کیا حل ہے؟'' سرفراز ملک نے بیٹے کے بگڑتے ہوئے تیوروں کو غور سے دیکھا۔

شرجیل نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ صنوبر سے محبت کرنا اتنا بڑا اور لاینحل امتحان بن جائے گا۔ جس میں ہر طرف سے راہیں مسدود ہو جائیں گی اور اس کے خاندان کی تباہی کے علاوہ اور کوئی چارہ باقی نہیں رہے گا۔ اس کے پاس باپ کے سوال کا اس وقت کوئی جواب نہیں تھا اور جب جواب تھا ہی نہیں تو وہ کیا جواب دیتا اس لیے بس چپ رہا۔ دل کی دھڑکن مسلسل یہ دوہراتی رہی کہ صنوبر سے کہ صنوبر سے بے وفائی کر کے وہ کبھی خوش اور زندہ نہیں رہ سکے گا یہ تصور ہی جان لیوا تھا کہ صنوبر کسی اور کی ہو جائے اور بس دیکھتا رہے۔ طویل خاموشی کے بعد سرفراز ملک نے اندازہ لگا لیا کہ بیٹے کے پاس ان کے سوال کا کوئی جواب نہیں ہے اس لیے وہ خاموشی سے اٹھے اور کمرے سے چلے گئے۔ اسی وقت صنوبر کی موبائل پر کال فلیش ہونے لگی وہ چاہتے ہوئے بھی یہ کال نہیں لے سکا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس وقت جب وہ ہر طرف سے مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے صنوبر سے کیا کہے گا۔ اس لیے اپنا دل مسوس کے رہ گیا اور فون بج بج کے بند ہو گیا۔

☆☆☆

صنوبر کے لیے یہ بات کسی بڑے صدمے اور پریشانی سے کم نہیں تھی کہ شرجیل اس کی کال ریسیو نہ کرے۔ وہ دیر تک اس بارے میں سوچتی رہی کہ ایسا کیا ہوا ہے یہ تو شرجیل کے سونے یا کسی بھی مصروفیت کا کوئی موقع نہیں ہے پھر کیوں اس نے اس کی کال ریسیو نہیں کی۔ مگر اسے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اسی وقت درشہوار اسے آوازیں دیتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ لیکن صنوبر اپنی پریشانی میں اس قدر محو تھی کہ اسے اپنی ماں کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔ درشہوار سمجھ گئی کہ وہ ضرور کسی بڑی پریشانی کا شکار ہے۔

''کیا بات ہے بیٹے تم کچھ پریشان ہو؟'' درشہوار سے رہا نہیں گیا۔

''نہیں کوئی بات نہیں ہے'' صنوبر نے جیسے انھیں ٹالنا چاہا۔

''کوئی تو بات ہے جو تم اپنی ماما کو بتانا نہیں چاہتیں'' درشہوار کی تشویش بڑھنے لگی۔

ماں کی بات سن کر صنوبر ایک دم چھلک پڑی اور اس کے آنسوؤں نے درشہوار کو اتنا تو سمجھا دیا کہ بیٹی کسی معمولی نہیں کسی زیادہ ہی بڑی پریشانی کا شکار ہے۔

''پلیز صنوبر اس طرح روؤ تو مت مجھے بتاؤ کیا بات ہے میں تمھاری ماں ہوں اور تمھاری مدد مجھ سے زیادہ بہتر کوئی اور نہیں کر سکتا۔'' درشہوار نے بیٹی کو گلے سے لگا لیا صنوبر ماں کے سینے لگ کر پہلے سے زیادہ شدت سے رونے لگی۔ اور پھر کتنی ہی دیر وہ اسی طرح روتی رہی۔ درشہوار اس کے دل ہلکا ہونے پر اسے منھ دھونے اور فریش ہونے کا کہہ کر اس کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔ درشہوار کو چائے کی طلب ہی صنوبر کے کمرے تک کھینچ کر لائی تھی وہ یونہی صنوبر سے پوچھنے چلی آئی کہ وہ لڑکا حماد کب تک واپس آئے گا وہ اگر کچھ جانتی ہے تو اسے ضرور بتائے اسے کیا معلوم تھا کہ اس کی بیٹی کس عذاب سے گزر رہی ہے۔ چائے بناتے ہوئے بھی وہ سارا وقت بس یہی ایک بات سوچتی رہی اور کہ آخر ایسی کیا بات ہے جس نے صنوبر کو اتنا پریشان کر دیا ہے کہ وہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ وہ چائے لے کر صنوبر کے پاس پہنچی تو وہ فریش ہو چکی تھی لیکن اس کے ستے ہوئے چہرے سے صاف لگ رہا

تھا کہ وہ کتنا رو تی رہی ہے۔

''لو چائے پیو۔ اس لڑکے حماد کی جیسی تو نہیں ہے مگر میں نے کوشش کی ہے کہ بہت اچھی چائے بنا کے اپنی بیٹی کو پلاؤں جس سے اس کا موڈ ایک دم ٹھیک ہو جائے۔'' درشہوار نے ہنسنے کی کوشش کی۔

''کیوں آپ نے کیوں بنائی چائے۔ سلمٰی کہاں ہے آپ اس سے کہہ دیتیں'' صنوبر نے کہا۔

''سلمٰی کی چائے تو بہتر ہے انسان خود ہی چائے بنا لے۔ دنیا کی بری سے بری چائے بھی سلمٰی کی چائے سے ضرور اچھی ہوگی۔'' درشہوار نے اس طرح کہا کہ صنوبر کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔

''اف کس قدر حسین لگتی ہو تم مسکراتے ہوئے بالکل اپنے پاپا کی طرح۔'' درشہوار نے بہت عرصے بعد آج اس طرح اپنے شوہر آصف کا ذکر کیا تھا۔

''پاپا کہاں ہیں کیا ہو آ گئے ہیں؟'' صنوبر نے پوچھا۔

''نہیں.... وہ تو آفس میں ہی ہیں۔'' درشہوار نے چائے کا سپ لیا۔

''اچھا کیا اب میری صنوبر مجھے نہیں بتائے گی کہ کیا بات تھی جس نے تمہیں اس طرح رلا دیا تھا؟'' صنوبر نے ایک گہری نظر ماں کے چہرے پر ڈالی اور پھر آہستہ آہستہ ساری بات درشہوار کو بتا دی۔ پوری بات سننے کے بعد درشہوار نے ایک گہرا سانس لیا مگر بولی کچھ نہیں۔

''آپ کچھ کہیں گی نہیں؟'' صنوبر کو ماں کا اس طرح چپ ہو جانا اور بھی زیادہ فکرمندی میں لے گیا۔ ''سوچ رہی ہوں کہ کیا کہوں۔ یہ لڑکا پہلے بھی تمہیں....'' ابھی درشہوار کی بات ادھوری ہی تھی کہ صنوبر درمیان سے بول پڑی۔

''میں آپ کو بتا چکی ہوں ماما وہ اور بات تھی اب ایسا نہیں ہے وہ میرے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ مگر......'' صنوبر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکی اس کے نتھنے پھولنے پچکنے لگے۔

''اگر ایسا ہی تو وہ تمہاری کال کیوں رسیو نہیں کر رہا؟'' درشہوار پھر سے دلیلوں پر اتر آئی۔

''وہ مجھے کسی مشکل میں لگتا ہے۔'' صنوبر نے دھیرے سے کہا۔

''مصیبت کیسی ہی کیوں نہ ہو اگر وہ تمہیں ساتھ لے کر نہیں چلے گا تو....'' وہ آگے کچھ اور ایسا کہنے والی تھی جس سے صنوبر کے دل دکھنے کا اندیشہ تھا اس لیے چپ ہو گئی اور بات بدلتے ہوئے بولی۔

''میں تمہیں یقین دلاتی ہوں وہ اگر ہمارے اسٹیٹس سے نیچے بھی ہوا تو میں تمہاری شادی اس سے کرانے میں تمہاری پوری مدد کروں گی اس سے کہو وہ مجھ سے آ کر مل لے بلکہ ایسا کرو اسے تم آج شام ہی بلوا لو میں اس سے ملنا چاہتی ہوں'' درشہوار کو لگا کہ اس وقت اپنی بیٹی کو دکھ سے نجات دلانے کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔

صنوبر ماں کی بات سن کر جیسے خوش تو ہوئی مگر اسے لگا خوشی نے اس کے اندر سے پھوٹ نکلنے کی ہلکی سی بھی کوشش نہیں کی اور وہ کوشش کے باوجود یہ نہیں جان سکی کہ ایسا کیوں ہوا۔

☆☆☆

فارس رحمان بڑی سرگرمی سے اس لڑکے کو تلاش کر رہا تھا جو اس کے اور صنوبر کے راستے میں دیوار بن کے کھڑا ہوا تھا۔ یہ تو اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہو نہ ہو وہ لڑکا صنوبر کے آرٹ اسکول میں اس کے ساتھ ہی پڑھتا ہے۔ کافی سوچنے کے بعد اسے یاد آ ہی گیا کہ اس کا ایک ہیلو ہائے جیسا دوست اس اسکول میں پڑھتا ہے۔ ذرا سی بھی دیر کیے بغیر وہ اس سے ملنے اسکول جا پہنچا اس لڑکے کا نام ایشان تھا۔ اور اس وقت وہ ایشان کے ساتھ اسکول کے ایک ویران گوشے میں ملاقات کرتے ہوئے جوس کا گلاس ہاتھ میں پکڑے باتوں میں مشغول تھا۔ لڑکا فارس کے لائف اسٹائل سے پہلے ہی مرعوب تھا اس لیے اس وقت فارس کا یوں اس سے ملنے چلے آنا اسے بہت ہی مزا دے رہا تھا۔

''مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ تم میرے اسکول میں مجھ سے ملنے آئے ہو۔ ہماری بس ایک دوسرسری سی

ملاقاتیں سٹی کلب کے جم اور انڈور گیمز میں کھیلتے ہوئے ہوئی تھیں۔'' ایشان نے پرجوش ہو کر کہا۔

''اصل میں ایشان میں میں تمہیں اپنے دوستوں کے گروپ میں شامل کرنا چاہتا ہوں'' فارس نے اس کی طرف وہ ہی ہڈی پھینکی جس کے لیے وہ کب سے بے چین تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کہوں۔ شکریہ تو مجھے ادا کرنا ہی ہے مگر یہ ایک دم سے میرے ستارے اس طرح کیسے چمکنے لگے کہ تم مجھے خود اپنے گروپ میں شامل کرنے میرے پاس آئے ہو۔ میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ تمہارا گروپ جوائن کروں مگر کبھی تم سے یا تمہارے گروپ کے کسی ممبر سے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔'' خوشی ایشان کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ موٹے نقوش اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا ایک براؤن رنگ کا نوجوان تھا۔ اس عمر میں ہر نوجوان ویسے ہی اچھا نظر آتا ہے اسی لیے ایشان بھی ایک نظر دیکھنے میں اچھا ہی معلوم ہوتا تھا۔ قد بھی اس کا چھ فٹ تھا اور جسم پر چڑھا ہوا گوشت بتا رہا تھا کہ اسے کھانے پینے کا شوق بھی بہت ہے۔

''اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' وہ ایکسائٹ منٹ سے بولا۔ ''میرا مطلب ہے کیا مجھے ہر روز تم لوگوں کے ساتھ رہنا ہوگا؟''

''ارے نہیں یار ایسا بھی نہیں ہے۔ ہم کوئی اتنے فارغ بھی نہیں ہوتے جو بلاوجہ سارا وقت گھومتے رہیں البتہ ویک اینڈ پر ہمیشہ ہم کوئی نہ کوئی پروگرام بنا ہی لیتے ہیں'' فارس کو لگا کہ یہ تو کافی چیکو قسم کا لڑکا ہے اور اسے چیکو ٹائپ لڑکوں سے ہمیشہ بڑی چڑ ہوتی تھی۔ ایشان کو اس کے جواب سے زیادہ مایوسی نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک قسم کا اطمینان ہی ہوا تھا کیونکہ اس کا باپ ایک سخت مزاج انسان تھا اور وہ روز روز کی آوارہ گردی کو شاید پسند بھی نہ کرے۔ لیکن ہفتے میں ایک دن گھر سے باہر رہنے پر اسے یقین تھا اس کے باپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ ویسے بھی اس کے باپ کو اپنے کاموں سے فرصت کم ہی ملتی تھی اس کی بچوں کے لیے اس کی معلومات کا ذریعہ اس کی ماں ہی تھی جو اسے ہفتے میں ایک بار باہر جانے کی اجازت بخوشی دے دیں گی۔

''چلو اچھی بات ہے۔ مجھے تو ویسے روزانہ باہر جانے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔'' اس نے قدرے سکون سے کہا۔

''ایشان کیا تم صنوبر کو جانتے ہو وہ اسی اسکول میں پڑھتی ہے؟'' فارس اپنے مطلب پر آ ہی گیا۔

''ارے یار یہ کیا بات کی تم نے۔ صنوبر کو کون نہیں جانتا۔ اس کے اور شرجیل کے عشق کے قصے تو یہاں ہر ایک کی زبان پر ہیں۔ دونوں میں بہت پیار ہے ایک دوسرے کے بغیر دونوں جیسے رہ ہی نہیں سکتے۔ کچھ لوگوں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے ہی اسکول آتے ہیں۔ ویسے تو پڑھنے اور اسائنمنٹ کرنے میں بھی ان کا ہمیشہ اچھا ہی ریکارڈ ہے۔'' ایشان کہتا رہا جیسے اسے اس موضوع پر بات کرنے کا بہانہ ہی تو چاہیے تھا اور فارس کا خون کھولتا رہا اس کی باتیں سن کر وہ رکا تو فارس نے کہا۔ ''اچھا اتنی محبت ہے دونوں میں۔ تو کیا اسکول والے انھیں کچھ نہیں کہتے یہ لیلیٰ مجنوں کا کھیل کھیلنے پر؟'' فارس نے غصہ اپنے اندر ہی دبا لیا تھا ورنہ اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا وہ ابھی کے ابھی شرجیل کو جا کے اتنا کوٹے کہ اس کی شکل پہچانی نہ جائے۔

''میں نے کہا نا ان دونوں کا پڑھائی کا ریکارڈ بھی بہت اچھا ہے اور ویسے بھی وہ اسکول کے اچھے اسٹوڈنٹس میں شمار ہوتے ہیں اسکول کے ڈسپلن کو انھوں نے کبھی بھی نظرانداز نہیں کیا تو اسکول کی انتظامیہ کو اس سے کیا کون کس سے محبت کرتا ہے۔'' ایشان نے جوس کا گلاس ختم کر کے اسے ہاتھوں سے توڑ مروڑ کر پھینکتے ہوئے کہا۔

''کیا تم مجھے شرجیل سے ملا سکتے ہو ابھی؟'' فارس نے کہا تو ایشان چونکا اسے لگا کہ جیسے فارس اسی کام سے اس کے اسکول آیا تھا۔

''میں تو سمجھا تھا تم مجھ سے ملنے آئے ہو۔ اب سمجھا تم اصل میں شرجیل سے ملنے آئے ہو!'' اس کی آواز میں اب وہ پہلے جیسا جوش خروش دم توڑ رہا تھا۔

''ارے نہیں یار میں تم سے ہی ملنے آیا تھا یہ تو بس ذکر نکل آیا تو میں نے پوچھ لیا۔ کیا تم سلمان کو جانتے ہو؟'' فارس نے فوراً ہی دوسرا پتا پھینکا۔

''سلمان کون سلمان اس نام کے تو بہت سے لڑکے یہاں اس اسکول میں پڑھتے ہیں۔'' ایشان نے کہا۔

''نہیں.... نہیں.... وہ یہاں پڑھتا نہیں ہے وہ صنوبر کا بھائی ہے۔''

''اوہ ہاں... میں نے اسے کئی بار صنوبر کو اسکول ڈراپ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔'' ایشان نے تجسس سے کہا۔

''بس اب تم ساری بات سمجھ جاؤ گے۔ سلمان صنوبر کا بھائی ہے اور وہ ہمارے گروپ کا ممبر ہے وہ بھی بہت خاص اسے کسی نے بتایا ہے کہ کوئی لڑکا یہی شرجیل جو تم نے ابھی بتایا اس کی بہن کو پھانس رہا ہے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے۔ تم تو جانتے ہو ہمارے گروپ کے کسی بھی ممبر کی پریشانی دراصل گروپ کی پریشانی بن جاتی ہے اسی لیے مجھے اس شرجیل کا دماغ ٹھیک کرنا ہے۔ تاکہ وہ صنوبر کا پیچھا چھوڑ دے۔'' فارس کی بات سن کر ایشان کو اس کی بات اجنبی لگی کیونکہ جتنا وہ جانتا تھا یہ معاملہ اس سے بھی زیادہ گہرائی لیے ہوئے تھا یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ ایک لڑکا کسی لڑکی کو پھانسنے کی کوشش کر رہا ہے اور اسے دھما کر اس کا دماغ درست کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو باقاعدہ عشق ہے جو دونوں طرف سے چل رہا ہے یعنی دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی ہے۔ ایشان چپ رہا اسے لگا کہ اب اس کی کوئی بھی بات بے سود ہوگی فارس کا مقصد تو کچھ اور ہی تھا۔ مانا کہ صنوبر ایک بے انتہا حسین لڑکی تھی اور کوئی بھی لڑکا اس کے چکر میں پڑ سکتا تھا لیکن شرجیل سے اس کی والہانہ محبت دیکھ کر کسی کو بھی صنوبر کی بڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

''اب تم بھی ہمارے گروپ کے ممبر بن چکے ہو اس لیے تمہارا بھی فرض ہے کہ گروپ کے دوستوں کا ساتھ دو۔ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟'' فارس نے اس کا کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے زور سے ہلایا۔

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' ایشان کی دبی دبی اور مشکوک سی آواز نکلی۔

''تمہیں مجھے ایک پل کی رپورٹ دینا ہوگی کہ وہ کیا کرتے ہیں کہاں جاتے ہیں اور کتنی دیر ایک دوسرے سے ملتے ہیں وغیرہ وغیرہ....''

''اچھا..... یہ تو بڑا مشکل کام ہے یار فارس... تم تو مجھے ان کی جاسوسی پر لگا رہے ہو؟'' ایشان کو لگا کہ گروپ جوائن کرنے کا اس کا جو مقصد تھا کہ خوب موج مستی کرنے ملے گی یہ بات تو اس کے پاس سے بھی نہیں گزر رہی۔

''تم بس مجھے شرجیل سے ملا دو۔ پھر تمہارا کام ختم سمجھو میں اسے ایک بار ہی مل کر ٹائیڈ کر دوں گا پھر وہ صنوبر کی طرف دیکھے گا بھی نہیں۔'' فارس نے بات بنائی کیونکہ اس نے محسوس کر لیا تھا یہ فضول لڑکا اس کے کسی کام کا نہیں ہے۔ یہ سالا تو کسی اور ہی چکر میں ہے۔

''چلو ٹھیک ہے۔ تم کل آنا میں تمہیں شرجیل سے ملا دوں گا'' ایشان نے کہا۔

''کل کیوں آج کیوں نہیں؟'' فارس جتنی جلدی میں رہتا تھا اس کے لیے کسی بھی کام کو فٹا فٹ کرنا ہی ہوتا تھا۔ اور اس وقت بھی وہ فوراً سے پیشتر شرجیل سے ملنا اور اسے دیکھنا چاہتا تھا۔

''اس لیے کہ آج وہ آیا نہیں ہے'' ایشان نے مختصر جواب دیا۔

''تب تو صنوبر بھی نہیں آئی ہوگی؟'' فارس نے ایک خاص اسٹائل سے کہا۔

''نہیں ایسا نہیں ہے وہ آئی ہے۔ مگر سارا وقت پریشان دکھائی دیتی رہی۔ ایسا لگتا ہے دونوں کے بیچ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔'' ایشان نے مزید معلومات بہم پہنچائی تو فارس جیسے ایک دم ہی قہقہہ مار کے ہنس پڑا۔

''ارے واہ تم نے تو میرا دل خوش کر دیا۔ یعنی ہمارے کچھ بھی کرنے سے پہلے ہی ہمارا کام خود بخود ہو رہا ہے۔''

جواب میں ایشان نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور یوں یہ ملاقات ختم ہوگئی۔ راستے بھر فارس دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا کہ شرجیل اور صنوبر میں کوئی جھگڑا ہوا ہے اور اس جھگڑے سے اس وقت وہ کیسے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ البتہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ صنوبر تو اس سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتی تھی اور جب سے سلمان نے اس سے رشتے کی

بات کی تھی اسے یقین تھا کہ اب وہ اور بھی محتاط ہو چکی ہوگی۔ پھر بھی ٹرائی کرنے میں کیا حرج ہے...... یہ سوچ کر اس نے گاڑی پھر سے اسکول کی طرف موڑ لی کہ صنوبر سے بات کر کے دیکھے کہ کیا ہوا ہے اگر تو اس جلتی پر مزید تیل ڈال کر اسے بھڑکایا جا سکتا ہے تو اس موقع کو ہاتھوں سے جانے نہ دیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اسے ایک ترکیب بھی سوجھی اس نے سلمان کو فون کیا اور اس سے ایک ایسی بات کی جسے مانتے ہوئے سلمان کو کافی تشویش ہوئی مگر وہ فارس کی دی ہوئی تسلیوں پر بادل نخواستہ مان گیا۔

☆☆☆

سلمان کے کمرے میں پہنچ کر نگراں کو لگا کہ اس نے یہاں آ کر زیادہ اچھا نہیں کیا یہ اس کی غلطی تھی اسے سلمان کو تو کم سے کم اپنے کمرے میں بلا لینا چاہیے تھا ویسے بھی وہ ایک طالب علم ہی تو تھا۔ کیا وہ اس کے بلانے پر آنے سے انکار کر دیتا۔ اس بات کا احساس اسے اس وقت زیادہ شدت سے ہوا جب سلمان کے کمرے میں ایک اور طالب علم عمران کو بھی اس نے موجود پایا۔ سلمان نگراں کو دیکھ کر کچھ زیادہ حیران نہیں ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا ایسا ہی ہوگا نگراں ابو ریحان مایوس ہونے کے بعد سیدھا اسی کے پاس آئے گا۔

کمرے میں موجود دوسرے طالب علم عمران کو ایک زبردست حیرت کا جھٹکا لگا۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ نگراں بھی کسی طالب علم کے کمرے میں اس طرح سے آیا ہو۔ وہ ڈر گیا شاید کوئی بڑی گڑبڑ ہوئی ہے۔ نگراں کے بولنے سے پہلے تک اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں کہ غلطی کس سے ہوئی ہے اس سے یا سلمان سے۔ جب نگراں نے کہا۔

''تم جاؤ عمران مجھے سلمان سے اکیلے میں بات کرنا ہے'' تو عمران کی جان میں جان آئی کہ غلطی کا تعلق اس سے نہیں بلکہ سلمان سے تھا۔ پھر بھی اس کی یہ تشویش باقی رہی کہ آخر بات کیا ہے۔ وہ اور سلمان ایک ہی کمرا شیئر کرتے ہیں کہیں کوئی ایسی بات نہ ہو جس کا تعلق ان دونوں سے ہو۔ اگر ہم دونوں سے تعلق ہوتا تو وہ مجھے کمرے سے باہر جانے کا کیوں کہتے۔ راہداری میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے عمران نے خود کو تسلی دی۔

''مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔'' سلمان نے کہا تو نگراں کا جیسے پتہ پانی ہو گیا ایک کل کا لونڈا اس سے اس لہجے میں بات کر سکتا ہے وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''تم جانتے ہو کس سے بات کر رہے ہو؟ اور کس لہجے میں بات کر رہے ہو۔ اس بدتمیزی پر میں تمہیں.....''

''آپ کچھ نہیں کر سکتے میں یہ بھی جانتا ہوں۔ آپ کے کمرے سے وہ سارے راز جن میں آپ کے گناہوں کے ثبوت چھپے ہوئے ہیں میں نے ہی چرائے ہیں۔'' سلمان نے نگراں کے اس تجسس کو بھی بھک سے اڑا دیا جس نے اس کی سوچوں میں آگ لگا رکھی تھی کہ اتنے سخت انتظام کے باوجود اس کے کمرے سے کاغذات چوری کیسے ہو گئے۔

''تم نے.....'' حیرت کا ایک بم تھا جو نگراں کی سماعت پر پھٹا۔

''مگر..... یہ ہوا کیسے سب کچھ تو.....؟'' نگراں کو جو تجسس بے چین کیے ہوئے تھا وہ اس کے لبوں پر آ ہی گیا۔

''سب کچھ تو تالے میں تھا تالا توڑا بھی نہیں گیا۔ کھڑکیاں اور دروازے بھی اسی طرح بند تھے جیسے انھیں آپ نے بند کیا تھا تو پھر میں نے وہ کاغذات کیسے چوری کیے..... یہی جاننا چاہتے ہیں آپ؟'' سلمان کی بات سن کر نگراں نے اسی کیفیت میں گردن ہلائی۔

''لیکن میں آپ کو یہ نہیں بتانا چاہتا اور اب آپ مجھ سے پوچھنے کی طاقت اور اختیارات کھو چکے ہیں۔ میں جانتا ہوں آپ اس وقت نگراں ہوتے ہوئے بھی نگراں نہیں ہیں۔ اگر میں نہیں جانتا تو آپ سے اس لہجے میں کبھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ آپ چلے جائیں یہاں سے ابھی اور اسی وقت۔'' سلمان کے لہجے میں جو قطعیت تھی اسے نگراں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔

''میں سمجھ گیا میری تباہی اب کسی صورت نہیں ٹالی جا سکتی لیکن کیا تم میرے ایک سوال کا جواب دینا پسند کرو گے۔ بس ایک سوال؟'' کروفر اور تکبر سے اکڑے لہجے میں بات کرنے والے نگراں کے لہجے میں اس وقت کافی گراوٹ تھی۔ اسے یقین آ چکا تھا کہ اب اسے ذلت اور بدنامی سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا اس کے نصیب کی روشنی چھینی جا چکی تھی۔

''پوچھیں کیا پوچھنا ہے؟'' سلمان جانتا تھا وہ کیا پوچھے گا۔

''بس اتنا بتا دو تم نے یہ کام کیا کیسے جب؟''

''آپ شاید بھول گئے۔'' نگراں کی بات کو درمیان سے ہی سلمان نے اچک لیا۔ ''آپ پہلے بھی اسی طرح حیران ہو چکے ہیں۔ اگر اس وقت آپ کی سمجھ میں وہ حیرانی آ جاتی تو آج تباہی آپ کا مقدر نہیں بنتی۔ یاد نہیں تو میں یاد دلا دیتا ہوں'' سلمان نے اس کے چہرے پر کھیلتی پریشانی اور گومگو کی لہروں کو دیکھ لیا تھا۔ صبح کا اجالا اتنا پھیل چکا تھا کہ کمرے کی ہر چیز اس اجالے میں واضح اور صاف دکھائی دے رہی تھی۔

''آپ نے مجھ سے ایسے سوالات کیے جن کے جواب کوئی بھی میرے درجے کا طالب علم دے ہی نہیں سکتا تھا اور اس وقت آپ کو جو حیرانی ہوئی تھی اسے آپ کا غصہ اور انتقام نگل گیا تھا۔ اس لیے آپ سمجھ ہی نہیں سکے کہ میں کون ہوں اور میرے پاس کیسی ماورائی طاقتیں ہیں۔ میں کہیں سے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ کیونکہ.......(وہ ان کے قریب آیا) کیونکہ میں انسان نہیں جن ہوں.....'' اتنا کہہ کر سلمان زور زور سے ہنسنے لگا اور نگراں کا بس پیشاب خطا ہونے ہی کو تھا۔ وہ کچھ دیر تو جیسے فریز ہو گیا۔ لیکن پھر جیسے ہی اسے ہوش آیا وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور اس نے اپنے کمرے کے حجرے کے غسل خانے میں آ کر ہی پناہ لی۔

☆☆☆

''ارے تم..... تم کب واپس آئے۔؟'' حماد کو اپنے کمرے کے پاس کھڑے دیکھ کر صنوبر کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ اس نے جلدی سے اسے اپنے کمرے میں پکڑ کر گھسیٹ لیا۔

''ماما سے ملے؟'' وہ جلدی سے بولی۔

''نہیں ابھی نہیں'' حماد نے جواب دیا۔

''اچھا یہ بتاؤ دروازے سے آئے ہو نا۔ اس دن کی طرح دیوار کود کر تو نہیں آئے جیسے تم اس رات کو گئے تھے۔'' صنوبر کو معلوم تھا کہ اب اس کا اس گھر میں پھر سے ملازمت پر رکھا جانا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ اس کا اس طرح دیوار پھاند کر یہاں سے جانا ناقابل معافی جرم تھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بی بی صاحبہ میں تو اس رات بھی دروازے سے ہی گیا تھا دیوار پھاند کر تو نہیں گیا تھا۔'' حماد کو یاد آ گیا اس رات کا یہاں سے چلے جانا۔

''ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ چوکیدار تو کہہ رہا تھا کہ تم دروازے سے نکلے ہی نہیں۔ مجھے بھی تم نظر نہیں آئے تھے میں تو بالکونی میں ہی بیٹھی ہوئی تھی۔'' صنوبر کو اس کے بیان پر شدید حیرت ہوئی۔

''آپ نے نہیں دیکھا اس کی تو ایک وجہ ہے اس رات آپ پریشان تھیں آپ کی نظر چوک گئی ہوگی۔ لیکن چوکیدار کو تو سویا پڑا تھا۔ میں نے اسے آوازیں بھی دیں مگر وہ جاگا ہی نہیں تو میں نے گیٹ کھولا اور میں چلا گیا۔ لیکن میں نے گیٹ کو پھر سے بند کر دیا تھا۔ اس طرح کھلا نہیں چھوڑا تھا کہ کوئی چور وغیرہ داخل ہو سکے۔'' حماد کی بات سن کر صنوبر کی پریشانی دوچند ہو گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ اگر یہ اس طرح گیا جیسے بتا رہا ہے تو بات تو یہ بھی پکڑ میں آنے والی ہے۔ اسے اس طرح گیٹ کھول کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ اور دیوار سے کود کر جانا بھی قابل سزا و اعتراض تھا تو اور دونوں ہی صورتوں میں اس کی نوکری نہیں رہے گی۔

''میں سمجھ گئی چوکیدار نے اس ڈر سے نہیں بتایا کہ اس طرح اس کی اپنی کمزوری پکڑی جائے گی کہ وہ رات کو

جاگ کے نگرانی کرنے کے بجائے سویا رہتا ہے۔ لیکن تمہارا اس طرح گیٹ کھول کر جانا بھی تو مناسب نہیں ہے اب کیا کیا جائے تمہیں پھر سے ملازمت پر رکھنا ناممکن ہے۔'' صنوبر کے لہجے میں اس کے لیے جو تشویش تھی وہ اسے اچھی لگی وہ اس کی فکر کر رہی تھی۔ لیکن بات اس کی ٹھیک تھی اب اس کی ملازمت کا کیا ہوگا۔

''تم بھی سوچو میں بھی سوچتی ہوں کہ تمہیں کس طرح پھر سے ملازمت پر رکھا جا سکتا ہے؟'' صنوبر نے کہا اور پھر سے بولی۔

''تم اس وقت بھی میرے کمرے تک آ گئے اور تمہیں کسی نے نہیں دیکھا کیا چھلاوہ ہو یا سلیمانی ٹوپی پہن کر گھومتے ہو۔''

''یہ تو عام بات ہے۔ صنوبر بی بی آپ کی ماما اوپر اپنے کمرے میں ہیں۔ سلمان صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ سلمٰی کچن میں کام کر رہی ہے۔ اور آپ کے پاپا'' اس نے وضاحت کی۔ ''میں نے سوچا پہلے آپ سے مل لوں کیونکہ میں آپ سے ہی چھٹی لے کر گیا تھا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب یہ تو سوچو تمہیں معافی کیسے ملے گی۔ تمہارا جرم کوئی چھوٹی بات نہیں ہے اگر تمہارے جانے کے بعد گھر میں خدانخواستہ چوری ہو جاتی تو کیا ہوتا۔'' صنوبر نے فکرمندی سے کہا۔

''وہ تو ہو ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ میں....'' ایک دم ہی اسے خیال آیا کہ اس کے منہ سے اس کا راز فاش ہونے لگا تھا۔ اس لیے اس نے فوراً ہی بات بدلتے ہوئے کہا۔ ''اصل میں میں نے آیت الکرسی پڑھ کر دروازے کا حصار کھینچ دیا تھا۔ ایسا کرنے سے چور یا غلط ارادے یا نیت سے گھسنے والا کوئی بھی آدمی داخل نہیں ہو سکتا۔'' اس کی بات سن کر صنوبر کو اس کی معصومیت پر جیسے ایک دم ہی ڈھیروں پیار آ گیا۔

''کیا واقعی ایسا ہے؟ تمہیں یہ بات کس نے سکھائی؟'' صنوبر کو اس کی باتوں میں دلچسپی ہونے لگی تھی۔

''میری ماں نے ہم تو ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں۔'' وہ رسانیت سے بولا۔

''پھر تو تمہارے پاس ایسی کوئی آیت بھی ضرور ہوگی جو غلطی کی معافی دلا سکتی ہو؟'' صنوبر نے پتا نہیں کیوں مگر اسی لمحے یہ سوچ لیا کہ اس کے یقین کا امتحان لینا چاہیے اگر تو وہ ٹھیک کہہ رہا ہے تو اسے آزمانا چاہیے اس میں اسے خود بھی کافی فائدہ نظر آیا۔ اس طرح خود اس کے پاس بھی دو ایسے قرآنی نسخے جمع ہو سکتے تھے جو وقت پڑنے پر شاید کبھی کام آ سکیں۔

''جی ہے ایسی بھی ایک آیت ہے'' وہ جانتا تھا کہ اسے کس شکتی سے کام لینا ہے۔ لیکن یہ بھی غلط نہیں تھا کہ قرآنی نسخوں میں بھی ایسی بہت سی تاثیریں چھپی ہوئی ہیں جو زندگی کے کئی مسائل کا حل ہیں۔

''بس تو پھر سمجھو کام بن گیا۔ ماما کے پاس چلتے ہیں تم ان پر وہ آیت پڑھ کے پھونک دینا جس سے وہ تمہیں معاف کر دیں اور یوں تمہاری جاب پھر سے بحال ہو جائے گی۔'' وہ بولی اور ساتھ ہی اسے ایک اور بات یاد آئی۔ ''لیکن ایک شرط پر تم مجھے بھی یہ دونوں آیتیں سکھاؤ گے۔ بولو منظور ہے؟''

''جی منظور ہے۔ ویسے آپ کو تو میں بنا شرط کے بھی سکھا سکتا ہوں'' حماد نے ایسی اپنایت سے کہا کہ صنوبر نے اس کا گال چھو کر اسے پیار کیا اور حماد جو دراصل سلمان تھا نشے میں جھوم ہی تو گیا۔

''اب چلو کھڑے کیوں ہو؟'' صنوبر نے کہا تو وہ ہوش و خرد کی دنیا میں واپس آ گیا۔

''جی........!!!'' وہ جلدی سے اس کے ساتھ ہو لیا۔

☆☆☆

فارس اس دن کی بات سوچ کر غصے سے اب تک پھنک رہا تھا۔ اس دن اس نے سلمان سے تو صنوبر کو ڈراپ کرنے کی اجازت لے لی تھی لیکن صنوبر کسی بھی قیمت پر اس کے ساتھ جانے پر راضی نہیں ہوئی۔ اس نے لاکھ کہا کہ میں سلمان کا دوست ہوں اور مجھے آپ کو پک کرنے کے لیے سلمان نے ہی بھیجا ہے۔ مگر وہ نہیں مانی اور اپنی ایک

دوست کے ساتھ جو اسکول فیلو بھی تھی بیٹھ کر چلی گئی۔ یہ ذلت ایسی تھی جس نے اس کی راتوں کی نیندیں چھین لی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

ڈھیر ساری شراب پینے سے بھی اسے سکون نہیں ملا۔ صنوبر جتنا اس کی پہنچ سے دور ہوتی جا رہی تھی اتنا ہی اس کے دل میں اسے پانے کی آرزو اور شدت سے مچل مچل اٹھتی۔ جو کچھ بھی ہو صنوبر کو اس کی ہونا ہی ہوگا۔ یہ خیال اسے لمحاتی تسکین تو دیتا تھا لیکن ایسا کب ہوگا اور کس طرح ہوگا یہ ابھی وہ نہیں جانتا تھا۔

اس رات وہ اسی بے چینی سے کبھی ٹہلنے لگتا کبھی بستر پر آ کر کروٹیں بدلنے لگتا نرم گرم بستر اسے آگ کی طرح جلاتا اور اس کا سارا جسم جیسے جھلسنے لگتا۔ وہ بالکونی میں جا کے کھڑا ہو جاتا اور دور تک ٹھہری ہوئی رات کو بے دھیانی سے دیکھنے لگتا اسے گھور اندھیرے میں بھی صنوبر کا روشن اور چمکتا ہوا چہرہ دکھلائی پڑتا اس کی بے چینی سوا ہو جاتی۔ تب اس نے اپنے بپھرے ہوئے جذبات کی تسلی کے لیے ایک ارادہ باندھا اور اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ صنوبر اسے ملے یا نہ ملے مگر وہ صنوبر کو کسی اور کا ہونے نہیں دے گا چاہے اس کے لیے اسے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔

رات اپنے ہی سروں میں بہتی رہی بے پروا اور ہر بات سے بے نیاز وقت ہوتا ہی ایسا ہے جو کسی کی پروا نہیں کرتا وہ چاہے فارس رحمان ہو چاہے شرجیل سب کے اوپر سے گزرتا چلا جاتا ہے۔

☆☆☆

یہ بھی اسی دن کا ذکر ہے جب شرجیل اسکول نہیں آیا تو صنوبر کو اس کی بڑی بھاری فکر لاحق ہوئی۔ رات بھر وہ اسے فون کرتی رہی تھی اور یہ سوچ کر اسکول آئی تھی کہ یہاں تو اس کی ملاقات شرجیل سے ضرور ہو جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا اور اس کا دل انجان دکھوں سے لبالب بھر گیا کہ شرجیل تو کبھی چھٹی کرتا ہی نہیں تھا۔ کرتا بھی تھا تو اسے ایک دن یا اس سے بھی پہلے بتا دیا کرتا تھا۔ پھر اب شرجیل کو کیا ہوا۔ کہیں وہ پھر سے بدلنے والا تو نہیں۔ اس خیال کو صنوبر نے فوراً ہی رد کر دیا۔ ایسا نہیں ہو سکتا اسے یقین تھا شرجیل اسے نہ ہی کبھی دھوکا دے گا اور نہ ہی چھوڑے گا۔ لیکن اتنا تو ضرور ہوا ہے کہ وہ کسی ایسی مشکل میں ہے جس نے اسے اتنا پریشان کر دیا ہے۔ اس کی ماں درشہوار پہلے ہی شرجیل کے بارے میں عجیب ہمت توڑنے والے خیالات کا اظہار کر چکی تھی صنوبر جانتی تھی اس کی ماما اس کی دشمن نہیں ہیں مگر وہ اپنی عادت سے مجبور ہیں جو انہیں ہر محبت کرنے والا بے اعتبار اور خود غرض نظر آتا ہے ایسا اس لیے تھا کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کو کبھی اتنی بھی محبت نہیں دی تھی جو اسے محبت پر اعتبار کرنا سکھا سکتی۔ لیکن اسے دوسروں کی زندگیوں پر اختیار نہیں تھا کم سے کم اپنے ماں باپ کی زندگیوں پر تو بالکل سے نہیں تھا وہ جو چاہتی تھی اس پر عمل ہوتا دیکھنا اس کے بس میں نہیں تھا پھر بھی اس نے اپنی حد سے زیادہ کڑوی اور تلخیوں سے بھری ہوئی ماں کو صبر کرنا اور ماں ہونا سکھا دیا تھا اسی لیے اب درشہوار پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ اچھے رویوں کے ساتھ جی رہی تھی۔ درشہوار کے ان رویوں کی تبدیلی کو اس کے باپ آصف کریم نے بھی محسوس کر لیا تھا اسی لیے ان کا رویہ بھی اس کی ماں سے اوپری طور پر کسی قدر پہلے کے مقابلے میں نرم اور اچھا ہوتا جا رہا تھا۔ صنوبر یہ سب محسوس کر کے خوش ہونا چاہتی تھی کہ اس کے گھر میں تبدیلی آ رہی تھی یہاں اس گھر میں رہنے والے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے تھے لیکن زندگی پر بھی انسان کا بس کہاں چلتا ہے پتا نہیں کہاں سے مصیبتیں اور انہونی باتیں در آتی ہیں اور اپنا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔

سلمان کی اس دن کی رات کو ہونے والی لہولعب کی اس تقریب نے بہت کچھ پھر سے تبدیل کر دیا تھا۔ سلمان جو دھیرے دھیرے گھر میں آنے والی تبدیلیوں کے اثر میں آنے لگا تھا اس رات کے بعد سے وہ پھر پہلے جیسے رویوں کا شکار ہو چکا تھا۔ اس رات کی تلخی کا اثر وقت کے ساتھ کم ہونے کی توقع بھی اس وقت جاتی رہی جب سلمان نے صنوبر سے اپنے دوست فارس سے شادی کرنے کی بات کی۔ صنوبر سمجھ گئی کہ اس کا بھائی کن لوگوں کے ہاتھوں کا کھلونا ہے۔

انسان چاہے کتنا ہی دیالو کیوں نہ ہو کوئی تو ایسی چیز ہوتی ہی ہے جسے وہ چاہے بھی تو کسی کو نہیں دے سکتا اور

صنوبر بھی اپنی محبت اور اپنا شرجیل کسی کو نہیں دے سکتی تھی حتیٰ کہ اپنے بھائی کو بھی نہیں۔ اس نے کبھی اس بات پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ اس کی کلاس میں کس قدر مفادات سے لتھڑی ہوئی زندگیوں کا چلن ہے یہاں اپنے مفاد کے لیے کچھ بھی چھوڑا اور جوڑا جاسکتا ہے۔ اپنے فائدے کے لیے شادیاں اور رشتے داریاں سب کاروباری بنیادوں پر ہوتی ہیں اسی لیے زیادہ تر گھر ایسے تھے جہاں رشتوں کے وہ معنی ہی نہیں تھے جو ہونے چاہییں۔ آدمی چھپ چھپ کے افیئر چلاتے تو عورتیں بھی اسی قسم کی سرگرمیوں میں مصروف رہتیں اس کا صاف مطلب تھا کہ آدمی اور عورت دونوں اپنے رشتوں سے مطمئن اور خوش نہیں تھے ایسے ہی دو کردار خود اس کے گھر میں بھی تھے۔

وہ اسکول سے گھر پہنچی تو اس کی حیرت کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ شرجیل اپنی ماں کے ساتھ اس کے گھر آیا ہوا تھا۔ بے پناہ مسرت ہوئی۔ اس کی ماں درشہوار ان سے نہایت خوش اخلاقی سے پیش آرہی تھی۔ صنوبر کو دیکھ کر درشہوار نے ایسے ری ایکٹ کیا جیسے وہ اس کی بیٹی نہیں اس کی دوست ہو۔

شاید درشہوار کے مثبت ہوتے رویوں نے اسے یہ سکھا دیا تھا کہ خود کو محبت نہ ملے تو اس کا بدلہ دوسروں سے لینے کے بجائے کوشش یہ کرنی چاہیے کہ کوئی دوسرا محبت سے محروم نہ رہے اور صنوبر تو کوئی دوسری نہیں بلکہ اس کی اپنی بیٹی تھی جس کی خوشیوں کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتی تھی وہ چاہتی تھی کہ جو زندگی اس نے گزاری ہے محبت اور توجہ سے خالی ایسی زندگی اس کی بیٹی کو نہیں گزارنی چاہیے اس لیے وہ شرجیل کا رشتا آنے پر ایسی خوشی میں مبتلا ہوچکی تھی جس کا وہ اظہار نہ بھی کرے تب بھی پتا چل رہا تھا کہ وہ کس قدر خوش ہے۔

دونوں عورتیں ایک دوسرے سے بچوں کی شادی کے بارے میں اور سوسائٹی کے بارے میں طولانی گفتگو میں بزی ہوگئیں تو شرجیل اٹھ کر صنوبر کے پاس چلا آیا۔ صنوبر اس سے ناراض ہونا چاہتی تھی لیکن اس طرح یوں اچانک ملنے والی اس خوشی سے اسے ضرور ہاتھ دھونا پڑتے۔ اس لیے وہ ناراضگی کو ظاہر نہیں کررہی تھی۔

''یہ کیا حرکت ہے۔ سرپرائز دینے کا یہ کون سا طریقہ ہے کل سے اب تک تم نے میری جان ہی تو نکال دی تھی اور اب یوں.....'' وہ بولی۔

''تم نہیں جانتیں میں کتنی ٹینشن سے گزرا ہوں۔ لیکن اب اس گزرے وقت کو جانے دو اور اپنے آنے والے کل کے بارے میں سوچو۔ آج ملنے والی خوشیوں کے بارے میں سوچو۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ شاید تمہاری ماما ہم سے اچھی طرح پیش نہیں آئیں گی اور شاید انھیں اس رشتے پر بھی کچھ تحفظات ہوں مگر انھوں نے تو مجھے حیران کردیا ہے۔'' شرجیل نے بکھرے ہوئے انداز سے کہا تو صنوبر کو لگا جیسے شرجیل کہنا کچھ چاہتا ہے اور خیالات بھٹک کر کہیں سے کہیں اسے لے جاتے ہیں اور وہ کبھی کچھ اور کبھی کچھ کہنے والی کیفیت کا شکار ہے۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ابھی ماما کی رائے کو سب کچھ نہیں سمجھا جاسکتا۔ وہ مجھے خوش دیکھنا چاہتی ہیں اور اس کے لیے انھوں نے طے کرلیا ہے کہ میں جو بھی کہوں گی جو بھی چاہوں گی وہ اسی کے ساتھ ہوں گی۔ مگر........'' صنوبر نے ایک ہی بات میں خوشی اور غمی دونوں کو سمو دیا۔

''مگر کیا......؟'' شرجیل نے دھیرے سے دریافت کیا۔

''فائنل فیصلہ تو پاپا ہی کو کرنا ہے۔ بس یہ اطمینان ہے کہ ماما کی رائے ہمارے حق میں ہونے کی وجہ سے وہ پاپا کو منانے میں اپنا پورا زور لگادیں گی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ بڑی مشکل تو سلمان ہے جو اس رشتے سے کبھی خوش نہیں ہوگا اور کوشش کرے گا کہ پاپا بھی اسی کا ساتھ دیں۔''

شرجیل یہ سن کر ایک دم ہی اداس ہوگیا۔ صنوبر نے اس کی آنکھوں میں وہ اداسی اور مایوسی دیکھ لی تھی۔ ''لیکن تم فکر مت کرو پاپا میری مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرسکیں گے۔ سلمان نے ان سے پہلے بھی بات کی تھی اپنے دوست کی دلچسپی اور اس کی حیثیت کے بارے میں بڑھا چڑھا کر بتایا تھا لیکن پاپا نے کہہ دیا تھا جو بھی ہو آخری فیصلہ تو صنوبر کو ہی کرنا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے صنوبر پھر بھی مجھے ایک انجان سا ڈر لگ رہا ہے جیسے ہم......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو۔ رک کیوں گئے اپنی بات پوری کرو شرجیل نہیں تو میں پریشان ہوتی رہوں گی پلیز'' صنوبر ایک دم سے فکروں میں گھر گئی۔

تب پھر بڑی مشکلوں سے شرجیل نے فارس اور اپنے باپ کے بارے میں وہ سب کچھ اسے بتادیا جو وہ بتانا نہیں چاہتا تھا اور جو کچھ اس نے پچھلے دو دنوں میں سہا تھا۔

''اوہ..... یہ تو بڑی پریشانی والی بات ہے... تب تو تمہارے ڈیڈی... اس رشتے پر آسانی سے راضی نہیں ہوں گے'' صنوبر نے سوچ کی لہروں میں تیرتے خوف کے سایوں کے درمیان سے کہا۔

''ہاں وہ شاید میری اس سوچ کو سپورٹ کرنا پسند کریں گے کورٹ میرج والی.... تاکہ انھیں فارس کے والد کو یہ کہنے میں آسانی رہے کہ میں نے ان کی بات نہیں مانی اور نافرمانی کرتے ہوئے تم سے رشتا جوڑ لیا ہے۔'' شرجیل نے دھیمے لہجے میں دکھ سے کہا۔

صنوبر چپ ہوگئی اور اسے لگا یہ بات تو اس کے باپ کے رضامند ہونے سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور کٹھن ہے۔ کورٹ میرج کے بارے میں اس کے ماں باپ کیسے راضی ہوں گے۔ ان کا موقف ہوگا کہ جب ہم راضی ہیں تو تمہیں کورٹ میرج کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کی ماں جو ابھی بہت خوش ہیں ان کے شرجیل کے بارے میں پہلے سے جو شکوک وشبہات ہیں وہ پھر سے اٹھانے لگیں گے یہ لڑکا جو تمہیں پہلے بھی چھوڑ کے جاچکا ہے کورٹ میرج کے بعد تو تم اور بھی زیادہ غیر محفوظ ہوجاؤ گی۔ وہ کیسے اپنے ماں باپ کو اس کورٹ میرج کے بارے میں بتا کر راضی کرسکے گی۔ اپنے عین قریب کھڑا ہوا شرجیل اچانک سے اسے بہت دور نظر آنے لگا۔ کچھ دیر پہلے اس کے چہرے پر جو گلاب کھل رہے تھے ایک ہی تیز جھونکے سے لرز کر مرجھانے لگے۔ شرجیل بھی سوچوں کی اتھاہ میں جاچکا تھا۔ دونوں دیر تک خاموشی سے یونہی کھڑے رہے اور درشہوار انھیں لنچ کے لیے بلانے آگئی۔ دوران لنچ سلمان بھی آگیا اور اس سے ان لوگوں کا تعارف کرایا گیا تو اس کے چہرے کا رنگ جیسے یکسر تبدیل ہوگیا۔ ناپسندیدگی اس کے رویے سے عیاں ہونے لگی اور وہ کھانے پر بھی نہیں بیٹھا۔ کچھ دیر بعد وہ آیا اور شرجیل کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اپنے کمرے میں یا ٹیرس پر یہ صنوبر نہیں جان سکی کیوں کہ اس وقت وہ اٹھ کر کچن میں آگئی تھی۔ واپس آئی تو شرجیل غائب تھا اسے درشہوار نے بتایا کہ سلمان اور شرجیل آپس میں کوئی بات کررہے ہیں۔ درشہوار کو اس وقت اس بات کا ادراک نہیں تھا کہ سلمان شرجیل سے کیا کہنے والا ہے لیکن صنوبر کو کچھ نہ کچھ اندازہ ہوچکا تھا کہ سلمان کیا کرنے والا ہے۔

واپس صرف شرجیل آیا اور اپنے رویے سے کچھ دیر پہلے ہونے والی تلخی کو ظاہر ہونے دینے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ صنوبر کو اندازہ ہوچکا ہے کہ اس کے بھائی نے اس سے کیا کہا ہے۔ پھر وہ وہاں زیادہ دیر رکا نہیں اور اپنی ماں کے ساتھ واپس چلا گیا۔

صنوبر سارا وقت پریشان رہی اور اس وقت بھی وہ پریشانیوں کے جنگل میں بھٹک رہی تھی جب حماد نے آکر اسے چونکا دیا۔ وہ لمحے بھر کو اپنا سارا دکھ بھول گئی اور حماد کو پھر سے ملازمت پر رکھوانے کے بارے میں مشغول ہوگئی۔

درشہوار نے حماد کو دیکھا تو ایک دم سے زور سے چلائی....

''یہ چور یہاں کیا کررہا ہے؟'' حماد اور صنوبر دونوں ٹھٹھک کر سیڑھیوں کے آخری اسٹیپ پر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

(ایک جن اور آدم کی محبت لیے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے سطر سطر زہر عشق لہو میں دوڑاتے، اس ناول کی اگلی کڑی ماہِ اپریل میں پڑھیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کُن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II - خیابانِ جامی - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی

عزیز بچو!

اللہ تم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ زندگی بہت تیزی سے گزرتی جارہی ہے۔ ایسے میں جب موقع ملے نیکی کما لینی چاہیے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی یہی عمل فائدہ دے گا۔ شکوے شکایات' نفرتیں صرف وقت کا زیاں ہے۔ زندگی بہت مختصر ہے یہ خوشیوں کے لیے ہی کم ہے پھر نفرتوں کے لیے وقت نکالنا تو سراسر زیادتی ہے۔ سنی سنائی باتوں پر یقین کرکے رشتے خراب کرنا مومن کو زیب نہیں دیتا۔ میں اپنے تمام پڑھنے والوں سے درخواست کروں گا کہ ایک دوسرے کے لیے دل میں جگہ رکھیں۔ جب فاصلے بڑھتے ہیں تب شیطان درمیان میں آجاتا ہے۔ لہٰذا دلوں میں ایک دوسرے کے لیے خلوص اور اعتماد رکھنا ہی بہتر ہے۔ نماز کی پابندی دلوں کو سختی سے بچاتی ہے۔ صدقہ خیرات جہنم کی آگ سے بچاتا ہے۔ بس فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ سورۃ الم نشرح' سورۃ واقعہ' سورۃ رحمٰن' کو اپنی زندگی کے شب و روز میں شامل کرنے والوں کے لیے خیر ہی خیر ہے۔ برکت ہی برکت ہے۔

□ مائدہ۔ کوئٹہ

○ محترم بابا جی السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش اور سلامت رکھے۔ آج میں آپ کی خدمت میں ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ امید ہے آپ مجھے اس کا جواب مارچ کے شمارے میں ضرور دیں گے۔ بابا جی میری عمر 30 سال ہے لیکن ابھی تک کافی کوشش کے باوجود میرا رشتہ کہیں طے نہیں ہو پارہا ہے۔ بابا جی آپ مجھے ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میری شادی کسی اچھے گھرانے میں ہوجائے۔ بابا جی آپ مجھے وظیفہ ضرور بتایئے گا اور میں آپ سے تعویذ نہیں منگوا سکتی۔ بابا جی آپ مجھے ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میرا مسئلہ جلد از جلد حل ہوجائے۔

☆ بیٹی مائدہ! بعد نماز فجر ایک بار سورۃ احزاب پڑھو اور دعا کرو نماز کی پابندی وظیفے کی کامیابی کے لیے بہت ضروری ہے۔ جس قدر ممکن ہو درود شریف پڑھو۔ مدت ایک ماہ ہے انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔

□ کرن شبیر۔ کراچی

○ بابا جی امید کرتی ہوں مزاج بخیر ہوں گے۔ بابا مجھے اپنے گھر کے حوالے سے استخارہ کروانا تھا۔ بہت سے مسئلے ہیں۔ میرے ابو سعودی عرب میں اچھا کماتے ہیں پر ان پر سفلی علم کرادیا ہے کسی نے، ان کا بس یہی کہنا ہے کہ کراچی چھوڑ کر گاؤں جاؤں۔ ہم بہن بھائی یہاں تعلیم حاصل کررہے ہیں ساتھ ہی جاب، کیونکہ وہ گھر کو سپورٹ نہیں کرتے، امی ٹینشن لے لے کر دل کی مریضہ بن گئی ہیں۔ ہم ان سے پیسے بھی نہیں مانگتے۔ اپنا کماتے ہیں پر ذہنی سکون نہیں، دوسرے میں جہاں شادی کرنا چاہتی ہوں۔ وہ پٹھان ہے مگر میرے گھر والے نہیں مان رہے۔ وہ باعزت طریقے سے رشتہ لانا چاہتا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا؟ کوئی ایسا عمل بتائیں یا تو میرے ابو ٹھیک ہوجائیں یا وہ میرے دل سے نکل جائے۔ میں اپنے والدین کے خلاف کبھی نہیں جاسکتی، امی بہت ساتھ دیتی ہیں مگر ابو جب بھی بات کریں گے امی کو طلاق دینے کی، ہر عمل کرا کے دیکھ لیا وظائف کیے، مگر ان پر کالا جادو ہے۔ اب آپ ہی کوئی وظیفہ بتائیں جس سے گھر میں سکون ہو اور برکت ہو، ایک بات اور اگر آپ سے ملنا ہو

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: 88-C II ۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 35893121-021

تو رابطہ نمبر ہو تو طریقہ کار بتا دیجیے میری والدہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔ ہر پل ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ خداوند تعالیٰ آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سر پر سلامت رکھے، دعاؤں میں اس بیٹی کو یاد رکھیے گا۔

☆بیٹی کرن! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ موجودہ صورتحال دیکھتے ہوئے میں تمہیں نصیحت کروں گا مجھ سے دو عدد تعویذ منگوالو ایک اپنے لیے اور ایک اپنے والد کے لیے..... طریقہ کار بہت سہل ہے۔ سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلوم کرلو یا پھر مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو میں تفصیل سے جواب دے دوں گا۔

□ ثانیہ۔حیدر آباد

○ بابا جی! یہاں میری ایک بہت اچھی دوست ہیں' وہ آپ کو بڑی پابندی سے خط لکھتی ہیں۔ اُن کے ذریعے آپ کا پتا چلا۔ بابا جی! میں اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ شادی کو 13 سال ہو چکے ہیں۔ اَب تو خود بھی کبھی کبھی امید جواب دے جاتی ہے مگر پھر ایک آس سی بندھ جاتی ہے۔ بابا جی! آپ کو اپنے رَب کا واسطہ' میری مدد کریں اور مجھے ایسا جلالی تعویذ دیں جس کی بدولت میں اولاد کی نعمت پالوں اور لوگوں کی طنز اور ترحم بھری نظروں سے بچ سکوں۔ اصل میں میرے میاں بھی اکلوتے ہیں اور میں بھی ایک ہی اولاد ہوں۔ بابا جی! پلیز' مجھے تعویذ بھجوا دیں' یہ آپ کا بڑا احسان ہوگا۔

☆بیٹی ثانیہ! اللہ تمہاری دُعا قبول فرمائے۔ بیٹی! میں کلامِ الٰہی دیتا ہوں مگر کامیابی صرف انہی لوگوں کو ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسا رکھتے ہیں اور خوشی اور غم دونوں میں اس کے شکر گزار رہتے ہیں۔ تم مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو اور تھوڑی سی تفصیل بھی اِرسال کرو۔ اپنی عمر' اپنے شوہر کی عمر' مکمل نام اور والدین کے مکمل نام۔ اللہ پر مکمل اعتقاد رکھو' وہ ضرور کرم کرے گا۔

□ شاہد سعید۔کراچی۔

☆بیٹے شاہد......! نہ تو ملتا ہوں اور نہ ہی کوئی آستانہ رکھتا ہوں۔ عام سا انسان ہوں بس قرآن مجید سے کتنا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے' لوگ بھول گئے ہیں۔ میں یاد دلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم میری خدمت کی بجائے اپنے والدین اور گھر والوں کی خدمت کرو اور اُن کی ذمے داریاں پوری کرو' یہ بھی جہاد ہے۔

□ نورین۔فیصل آباد۔

○ بابا جی! میں بہت دُکھی عورت ہوں۔ بیوہ ہوں' تین بچے ہیں' شوہر کی ساری جائیداد پر پہلی بیوی نے قبضہ کر رکھا ہے۔ میں سارے خاندان میں دھکے کھاتی پھرتی ہوں۔ بابا جی! خود سوچیے' تین بچوں کے ساتھ مجھے کون برداشت کرے گا؟ پھر سچ بھی ہے' مہنگائی نے سب کو تنگ کر دیا ہے۔ میرے رشتے کے بہنوئی ہیں' وہ خاموشی سے میری مدد کرتے ہیں مگر وہاں بھی لوگ عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں۔ ڈرتی ہوں' کسی دن انہیں پتا چل گیا تو یہ آسرا بھی جائے گا۔ بابا جی! آپ کے پڑھنے والے باہر ملکوں میں بھی رہتے ہیں' کیا اُن کے دل میں بھی اتنی جگہ نہیں کہ وہ ہم جیسوں کے لیے ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم بھجوا دیا کریں۔ کم از کم آپ سے مدد لیں گے تو لوگ انگلیاں تو نہیں اٹھائیں گے۔ کچھ عرصہ ایک خاتون میری مدد کرتی رہیں مگر جب ڈاک خانے والوں کے انداز مجھے بدلے بدلے لگے تو میں نے بھائی کو بھیجنا شروع کیا' بس وہ دن ہے اور آج کا دن' مجھے کچھ نہیں ملا۔ بابا جی! آپ تو اللہ کے نیک بندے ہیں' لوگ آپ کی بات مانتے بھی ہیں' اُن سے کہیں کہ پاکستان میں بہت غربت ہے اور مجھ جیسی عورتیں تو اپنے بچوں کے ساتھ خودکشی بھی کرلیں گی تو بتائیں' اِس کا ذمے دار کون ہوگا؟ اتنی بڑی دنیا میں بابا جی! ہم چار لوگوں کے پاس کھانے کو نہیں' اور لوگ کتنے خوش رہتے ہیں۔ بابا جی! مجھے معاف کر دیں' میں آج اتنا روئی ہوں۔ پچھلے سال تک فکر ہی نہیں تھی کہ بچے عید کیسے منائیں گے مگر اَب دل پھٹ رہا ہے۔ بابا جی! کچھ مت بتائیے' صرف صبر کی دُعا بتائیے تاکہ ہم دنیا کی ضروریات سے آشنائی ہی چھوڑ دیں۔

☆ بیٹی نورین! تمہارا خط پڑھ کر بہت دُکھ ہوا۔ تمہارے سوال کا جواب میرے پاس بھی نہیں۔ کچھ عرصے پہلے تک میرے کچھ بچے بہت خیال کرتے تھے۔ رمضان اور پھر عید کے بعد یتیم بچیوں کی شادی کا مگر شاید اَب وہ بھی زندگی میں بہت مشغول ہو گئے ہیں' یہ بھول گئے ہیں' ساتھ صرف اَعمال جاتے ہیں۔ ایک تکلیف دہ صورتِ حال اور بھی ہے' ڈاک خانے والے لفافے کھول

کر خط پھاڑ دیتے تھے' اِس لیے میں سب کو یہی نصیحت کرتا ہوں کہ لفافے میں صرف خط اور جوابی لفافہ رکھیں۔ بیٹی! تم اللہ سے صبر مانگ رہی ہو' وہ تمہیں صبر ضرور دے گا۔ سورۃ البقرۃ آیت 39 بکثرت پڑھا کرو اور بیٹی! ایک بات پھر کہوں گا کہ دنیا میں اچھے لوگ ہیں' شاید اِسی لیے دنیا چل رہی ہے۔ ہمت رکھو' اور صبر رکھو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

□ نظیر احمد۔حضرو۔

○ بابا جی! میرا تعلق ایک حساس ادارے سے ہے۔ نوکری کے سلسلے میں اکثر گھر سے دور رہتا ہوں۔ ایک عجیب سے احساس نے گھیر رکھا ہے۔ مجھے لکھتے ہوئے دُکھ ہو رہا ہے اور شرم بھی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اپنی بیوی پر شک ہے۔ اس کا رویہ بھی عام عورتوں جیسا نہیں ہے۔ لکھنا چاہوں تو شاید صفحے بھر جائیں۔ آپ سمجھ جائیں کہ میں شوہر ہو کر سمجھتا ہوں کہ وہ میری موجودگی سے خوش نہیں رہتی۔ بس میرے کم لکھے کو بہت جانیں اور میری مدد کریں۔

☆ بیٹے نظیر! شک کا علاج ممکن نہیں۔ تم اگر اپنی بیوی سے کھل کر اِس مسئلے پر بات کرلو تو بہتر ہے۔ ایسے مسائل بہت بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ بات کرلو اور اپنا رویہ بھی درست کرلو۔

□ صائمہ۔UK۔

○ بابا جی! اِس سے پہلے بھی آپ سے رابطہ کیا تھا' اَب پھر آپ کو انشورڈ لیٹر بھیجا مگر جواب ندارد...... میرا مسئلہ بہت سنگین ہے' بتائیے کیا کروں؟

☆بیٹی صائمہ......! تمہارا یہ پہلا خط ہے جو مجھے ملا اور یہ دو سطریں بھی اِس لیے پڑھ پایا کہ یہ تم نے لفافے کے اندر لکھی تھیں۔ تم نے یقیناً ہدیہ لفافے میں رکھا جو یہاں نکال لیا گیا اور تمہارا خط پھاڑ دیا گیا۔ بتاؤ' اَب میں مسئلہ جانے بغیر کیا جواب دوں؟ جانتا ہوں' تم لوگ اتنی دور سے خط لکھتے ہو' یقیناً جواب نہ ملنے پر کوفت ہوتی ہوگی۔

□ ریحان۔ایبٹ آباد۔

○ بابا جی! پچھلا ماہ کراچی آنا ہوا تھا مگر آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ روزگار کے سلسلے میں آپ سے وظیفہ لیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے' اَب روزگار سے ہوں۔ پہلی تنخواہ پاتے ہی رَب کے بعد آپ کا شکریہ اَدا کیا۔ اللہ آپ کو اِسی طرح ضرورت مندوں کی مدد کرنے کی توفیق دیتا رہے۔

☆ بیٹے ریحان......! اللہ کا شکر اَدا کرتے رہو اور اس کے بندوں کا بہت خیال رکھنا۔ اللہ اپنے ان بندوں سے بہت محبت کرتا ہے جو اس کے بندوں سے محبت کرتے ہیں۔ نماز کی پابندی رکھنا اور صدقہ خیرات بہت دینا۔

□ فریدہ۔منڈی بہاؤالدین

○ بابا جی! میرا مسئلہ بڑا شدید ہے۔ میں جس لڑکے کو پسند کرتی ہوں' وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے مگر میرے گھر والے اِس رشتے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ بابا جی! وہ لوگ پنجابی ہیں اور ہم پٹھان۔ ہم ایک دوسرے سے سچی محبت کرتے ہیں اور کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ آپ ہمیں تعویذ تیار کر دیں۔ جتنا ہدیہ کہیں گے' میں دوں گی۔ بس میرا کام کر دیں۔

☆بیٹی فریدہ......! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ میرے لیے بہت سہل ہے کہ تمہارے لیے تعویذ تیار کر دوں مگر جو میں دیکھ رہا ہوں وہ تم نہیں دیکھ سکتیں۔ بیٹی جو بچے والدین کی مرضی کے خلاف جاتے ہیں ان کو قسمت میں سوائے پچھتاوے کے اور کچھ نہیں ملتا۔ تمہیں بھی نصیحت کروں گا کہ بکثرت استغفار پڑھو تاکہ شیطان حاوی نہ ہو۔ کسی کو پسند کرنا جرم نہیں مگر والدین کی نافرمانی گناہ ہے۔ والدین کا تجربہ اولاد سے بہت زیادہ ہوتا ہے پھر وہ محبت بھی کرتے ہیں۔ ایسے میں ان سے بہتر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ کوئی جذباتی قدم مت اٹھانا والدہ سے بات کرو اپنی پسند سے آگاہ کرو اور اُن کی ناپسندیدگی یا اعتراض کی وجہ مجھے تحریر کرو' میں تمہیں بتاؤں گا کہ درست قدم کیا ہوگا۔

□ عنبرین۔لندن

○ بابا جی! میں شادی کے بعد پہلی بار یہاں آئی ہوں۔ گھر والوں سے دور ہونے کی وجہ سے ویسے ہی اَپ سیٹ رہتی ہوں مگر میرے سسرال والوں کا رویہ بھی

بہت عجیب ہے۔ میرے شوہر جاب سے واپسی کے بعد کمپیوٹر پر بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمارے تعلقات بھی واجبی سے ہیں۔ باباجی! میرا یہاں دَم گھٹتا ہے۔ میں واپس اپنے گھر آنا چاہتی ہوں۔ پلیز' میری مدد کریں۔

☆بیٹی عنبرین......! تم نے یہ نہیں لکھا کہ تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟ ابتداء میں مشکلات آتی ہیں' لوگ ایک دوسرے کو سمجھ ہی رہے ہوتے ہیں۔ صبر سے کام لو' اپنے شوہر سے اِس مسئلے پر بات کرو۔ بیٹی......! یاد رکھو' تمیز اور طریقے کے دائرے میں کی گئی ہر بات اَثر رکھتی ہے۔ اپنے گھر والوں کو پریشان مت کرو اور خود بھی مت ہو۔ حالات کا مقابلہ کرو اور انہیں اپنے حق میں کرو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 11-11 بار پڑھو' سورۃ البقرۃ آخری رُکوع پھر دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ ساجدہ۔ بھیر کنڈ' مانسہرہ۔

o باباجی! میں آپ کی وہی بیٹی ہوں جس نے پسند کی شادی کے لیے آپ سے تعویذ مانگا تھا' لیکن آپ کے انکار پر 3 ماہ پہلے ہم دونوں نے کورٹ میرج کرلی۔ کچھ عرصہ تو بات چھپی رہی مگر اَب کھل گئی ہے۔ دونوں خاندان ایک دوسرے کے دشمن ہوگئے ہیں۔ یاسر کو تو انہوں نے غائب ہی کردیا ہے اور وہ مجھ سے بھی رابطے میں نہیں مگر مجھے پتا چلا ہے کہ وہ اپنے والدین سے رابطے میں ہے۔ باباجی! خدا کے لیے' رَحم کریں۔ میں امید سے بھی ہوں۔ دنیا کو کیا منہ دکھاؤں گی؟ میرے لیے کچھ کریں۔

☆بیٹی ساجدہ......! جب تم نے خود اپنے آپ کو تباہ و برباد کرلیا تو میں کیا کرسکتا ہوں؟ جلد بازی نقصان دہ ہوتی ہے۔ بس اپنے لیے دُعا کرو' اپنے والدین سے معافی مانگو اور ہر نماز کے بعد بکثرت توبہ استغفار پڑھو' یہی بس اَب حل ہے......

□ نجمہ۔ خان پور۔

o باباجی! میں بہت پریشان ہوں' میری شادی کو 16 سال ہوچکے ہیں۔ یہ کوئی کم عرصہ نہیں ہوتا مگر میں نے ایک دن بھی سکھ کا نہیں دیکھا۔ شوہر ذلیل کرتے ہیں' کوئی بات نہیں سنتے' ساس بات بے بات منہ پر تھپڑ مارتی ہیں۔ باباجی......! بچے بڑے ہوگئے ہیں' اُن کے سامنے اتنی ذلت ہوتی ہے تو دل چاہتا ہے کہ خودکشی کرلوں مگر بچوں کا سوچ کر چُپ ہوجاتی ہوں۔ آپ لوگوں کو وظائف بتاتے ہیں۔ مجھے بھی بتائیں تاکہ میری زندگی میں بھی سکون آسکے۔

☆بیٹی نجمہ! سورۃ البقرۃ کی ابتدائی 3 آیات ہر نماز کے بعد پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ کنول۔ موسیٰ خیل۔

o باباجی! میری بڑی بہن کے ساتھ ایک مسئلہ درپیش ہے' وہ یہ کہ جب سے اُس کی شادی ہوئی ہے' تب سے وہ بہت پریشان ہے۔ مزید یہ کہ اُس کی شادی ہوئے گیارہ سال ہوگئے ہیں' اور وہ ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔ اُس کے سُسرال والے پہلے ہی اُس کے خلاف تھے' اَب تو اور بھی زیادہ ناراض اور خلاف رہتے ہیں۔ میری بہن کا شوہر شراب پیتا ہے اور جوا بھی کھیلتا ہے اور شراب پی کر گندی حرکتیں کرتا ہے' اور بہن پر دوسرے ظلم بھی کرتا ہے۔ اُس نے عیاشی کے لیے دو عورتیں بھی رکھی ہوئی ہیں۔ وہ میری بہن کو دھمکی دیتا ہے کہ میں تجھے چھوڑ دوں گا' لیکن چھوڑتا بھی نہیں ہے اور اُس نے زبردستی اپنی بہن سے میرے بھائی کی شادی بھی کروا دی ہے۔ پہلے تو میرا بھائی اِس شادی پر خوش تھا' لیکن اَب جبکہ اُس کے گھر اولاد بھی ہونے والی ہے' وہ کہتا ہے کہ میں اسے چھوڑ دوں گا۔ نجانے ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ برائے کرم ہماری کچھ مدد کریں' اِس کا حل بتائیں اور میں ہمیشہ آپ کے لیے دُعاگو رہوں گی۔

☆بیٹی کنول! اللہ تمہاری بہن کو اپنی اَمان میں رکھے۔ ایسے شیطان صفت آدمی کے ساتھ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اللہ نے عورت کو اختیار دیا ہے لہٰذا اپنا اختیار استعمال کرے اور علیحدگی اختیار کرلے' یہی مناسب ہے۔

□ سندس۔ یزمان۔

o قابلِ احترام باباجی! السلام علیکم! باباجی! میں اس سے پہلے بھی دیگر مسائل کے سلسلے میں آپ سے رابطے میں رہ چکی ہوں مگر باباجی! اس بار میں بہت مشکل اور دکھ سے بھرے ہوئے دل سے آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

"مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کرجاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کردیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کرجاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

بابا جی! میری بہن جس کا نام سحرش تھا' اُس کا آٹھ محرم کو انتقال ہوگیا ہے۔ وہ ماشاء اللہ' سے قرآنِ پاک پڑھی ہوئی تھی اور دین سے بھی اُس کو بہت محبت تھی اور نعتوں کا بھی بہت شوق تھا۔ بابا جی! میں جس مسئلے کی وجہ سے آپ کو خط لکھ رہی ہوں' وہ میرے لیے بہت مشکل اور ذہنی پریشانی کا باعث بن ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ عید کے بعد جو مہینہ آتا ہے خالی کے چاند کا' اُسی مہینے میں' میں نے تقریباً صبح کے وقت ایک بہت ہی عجیب خواب دیکھا' تاریخ مجھے یاد نہیں' میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ہیں' وہ ہماری بلڈنگ کے سامنے موجود ہیں اور لوگ بھی اُن کے گرد جمع ہیں۔ میں اور میری امی کہتے ہیں کہ آؤ چلو' دیکھتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے؟ تو ہم سامنے جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ بزرگ کے پاس ایک لڑکا لیٹا ہوا ہے اور وہ بزرگ اُس کی کھال اتار رہے ہیں مگر اُس لڑکے کو بالکل بھی تکلیف نہیں ہو رہی ہے اور پھر وہ لڑکا دیکھتے دیکھتے ہی قرآن شریف بن گیا اور قرآن شریف ایسا چمک رہا تھا جیسے چاند تو یہ دیکھ کر میں اور میری امی کہتی ہیں کہ...... ''یہ کیسے ہوا؟'' تو وہ بزرگ پیچھے مڑ کر مسکراتے ہیں اور میری امی سے کہتے ہیں کہ...... ''تو اپنی بیٹی کی خوشیاں نہیں دیکھ سکے گی اور ویسے بھی محرم تو آنے ہی والے ہیں۔'' اُس کے بعد فوراً میری آنکھ کھل گئی۔ بابا جی! اُس دن کے بعد سے مجھے بہت ڈر لگنے لگا تھا مگر پھر میں نے سوچا شاید یہ میرا وہم ہے مگر بابا جی! یہ میرا خواب بالکل سچا تھا۔ آٹھ محرم کی صبح کو میری بہن اٹھی۔ وہ بالکل ٹھیک تھی' منہ ہاتھ دھویا' بال بنائے' ناشتا کیا' بس دس بجے اچانک اُس کی طبیعت خراب ہوگئی۔ بابا جی! اُس کو بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی اور یہ ایسی گھبراہٹ تھی کہ میں شاید کبھی بیان نہ کرسکوں۔ ہم فوراً اُسے اسپتال لے کر گئے' وہیں پر اُس کا انتقال ہوگیا۔ بابا جی! اِس سے پہلے بھی میرے والد کو خواب میں محرم کے جلوس نظر آتے رہے ہیں۔ مجھے بھی بہن کے انتقال سے پہلے ماتمی جلوس نظر آیا تھا۔ کیا یہ خواب اسی حادثے سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر یہ کیا معاملہ ہے؟ بابا جی! آپ مجھے یہ ضرور بتائیں کہ اس خواب کا اس حادثے سے کیا تعلق ہے؟ ورنہ بابا جی! مجھے لگتا ہے کہ سوچ سوچ کر میں مرجاؤں گی یا پاگل ہوجاؤں گی۔ بابا جی! میرا خدا کے بعد آپ کے سوا کوئی آسرا بھی نہیں ہے جس سے میں اپنے دل کا حال بتاؤں۔ بابا جی! خدا گواہ ہے' بہن کے انتقال کے بعد لگتا ہے کہ جیسے زندگی ختم ہوگئی ہے' صرف سانس چل رہی ہے۔ بابا جی! مجھے بالکل بھی صبر نہیں آتا ہے۔ اتنا ایصالِ ثواب کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں کہ صبر کی مگر صبر نہیں آتا' صبر کی بھی کوئی دُعا بتائیں اور بابا جی! آپ اجتماعی دُعا میں میری بہن سحرش جس کا انتقال ہوا ہے' اُس کے لیے اور ہمارے لیے ضرور دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اُس کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ہمیں صبر عطا ہو۔ میرے اِس خط کا جواب اپریل کے شمارے میں ضرور شائع کیجیے گا۔ میں ایک ایک دن گن گن کر گزاروں گی۔ بابا جی! خط لکھنے میں کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معافی کی طلب گار ہوں۔

☆ بیٹی سندس! جو دنیا میں آیا ہے' اس کو واپس بھی جانا ہے۔ بعض اوقات خوابوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ بندے کو آنے والے حالات سے آگاہ کرتے ہیں۔ تم پریشان ہونے کی بجائے اپنی بہن کے لیے قرآن مجید پڑھ کر بخشا کرو۔ یقین کرو' بہت سکون ملے گا۔

□ آسیہ۔ اسلام گڑھ۔

○ محترم بابا جی! السلامُ علیکم! بابا جی! آپ نے ہزاروں لوگوں کے مسائل حل کیے ہیں۔ بابا جی! میرا مسئلہ شاید آپ کو اتنا بڑا نہ لگے مگر بابا جی! میرے لیے یہ بہت بڑا مسئلہ ہے' اس میں میرے ہزاروں آنسو شامل ہیں۔ برائے کرم مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتادیں جس سے میری والدہ کا مسئلہ حل ہو جائے۔ بابا جی! ہم نے اپنی والدہ کا بہت علاج کروایا مگر میری والدہ کو آج بھی معدے اور ہائی بلڈ پریشر کا مسئلہ ہے۔ میری والدہ کے معدے میں زخم ہیں جو کبھی کبھی شدید درد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ والدہ کبھی کبھی گھریلو مسائل کی وجہ سے اتنی ٹینشن لے لیتی ہیں کہ اُن کے دماغ کی نسیں پھٹنے لگتی ہیں۔ پلیز' بابا جی! مجھے میری والدہ کے اس مرض کا علاج بتادیں۔

☆ بیٹی آسیہ! شفا دینے والی ذات اللہ کی ہے۔ اپنی والدہ سے کہو غذا میں احتیاط کریں۔ دوپہر میں دہی میں اسپغول ملا کر ضرور کھائیں۔ پریشان ہونے سے مسائل ختم نہیں ہوتے بلکہ اور بڑھتے ہیں۔ اللہ پر اگر کامل یقین ہو تو انسان مطمئن رہتا ہے کہ دنیا میں بھیجا ہی گیا آزمائش کے لیے ہے لہٰذا خوشی پر خوش اور دُکھ پر صبر کرنے والے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ اپنی والدہ سے کہو' نماز کی پابندی کریں۔ بکثرت یَاشَافِعِیُ کا وِرد کریں اور ہر وقت باوضو رہیں۔ کرم ہوگا۔

□ فہمیدہ حسن' کھروڑ پکا

○ محترم بابا جی! السلامُ علیکم! میری شادی کو سات سال ہو چکے ہیں' چھے سال کا ایک بیٹا ہے مگر اِس کے بعد اولاد نہ ہو سکی۔ متواتر دو بار Miscarriages جو کہ دوسرے اور تیسرے مہینوں میں ہوئے۔ اس کے بعد سات مہینے میں بیٹے کی پیدائش مگر دو دن کے بعد ہی اُس کا انتقال ہوگیا۔ اُس کے بعد pregnancy کے تیسرے مہینے میں پھر .Miscarriage بہترین ڈاکٹروں کو دکھایا مگر سارے ٹیسٹ clear ہیں۔ ڈاکٹرز کوئی بھی وجہ بتانے سے قاصر ہیں۔ میں اپنے حالات سے بہت پریشان ہوں' سوچتی ہوں کہ کہیں کسی نے کچھ کر تو نہیں دیا ہے اسی لیے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ ایک اور بات یہ کہ میرے سسرال میں بچے بہت کم ہیں' بہت چاہنے کے باوجود بھی نند اور جیٹھانی کو ایک ایک اور بڑی نند کو دو بچے ہیں۔ اب تو سب بڑے ہو چکے ہیں۔ بابا جی! آپ میری مدد فرمائیں۔ اگر کوئی اثر ہے تو کیا آپ کوئی اشارہ دے سکتے ہیں؟ اپنے علم کی رہنمائی میں کیا مجھے بتا سکتے ہیں کہ میرے یہاں اور اولاد ہوگی یا نہیں؟ مہربانی فرما کر مجھے دُعائیں اور وظائف بھیجیں۔ میں اپنا اور والدہ کا نام تو بھیج رہی ہوں اور ساتھ ہی شوہر اور اُن کی والدہ کا نام بھی بھیج رہی ہوں۔ مہربانی فرما کر جلد از جلد میری مدد فرمائیں۔ میں بہت شکر گزار ہوں گی۔

☆ بیٹی فہمیدہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ مناسب ہوگا' مجھ سے اِس سلسلے میں تعویذ منگوالو۔

□ رحیمہ۔ KPK

○ بابا جی! السلامُ علیکم! سلام کے بعد عرض ہے کہ بہت امید لے کر آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں کہ ہمارے گھر زیادہ لڑکیوں کی پیدائش ہوتی ہے۔ ہم سات بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ ہم نے بھائی کی بہت کم عمری میں شادی کی ہے۔ بھائی کی بھی لڑکیاں ہیں اور ایک پانچ سال کا بیٹا ہے اور میرا بھی ایک بیٹا ہے۔ اس کی شادی کی ہے۔ ابھی بیٹے کی دو لڑکیاں ہوئی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ آگے کتنی لڑکیاں ہوں گی؟ بابا جی! اب اللہ کے بعد آپ کا آسرا ہے کہ آپ ہمیں ایسا وظیفہ یا تعویذ دیں کہ ہمارے خاندان میں لڑکوں کی پیدائش ہو۔ پتا نہیں کہ ہم سے ایسی کون سی غلطی ہوئی ہے کہ خدا نے ہمارا گھر لڑکیوں سے بھر دیا ہے اور ہم صوبہ سرحد کے رہنے والے ہیں جس میں قبائلی رواج کے مطابق خاندان میں مرد کم ہوں تو رشتے دار ظالم بن جاتے ہیں اور ہر طرح کا ظلم کرتے ہیں' نہ لڑکیوں کا رشتہ اپنی مرضی سے کر سکتے ہیں اور نہ جائداد وغیرہ بیچ سکتے ہیں۔ خدارا' بابا جی! ہمیں کوئی وظیفہ جلد از جلد بتائیں۔

☆ بیٹی رحیمہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ اولاد میں لڑکا ہو یا لڑکی' یہ تو اللہ کی رضا ہے۔ بندہ تو صرف دُعا ہی کرسکتا ہے۔ تمہیں نصیحت کروں گا' مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ تفصیل تعویذ کے ساتھ اِرسال کی جائے گی۔

□ صمد۔ راولپنڈی۔

○ بابا جی! آج بہت ہمت کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ معاشی مسائل سے تو عرصہ 6 سال سے نبرد آزما ہوں مگر اَب بیٹی کی بیماری نے بالکل توڑ کر رکھ دیا ہے۔ بابا جی! میری بیٹی کی عمر 20 سال ہے' اَب سے چھے ماہ پہلے تک وہ مکمل طور پر صحت مند تھی۔ ایک رات اچانک درد اٹھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے گئے' ٹیسٹ ہوئے جن سے پتا چلا کہ گردے صحیح کام نہیں کر رہے لہٰذا Dialysis ضروری ہے۔ ہفتے میں 3 دن بچی کے ساتھ اسپتال آتا ہوں۔ Dialysis کے لیے تو بابا جی! اس کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی' پھر اَب ڈاکٹرز Transplant کا کہہ رہے ہیں۔ اُن کے مطابق گردے آہستہ آہستہ ناکارہ ہو رہے ہیں اور اَب تک جو بھی علاج ہوا ہے' اُس سے فائدہ ہوتا نظر نہیں آ رہا لہٰذا گردے کی پیوند کاری ضروری ہے۔ بابا جی! اِس بات نے ہمارے ہوش اُڑا دیے ہیں۔ مالی وسائل اپنی جگہ مگر اِس مہنگے ترین علاج کے بعد بھی زندگی کی کوئی ضمانت

نہیں۔ باباجی! ہمارے خاندان کے لیے یہ بہت کڑا وقت ہے۔ میری بیوی کی حالت تو بہت خراب ہے۔ ہم چاہتے ہوئے بھی بیٹی کے سامنے اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتے۔ خدا کے لیے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس کی برکت سے معجزہ ہوجائے اور میری بیٹی پہلے جیسی صحت مند ہوجائے۔ باباجی! اِس وقت بھی میری آنکھوں میں آنسو ہیں' مجھ سے اپنا آپ ہی نہیں سنبھل رہا تو اُس بچی کی ماں کو کیسے سمجھاؤں؟ رحم کیجیے اور اِس مشکل وقت میں مدد بھی۔

☆ بیٹے صمد! تمہارا خط پڑھ کر بہت دُکھ ہوا مگر بیٹے! ہمت سے اِس آزمائش کا سامنا کرو۔ تمہیں اپنے اندر ہمت پیدا کرنی ہوگی ورنہ گھر کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ بیٹے! بے شک میڈیکل سائنس نے بہت ترقی کرلی ہے مگر اِس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اِن رپورٹوں کو حرفِ آخر سمجھ لے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بہت بے نیاز ہے' وہ جب چاہے' جسے چاہے' نواز دے۔ جہاں تک ممکن ہو' بچی کا علاج کرواؤ۔ اِس کے بعد کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کردو۔ دُعا اور دوا دونوں بہت ضروری ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر اَسباب بھی پیدا کرے گا۔ بس اپنا یقین پختہ رکھو۔ بعد نمازِ فجر اور عشاء 41-41 بار سورۃ فاتحہ پڑھ کر پانی پر دَم کرواور یہ پانی دو دو گھونٹ بیٹی کو پلاؤ۔ میں بھی خصوصی دُعا کا اہتمام کروا رہا ہوں' انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔ مجھے 41 دن بعد حالات سے آگاہ کرو۔

☐ روشانے۔ پنڈی۔

o باباجی! آپ کے بارے میں ''سچی کہانیاں'' میں پڑھا' دل چاہا' اپنا مسئلہ آپ کو بیان کروں۔ والد کچھ کرتے نہیں' میں نے DSC کیا ہے اور مزید آگے پڑھنا چاہتی ہوں۔ ہم پر قرضہ بھی بہت ہے۔ بھائی کوئی ہے نہیں لہٰذا مستقبل تاریک ہی نظر آتا ہے۔ آپ مدد کریں' اللہ کے نیک بندے ہیں' اللہ آپ کی ضرور سُنے گا۔

☆ بیٹی روشانے! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ کیا جن کے بھائی نہیں ہوتے' اُن کا مستقبل نہیں ہوتا؟ بیٹی......! اللہ نے عورت کو بہت طاقت ور بنایا ہے۔ وہ بیک وقت گھر بھی سنبھالتی ہے اور باہر کے معاملات بھی دیکھتی ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 7 تسبیح یَا خُجَتۃُ القائمُ کی پڑھو اور دُعا کرو۔ اللہ بہتر اَسباب پیدا کرے گا۔

☐ فیصل۔ پاک پتن

o باباجان! بہت پریشان ہوں۔ آپ جانتے ہیں' جھوٹے کیس میں مجھے پھنسا دیا تھا۔ غریب آدمی ہوں' پولیس اٹھا کر لے گئی اور ابھی تک عدالت میں بھی پیش نہیں کیا۔ خدا کے لیے' مجھ پر رحم کریں۔ یہ لوگ مجھ سے پیسا مانگتے ہیں' کہاں سے لاؤں؟ بیوی کو بھی تھانے آنے سے منع کردیا ہے۔ باباجان! دُعا کریں کہ میری پریشانیاں ختم ہوں۔

☆ بیٹے فیصل! تم بھی جانتے ہو کہ تم اپنی غلطی کی وجہ سے مشکل میں ہو۔ کسی پر اتنا اعتبار کرنا ہی نہیں چاہیے۔ آج کل کا دور ایسا نہیں۔ لوگ مدد کرنے والے کو ہی زیادہ دکھ دیتے ہیں۔ بہرحال میں تمہارے لیے خصوصی دُعا کروں گا۔ انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔ بس نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین ضرور پڑھو۔ اللہ حامی وناصر ہو۔ (آمین!)

☐ ا۔ب۔ کراچی

o بزرگ! میں نہیں جانتی کہ آپ میرے خط کا جواب بھی دیں گے یا نہیں؟ میں غیر مذہب سے ہوں جیسا میرے نام سے ظاہر ہے۔ ہر طرف سے مایوس ہوکر آپ سے رابطہ کررہی ہوں۔ تھوڑا سا یقین ہے کہ آپ مجھے اچھوت نہیں سمجھیں گے۔ مجھے آپ کی تیار کردہ دوا چاہیے۔ میرا چہرہ دانوں کی وجہ سے بہت خراب ہوگیا ہے۔ اگر دوا ارسال کرنے کا طریقہ کار بتادیں تو بہت شکرگزار رہوں گی۔

☆ بیٹی......! سب سے بڑا مذہب انسانیت ہے۔ دوا میں تیار کردوں گا مگر تم مجھے جوابی لفافہ ضرور ارسال کرو۔ دوا مستقل مزاجی سے استعمال کرنی ہوگی۔ ہمیشہ اپنے پیدا کرنے والے کا شکر اَدا کیا کرو۔ بے شک وہ بہت مہربان ہے۔

☐ قرأت۔ حویلیاں

☆ بیٹی قرأت! تمہارا مسئلہ اتنی شدید نوعیت کا نہیں ہے۔ تم نے سوچ سوچ کر اپنے آپ کو بیمار کرلیا ہے۔ روزانہ رات کو ایک گلاس گرم دودھ ضرور پیو ہمراہ دو کھجور ضرور کھاؤ۔ بکثرت یَاشَافِعیُ پڑھا کرو۔ انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔ اللہ ضرور مکمل شِفا عطا فرمائے گا۔

☐ بشریٰ۔ کوہاٹ

☆ بیٹی بشریٰ! مسلمان ہونے کے ناتے تمہیں قرآنِ پاک پڑھنا ضرور آنا چاہیے اور اِس کے لیے کوئی خاص عمر نہیں ہوتی۔ بہرحال تم تعویذ چاہ رہی ہو' اُس کے لیے مجھے براہِ راست خط لکھو۔

☐ ثمرین۔ کراچی۔

☆ بیٹی ثمرین! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ معاملات میں خاموشی رکھو اور ہر نماز کے بعد یَاحَافظُ یَاحَفیظُ کا بکثرت وِرد کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔ بیٹی! ابھی بہت کم وقت گزرا ہے لہٰذا صبر اور مستقل مزاجی سے معاملات کو سنبھالو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

☐ حدیقہ۔ شادی وال

☆ بیٹی حدیقہ! اللہ تمہیں مکمل شِفا دے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمٰن پڑھو اور ہاتھوں پر دَم کرکے ہاتھ چہرے پر پھیرلو۔ منفی سوچیں انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتیں۔ تکلیف بے شک تمہیں ہے مگر اِس کا علاج کرواور لوگوں سے ڈرو گی تو جیو گی کیسے؟ ہمارے چاروں طرف لوگ ہی تو ہوتے ہیں۔ بیٹی! اللہ پر بھروسہ رکھو اور دل لگا کر عبادت کرو اور صابر وشاکر رہو۔ مجھے 41 دن بعد مطلع کرو۔

☐ نگہت خان۔ مانسہرہ

☆ بیٹی نگہت! نماز کی پابندی رکھو۔ انشاء اللہ اللہ تعالیٰ خود بخود تمہاری غیبی امداد کرے گا۔ جتنی جلدی ممکن ہو۔ مجھ سے تعویذ منگوالو۔ بیٹی! اللہ پر بھروسا رکھو' وہ مہربان آقا ہے۔

☐ حمیرا۔ سکھر

☆ بیٹی حمیرا! تمہارا خط ملا' پڑھ کر اچھا لگا کہ تم بڑوں کی نصیحتوں پر عمل کرتی ہو۔ تمہیں حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعمَ الوَکِیل والا وظیفہ کرنا ہے۔ کوشش کرو کہ وظیفہ نامکمل نہ رہے۔ اگر ایسا ہوجائے تو پھر شروع کرو اور ہرحال میں مکمل کرو۔

ہائیڈ پارک

ذکی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

انمول موتی

اللہ تعالیٰ انسان سے فرماتا ہے۔ ''اے انسان! مجھ سے سوال کر کے تو دیکھ، بخشش کی حد نہ کردوں تو کہنا۔ میرے لیے بے قرار ہو کر تو دیکھ قرار کی حد نہ کردوں تو کہنا۔ مجھے رب مان کے تو دیکھ سب سے زیادہ بے نیاز نہ کردوں تو کہنا۔ میرے خوف سے آنسو بہا کر تو دیکھ مغفرت کا دریا نہ بہا دوں تو کہنا۔ صرف میرا ہو کر تو دیکھ ہر کسی کو تیرا نہ کردوں تو کہنا۔

مرسلہ: خضر حیات۔ روڈہ تھل

خوب صورت باتیں

☆: تمام دنیا گھوم کر دیکھ لو مفلس کے لیے کوئی بھی دروازہ کھلا ہوا نہیں ہے۔

☆: خاموشی دانشمندی کی علامت ہے تو سہی لیکن کبھی کبھی اس سے حماقت کا ثبوت ملتا ہے۔

☆: کسی سے کتاب مستعار لینے کے بعد مشکل سے واپس ملتی ہے۔

☆: اپنے متعلق آپ کچھ بھی نہ کہیے یہ کام آپ کے جانے کے بعد خود ہی ہو جائے گا۔

☆: عیاری چھوٹے کمبل کی مانند ہے کہ سر چھپاؤ تو پیر ننگے ہو جائیں گے۔

☆: محبت کے نشے میں ''مرد'' اور ''عورت'' ایک دوسرے کے کردار کا جائزہ نہیں لے سکتے۔

حسنِ انتخاب: مسز نگہت غفار۔ کراچی

قدرت کے رنگ

کچھ لوگوں کا صبر قدرت کو اس قدر پسند آجاتا ہے کہ وہ انہیں اپنی آزمائشوں کے لیے چن لیتی ہے اور آزمائش ان کا مقدر ہو جاتی ہیں۔ یہ لوگ صابرین میں سے ہیں اور قدرت کو کبھی مایوس نہیں کرتے۔

☆ ذاتِ باری تعالیٰ بیکراں ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ میں نے انسان کو محبت سے تخلیق کیا تاکہ میں پہچانا جاؤں۔ اسے اپنے لیے بندوں سے محبت کرنے والے پسند ہیں۔

شاہراہِ حیات One way ہے۔ اس پر ہم صرف آگے جا سکتے ہیں واپس نہیں مڑ سکتے۔ اس شاہراہ پر بہت ایکسیڈنٹ ہوتے ہیں۔ بڑی چوٹیں لگتی ہیں اور جب ان حادثات سے ہم زندگی کو سمجھنے لگتے ہیں تو ہمیں بوڑھا بنا کر ریٹائر کر دیا جاتا ہے۔

کنواں کبھی بالٹیاں بھر بھر کر ڈالنے سے نہیں بھرتا' بالکل اسی طرح تم کسی انسان کے دل میں کوئی خوب صورت جذبہ کبھی نہیں جگا سکتے جب تک اس جذبے کی کونپل اس کے اندر پہلے سے موجود نہ ہو۔

حسنِ انتخاب: ریاض حسین تبسم۔ فیصل آباد

ایٹمی دھماکے

☆ 16 جنوری 1945ء کو امریکہ نے پہلا ایٹمی دھماکہ صحرائے میکسیکو میں کیا۔

☆ 14 جولائی 1949ء کو روس نے پہلا ایٹمی دھماکہ سائبریا میں کیا۔

☆ 13 اکتوبر 1952ء کو فرانس نے پہلا ایٹمی دھماکہ صحرائے افریقہ میں کیا۔

☆ 16 اگست 1952ء کو ہیروشیما پر صبح 8 بجے 3 ہزار فٹ کی بلندی سے امریکی طیارے نے بم گرایا۔

☆ 19 اگست 1945ء کو ناگاساکی پر 11 بج کر 2 منٹ پر امریکہ نے دوسرا ایٹم بم گرایا۔

☆ 28 مئی 1998ء کو پاکستان نے سہ پہر 3 بج کر 16 منٹ پر 5 ایٹمی دھماکے صوبہ بلوچستان میں چاغی کے مقام پر کیے۔

مرسلہ: نور العین۔ اسلام آباد

غزل

سہارے ڈھونڈنے نکلا سہارے کھو گئے میرے
لبِ ساحل جو پہنچا تو کنارے کھو گئے میرے
سنبھالے تو بڑے آئے چلے بھی ساتھ میرے جو
مجھے تھی آرزو جن کی وہ پیارے کھو گئے میرے
گیا تھا آسماں پر بھی مقدر ڈھونڈنے لیکن
چھپا کر چاند منہ رویا ستارے کھو گئے میرے
چمن اب خوب صورت بھی مرے کس کام آئے گا
تھی چاہت جن کی آنکھوں کو' نظارے کھو گئے میرے
کہیں سے ڈھونڈ کر لاؤ میری گزری جوانی کو
جوان جذبے جوانی میں ہی سارے کھو گئے میرے
غموں نے چھین کر قاسم میرا بچپن مٹا ڈالا
ابھی تھے کھیلنے کے دن' غبارے کھو گئے میرے

شاعر: محمد قاسم خان بلوچ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

افسانچہ

میں اِسے آج تک نہیں بھولی، بہت یاد آتا ہے میرے ہی ہاتھوں میں تو اُس نے جان دی تھی۔ کیسے تڑپی تھی میں، جب وہ آخری سانسوں میں تھا، کس قدر بے بسی تھی، میری اس کو بچانے کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی اور میں روئے چلی جا رہی تھی۔ آنسو تھے، کہ رکنے کا نام نہ لیتے تھے، ہچکی بندھ گئی تھی روتے روتے۔

میں نے اس کے منہ میں پانی ڈالا کہ شاید چند سانسیں اِسے جینے کو اور مل جائیں وہ لاچار میری طرف تک رہا تھا۔ آخر وہ وقت آگیا کہ جس نے تمہیں مجھ سے الگ کر دیا۔ تم بہت دور چلے گئے۔ مجھ پہ سکتہ ہو گیا تھا۔ میں اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی کہ جس پہ سے تم پھسلتے پھسلتے زمین پہ ایک بے جان وجود کی طرح گر گئے تھے۔ میں تمہیں یوں گھور رہی تھی کہ جیسے میری نظروں کی تپش سے تم جاگ جاؤ گے مگر نہیں شاید یہ میری خام خیالی تھی۔ موت نے تمہارے وجود کو برف کر دیا تھا۔ اور میں تمہارے قریب زمین پہ بیٹھی کانپ رہی تھی۔ میرے آنسو تمہیں بھگو رہے تھے۔ مگر تم بے حس و حرکت پڑے تھے۔ موت اتنی کربناک ہوتی ہے تمہیں دیکھ کر احساس ہوا تھا۔ یہ سچ ہے کہ تمہاری موت کے بعد میں نے دوسرا ''طوطا'' خرید لیا۔ مگر وہ تم تو نہیں ہو سکتے نا، وہ کبھی تمہاری جگہ نہیں لے سکتا میرے پیارے طوطے۔

زورِ قلم۔ عظمیٰ شکور۔ اسلام آباد

ایک لمحہ

ایک لمحہ ہوتا ہے احساس کو جگانے کے لیے۔ ایک لمحہ ہی بعض دفعہ کافی ہوتا ہے سنبھلنے کے لیے اور ایک لمحہ ہی جہت ہے۔ پاتال میں لے جانے کے لیے۔ بے شمار لمحوں میں سے ایک لمحے کا غرور بھی اللہ کے ہاں آپ کی پکڑ کر سکتا ہے اور بے شمار لمحوں میں سے ایک لمحے کی توبہ آپ کو رب کی بارگاہ میں معتبر کر سکتی ہے۔

از قلم: فرح انیس۔ کراچی

اچھی باتیں

☆: محبت سب سے کرو مگر اعتماد چند لوگوں پر کیا جائے۔

☆: کسی کو اس کی ذات پر پرانے لباس کی وجہ سے حقیر مت سمجھو اس لیے کہ تیرا رب اور اس کا رب ایک ہے۔

☆: جب تیرا دل گناہوں کے کاموں میں لگنا شروع ہو جائے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارا رب تم سے ناراض ہے۔

☆: انسان کا نقصان مال اور جان کا چلا جانا نہیں بلکہ انسان کا سب سے بڑا نقصان کسی نظروں سے گر جانا ہے۔

☆: مہمان کے آگے کم کھانا رکھنا بے مروتی ہے اور حد سے زیادہ کھانا رکھنا تکبر ہے۔

کنول جی تنہا۔ گگو منڈی، بورے والا

غزل

اک عجب سا اضطراب مجھ پہ طاری ہے
سانس لینا بھی لگتا اب تو بھاری ہے
یہ محبت تو گزرے دنوں کی بات ٹھہری
تماشا بنی زندگی ساری کی ساری ہے
آج وہ ملتا ہے اک اجنبی کی طرح
جس کے وصل میں یہ عمر گزاری ہے
کہاں کا عشق یہ پیار محبت پیارے
اک فسانہ بنی اب تو یہ دلداری ہے
عجب یہ بات ٹھہری بھول نہ پائے اُسے
ناجانے یہ عشق کی کسی خماری ہے
بھول جانے میں مجھے شاید اسی کی مرضی تھی
پر کیا کروں لگتی ہر اک ادا اس کی پیاری ہے
بچنا اے صاحب اہل حُسن کی نگری سے
تابش کی تم سے یہ عرض گزاری ہے

شاعر: ڈاکٹر علی حسنین دانش۔ چشتیاں

پھلیاں

پھلیاں ریشے، پروٹین، حیاتین اور معدنی نمکیات کا بہترین ذریعہ ہوتی ہیں۔ ان میں اگر ریشہ بہت ہوتا ہے تو چکنائی بھی بہت کم ہوتی ہے۔ زیادہ ریشے اور کم چکنائی والی پھلیاں خاص طور پر معدے کے سرطان سے محفوظ رکھتی ہیں۔ ان میں موجود ریشہ آنتوں سے رسولیوں کا سبب بننے والے زہریلے مادوں کو سمیٹ کر جسم سے خارج کر دیتا ہے۔ اس ریشے کا عمل تیز ہوتا ہے، اس طرح جسم بھی ان مادوں سے جلد نجات پا کر سرطان سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ دنیا بھر میں پھلیوں کی کئی اقسام پیدا ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک میں سیم، لوبیا، چنے، گوار پھلی، فرنچ بین (فراش بین) کی کوئی کمی نہیں، انہیں ضرور کھانا چاہیے۔

مرسلہ: اسامہ بلال اعوان۔ لاہور

مزاحمت

وکیل نے کیس لینے سے پہلے موکل سے پوچھا۔ "تمہیں کس سلسلے میں گرفتار کیا گیا ہے۔"

"سرکاری کام میں مداخلت کی تھی۔"

"تم نے کس کام میں مداخلت کی تھی؟"

"انسپکٹر صاحب مجھے گرفتار کرنا چاہتے تھے میں نے مزاحمت کی تھی۔"

"کس طرح کی مزاحمت کی تھی۔ مار پیٹ یا بحث و مباحثہ۔"

"نہ مار پیٹ نہ بحث و مباحثہ۔ بس وہ بیس ہزار مانگ رہے تھے۔ میں نے پانچ ہزار دینے کی کوشش کی تھی۔"

مرسلہ: عمر العطاس۔ کراچی

سادگی

صبح دودھ والے نے گھنٹی بجائی تو شوہر کی آنکھ کھل گئی۔ بیوی گہری نیند سو رہی تھی، اس کے شوہر نے سردی کی وجہ سے بیوی کی شال اچھی طرح اوڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ دودھ والے سے دودھ لے کر وہ جونہی مڑا، پیچھے سے اسے دودھ والے کی آواز آئی۔ "کیا بات ہے ڈارلنگ، کیا آج کچھ ناراض ہو؟"

شوہر ہنستا ہوا مسہری پر جا لیٹا۔ بیوی نے نیند بھری آواز میں پوچھا۔ "ہنس کیوں رہے ہو؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "ابھی بڑے مزے کی بات ہوئی، میں تمہاری شال اوڑھ کر دودھ والے سے دودھ لینے گیا تو اس نے پیار سے مجھے ڈارلنگ پکارا۔ میرا خیال ہے اس کی بیوی کی شال بھی تمہاری جیسی ہے۔"

مرسلہ: محمد جواد۔ چک شہزاد

غلطی

ایک نوجوان نے اپنے دوست کو بتایا۔ "لو بھئی وہ حادثہ ہو ہی گیا، میری غریبی کی وجہ سے نسرین نے میرے ساتھ شادی سے انکار کر دیا۔"

دوست نے پوچھا۔ "کیا تم نے اسے اپنے دولت مند چچا کے بارے میں نہیں بتلایا جن کے مرنے کے بعد ان کی ساری جائیداد تمہیں ہی ملے گی؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "ہاں، بتلایا تھا اور اب نسرین میری چچی ہے۔"

مرسلہ: عامر بشیر۔ کراچی

شرط

ایک ہوٹل میں ایک صاحب نے اچانک اعلان کیا کہ اگر کوئی شخص ایک وقت میں تیس چکن تکے ایک ساتھ کھائے گا تو وہ اسے پانچ ہزار روپے انعام میں دیں گے۔ ہوٹل میں ایک سردار جی بھی بیٹھے ہوئے تھے، وہ یہ شرط سنتے ہی باہر چلے گئے۔ کافی دیر بعد وہ واپس آئے اور ہوٹل کے منیجر سے پوچھا۔

"کیا وہ تیس تکے کھانے والی شرط ابھی تک برقرار ہے؟ میں اس میں حصہ لینا چاہتا ہوں؟"

"ہاں، وہ شرط تو برقرار ہے لیکن آپ اچانک کہاں چلے گئے تھے؟"

"میں دراصل ساتھ والے ہوٹل میں تیس تکے کھانے گیا تھا تاکہ مجھے اندازہ ہو سکے کہ میں شرط پوری کر سکتا ہوں یا نہیں؟"

مرسلہ: شاہانہ احمد۔ کھاریاں

گھریلو ٹوٹکے

☆ اکثر لوگوں کی کام کرتے وقت یا زیادہ چلتے پھرتے ہوئے سانس پھولنے لگتی ہے، ان کے لیے آزمودہ نسخہ ہے کہ کریلے کے پانی میں تھوڑا سا شہد ملا کر کھا لیں، سانس نہیں پھولے گی۔

☆ کچی پیاز کھانے سے پیٹ کے کیڑے مر جاتے ہیں بشرط متواتر چار پانچ روز متواتر استعمال کی جائے۔

☆ دو لیموں کے رس میں ڈیڑھ پاؤ کھولتا ہوا پانی ڈالیں اور اسے حسب ذائقہ شہد سے میٹھا کر کے رات کو سوتے وقت پی لیں۔ زکام میں اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔

☆ دانت کے درد کے لیے لونگ کا سفوف ایک چھوٹا چمچہ ایک لیموں کے رس میں خوب ملا کر دانتوں پر ملنے سے درد دور ہو جاتا ہے۔

☆ ہرا دھنیا سونگھنے سے چھینکیں آنا بند ہو جاتی ہیں۔

مرسلہ: مسز عظمت مبارک، کراچی

نیکی

ایک ٹیچر نے بچے سے پوچھا۔ "اس ہفتے تم نے کوئی نیکی کا کام کیا؟"

بچے نے جواب دیا۔ "جی ہاں، کل میں نے ایک موٹے آدمی کو بس پکڑنے کے لیے دوڑتے ہوئے دیکھا، میں نے اپنا کتا اس کے پیچھے دوڑا دیا، بس پھر وہ شخص اتنی تیزی سے بھاگا کہ کافی دور جاتی بس پر وہ چڑھ ہی گیا ورنہ بس اس سے مس ہو جاتی۔"

مرسلہ: رمشا عارف۔ حیدرآباد

اقوال زریں

☆ سب کے سامنے کسی کو نصیحت کرنا ایک طرح کی ملامت ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆ جو شخص تم سے دوسروں کے عیوب بیان کرتا ہے، وہ یقیناً دوسروں کے سامنے تمہاری برائی بھی کرتا ہوگا۔ (حضرت حسن بصریؒ)

☆ تین شخص/اشخاص تین باتوں سے پہچانے جاتے ہیں، دانا غصے کے وقت، بہادر لڑائی کے وقت اور دوست ضرورت کے وقت۔ (حضرت لقمان)

☆ محبت میں یہ قباحت ہوتی ہے کہ جس سے محبت کی جائے، اسے خود سے جدا کرتے وقت بہت تکلیف ہوتی ہے۔ (خلیل جبران)

☆ اپنے خدا سے آشنا بنو کیونکہ جب مسافر کسی شہر میں پہنچتا ہے تو آشنا کی موجودگی اسے بہادر اور نڈر بنا دیتی ہے۔ (کنفیوشس)

☆ بے موقع گفتگو انسان کو لے ڈوبتی ہے۔ (ایڈورڈ بوہری)

مرسلہ: صائمہ بشیر۔ سرگودھا

سکونِ قلب

سکونِ قلب کسی فارمولے کا نام نہیں' فارمولے تو بچوں کے لیے ہوتے ہیں کہ مٹھائی بنالی ہے' لو کھا لو لیکن یہ سکونِ قلب ہے۔ کسی کا سکونِ قلب برباد نہ کرو' سکونِ قلب مل جائے گا۔ پیسوں سے محبت نہ کیا کرو' سکونِ قلب مل جائے گا۔ دُعا پر بھی ضد نہ کرو' نامنظور دُعا کا بھی اتنا ہی احترام کرنا جتنا منظور کا۔ اگر یہ فرق سمجھ میں نہیں آتا' سکونِ قلب نہیں ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو ہو رہا ہے' اگر آپ اس کو پسند کر کے چلنا شروع ہو جاؤ' سکونِ قلب مل جائے گا۔

واصف علی واصف کی ''گفتگو'' سے نادیہ طارق۔ ساہیوال کا انتخاب

سچ

چھوٹا بچہ باہر سے گھر آیا تو اس کے ہاتھ میں سو کا نوٹ تھا۔ باپ نے فوراً پوچھا۔ ''یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟''

''یہ مجھے گلی میں پڑا ملا ہے۔'' بچے نے بتلایا۔

''تم سچ بول رہے ہونا؟'' باپ نے شکی لہجے میں پوچھا۔

''ہاں ابو' آپ خود جا کر دیکھ لیں' ایک آدمی ابھی تک اسے سڑک پر ڈھونڈ رہا ہے۔''

مرسلہ: شمائلہ اختر' لاہور۔

حوا کی بیٹی

یہ اماں حوا کی بیٹی
نا جانے ذہن کی سلائیوں پہ
کیوں نت نئے اور نامکمل خواب بنتی رہتی ہے
یہ مشرقی روایات کی پابند
اور گونگی ذات
کیوں خود فریبی کے جال میں مُقید ہے!
یہ معصوم اور مظلوم ہستی
آخر کب تک
اپنے ہی معاشرے میں
یوں اجنبیوں کی طرح جیے گی؟

شاعرہ: روبینہ ناز روبی۔ رضا آباد، فیصل آباد

اظہار

ایک سردار جی کو اسپتال کی نرس سے محبت ہوگئی۔ جب وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہونے لگے تو سوچا کہ جاتے وقت اظہارِ محبت کر ہی دینا چاہیے' سو وہ نرس کے پاس گئے اور بڑی ہمت کر کے بولے۔ ''آئی لو یو سسٹر......''

مرسلہ: محمود علی۔ جہلم

بے کار

ایک امریکی پالتو جانوروں کی دکان پر گیا اور بولا۔ ''یہ کتا میں نے ہزار ڈالر میں خریدا تھا لیکن اسے آپ سو ڈالر میں خرید لیں۔''

''کیوں' کیا اس کتے میں کوئی عیب ہے؟'' دکان دار نے شک سے پوچھا۔

''جی نہیں' اصل میں کچھ دنوں پہلے اس نے میری ساس کو کاٹ لیا تھا جس کی وجہ سے وہ مر گئیں۔ اب اس کے بعد اس کتے کا کوئی کام ہی نہیں رہا' یہ میرے لیے بے کار ہے۔''

مرسلہ: نبیلہ وسیم۔ میرپور خاص

بے بسی

چڑیا گھر کی سیر کے دوران ایک صاحب نے دیکھا کہ چڑیا گھر کا ایک ملازم خاموشی سے بیٹھا آنسو بہا رہا ہے۔ ان صاحب نے اس سے پوچھا۔ ''بھائی' ایسے کیوں رو رہے ہو؟''

''آج ہمارے چڑیا گھر کا ایک ہاتھی مر گیا ہے۔'' ملازم بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''اوہو' بڑا افسوس ہوا' یقیناً تمہیں اس سے بہت محبت ہوگی۔''

''ارے صاحب' محبت گئی بھاڑ میں' مجھے تو اس کی قبر کھودنے کا حکم ملا ہے۔'' ملازم روتے ہوئے بولا۔

مرسلہ: حنا لطیف۔ کراچی



قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں

نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

ایم افضل آزاد......ساہیوال

جب بکھیرتا ہے کوئی خواب خزاں آنکھوں میں
اشک بن جاتا ہے زیرآب خزاں آنکھوں میں

نائلہ غضنفر.........کراچی

اس نے کہا کہ ساتھ کہاں تک نبھاؤ گے؟
میں نے کہا کہ جتنی یہ سانسوں کی تار ہے
اس نے کہا کہ مجھ کو یقیں آئے کس طرح؟
میں نے کہا کہ نام مرا اعتبار ہے

عامر جاوید.........ملتان

سی صحرا کو پیاسا چھوڑ جاتا ہے کبھی دریا
بھی پیاسے کو دریا کی سخاوت یاد رہتی ہے

فریحہ ناز.........لاہور

پلکوں کو بھگونے کے زمانے نہیں آتے
اب لوگ بہت یاد پرانے نہیں آتے
تنہائی سے اکتا کر چلے آتے ہیں ورنہ
ہم زخم زمانے کو دکھانے نہیں آتے

یاسمین.........کوٹری

بتے رشتے تلاش کرتی ہے
خوشبو غنچے تلاش کرتی ہے
جب گزرتی ہے اس گلی سے صبا
خط کے پرزے تلاش کرتی ہے

کامران احمد.........میلسی

رات کی جیب سے نکالی ہے
رات بھر چاندنی اچھالی ہے
پھر ہوا سونگھتی ہے دروازے
پھر کوئی بات ہونے والی ہے

نعیم اکبر......قصور

جگر ہو جائے گا چھلنی' یہ آنکھیں خون روئیں گی
وصی بے فیض لوگوں سے نبھا کر کچھ نہیں ملتا

نگہت منیر.........اوکاڑہ

کاش کہ تیری آنکھوں کا پانی بن جاؤں فراز
تو کبھی نہ روئے مجھے کھونے کے ڈر سے

فہد غفار.........کراچی

نہ ہم رہے نہ خوابوں کی زندگی ہی رہی
گماں گماں سی مہک خود کو ڈھونڈتی ہی رہی
حریم شوق کا یہ عالم بتائیں کیا تم کو
حریم شوق میں بس شوق کی کمی ہی رہی

ارباز حسین.........کراچی

وہ کر نہیں رہا تھا مری بات کا یقیں
پھر یوں ہوا کہ مر کے دکھانا پڑا مجھے

شجاع حسین.........ٹنڈو آدم

کچھ بتا اے ماتمی راتوں کی دھندلی چاندنی
بھولنے والوں کو آخر کس طرح یاد آؤں میں؟

نور فاطمہ.........ڈیرہ اللہ یار

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے آلات

جمیلہ کنول.........کراچی

رائیگاں نہیں جاتی دل پہ جو گزرتی ہے
آدمی بکھرتا ہے' شاعری نکھرتی ہے

عابدہ بیگم..........سیالکوٹ

اک قبیلے میں تھا سردار کا بیٹا شاعر
اس قبیلے کو کبھی خوں نہ بہاتے دیکھا

مصطفےٰ خان..........جہلم

اپنی ہستی میں بھی کچھ شک آ پڑا
علم کا سودا بڑا مہنگا پڑا

اشعر عتیق..........کراچی

ہو برائے شام ہجراں لب ناز سے فروزاں
کوئی ایک شمع پیماں کوئی اک چراغ وعدہ

عارف خان..........ایبٹ آباد

ساتھ بیٹھے ہیں جو دلدار نہ سمجھے جائیں
بس شناسا ہیں مرے یار نہ سمجھے جائیں

شازیہ رضوی..........کراچی

اے رات مجھے ماں کی طرح گود میں لے لے
دن بھر کی مشقت سے بدن ٹوٹ رہا ہے

شعبان کھوسہ..........کوئٹہ

تلاشِ منزل کے مرحلوں میں یہ حادثہ اک عجیب دیکھا
فریب راہوں میں بیٹھ جاتا ہے صورت اعتبار بن کر

نبیل جاوید..........سرگودھا

اک عمر کی جدائی میرا نصیب کر کے
وہ تو چلا گیا ہے باتیں عجیب کر کے

ایم وکیل عامر جٹ..........ساہیوال

نقاب رخ سے ہٹاؤ کہ رات جاتی ہے
کوئی تو بات سناؤ کہ رات جاتی ہے

مے میکدے میں نہیں ہے تو کیا ہوا ساقی
ہمیں نظر سے پلاؤ کہ رات جاتی ہے

معاویہ عنبر وٹو..........ہڑپہ

موت ہی سے کچھ علاج درد فرقت ہو تو ہو
غسل میت ہی ہمارا غسل صحت ہو تو ہو

عذیر شفیق..........اسلام آباد

مرا ذوق خریداری ہے اک جنس گراں مایہ
کبھی پھولوں کا شیدائی، کبھی کانٹوں کا بنجارہ

نسیم شفیق..........اسلام آباد

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن، کچھ تو ادھر بھی

فرح عالم......اسلام آباد

دریا کو نہیں خیال اپنا
پانی میں اک آسمان بھی ہے

ایم سعید انور سعید......لاہور

بات کرتے ہیں وہ اجالوں کی
جن سے روشن دیا نہیں ہوتا

تحسین جونیجو..........خیر پور ناتھن شاہ

کنارہ دوسرا دریا کا جیسے
وہ ساتھی ہے مگر محرم نہیں ہے

مبشر عالم..........سکھر

منتظر کہاں ہوں میں اب کسی بھی ساتھی کا
اپنے آپ سے ہی اب دوستی بلا کی ہے

☆☆☆

کوپن برائے

تیرنیم کش

مارچ 2016ء

میرا یہ پسندیدہ شعر "سچی کہانیاں" کی نذر ہے

نام:

پتا: